ISSN: 2348-2826

"He is the Almighty Allah and no God except Him"
(The Holy Quran : 59/22)

تصوف پر علمی، تحقیقی و دعوتی مجلّہ

کتابی سلسلہ

الاحسان

الہ آباد

الذی لا الٰہ الا ھو

وہ عظیم ذات صرف اللہ کی ہے، جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ (الحشر:۲۲)

کتابی سلسلہ 5

تصوف پر علمی، تحقیقی و دعوتی مجلہ
کتابی سلسلہ
الاحسان الہ آباد

Shah Safi Academy, Allahabad

کتابی سلسلہ 5

February 2014

Issue : 5

(An Annual Journal on Islamic Spirituality)

Shah Safi Academy, Jamia Arifia
Saiyed Sarawan, Kaushambi, Allahabad U.P. (India) 212213
Ph: +91-9696973121, 07860604036, (India), Email:alehsaan.yearly@gmail.com

Edited, Printed and Published by Hasan Saeed on behalf of Shah Safi Academy, Jamia Arifia at Kainat Publication & Printers 14-H, South Housing Scheme, Tulsipur, Allahabad (U.P.)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تصوف پر علمی، تحقیقی و دعوتی مجلہ

کتابی سلسلہ الاحسان الہ آباد

زیر سرپرستی: داعی اسلام شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی مد ظلہ العالی

مدیر: حسن سعید صفوی

مرتبین

مجیب الرحمن علیمی، ذیشان احمد مصباحی، ضیاء الرحمن علیمی، رفعت رضا نوری

معاونین

محمد عمران ثقافی، عارف اقبال مصباحی، کتاب الدین رضوی

ناشر

شاہ صفی اکیڈمی، جامعہ عارفیہ/ خانقاہ عارفیہ، سید سراواں، الہ آباد (یوپی)

E-mail :alehsaan.yearly@gmail.com

shahsafiacademy@gmail.com

سلسلۂ مطبوعات شاہ صفی اکیڈمی نمبر (8)

کتابی سلسلہ: الاحسان (شمارہ نمبر-۵)

مدیر: حسن سعید صفوی

ترتیب: مجیب الرحمن علیمی، ذیشان احمد مصباحی، ضیاء الرحمن علیمی، رفعت رضا نوری

سال اشاعت: فروری ۲۰۱۴ء/ ربیع الآخر ۱۴۳۵ھ

ناشر: شاہ صفی اکیڈمی، جامعہ عارفیہ/ خانقاہ عارفیہ، سید سراواں، الہ آباد (یوپی)

قیمت فی شمارہ:	Rs. 250
لائبریری اور سرکاری اداروں کے لیے:	Rs. 500
بیرونی ممالک:	$. 40

Alehsaan (*An Annual Journal on Islamic Spirituality*)
Published by. **Shah Safi Academy**, Jamia Arifia
Saiyed Sarawan, Kaushambi, Allahabad U.P.(India)211001
Ph:8382923993/9026981216-Email:alehsaan.yearly@gmail.com

اہل قلم کی رائے سے ادارے کا اتفاق ضروری نہیں!

انتساب

عارف باللہ، قطب ربانی، ابوالمواہب

امام عبدالوہاب شعرانی قدس سرہٗ

(پیدائش: ۲۷ رمضان ۸۹۸ھ/ ۱۱ جولائی ۱۴۹۳ء۔ وفات: جمادی الاولی ۹۷۳ھ/ دسمبر ۱۵۶۵ء)

کے نام

جنھوں نے علامہ شہاب الدین قسطلانی، شیخ الاسلام زکریا انصاری اور امام جلال الدین سیوطی سے علمی وفکری استفادہ اور شیخ علی المرصفی، شیخ محمد الشناوی اور شیخ علی الخواص سے روحانی و اخلاقی تربیت حاصل کی

اور

الیواقیت والجواہر، میزان الشریعۃ الکبریٰ، الانوار القدسیۃ، الطبقات الکبریٰ، لواقح الانوار القدسیۃ، لطائف المنن، مشارق الانوار اور الکبریت الاحمر جیسی اپنی گراں قدر تصنیفات سے تصوف اور صوفیہ کی علمی تعبیر وتشریح اور حمایت ونصرت فرمائی۔

خانقاہ عارفیہ/ جامعہ عارفیہ کا ترجمان

آسان اردو زبان میں خالص اصلاحی ماہانہ رسالہ

خضرراہ

سفر وحضر کا بہترین ساتھی

گھر کے ہر فرد کی فکری اور روحانی تسکین کا سامان

آسان زبان میں اسلامی افکار وخیالات کا انمول خزانہ

سوسائٹی کو سیرت نبوی میں ڈھالنے کے لیے پڑھیں اور پڑھوائیں

قیمت فی شمارہ ۲۰ روپے

قیمت فی شمارہ: (لائبریری اور سرکاری ادارے) ۴۰ روپے

قیمت سالانہ (سادہ ڈاک) ۲۵۰ روپے

قیمت سالانہ (رجسٹری ڈاک) ۵۰۰ روپے

بیرونی ممالک ۴۰ ڈالر

اعزازی ممبرشپ ۵۰۰۰ روپے

ناشر: شاہ صفی اکیڈمی، جامعہ عارفیہ، سید سراواں، کوشامبی، الہ آباد (یوپی)

رابطہ: 9312922953/7860604036

ای میل: khizrerah@gmail.com

عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد
من از سر نو زندہ کنم دار و رسن را
(سرمد شہید)

مشمولات

بحث ونظر

تصوف کے بنیادی مآخذ کیا ہیں؟

شناسائی

مطالعۂ تصوف

صوفی ادب

زاویہ

امام عبدالوہاب شعرانی کی شخصیت اور ان کی علمی واصلاحی خدمات پر خصوصی گوشہ

مکتوبات

بادہ وساغر

غزل

تیر قضا کو کیف میں حسن ادا کہوں
یعنی ہر اک جفا کو میں جان وفا کہوں

ساغر بدست مست ہوں روز أَلَسْتُ سے
مستی میں کیا کہوں جو نہ قَالُوابَلیٰ کہوں

گویا ہے کوئی اور ہی اپنی زبان سے
میری مجال ہے کہ میں إِنِّی أَنَا کہوں

کہنا ہے جو بھی آپ کو کہیے وہ شوق سے
راز و نیاز عشق میں کیوں برملا کہوں

جاکر در حبیب پہ کاش ایک بار میں
بعد از سلام حال دل مبتلا کہوں

خلد بریں کو چھوڑ کے آیا زمیں پہ کیوں
حسن قضا کہوں کہ میں حسن خطا کہوں

آنکھوں سے وہ شراب پلائی ہے آپ نے
جس کو جنون کیف میں ہستی ربا کہوں

امید رکھ یہ اور کسی دوسرے سے تو
میں اور پھر سعیدؔ تجھے پارسا کہوں؟

شیخ فخرالدین ابراہیم عراقی
منظوم ترجمہ: غوث سیوانی

غزل

صبا وقتِ سحر بوئے ز کوئے یار می آید
کہ بوئے او شفائے جانِ ہر بیمار می آید
نسیمِ او مگر در باغ جلوہ می دہد گل را
کہ آوازِ خوشِ بلبل ز ہر سو زار می آید
بیا در گلستاں اے دل بوئے گل برافشاں جاں
کہ از رنگش مرا یادِ رخِ دل دار می آید
گل از شادی ہمی خندد من از غم زار می گریم
کہ از رنگش مرا یادِ رخِ دلدار می آید
اگر گلزار می آید کسی را خوش مرا باری
نسیمِ کوئے او خوشتر ز صد گل زار می آید

منظوم ترجمہ

صبا کے دوش پہ خوشبوے کوے یار آتی ہے
کہ اس کی بو شفاے جانِ ہر بیمار آتی ہے
کلی چٹکی وہ گلشن میں نسیمِ مشک بار آئی
کہ آوازِ خوشِ بلبل بہر سو زار آتی ہے
چمن میں پھول کی خوش بو پہ دل قربان کرتا ہوں
کہ اس کے رنگ سے یادِ رخِ دل دار آتی ہے
خوشی سے پھول کھلتے ہیں مگر میں غم سے روتا ہوں
کہ ان کے رنگ سے یادِ رخِ دل دار آتی ہے
چمن کی زیب وزینت دل لبھاتی ہے مگر پھر بھی
نسیمِ کوئے دل بر رشک صدگل زار آتی ہے

ابتدائیہ

حدیث جبریل کی روایتوں میں ترتیب کا یہ اختلاف ہے کہ بعض میں پہلے نمبر پر ایمان ہے اور دوسرے نمبر پر اسلام، جب کہ بعض میں پہلے نمبر پر اسلام ہے اور دوسرے نمبر پر ایمان ہے۔ البتہ! احسان تمام روایتوں میں تیسرے نمبر پر ہے، جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ احسان کا مقام بلند ایمان واسلام کے بعد آتا ہے۔ رہے ایمان واسلام تو ان کی ترتیب افراد کے اختلاف سے بدل جاتی ہے۔

دین حق کی دعوت اہل عرب کی فکر ونظر میں تبدیلی کی دعوت تھی، جن لوگوں نے یہ دعوت قبول کی دراصل انھوں نے سب سے پہلے اسلامی عقائد یعنی ایمان کو قبول کیا، پھر احکام اسلام کا تدریجاً نزول ہوتا رہا اور وہ ان احکام کو اپنی زندگی میں نافذ کرتے رہے۔ اس کے برخلاف ان کی آنے والی نسلوں نے جب شعور کی آنکھیں کھولیں تو ان کا گھر اسلامی احکام اور دینی ثقافت کا مرکز تھا، شعوری یا غیر شعوری طور پر تمام احکام وروایات ان کی زندگی کا حصہ بن چکے تھے، پھر بعد میں انھوں نے عقائد اسلامی میں غور وخوض کیا اور اپنے ایمان کو مستحکم کیا۔

یہ فرق آج بھی نئے مسلمانوں اور خاندانی مسلمانوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ خاندانی طور پر جو مسلمان ہیں وہ اکثر اسلامی احکام واعمال سے واقف اور ان پر عامل ہوتے ہیں مگر بالعموم ایمان ان کے دلوں کی گہرائی میں اترا ہوا نہیں ہوتا، جب کہ نو مسلم عموماً پہلے نغمۂ توحید اور رسالت محمدی کو اپنے درون خانہ میں بٹھاتے ہیں، داخلی سطح پر ایک طویل کشمکش کے بعد اپنے موروثی عقائد سے تائب ہوتے ہیں اور دین حق کو قبول کرتے ہیں، پھر انھیں احکام اسلامی سے رفتہ رفتہ واقفیت ہوتی رہتی ہے اور بحسن وخوبی وہ ان کی انجام دہی کرتے جاتے ہیں۔

بہر کیف! مقام احسان؛ ایمان واسلام دونوں کے بعد کا ہے، اپنے ایمان وعمل میں حسن پیدا کرنا، خاندانی مسلمانوں کے لیے بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا نو داخل مسلمانوں کے لیے۔ اور حدیث جبریل کے مطابق یہ حسن صرف دو ہی طریقے سے پیدا ہوسکتا ہے، ہم عبادت اس طور پر کریں، گویا ہم اپنے خالق و مالک کو دیکھ رہے ہوں یا کم از کم اس طور پر کہ ہمارا خالق و مالک ہمیں دیکھ رہا ہو۔ (متفق علیہ)

احسان کی تشریح بعض دیگر روایتوں میں دیگر الفاظ میں بھی آئی ہے، مثلاً:

ابونعیم کی حلیۃ الاولیاء میں ہے، حضرت ابوذر فرماتے ہیں:

''میرے خلیل صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اللہ سے ایسے ڈروں جیسے میں اسے دیکھ رہا ہوں، یا اس طرح جیسے وہ مجھے دیکھ رہا ہو۔''

مسند الربیع میں ہے:

''احسان یہ ہے کہ تم اللہ کے لیے ایسے کام کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، یا پھر ایسے جیسے وہ تمہیں دیکھ رہا ہو۔''

دیلمی کی مسند الفردوس میں ہے:

''تم ایسے رہو جیسے تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، یا پھر ایسے رہو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہو۔''

صحیح مسلم اور سنن ترمذی کی ایک روایت کے مطابق:

''اللہ نے ہر چیز میں احسان کو فرض کیا، یہاں تک کہ اگر تم قتل کرو تو احسان یعنی اچھے سے وار کرو، ذبح کرو تو اسے بھی احسان کے ساتھ یعنی اچھے سے ذبح کرو، آدمی پہلے اپنی چھری تیز کرلے تا کہ جانور کو تکلیف سے راحت مل جائے۔''

ابن ماجہ کی روایت ہے:

''ایک شخص نے دریافت کیا: حضور! میں محسن کب ہوجاؤں گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تمہارا پڑوسی اگر تمھیں اچھا کہے تو اچھے ہو اور اگر برا کہے تو برے ہو۔''

المختصر عقائد واعمال سے لے گفتار وکردار تک میں حسن پیدا کرنا اور ہر لمحہ اللہ عز وجل کو حاضر وناظر تصور کرنا احسان کا جامع مفہوم ہے۔ صوفیہ نے اسی مفہوم کو اپنی زندگی میں اتارنے کے لیے اپنی زندگیاں گزار دیں۔

....

الاحسان کی اتنی ساری تعبیرات کے بعد ممکن ہے کہ بعض ضعیف الدماغ افراد یہ سمجھ بیٹھیں کہ الاحسان ایک مبہم اور غیر واضح چیز ہے، جب اس کی تعریف وتعبیر میں چند ایک اختلافات ہیں

پھر تو اس کی بنیاد پر قائم تصوف بھی ایک مبہم اور غیر واضح چیز ہوگی، یہی وجہ ہے کہ خود تصوف کی تعبیر وتشریح میں بھی اہل تصوف کے بے شمار اختلافات پائے جاتے ہیں۔

ایسے حضرات سے پہلے التماس ہے کہ وہ اپنے ایمان کی خیر منائیں اور جرات فکر ونظر پر توبہ کی توفیق مانگنے کے لیے شب کی تاریکیوں میں بارگاہ صمدیت میں اپنی پیشانی کو خم کردیں اور رب زدنی علما کا وظیفہ اور فتح حق کی دعا کریں، انھیں یہ دعوت فکر ہے کہ وہ ٹھنڈے دل ودماغ سے سوچیں کہ تصوف کی مختلف تعبیرات پر ان کا اعتراض انھیں کہاں تک لے جاتا ہے اور پھر بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی، احادیث کریمہ میں ایمان واسلام اور مومن ومسلم کی تعریف وتشریح بھی متعدد مختلف تعبیرات میں آئی ہے۔ کہیں کہا گیا کہ مومن وہ ہے کہ جس سے اہل ایمان اپنے جان ومال کے سلسلے میں بے خوف رہیں۔ (احمد) کہیں قسم کھا کر یہ کہا گیا کہ جس سے اس کے پڑوسی کو تکلیف ہو وہ بخدا مومن نہیں ہوسکتا۔ (متفق علیہ) کہیں کہا گیا کہ ایمان کے ستر درجات ہیں، ایمان کا افضل درجہ کلمہ **لاالہ الا اللہ** ہے اور ادنیٰ درجہ راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹانا ہے اور کہیں کہا گیا کہ ایمان کے اوصاف تین ہیں: (۱) بندہ جب غضب ناک ہو تو اس کا غضب اسے باطل تک نہ پہنچا دے، (۲) جب خوش ہو تو اس کی خوشی اسے حق سے دور نہ کردے اور (۳) قادر ہو تو دوسرے کا سامان نہ لے لے۔ (طبرانی)

اسی طرح اسلام اور مسلمان کی تشریح میں کتب احادیث میں مختلف تعبیرات آئی ہیں، مثلاً: (۱) مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔ (بخاری) (۲) مسلمان وہ ہے جس سے سارے انسان محفوظ رہیں۔ (احمد) اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے، کلمہ توحید کی شہادت، ادائے نماز، ادائے زکات، حج اور ماہ رمضان کے روزے۔ (متفق علیہ)

کتب احادیث میں اس طرح کی مثالیں تلاش کی جائیں تو اس پر مستقل ایک کتاب تیار ہوجائے گی، لیکن ان تعبیری اختلافات سے حقیقت ایمان واسلام اور روح احسان کو مبہم سمجھنا کسی فکری قلاش کا ہی شیوہ ہوسکتا ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ایک چیز کی مختلف تعبیر اس چیز کی حقیقت کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ اس حقیقت سے کس کو انکار ہے کہ حقائق وجمالیات کی دنیا علم الحساب کی دنیا سے مختلف ہے۔

۲+۲=۴ ہوتا ہے، یہ سوال پوری دنیا میں جس سے چاہیں کرلیں جواب میں کوئی اختلاف نہیں ہوگا، اس کے برخلاف حسن وجمال، عقل ودانائی، اخلاق وشرافت کس کو کہتے ہیں؟ اس سوال کے جواب میں ہر دوسرے شخص کا جواب پہلے سے مختلف ہوگا لیکن اس تعبیری اختلاف سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ حسن وجمال، عقل ودانائی اور اخلاق وشرافت کی کوئی حقیقت نہیں، علمی وفکری دیوالیہ پن کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔

تصوف کی ایک سے زائد تعبیر کرنے کے باوجود اہل تصوف اس بات پر متفق ہیں کہ بندے کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے اندر احتساب ومجاہدے کے بعد مراقبے یا مشاہدے کی کیفیت پیدا کرے، یہی حدیث احسان کا صریح مفہوم ہے، اب اس کے بعد اس مقصد کے حصول کے سلسلے میں آداب وتفصیلات میں صوفیہ کو ایک دوسرے سے بعض فروعی اختلافات ہیں، یہ اختلافات بھی کمزور ذہنوں کے لیے حجاب بن جاتے ہیں، ضرورت یہ ہے کہ اس حجاب کو اٹھایا جائے اور صوفیہ کی جو اصل دعوت ہے، اس کے سامنے لبیک کہا جائے۔فروعی اختلافات کے سبب کبیدہ خاطر ہونے کی ضرورت نہیں، بلکہ فہم اختلاف کی دعا مانگتے ہوئے، اختلاف کے باوجود احترام باہم کے ساتھ جینے کا سلیقہ سیکھنے کی ضرورت ہے۔

....

تاریخ اسلامی کے آنے والے ادوار میں جب الگ الگ طور پر فنون ظہور پذیر ہوئے، اس وقت مباحث ایمان کے لیے علم الکلام وجود میں آیا، مباحث اسلام کے لیے علم الفقہ کی ایجاد ہوئی، جب کہ مباحث احسان کے لیے تصوف مستقل دبستان عرفان وعمل کی شکل میں سامنے آیا۔بعض نگاہوں میں اگر تصوف کا دبستان خار بن کر کھٹکتا ہے تو اس میں حیرت کیا ہے؟ بہت سے مدعیان علم ودانش کو علم الکلام او رعلم الفقہ سے بھی خدا لگتی بیر ہے۔بعض نے علم الکلام کو دین وشریعت سے خارج، یونانی فلسفیانہ مباحث کی بازگشت ٹھہرایا ہے تو بعض نے علم الفقہ کو کتاب وسنت سے خارج یونانی قوانین کا چربہ اور یہودی تلمودی افکار کا خلاصہ بتایا ہے۔بات یہیں ختم نہیں ہوتی، تفسیری آرا کو اسرائیلی روایات سے عبارت اور حدیثی کتابوں کو موضوعات کا مجموعہ بتانے والوں کی بھی آج کمی نہیں، پھر اسلام کیا ہے؟ قرآن کریم کی من مانی تشریح، چودہ سالہ سوتوارث، تواتر، تاریخ اور ثقافت سے بغاوت، خود پرستی اور انانیت کی تسکین اور اس کی دلیل کیا ہے؟ عقل محض اور خواہش نفس کی پیروی میں قرآن کریم کے جس لفظ کو جب چاہیں حقیقت سے مجاز میں بدل دیں اور جسے چاہیں مجاز سے حقیقت میں لے آئیں۔

اس قسم کے شبہات وتوہمات میں الجھے شاذ ونادر افراد کل بھی تھے، آج بھی ہیں اور کل بھی رہیں گے، مگر مسلمانوں کی جماعت عظمیٰ، سواد اعظم اور جمہور اہل اسلام کل بھی اس قسم کے شبہات وخرافات سے ہٹ کر کتاب اللہ، سنت رسول، نقوش صحابہ اور طریق اسلاف پر قائم تھے اور علما ومشائخ اسلام؛ محدثین ومفسرین، متکلمین وفقہا اور صوفیہ کو ان کا صحیح مقام دیتے ہوئے ان کے انوار وفیوض سے اکتساب کرتے رہے، یہ سلسلہ آج بھی قائم ہے اور کل بھی باقی رہے گا۔بس دعا کرنے کی ضرورت ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ذہنوں میں وسعت اور دلوں میں ایمان عطا فرمائے۔غلو اور افراط وتفریط سے محفوظ رکھے، ہمیں سیدھی راہ پر چلائے، جو اس کے انعام یافتہ بندوں کی راہ ہے، جو انبیا، شہدا، صدیقین اور صالحین کی راہ ہے۔(اللھم آمین!)

....

تصوف اور شریعت کے درمیان کون سا رشتہ ہے؟ اس سوال کا صاف وشفاف جواب صوفیہ صافیہ نے ہر عہد میں بہت صفائی کے ساتھ دیا ہے، مگر اس کے باوجود نہ جانے کیوں یہ سوال آج بھی بہت سے ذہنوں میں تشکیک اور الجھن کا باعث بنا رہتا ہے۔

اس سے قبل الاحسان میں بھی متعدد بار یہ بات کہی گئی ہے کہ شریعت، دین کے مفہوم میں احسان سے عام ہے، اور احسان وتصوف اس کا ایک حصہ ہے، جب کہ شریعت، فقہ کے مفہوم میں تصوف کے بالمقابل بالعموم احکام ظاہر سے بحث کرتی ہے اور نظام کی اصلاح کی داعی ہے جیسے تصوف عموماً احکام باطن سے بحث کرتا ہے اور شخصیت کی باطنی اصلاح کی دعوت دیتا ہے اور یہ دونوں۔شریعت اور تصوف۔دین برحق کا حصہ ہیں۔گویا شریعت اپنے وسیع مفہوم میں دین کا مترادف ہے اور تصوف اس کا محض ایک حصہ ہے اور مخصوص مفہوم میں شریعت، تصوف سے الگ ہے لیکن دونوں دین سے باہر کی چیز نہیں بلکہ دین کا ہی حصہ ہیں، ایک کا موضوع احکام ظاہر ہیں تو دوسرے کا موضوع تزکیہ واصلاح باطن۔

اس وضاحت کے بعد پھر اس طرح کے سوالات بہت اہم نہیں رہ جاتے ہیں کہ ظاہر و باطن کا صحیح علاج کس سے ہوگا، شریعت سے یا تصوف سے؟ جو تصوف کو اصلاح باطن کا ذمہ دار بتائے کیا وہ کتاب وسنت سے باہر نور ہدایت کا متلاشی ہے؟ اور کیا تصوف شریعت کے متوازی ایک مستقل نظام شریعت ہے؟

یقیناً اصلاح ظاہر وباطن کا ایک ہی ماخذ ہے اور وہ ہے وحی ربانی، جس کی دو شکلیں ہیں؛ کتاب اللہ اور سنت رسول۔انھی دونوں سے اصلاح ظاہر وباطن کے سارے اسباق نکالے گئے ہیں، البتہ اگر ان اسباق کا تعلق تزکیہ اور سلوک باطن سے ہو تو انھیں تصوف یا طریقت کہا جاتا ہے اور ان کے ماہرین کو صوفیہ یا اہل احسان اور اگر ان اسباق کا تعلق اصلاح نظام اور عدالت وقضا سے ہو تو انہیں فقہ وشریعت کہتے ہیں اور ان کے ماہرین کو فقہا اور ماہرین قانون اسلامی۔

دراصل سوال یہ نہیں ہے کہ تصوف کتاب وسنت سے خارج ہے یا اس میں داخل، مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ وہ ہے جو نماز وروزہ اور حج وزکات کی ادائیگی کے بعد تزکیہ وسلوک، اصلاح باطن اور تربیت نفس کی ضرورت کا قائل ہی نہیں، اسے اس کا ادراک ہی نہیں کہ عجب وغرور، حسد وکینہ، ریا وسمعہ اور خود پسندی وانانیت کوئی قابل اصلاح مرض ہے، نفس پرستی اور خود سری کا یہ عالم ہے کہ ایک طبقہ صرف یہ کہتا ہے کہ ہمارے لیے صرف کتاب اللہ کافی ہے، دوسرا اس سے آگے بڑھ کر سنت تک آتا ہے، ایک قدم اور آگے بڑھا یا تو علم الکلام اور علم الفقہ تک آیا، تزکیہ

وتربیت نفس کے قائلین کم ہیں، جو قائل ہیں بھی وہ عامل نہیں، تصوف کا لفظ قرآن کریم اور حدیث میں آیا ہے یا نہیں؟ اور یہ دین سے خارج ہے یا داخل؟ ان سوالات کے بجائے ہمیں اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ غیر مزکی نفوس اور غیر تربیت یافتہ افراد، خواہ لاکھ ظاہری زہد وتقویٰ کا لباس پہن لیں، ان کا انجام تباہی اور صرف تباہی ہے۔ اللہ کا فرمان ہے:

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى (الاعلیٰ:14)

جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا وہ کامیاب ہوا۔

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰاهَا وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰاهَا (الشمس:9،10)

جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا وہی کامیاب ہوا اور جس نے نفس کو گندا کیا وہ ناکام ونامراد ہوا۔

تصوف اور صوفیہ کا ایک ہی موضوع ہے اور وہ ہے تزکیۂ نفس اور تربیت باطن، تاکہ مشاہدہ یا مراقبہ کی دولت حاصل ہو، جس کی طرف حدیث پاک: أَنْ تَعْبُدَ اللهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ (متفق علیہ) میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اہل تصوف نے اس کے لیے فقہا کی طرح ہی کتاب وسنت اور قیاس واستنباط سے احکام اخذ کیے ہیں اور اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر کشف والہام اور اشارات کو اپنا ماخذ بنایا ہے، لیکن اس کے ساتھ انھوں نے کشف والہام یا قیاس واستنباط کو آزاد نہیں رکھا ہے، سب کو کتاب وسنت کا پابند رکھا ہے، اسی لیے حضرت جنید بغداری نے فرمایا:

علمنا هذا مقيد بالكتاب و السنة۔

ہمارا علم طریقت کتاب وسنت کا پابند ہے۔ (الرسالۃ القشیریۃ، ۱/ ۷۹ط۔ دارالمعارف قاہرۃ)

بعض مشائخ کا قول ہے:

كل حقيقة ردتها الشريعة فهي الزندقة۔

ہر وہ حقیقت جسے شریعت رد کردے وہ زندیقی ہے۔ (مرج البحرین، ص: ۳۳، ایجوکیشنل پریس، پاکستان)

اس کے باوجود جس طرح محدثین، فقہا اور متکلمین اپنے خاص موضوع و مدعا پر متفق ہوتے ہوئے بھی بہت سے فروعی اور جزئی مسائل میں دلیل کی بنیاد پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں، یہی حال صوفیہ کا ہے کہ فروعی آداب ومسائل میں بسا اوقات وہ بھی ایک دوسرے سے اختلاف رائے رکھتے ہیں، ان کا یہ اختلاف اتباع نفس اور کتاب وسنت کی مخالفت میں نہیں، اخلاص وتوکل کے ساتھ استنباط واستخراج میں اختلاف کی وجہ سے ہے۔ بعض اختلافات، اختلاف زمان ومکان کے باعث ہیں، اس طرح کے اختلافات فطری بھی ہیں اور لازمی بھی، اس طرح کے اختلافات سے کس کا دامن پاک ہے؟ کیا صحابہ وتابعین میں اس طرح کے اختلافات

نہیں ہوئے، پھر صوفیہ کرام ہی تنہا ہمارے غیظ وغضب کا شکار کیوں ہوتے ہیں؟ یا ہم ان کے تعلق سے شبہات والتباسات میں کیوں الجھ جاتے ہیں؟

....

الاحسان کا پانچواں شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ الاحسان نے اس شمارے کے ساتھ اپنی مسلسل اشاعت کے پانچ سال پورے کر لیے۔ اس نصف عشرہ کے سفر میں بہت سے مقامات آہ وفغاں آئے گئے، لیکن اس کے باوجود الاحسان کی خوش قسمتی ہے کہ اس مختصر سی مدت میں اس نے علمی دنیا میں اپنا ایک مقام بنا لیا۔ اس کی توثیق ارباب دین ودانش کے تأثرات سے ہوتی ہے۔ یہ الاحسان کی مقبولیت ہی تھی جس نے بعض احباب کو الاحسان کو شش ماہی کی شکل میں شائع کرنے کے لیے مشورہ دینے پر مجبور کیا۔ ہم نے ان کے جذبے کے احترام میں گذشتہ شمارے میں اسے شش ماہی کرنے کا اعلان بھی کر دیا تھا مگر اہل محبت اور الاحسان کے شرکائے سفر کے اصرار مسلسل کے بعد ہمیں اپنا فیصلہ واپس لینا پڑا۔ پانچواں شمارہ حسب روایت گذشتہ شماروں کی طرح تمام تر رعنائیوں کے ساتھ آپ کے پیش نظر ہے۔ ہم نے اسے بھی گذشتہ شماروں کی طرح بہتر سے بہتر کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے، اس کوشش میں ہم کتنا کامیاب ہیں، اس کا فیصلہ قارئین کے حوالے ہے۔

....

یہ شمارہ حضرت داعی اسلام شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی دام ظلہ العالی کی ایک اردو غزل اور حضرت شیخ فخر الدین ابراہیم عراقی رحمۃ اللہ علیہ کی فارسی غزل سے شروع ہوتا ہے۔ حضرت عراقی کی مرصع غزل کا منظوم ترجمہ بھی شامل شمارہ ہے جسے جناب غوث سیوانی نے کیا ہے۔ موصوف صوفی شاعری کا انتخاب اپنے منظوم اردو ترجمے کے ساتھ شائع کرنے والے ہیں۔ تصوف پر ان کی اور بھی علمی خدمات ہیں جن پر وہ ادارہ الاحسان کی طرف سے قابل مبارک باد ہیں۔

بادۂ کہنہ کے کالم میں ضرورت شیخ کے تعلق سے شیخ سعد خیر آبادی کی تحریر اگر چشم کشا ہے تو مسئلۂ تکفیر میں اعتدال کے حوالے سے امام عبد الوہاب شعرانی کی تحریر سبق آموز اور بصیرت افروز ہے۔ اس بار تذکیر کے کالم میں تین تحریریں ہیں، داعی اسلام شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی کے عارفانہ کلمات، سلوک اور حال ومقام کی سہل تفہیم وتشریح کرتے ہیں تو ڈاکٹر سید شاہد علی ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اسلامیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کی عالمانہ تحریر نفس اور اخلاق کی تعبیر و تشریح کرتے ہوئے اخلاقیات قرآن اجاگر کرتی ہے۔ الاحسان کا ایمانی سلسلہ [کفر سے ایمان تک] حسب سابق اس بار بھی شامل ہے۔ اس بار جناب جان محمد عرف جانکی پرساد کی داستان ایمان ہم خاندانی مسلمانوں کے لیے لمحۂ فکریہ کا درجہ رکھتا ہے۔

اس شمارے میں پہلی بار تین عرب اہل قلم کی تحریریں شامل اشاعت ہیں، موسیقی ونغمہ کے تعلق سے سابق مفتی اعظم مصر ڈاکٹر علی جمعہ کی تحریر، حضرت رابعہ بصریہ کی شخصیت وافکار پر معروف عالمی اسکالر ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی تحریر اور علم حدیث کی تحقیق واشاعت میں صوفیۂ کرام کی تاریخی خدمات کے حوالے سے شیخ عدنان بن عبداللہ زہار کی تحریر، یہ تینوں تحریریں مختلف جہتوں سے بہت ہی اہمیت کی حامل ہیں، ان کا ترجمہ بالترتیب مولانا اظہار احمد ثقافی، مولانا محمد ذکی اور مولانا غلام مصطفیٰ ازہری نے کیا ہے۔ان تحریروں کی اشاعت کے پیچھے عرب وعجم کے مابین علم وفکر اور تہذیب وثقافت کا تبادلہ بھی ہمارے پیش نظر ہے۔

ہندوستان کے اہل سنن کا بڑا طبقہ مجاہد گروہ صوفیہ امام احمد رضا قادری بریلوی کے مسلک و منہاج کا نام لیوا ہے، مسلمانان ہند میں بڑی سطح پر بیعت وارادت اور اجازت وخلافت بھی رائج ہے۔لیکن موجودہ زمانے میں جس انداز میں بیعت وخلافت کی ارزانی ہوئی ہے، کیا یہ سب کچھ اکابر صوفیہ خصوصاً امام احمد رضا قادری بریلوی کی تعلیمات وتشریحات کے مطابق درست ہے؟ مجلہ الاحسان کے شریک مرتب مولانا مجیب الرحمٰن علیمی نے امام احمد رضا قادری کے اقوال و ارشادات کی روشنی میں اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔موصوف نے آئینہ رکھ دیا ہے، اب کس کی صورت اس میں کیسی نظر آتی ہے، اس کے ذمہ دار مولانا موصوف تو نہیں!

مولانا ضیاء الرحمن علیمی کا اپنا سلسلہ جاری ہے۔مخالفین تصوف کے پیشواؤں کی کتابوں سے تصوف موافق تعلیمات کی مسلسل تلاش اور پھر ان کی علمی پیش کش مولانا کی وہ علمی خدمت ہے جس کا اعتراف مستقبل میں کیا جاتا رہے گا، ابن جوزی، ابن تیمیہ اور ابن قیم کے بعد ان کا چوتھا سلسلہ قاضی شوکانی کے ان افکار وخیالات سے متعلق ہے جن سے بالواسطہ یا بلا واسطہ تصوف کی حمایت وخدمت ہوتی ہے۔اکیسویں صدی میں ہونے والے صوفیانہ تحقیقات میں مولانا کا یہ سلسلہ ان شاء اللہ العزیز تا دیر موضوع بحث بنا رہے گا۔مولانا موصوف کے اس سلسلے کے مقالات اللہ نے چاہا تو شاہ صفی اکیڈمی کی طرف سے کتابی شکل میں بھی شائع کیے جائیں گے۔ موصوف کے اس علمی سلسلے کا مقصد علمی تحقیق کے ساتھ مخالفین کی علمی تفہیم اور مخلصانہ دعوت کی ایک کوشش ہے۔اسے اسی طور سے دیکھا جائے۔اللہ کرے کی یہ کوشش کامیاب ہو۔

جامعہ عارفیہ، سید سراواں کے استاذ امام الدین سعیدی نے اس بار نظریۂ وحدۃ الوجود کی علمی تفہیم کی قابل قدر کوشش کی ہے۔موصوف نے پرانی شراب کو نئی بوتل میں پیش کرنا چاہا ہے، اس پیش کش میں بڑی حد تک انہوں نے میکدۂ احسان کے روح رواں داعی اسلام عارف حق حضرت شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی دامت فیوضہم کی صحبت فیض سے چنے ہوئے موتیوں

کو بھی شامل رکھا ہے، امید کہ قارئین کو یہ پیش کش بھی اچھی معلوم ہوگی اور اس سے ان کے شبہات کے ازالے کا سامان بھی ہوگا۔تحقیق وتنقید کے کالم میں مولانا محمد آصف رضا مصباحی کا مقالہ صوفیانہ تفسیر: مقبول یا مردود؟ بھی قابل مطالعہ اور مستحق تحسین ہے۔

کالم بحث ونظر میں تصوف کے بنیادی مآخذ کی تلاش میں مفتی مطیع الرحمٰن رضوی اور جناب شمیم طارق صاحب کے خیالات بھی اس بار کافی اہم ہیں۔اسی طرح شناسائی کے تحت حضرت سید شرف الدین نیر قادری سجادہ نشیں خانقاہ قادریہ امجھر شریف بہار کی محبت اور معلومات بھری باتیں بھی ان شاء اللہ دلچسپی سے پڑھی جائیں گی۔

مولانا صادق رضا مصباحی، مولانا افضل حسین مصباحی، مولانا حماد رضا مصباحی اور مولانا محمد ناظم اشرف مصباحی صاحبان مختلف نئی مطبوعات تصوف پر اپنے مطالعات کے ساتھ شریک ہیں، نقد ونظر کا ہر ایک کا اپنا انداز ہے۔جن کتابوں/ رسائل پر اس بار تبصرے شامل ہیں وہ حسب ذیل ہیں: (۱) تصوف اور بھکتی: ایک تنقیدی اور تقابلی مطالعہ/شمیم طارق (۲) تصوف اور کشمیری صوفیہ/ غوث سیوانی (۳) سہ ماہی دیوان پٹنہ کا تصوف نمبر/ سید شاہ حسین احمد (۴) سال نامہ الاحسان الہ آباد/ حسن سعید صفوی

صوفی ادب میں شامل تینوں مقالات نہایت اہم اور وقیع ہیں۔پروفیسر اختر الواسع، ڈاکٹر ظفر انصاری ظفر اور مولانا جہاں گیر حسن مصباحی نے بالترتیب ہندوستان میں صوفی ادب: ایک اجمالی جائزہ، حضرت آسی غازی پوری کی عارفانہ شاعری اور مرزا مظہر جان جاناں: شاعری اور اصلاح زبان کو اپنا موضوع بنایا ہے۔تینوں مقالات اپنے موضوع اور مواد کے لحاظ سے اس کالم کے شایان شان ہیں۔ان میں پہلا مقالہ پروفیسر اختر الواسع صاحب کا توسیعی خطبہ ہے جسے انہوں نے الہ آباد یونی ورسٹی میں ۲۳ نومبر ۲۰۱۳ء کو پروفیسر محمد رفیق یادگاری خطبہ کی مناسبت سے پڑھا تھا۔آخر الذکر دونوں مقالے بھی خانقاہ عارفیہ، سید سراواں میں مختلف موقع سے حضرت مرزا مظہر جان جاناں اور حضرت آسی غازی پوری پر منعقد سیمینار میں پڑھے جا چکے ہیں۔

الاحسان کا کالم زاویہ شریعت وطریقت کی ایک انتہائی قابل احترام شخصیت عارف ربانی ابوالمواہب امام عبدالوہاب شعرانی کی حیات وخدمات کے نام ہے۔آپ کا شمار اہل علم نے دسویں صدی کے مجددین میں کیا ہے۔نفرت، تعصب، غلو، دین بےزاری اور تقلید محضیت کے دور میں آں موصوف نے تصوف کا نغمۂ جاں فزا چھیڑا، کیوں کہ ان مسائل کا حل صرف تصوف ہی فراہم کرسکتا تھا، دوسرے لفظوں میں وہ مسائل پیدا ہی اس وقت ہوتے ہیں جب تصوف اور روحانیت سے دوری اختیار کرلی جاتی ہے، لہٰذا ان کا حل بھی اسی وقت ہوسکتا ہے جب معاشرے

میں تصوف کی آمد ثانی ہو۔حضرت امام شعرانی کی شخصیت وافکار کو پیش کرتے ہوئے ہمیں بار بار یہ خیال گزرا کہ ہم اپنے عہد کے مسائل کا حل پیش کر رہے ہیں، ہمیں نہیں معلوم کہ قارئین ہمارے اس خیال میں ہم سے کتنا اتفاق کریں گے۔

مکتوبات کے کالم میں ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی کا مکتوب رئیس المکاتیب بلکہ محتسب المقالات کا درجہ رکھتا ہے۔ہم اس کا شکریہ اس لیے نہیں کرتے کہ الاحسان کو اپنے علمی فیضان سے سیراب کرنا ڈاکٹر موصوف کا صرف اخلاقی نہیں، علمی فرض بھی ہے۔ویسے بھی ادارہ الاحسان نے کبھی ان کو باہر کا نہیں سمجھا۔اسی لیے اگر وہ اپنے الطاف خاص سے مدیر ومرتبین الاحسان کو بھی نوازتے ہیں تو ہمیں برا نہیں لگتا۔وہ ہمارے بڑے ہیں اور محبت ورحمت کے ساتھ چھوٹوں کی تادیب وتہذیب بڑوں کا حق ہے۔

آخر میں ہم ان اخبارات ومجلّات کے بھی شکر گزار ہیں جنھوں نے گذشتہ شمارے پر تبصرے کیے، ان احباب کا بھی جنھوں نے اپنے تاثرات اور مشوروں سے نوازا اور ان تمام کرم فرماؤں کا بھی جنھوں نے الاحسان کی اشاعت وفروغ میں کسی بھی شکل میں ہمارا تعاون کیا۔

....

شاہ صفی اکیڈمی نے سال گذشتہ سے الاحسان عربی کی اشاعت شروع کی تھی۔ملک و بیرون ممالک اس کی بڑی پذیرائی ہوئی۔عالم عرب میں جہاں بھی رسالہ پہنچا اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔خصوصاً جامعہ ازہر مصر کے اساتذہ وطلبہ نے اسے بہت سراہا اور اسے ہند ومصر دینی وعلمی رابطے کی راہ میں کلید قرار دیا۔پہلے شمارے میں تقریباً تیس مقالات شامل تھے جن میں نصف سے زائد مصر کے اکابر علما ومشائخ کی تھے۔الاحسان کا دوسرا شمارہ قدرے مختلف ہے۔یہ شمارہ علامہ قطب الدین دمشقی علیہ الرحمہ (وفات:۷۸۰ھ) کے متن تصوف الرسالۃ المکیۃ کے اوپر ہے۔علامہ قطب الدین دمشقی، حضرت عبداللہ یافعی (وفات:۷۶۸ھ) اور مخدوم جہانیاں جہاں گشت (وفات:۷۸۵ھ) علیہما الرحمہ کے معاصر ہیں۔علامہ دمشقی کا رسالہ ایک زمانے میں خانقاہوں میں داخل درس رہا۔اسی رسالے کی فارسی شرح حضرت مخدوم شاہ مینا لکھنوی قدس سرہ کے مرید وخلیفہ، عظیم عالم وصوفی حضرت شیخ سعد خیرآبادی قدس سرہ نے مجمع السلوک کے نام سے کی جس کا اردو ترجمہ مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی کے قلم سے عن قریب شاہ صفی اکیڈمی کی طرف سے شائع ہونے والا ہے۔الاحسان عربی کے دوسرے شمارے میں پہلی مرتبہ الرسالۃ المکیۃ مولانا غلام مصطفیٰ ازہری کی تحقیق وتخریج اور مولانا ضیاء الرحمٰن علیمی کے مقدمے کے ساتھ شائع ہو رہا ہے، گویا الاحسان عربی کے اس شمارے کی حیثیت مستقل کتاب کی ہے، اللہ کرے کہ خانقاہوں میں اس طرح کے متون

تصوف پھر سے داخل درس ہوں اور خانقاہوں کی روحانی وعلمی بہار پھر سے واپس آئے۔

....

اللہ کریم سے دعا ہے کہ مولیٰ تعالیٰ اس علمی، فکری، اخلاقی، دعوتی اور تربیتی مجلّے کو عمر خضر عطا فرمائے۔اس کے بانی وسرپرست حضرت داعی اسلام شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی مدظلہ العالی کا سایہ ہمارے سروں پر دراز فرمائے تاکہ خانقاہ عارفیہ، سید سراواں سے برپا ہونے والا احیائے تصوف کا علمی وعملی مشن پایۂ تکمیل کو پہنچ سکے۔اللہ بس باقی ہوس!!

ذیشان احمد مصباحی

اعتذار

گزشتہ شمارے میں ص:۲۲ پر ایک مضمون بعنوان: **فقہی مذاہب کا اختلاف رحمت ہے**، شائع ہوا ہے، اس میں ایک مقام پر ہے:

جدید دور میں طویل ملکی اور غیر ملکی اسفار کے دوران بطور خاص ہوائی سفر میں ایسی صورتیں پیش آتی ہیں کہ جمع بین الصلاتین پر عمل کر لیا جائے یا امام اعظم کے قول ثانی اور امام ابو یوسف، امام محمد اور امام شافعی کے مذہب پر عمل کرتے ہوئے مثل اول میں عصر ادا کر لی جائے تو ترک نماز سے بچا جا سکتا ہے۔

نشان زدہ جملے کو قارئین اس طرح پڑھیں: مثل اول کے بعد مثل ثانی میں عصر ادا کر لی جائے تو ترک نماز سے بچا جا سکتا ہے۔اسی طرح اس عبارت کی دیگر مقامات پر بھی تصحیح کر لیں۔ادارہ اس کے لیے معذرت خواہ ہے۔

بادۂ کہنہ

تحریر: شیخ سعد خیر آبادی
ترجمہ: ضیاء الرحمٰن علیمی

کتاب وسنت کی عظمت اور اتباع شیخ کی ضرورت

علم راجح و نافع جس سے بندہ کے معارف اور اس کے نیک اعمال درست ہوجاتے ہیں، وہ کتاب الٰہی یعنی قرآن میں ہے۔ کیوں کہ قرآن ہی عقیدہ، ایمان، توحید، معرفت، اعمال اور احوال کے معاملے میں پیشوا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَ الَّذِيْ اَوْ حَيْنَا اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ۔ (فاطر:۳۱)

ہم نے تمہارے اوپر جو کتاب وحی کی ہے وہ حق ہے، اور وہ اس سے پہلے والی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے۔

اور رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِتَّبِعُوْ اما اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ۔ (اعراف:۳)

اس کی پیروی کرو جو تمہارے پروردگار کی جانب سے تمہاری طرف اتاری گئی ہے۔

یعنی قرآن کی پیروی کرو اور قرآن کو چھوڑ کر کوئی کام نہ کرو، یہ کلام خوف والی باتوں کو بھی شامل ہے اور بندگی کو بھی جامع ہے، اس لیے کہ قرآن کی پیروی کرنا ایمان وتوحید اور معرفت کی حقیقت، اللہ کے تمام احکام کی پیروی، تمام ممنوعات سے باز رہنے، اس کی جانب سے کیے گئے تمام وعدوں کی طرف رغبت رکھنے اور اس کی وعیدوں سے خوف رکھنے کا نام ہے، اس میں پچھلی قوموں اور نسلوں کا بھی بیان ہے، گزرے ہوئے لوگوں کے احوال اور آنے والی باتوں کا بھی تذکرہ ہے، جیسا کہ قرآن مبین کا اعلان ہے:

وَ لَا رَطْبٍ وَّ لَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ۔ (انعام:۵۹)

ہر خشک وتر اس واضح کتاب میں مذکور ہے۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا۔ (آل عمران: ۱۰۳)

اللہ کی رسی یعنی قرآن کو مضبوطی سے پکڑلو اور متفرق مت رہو، یعنی فرقہ فرقہ مت بن جاؤ۔

اور حدیث میں آیا ہے:

ان ھذا القرآن ھو الحبل المتین و النور المبین و الشفاء النافع و عصمة لمن تمسک بہ و نجاة لمن تبعہ۔

(السنن الصغریٰ للبیہقی، کتاب فضائل القرآن، باب الترغیب فی تعلم القرآن و تعلیمہ و تلاوتہ)

بے شک یہ قرآن مضبوط رسی ہے، یہ نور مبین ہے، یہ شفا اور نفع بخش ہے، جو اس کو مضبوطی سے پکڑ لے گا اس کے لیے لغزشوں سے حفاظت کا ذریعہ ہے اور جو اس کی پیروی کرے گا اس کے لیے یہ ذریعۂ نجات ہے۔

اسی قسم کی دوسری روایات بھی ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

انی ترکت فیکم ما ان تمسکتم بہ لن تضلوا کتاب اللہ و عترتی۔

(سنن الترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب اہل بیت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

میں تمہارے بیچ دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں، جب تک تم ان سے چمٹے رہو گے گم راہ نہ ہو گے؛ ایک کتاب اللہ اور دوسری میری آل۔

اور ایسے ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث بھی ان تمام چیزوں میں پیشوا ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

إني قد ترکت فیکم شیئین لن تضلوا بعدھما: کتاب اللہ و سنتي۔

یقینا میں نے تمہارے درمیان دو ایسی چیزیں چھوڑی ہیں کہ اگر تم ان کو مضبوطی سے تھامے رہو گے تو گمراہ نہیں ہو گے؛ قرآن اور سنت۔ (المستدرک، کتاب العلم)

یعنی یہ تمام باتیں جو ذکر کی گئی ہیں اگر قرآن نہ اترتا اور اخبار و احادیث وارد نہ ہوتیں تو ہرگز نہ سمجھ میں آتیں اور نہ معلوم ہوتیں، چنانچہ جو شخص قرآن و سنت کو مضبوطی سے پکڑے گا وہ راہ حق پا لے گا؛ کیوں کہ قرآن و سنت کو چھوڑ کر جو بھی دوسری راہ اختیار کرے گا وہ راہ نہیں ہوگی، بلکہ گمراہی ہوگی۔ اور جو شخص اس مرتبہ تک نہیں پہنچا ہو کہ وہ خود سے قرآن و حدیث سے رشد و ہدایت حاصل کر سکے تو اس کے لیے ایک شیخ کامل ضروری ہے، جو اسے مولیٰ تعالیٰ کی راہ دکھائے، طریقت و حقیقت کی طرف اس کی رہنمائی کرے، اور حق تعالیٰ کی جانب رہبری کرے جو سراسر مشاہدۂ انوار کا نام ہے۔

بعض مشائخ نے فرمایا ہے کہ علامہ قطب الدین دمشقی کے کلام سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ

جس کو قرآن و حدیث سے رشد و ہدایت حاصل ہو جائے اسے کسی شیخ کی پیروی کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اگر اسی پر اکتفا کر لے تو کافی ہوگا، اور صوفیہ کا یہ قول کہ **من لا شیخ لہ فالشیطان شیخہ** (جس کا کوئی پیر نہیں اس کا پیر شیطان ہے) ان سالکین کے بارے میں ہے جو قرآن و سنت کے لطائف سے محروم ہوں۔

میں کہتا ہوں ہاں کیوں نہیں! معاملہ ایسا ہی ہے، اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ کسی شخص کو بغیر کسی مرشد کی پیروی کے شایان شان رشد و ہدایت عطا فرما دے، بلکہ وہ تو اس بات پر بھی قادر ہے کہ قرآن و سنت کے وسیلے کے بغیر ہی کسی کو اعلیٰ مقام تک پہنچا دے۔ مالک الملک اپنی ملکیت میں جیسے چاہتا ہے تصرف فرماتا ہے، لیکن یہ امر نادر ہے، اگرچہ ممکن ہے اور خطرات سے بھی خالی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ وہ دوسروں کا مرشد نہیں بن سکتا، اس کارگہ حکمت میں کابراً عن کابرٍ یہی سلسلہ اور طریقہ چلا آ رہا ہے، چنانچہ شیخ کامل کی پیروی کے بغیر توحید یقینی اور معرفت شہودی، علم باطن و احوال، مکاشفہ اور مشاہدہ جن کا تعلق حضوری شیخ اور پیر کی تربیت سے ہے، اس وقت تک حاصل نہیں ہوگا، جب تک کہ وہ ایسے شیخ کامل کی پیروی نہ کر لے جو اس راہ کا شناور اور دیدہ ور ہو۔

اے عزیز! علم تصوف کوئی حسی چیز نہیں ہے کہ آیات و احادیث کے پڑھ لینے سے حاصل ہو جائے گا، جب تک بندہ کسی شیخ کامل کی، جو راہ تصوف کا شناور اور دیدہ ور ہو، پیروی نہیں کرے گا اس وقت تک وہ اس مقصود کامل تک نہ پہنچ سکے گا جہاں کاملین پہنچے ہیں، ایک بزرگ فرماتے ہیں:

روشن تر از آفتاب باید راہی ۔۔۔ تا بشناسد مزاج ہر سودائی

سالک کو آفتاب سے بھی زیادہ روشن ہونا چاہئے تا کہ ہر سودائی کے مزاج کو وہ پہچان جائے۔

اس فقیر کے پیر دست گیر حضرت مخدوم شاہ مینا قدس سرہ نے فرمایا کہ شیخ الاسلام شیخ نصیر الدین قدس سرہ کے عہد میں ایک بزرگ نے ترک دنیا کر کے عبادت الٰہی میں مشغولی اختیار کر لی، عوارف المعارف اور مشکوٰۃ المصابیح کو اپنے ساتھ رکھ لیا اور دونوں کا مطالعہ کرنے لگا، جو کچھ اس کتاب میں لکھا تھا اس پر عمل کرتا یہاں تک کہ کچھ زمانہ گزر گیا، لیکن مقصود اصلی اور معرفت حقیقی تک اس کو رسائی نہیں حاصل ہو سکی، اس کے بعد اس بزرگ نے حضرت شیخ الاسلام شیخ نصیر الدین کی جانب توجہ کی، حضرت کی بارگاہ میں پہنچے اور انہوں نے یہ شعر پڑھا:

من کہ در کوئے بتاں پا نہ نہادم ہرگز ۔۔۔ چوں ندیدم رخ تو سر نہ نہادم ہرگز

میں ہرگز حسینوں کی گلی میں قدم نہیں رکھوں گا، جب تک تیرے رخ زیبا کا دیدار نہ کر لوں سر نہیں رکھوں گا۔

پھر وہ مرید ہو گئے اور قطب جہاں کی اقتدا اور پیروی میں لگ گئے، چند روز میں ہی آں بزرگ کو ذکرِ خفی کے مقام تک پہنچا کر ان کو واصلین ومقربین کے زمرے میں شامل کرا دیا۔

خواجہ ابوعلی دقاق فرماتے ہیں:

''ہر وہ درخت جو خود رو ہوگا اس میں پتیاں تو ہوں گی لیکن پھل نہیں آئے گا اور اگر پھل آیا بھی تو بدمزہ ہوگا، ایسے ہی وہ مرید جس کا کوئی پیر اور استاد نہ ہو، وہ ہوا پرست ہے، اسے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔''

رئیس درویشاں، محتسب عارفاں شیخ قوام الحق والدین قدس اللہ روحہ فرماتے ہیں:

''شیخ کا دل صیقل شدہ آئینہ کی طرح ہے جس پر حضرت رب العزت کی جانب سے فیض اترتا ہے اور وہ آئینہ ذات وصفات واسما وافعال الٰہی کی تجلیوں سے متجلی ہوجاتا ہے اور ہر لمحہ اترنے والے غیبی لطائف سے آراستہ ہوتا رہتا ہے اور جب مرید صادق اپنی کامل ارادت کے ساتھ اپنے دل کے آبگینے کو اس طرح کے آئینے کے سامنے کرتا ہے تو شیخ کے آئینۂ دل سے مرید کے آئینۂ دل پر تجلی کا انعکاس ہوتا ہے، اور اس طرح بغیر کسی کسب اور بغیر کسی عمل کے، غیریت کی کدورت سے پاک اور طبیعت کی آلودگیوں سے صاف مرید کے آئینۂ دل پر ان تمام معنوی کمالات کا فیضان ہوجاتا ہے، مرید کی استعداد کے مطابق ایک لمحے میں اس کو وہ معنوی کمالات حاصل ہوجاتے ہیں جو کہ ایک زمانے تک کے ریاضت ومجاہدے سے بھی حاصل نہیں ہوتے۔''

اس چیز کو طالب علم ایک مثال کے ذریعے ہی سمجھ سکتا ہے۔ دمشق النصائح میں شیخ الشیوخ نے فرمایا ہے کہ دو نقاش ایک بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان میں ایک ہندوستانی تھا اور دوسرا چینی، دونوں نے نقاشی کا دعوی کیا اور نقاشی میں کمال رکھنے کے لیے سرغرور بلند کیا، بادشاہ نے حکم دیا کہ دونوں نقاش کو ایک کمرے میں بند کردیا جائے اور دونوں کے مابین ایک پردہ ڈال دیا جائے، چینی نقاش رنگا رنگ نقاشی میں مشغول ہوگیا اور ہندوستانی نقاش صرف اس دیوار کی صفائی میں مشغول ہوگیا جو کہ چینی نقاش کی نقش شدہ دیوار کے بالمقابل تھی، ایک طویل مدت اور بڑی مشقت کے بعد جب وہ دونوں نقاشی سے فارغ ہوگئے، تو بادشاہ کو خبر کی گئی کہ اب نقاشی کو دیکھنے کا وقت آگیا ہے، بادشاہ نے اپنا مبارک قدم اس کمرے کے اندر ڈالا اور درمیان سے پردہ اٹھانے کا حکم دیا، جب پردہ اٹھا دیا گیا تو چینی نقاش کے تمام نقوش اس ہندوستانی نقاش کی دیوار پر منعکس ہوکر زیادہ صاف اور زیادہ لطیف معلوم ہونے لگے، یہ دیکھ کر بادشاہ نے ہندوستانی نقاش کو زیادہ خلعت وانعام سے نوازا۔

یہ ذہن نشین کرلو کہ صفائی واستعداد سے آراستہ مرید کے دل پر شیخ کے دل سے کمالات الٰہی کا اسی طرح انعکاس ہوتا ہے اور یہ سب کتابوں کے مطالعے سے ہاتھ نہیں آتا، مثلاً وہ شخص جس کا کوئی مرشد برحق نہیں ہے، وہ صوفیہ کی کتابوں کے مطالعے میں مشغول ہوگیا اور اس نے اس پر قناعت کرلی، وہ اس شخص کی طرح ہے جو طلب علم کی تلاش وجستجو میں ہے لیکن کسی ماہر حکیم کی شاگردی کے بغیر ہی وہ یقین رکھے ہوئے ہے کہ وہ غلطی کا شکار نہیں ہوگا جب کہ وہ نہ مرض پہچانتا ہے اور نہ دوا کی کمیت وکیفیت سے واقف ہے، اس کے ذریعے سے بیمار ہلاک ہوجائے گا اور صحت یاب نہیں ہوگا۔

اس کارگہ حکمت میں پیر سے گریز کی کوئی راہ نہیں، وہ لوگ نادان ہیں جو کہتے ہیں کہ پیر کی کیا ضرورت ہے، کتاب وسنت پر عمل کافی ہے، کتاب وسنت کے ذریعے نفس کا علاج ہر شخص نہیں کرسکتا اور نہ نفس کے امراض کو پہچان سکتا ہے، اگرچہ کلام الٰہی انواع واقسام کی حکمتوں سے پُر ہے لیکن ایک حکیم کے سوا دوسرا کوئی نہیں جان سکتا کہ کون سے مرض کے لائق کون سی دوا ہے۔

جواں مرد! بعض مریدین ابرار کا مقام رکھتے ہیں، بعض مقربین کا اور بعض اپنے آپ پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض مریدی کے دائرے سے باہر ہیں، اگرچہ اپنے گمان فاسد میں وہ خود کو خلیفہ اور شیخ سمجھتے ہیں، چنانچہ جب تک کسی ایسے شیخ کامل کی صحبت نہ اختیار کی جائے جو اللہ کا خاص ولی ہو، جو فانی فی اللہ، قائم باللہ اور ظاہر باسماء وصفات اللہ ہو، محض کتابوں کے مطالعے سے یہ معنوی کمالات حاصل نہیں ہوسکتے۔

اے عزیز! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ۔ (مائدۃ:۳۵)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کی جانب وسیلہ ڈھونڈو۔

اور فقیروں کا تقرب ہی وسیلہ ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

سیروا سبق المفردون (مسند احمد ابن حنبل، مسند ابوہریرہ)

جلدی چلو، اصحاب تفرید سبقت لے گئے۔

اللہ کی جانب سیر کرنے والے کے لیے ایک مرشد کی ضرورت ہے جو ارشاد ورہنمائی کا کام انجام دے اور یہ واضح بات ہے کہ بغیر رہبر کے رہروی ممکن نہیں ہے، اسی لیے شب معراج میں سدرۃ المنتہیٰ تک جبریل علیہ السلام رسول کریم ﷺ کے رہبر تھے، آگے ایک دوسرا فرشتہ رفرف رہنما بنا اور جب رفرف بھی اپنے مقام پر ٹھہر گیا تو تائید الٰہی آپ کی رہبر بنی، واسطہ ختم ہوگیا اور قاب قوسین کے قرب تک پہنچ گئے۔

○○○

امام عبدالوہاب شعرانی
ترجمہ: ناظم اشرف مصباحی

مسئلۂ تکفیر میں اعتدال کی راہ

کسی گناہ کبیرہ یا بدعت کی وجہ سے اہل قبلہ کی تکفیر میں جو احادیث یا اقوال علما وارد ہوئے ہیں، وہ سب منسوخ ہیں، مؤول ہیں یا تغلیظ وتشدید کے طور پر وارد ہیں، جیسے قرآن کی یہ آیت:

و من لم یحکم بما انزل اللہ فأولئک ھم الکافرون۔ (مائدہ: ۴۴)

جو اللہ کی اتاری ہوئی باتوں کو اپنا فیصل نہ بنائیں درحقیقت وہی کافر ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں جس کفر کا بیان ہوا ہے اس کی وجہ سے انسان اسلام سے خارج نہیں ہوتا، جیسے شراب پینے، کاہن وجادوگر کے پاس جانے کی وجہ سے حدیث میں تکفیر کا حکم وارد ہوا ہے۔ یوں ہی صفات الٰہی کا انکار کرنا، اللہ تعالی کو بندوں کے افعال کا خالق نہ ماننا، بروز قیامت دیدار الٰہی کے عدم جواز کا قائل ہونا، ایسی بدعات ہیں جن کے بارے میں تکفیر کا حکم آیا ہے، اسی لیے بعض علما نے ان لوگوں کی تکفیر کی ہے۔

ہاں! اہل قبلہ میں سے جو شخص اپنی بدعت کی وجہ سے اسلام سے خارج ہوجائے مثلاً حدوث عالم کا قائل ہو، بعث بعد الموت اور اجسام کے حشر ونشر اور علم بالجزئیات کا منکر ہو جس کی بحث اللہ کے اسم ''**عالم**'' کے بیان میں ہوچکی ہے، ان کے کفر میں کسی کا اختلاف نہیں رہا ہے؛ کیوں کہ انہوں نے ایسی چیز کا انکار کیا ہے جس کا ماجاء بہ الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے ہونا بداہۃً معلوم ہے۔

علامہ کمال الدین ابوالمعالی شرح جمع الجوامع کے حاشیے میں فرماتے ہیں: گنہ گار اور بدعتی اہل قبلہ کی تکفیر کا قول امام اشعری کی طرف منسوب ہے۔ شیخ عزالدین بن عبدالسلام وغیرہ فرماتے ہیں: شیخ ابوالحسن اشعری نے اپنی وفات سے قبل کسی بھی اہل قبلہ کی تکفیر کرنے سے رجوع کرلیا تھا۔ اس کی وجہ شیخ خود بیان فرماتے ہیں: صفات کا انکار موصوف کے انکار کو مستلزم نہیں ہے۔ آپ مزید فرماتے ہیں: ہم نے متعدد عبارتوں میں اختلاف کیا ہے، حالاں کہ ان سب کا ماحصل ایک ہی ہے۔

شیخ کمال الدین ابن ابی شریف فرماتے ہیں: جن کے نزدیک لازم کفر، کفر ہے، انہوں نے ان مبتدعین کی تکفیر کی جن کا مذہب کسی کفر کو لازم کرتا ہے، مثلاً فرقہ مجسمہ نے جسم کی پرستش کی جس کا غیر اللہ ہونا بالیقین ثابت ہے اور غیر اللہ کی پرستش کفر ہے۔ آپ لکھتے ہیں: معتزلہ نے اگرچہ احکام صفات کا اعتراف کیا ہے، لیکن انہوں نے صفات کا انکار کیا ہے اور صفات کا انکار ان کے احکام کا انکار ہے جس کی وجہ سے وہ کافر ہیں۔ مزید فرماتے ہیں: صحیح یہ ہے کہ لازم مذہب، مذہب نہیں ہوتا اور محض لزوم، کفر نہیں ہے؛ کیوں کہ لزوم اور التزام میں فرق ہے۔

مواقف میں ایسی عبارت مذکور ہے جس کے مطابق جو یہ کہا گیا ہے کہ ''لازم مذہب، مذہب نہیں ہوتا'' یہ بات اس شرط کے ساتھ مقید ہے کہ متعلق شخص کو لزوم اور لازم کے کفر ہونے کا علم نہ ہو۔ انہوں نے کہا ہے کہ کوئی ایسا کام کرے جس سے کفر لازم آتا ہو اور اسے اس کا علم نہ ہو تو وہ کافر نہیں ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ علم کے بعد اس فعل کا التزام کرنا کفر ہے۔ واللہ اعلم

شیخ ابوطاہر قزوینی نے اپنی کتاب ''سراج العقول'' میں نقل کیا ہے کہ بعض طرق سے جو یہ روایت مروی ہے کہ **ستفترق امتی علی نیف و سبعین فرقۃ کلھا فی النار الا واحدۃ** (میری امت ۷۰ر سے زائد فرقوں میں بٹ جائے گی، ان میں ایک کے سوا سب جہنم میں جائیں گے) وہ اس طرح ہے: **کلھا فی الجنۃ الا واحدۃ** (یعنی ایک فرقہ کے علاوہ سب جنت میں جائیں گے) جس کو ابن النجار نے روایت کیا ہے۔ علما نے فرمایا کہ جہنم میں جانے والا وہ ایک فرقہ ''زنادقہ'' ہے۔

علامہ قزوینی فرماتے ہیں کہ اس روایت کی بنیاد پر روایت مشہورہ یعنی ''**کلھا فی النار الا واحدۃ**'' (ایک کے سوا سب جہنم میں ہوں گے) کے معنی یہ ہوں گے کہ سب جہنم میں وارد ہوں گے اور یہ پل صراط سے گزرتے وقت ہوگا، پھر اللہ تعالی متقیوں کو بخش دے گا اور ظالمین کو اسی میں چھوڑ دے گا۔ **ثم ننجی الذین اتقوا و نذر الظالمین فیھا جثیا** (مریم: ۷۲) یہاں ظالمین سے مراد کافرین ہیں۔ لہٰذا صراط مستقیم سے ہٹنے والا کوئی فرقہ جب تک اسلام پر قائم رہے اور احکام اسلام پر عمل کرے، کسی متدین کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ اس کی تکفیر کرے۔

آپ مزید فرماتے ہیں کہ حدیث میں جن فرقوں کا ذکر آیا ہے ان میں اصل چھ فرقے ہیں: (۱) مشبہہ (۲) معطلہ (۳) جبریہ (۴) قدریہ (۵) رافضہ (۶) خوارج۔

ان میں سے ہر ایک بارہ فرقوں میں بٹ گئے، بارہ کو چھ سے ضرب دیں، جو حاصل نکلے اسی کی طرف نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ ہے۔

نیز آپ فرماتے ہیں: کفر ایمان کی ضد ہے۔ ارشاد ربانی ہے: **فمنھم من اٰمن و منھم من کفر۔** (البقرہ: ۲۵۳) ایمان؛ رسول اور ماجاء بہ الرسول (تعلیمات رسول) کی تصدیق

کرنا ہے اور کفر؛ ان دونوں کی تکذیب کو کہتے ہیں؛ کیوں کہ اس میں نص قطعی اور اجماع کی مخالفت پائی جاتی ہے اور یہ دونوں ہی تکذیب رسول ہیں۔

پھر تکذیب کی چار قسمیں ہیں:

اول: نبوت محمدی کی تکذیب جو یہود و نصاریٰ کرتے ہیں، یہ بلا شک وشبہ کفر ہے۔

دوم: منکرین اصل نبوت کی تکذیب، ان کی تکفیر بدرجہ اولیٰ کی جائے گی؛ کیوں کہ انہوں نے جملہ انبیا کو جھٹلایا ہے۔ انہیں میں دہریہ بھی ہیں جو اللہ اور جملہ رسل کی تکذیب کرتے ہیں۔ ملحدین بھی اسی دوسری قسم میں شامل ہیں جنھوں نے تکذیب کو تصدیق کی صورت میں پیش کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اللہ کی معرفت رسول کی معرفت پر موقوف ہے جب کہ یہ بات قطعی طور پر معلوم ہے کہ رسول کی معرفت، مرُسِل کی معرفت پر موقوف ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ مسئلہ دور یہ ہے کہ ان میں کسی ایک کو دوسرے سے ثابت کرنا ممکن نہیں ہے۔ ان کے اس دعویٰ سے رسول و مرسل دونوں کا انکار لازم آتا ہے۔ بعض لوگوں نے اِنہی عقائد کی بنا پر شریعت کا انکار کر دیا، اپنی ماں بیٹیوں سے نکاح جائز کر لیا اور یہاں تک کہا کہ لوگ دنیا میں آتے رہیں گے اور زمین کی خوراک بنتے رہیں گے۔ ''**ماثم الا فروج تدفع و ارض تبلع**'' یہ لوگ مجوسیوں اور دہریوں کی طرح ہیں۔

سوم: وہ قوم جس نے رسول کی تصدیق کی لیکن ان کا اعتقاد یہ ہے کہ نبی نے منکر ونکیر اور حشر ونشر وغیرہ جن شرائع کی خبر دی ہے وہ صرف مخلوق کے مصالح کے لیے ہیں۔ یہ فلاسفہ کی جماعت ہے۔ یہ لوگ اس لیے کافر ہیں کہ انہوں نے انبیا علیہم السلام پر کذب کو جائز ٹھہرایا، جس سے بالکلیہ نبوت کا سد باب ہوتا ہے، اس لیے کہ انبیا کی تعلیمات سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ لہٰذا ان کی تکفیر بدرجۂ اولیٰ واجب ہے۔ فرقۂ حلولیہ کا معاملہ بھی انہی کی طرح ہے، جن کا اعتقاد ہے کہ روح الٰہی ان میں حلول کر گئی ہے اور حروف ہجائیہ کی طرح اللہ تعالیٰ کے اعضا ہیں۔ اسی طرح فرقۂ خطابیہ بھی ہے، جس نے جعفر بن محمد صادق کے خدا ہونے کا دعویٰ کیا، یوں ہی صابئہ جنہوں نے حضرت علی کی الوہیت کا دعویٰ کیا تھا، حضرت علی نے ان کو آگ میں جلانے کا حکم دیا۔ جب وہ آگ میں جلنے لگے تو چلا چلا کر کہتے: اب تو ہمیں اور یقین ہو گیا کہ آپ ہی خدا ہیں۔ ائمۂ شریعت نے ان بے ہودہ اور گمراہ کن باتوں پر مطلع ہو کر قدریہ پر مجوسیوں کا، حلولیہ پر مرتدین کا اور مجسمہ پر بت پرستوں کا حکم لگایا۔ ان کے کفر پر تنبیہ کی اور توبہ کرنے کو کہا۔ اگر یہ لوگ اس پر مصر رہیں اور رجوع نہ کریں تو بادشاہ اسلام علما کی ایک مجلس منعقد کرے اور مجلس علما کے اتفاق رائے سے انہیں قتل کرے یا کوئی دوسری سزا دے۔ باجماع امت یہ حق کسی عام فرد کو حاصل نہیں۔

چہارم: اس میں وہ لوگ شامل ہیں جو اہل قبلہ ہیں اور رسول کے قول کی تصدیق کرتے ہیں، لیکن تاویل میں ان سے خطا ہوئی ہے، جیسے معتزلہ، نجاریہ، روافض، خوارج اور مشبہہ وغیرہ۔ لیکن خطافی التاویل کفر ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں علما کا اختلاف ہے۔ اس مسئلے میں علما کے دو فریق ہیں:

فریق اول: اس فریق کا کہنا ہے کہ جس نے رسول کی کسی بات کی مخالفت کی گویا اس نے رسول کی تکذیب کی خواہ وہ انکار محض ہو یا انکار تاویلی۔ اس فریق نے غالی اور معتدل کے درمیان امتیاز کیے بغیر ان پر کفار کے احکام جاری کر دیے۔ یہ ایسے علما ہیں جنہوں نے اللہ کی وسیع رحمت کو تنگ کر دیا۔ جمہور علما نے ان کی متابعت نہیں کی، نہ اپنے فتاویٰ کے ذریعے ان کے خون بہانے کو جائز کہا ہے اور نہ ان کے مال اور عزت وحرمت کی پامالی کا حکم دیا ہے، بلکہ موجودہ زمانے تک ان پر مسلمانوں کے احکام جاری کیے ہیں؛ کیوں کہ لفظ مسلم ان پر صادق آتا ہے اور وہ بلاشبہ امت اجابت میں داخل ہیں۔ جس نے انہیں کافر کہا اس نے ظلم کیا۔ زیادہ سے زیادہ ان لوگوں کو فاسق، گم راہ، بدعتی اور خاطی کہا جائے گا۔ جن علما نے انہیں کافر کہا ہے، ان کی خطائے فاحش اور بدعت شنیعہ کی وجہ سے تشدید وتغلیظ کے طور پر کہا ہے اور قرب کفر کی وجہ سے مشابہ کفر قرار دیا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ: ''**المراء فی القرآن کفر**'' (قرآن میں رائے زنی کفر ہے۔) ایک دوسری حدیث میں ہے: **بین العبد و بین الکفر ترک الصلوۃ**'' (بندے اور کفر کے مابین فاصلہ ترک نماز ہے) ''**من ترک الصلوٰۃ متعمداً فقد کفر**'' (جس نے قصداً نماز چھوڑی، اس نے کفر کیا) ''**اذا قال المسلم للمسلم یا کافر فقد کفر**'' (جس مسلمان نے کسی مسلمان کو کافر کہا، اس نے کفر کیا) ''**لایزنی الزانی حین یزنی وھو مؤمن**'' (زانی زنا کی حالت میں مومن نہیں رہتا) اس قسم کی جتنی بھی احادیث وارد ہیں، سب کے سب بطور تغلیظ اور زجر وتوبیخ کے ہیں۔ اس لیے کہ کبھی ایک شے کا اطلاق دوسری شے پر مشابہت کی بنا پر کر دیا جاتا ہے، وہاں حقیقت میں حکم مقصود نہیں ہوتا، جیسا کہ ایک شخص کسی اجنبی سے اظہار قربت اور تعظیم کے لیے کہے کہ تم میرے بھائی ہو، یا تم میرے بیٹے ہو، تو اس کی موت کے بعد وہ اجنبی اس کا وارث نہیں ہو جاتا اور نہ ہی اس کی بہن بیٹیاں اس پر حرام ہو جاتی ہیں۔ یوں ہی ایک شخص دوسرے سے تواضع کے طور پر کہے کہ میں آپ کا غلام ہوں تو اس کی وجہ سے وہ اس کی ملکیت میں نہیں آ جاتا اور نہ اس کی بیع جائز ہو جاتی ہے۔

میں کہتا ہوں: فتاویٰ امام کردی میں الفاظ تکفیر کے آخر میں ائمۂ حنفیہ کی طرف سے الفاظ کفر شمار کرانے بعد اس بات کی صراحت ہے:

> بعض لوگوں سے ایسی بات منقول ہے جو اس سے پہلے کسی نے نہیں کہی اور وہ یہ کہ ''جو فتاویٰ میں مذکور ہے کہ فلاں ان باتوں سے کافر ہو جاتا ہے تو یہ تخویف وتہویل کے طور پر ہے نہ کہ حقیقی کفر بیان کرنے کے لیے۔'' فرماتے ہیں کہ یہ کلام باطل ہے اور بہت بعید ہے کہ اللہ کے امین علمائے کرام، احکام یعنی حرام وحلال اور کفر واسلام سے کھلواڑ کریں۔ یہ لوگ حق کے

سوا کچھ نہیں کہتے بلکہ وہی کہتے ہیں جو سید الانام صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے یا جسے کسی مجتہد نے قرآن وسنت سے استنباط کیا یا صحابۂ کرام نے کہا۔ یہ وہ بات ہے جو میں نے مشائخ عظام (اللہ ان کا ٹھکانہ جنت بنائے) سے سنا ہے۔

لیکن جمہور کا مذہب ہی اولیٰ ہے؛ کیوں کہ فرقوں کے اختلافات سمجھنا اکثر لوگوں پر دشوار ہے۔ کیا ایسے شخص کو قتل کیا جاسکتا ہے جو اللہ کے رب، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے پر اور حشر ونشر اور حساب وکتاب پر ایمان رکھتا ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

فریق ثانی: یہ فریق مؤولین کی تکفیر سے سکوت کرتا ہے اور ان میں سے کسی کو کافر یا مکذب رسول نہیں ٹھہراتا؛ کیوں کہ مؤولین اگر کافروں کی طرح مکذب رسول ہوتے تو وہ کلام رسول کی تاویل نہ کرتے، انہوں نے انکار سے گریز کیا اور تاویل کا راستہ اختیار کیا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ انہوں نے کلام رسول کو قبول کیا اور اس کی تصدیق کی۔ یہ اور بات ہے کہ انہوں نے تاویل میں خطا کی ہے۔ لہٰذا ان کا حکم اس شخص کا ہوگا جس نے کفر سے راہ فرار اختیار کیا لیکن اپنی خطا کی وجہ سے بدعت میں مبتلا ہوگیا۔

ابوسلیمان خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اہل سنت میں فرقہ بندی سب سے پہلے امام علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہوئی۔ یہ وہی لوگ تھے جن کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ نے خبر دی تھی کہ وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر کمان سے نکلتا ہے۔ امام علی رضی اللہ عنہ سے ان کے بارے میں پوچھا گیا کہ کیا یہ لوگ کافر ہیں؟ جواب میں فرمایا: نہیں! یہ تو کفر سے بھاگتے ہیں۔ پوچھا گیا کہ کیا یہ منافق ہیں؟ فرمایا: نہیں! منافقین ذکر کم کرتے ہیں اور یہ تو بکثرت ذکر کرتے ہیں۔ پوچھا گیا کہ آخر یہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو فتنے میں پڑ کر اندھے اور بہرے ہوگئے ہیں۔

خطابی نے کہا کہ انہیں کافر اس لیے نہیں قرار دیا کہ انہوں نے آپ ﷺ کے قول کی تاویل کی۔ حضور ﷺ کے قول کہ "وہ دین سے نکل جائیں گے" سے مراد طاعت سے نکلنا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ (یوسف:۷۶) یوسف کے لیے بادشاہ کے دین میں یہ روا نہیں تھا کہ وہ اپنے بھائی کو لے لیتا۔ یعنی بادشاہ کی طاعت میں۔

خطابی کہتے ہیں: جو لوگ مؤولین کے عدم تکفیر کے قائل ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ ان مؤولین کی جان ومال کی عصمت ان کے **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** کہنے سے ہی ثابت ہوگئی، لیکن یہ ثابت نہیں ہے کہ خطائی التاویل کفر ہے؛ کیوں کہ اس پر نص قطعی، اجماع یا کسی اصل صحیح پر قیاس صحیح کا ہونا ضروری ہے اور ہمیں ایسی دلیل نہیں ملی، لہٰذا یہ لوگ اسلام پر باقی ہیں۔ ہاں! اگر کسی زمانے میں ایسے مجتہد کا وجود ہو جس کے اندر ائمۂ اربعہ کی طرح اجتہاد کی تمام شرائط پائی جائیں، وہ دلیل قطعی سے ثابت کرے کہ خطائی التاویل موجب کفر ہے تو ہم بھی اس کی تکفیر کریں گے، لیکن افسوس! اس زمانے ایسے مجتہد نہیں پائے جاتے۔

امام مزنی رحمۃ اللہ علیہ سے علم عقائد کے ایک مسئلے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے جواب دیا کہ جب تک میں اس میں غور وفکر اور تحقیق نہ کرلوں جواب نہیں دوں گا، اس لیے کہ یہ اللہ کا دین ہے۔ امام مزنی ان کا رد کیا کرتے تھے جو لوگ اہل ہوا و بدعت کی بلا تحقیق تکفیر کرتے ہیں اور فرماتے تھے کہ جن مسائل میں یہ لوگ گفتگو کرتے ہیں یہ بڑے دقیق ہیں۔

امام حرمین رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ اگر ہم سے یہ کہا جائے کہ مقتضائے تکفیر عبارات کو الگ کردیجیے تو ہم کہیں گے کہ یہ بے فائدہ طمع ہے، اس لیے کہ یہ عقل سے بعید اور دشوار گذار راستہ ہے جو بحر توحید سے ماخوذ ہے اور جس کا علم انتہائے حقائق کو محیط نہ ہو وہ وثوق کے ساتھ دلائل تکفیر کو حاصل نہیں کرسکتا۔

ابوالمحاسن رویانی وغیرہ جملہ علمائے بغداد کہا کرتے تھے کہ کوئی شخص اہل اسلام میں سے کسی کی تکفیر نہ کرے؛ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من صلی صلاتنا و استقبل قبلتنا و أکل ذبیحتنا فله مالنا و علیه ما علینا۔

جو ہماری طرح نماز پڑھے، استقبال قبلہ کرے اور ہمارا ذبیحہ کھائے تو اس کے نفع و نقصان کی چیزیں وہی ہیں جو ہماری ہیں۔

اقول: میں نے شیخ شہاب الدین اذرعی صاحب "قوت" کے ہاتھ سے لکھا ہوا ایک استفتا شیخ تقی الدین سبکی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس دیکھا، اس میں لکھا تھا: کیا فرماتے ہیں سیدنا ومولانا حضرت شیخ الاسلام اہل ہوا و بدعت کی تکفیر کے بارے میں؟ تو آپ نے اس کے جواب میں لکھا: اے میرے بھائی! مؤمنین کی تکفیر پر اقدام نہایت سخت ہے اور جس کے دل میں ادنیٰ ایمان ہو اس سے بہت بعید ہے کہ کلمہ **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** کے اقرار کے باوجود اہل ہوا و بدعت کی تکفیر کرے، اس لیے کہ مسئلۂ تکفیر نہایت پر خطر ہے، جس نے کسی انسان کی تکفیر کی تو گویا اس نے اس کے بارے میں یہ خبر دی کہ وہ آخرت میں ہمیشہ اور ابدالآباد تک عذاب وعقاب کا سزاوار ہے اور دنیا میں اس کا خون بہانا اور مال چھین لینا مباح ہے، کسی مسلم خاتون سے اس کا نکاح نہیں ہوسکتا اور اس کی زندگی میں اور موت کے بعد اس پر مسلمانوں کے احکام جاری نہ ہوں گے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کرنا، ہزار کافروں کو قتل نہ کرنے سے بھی زیادہ گناہ ہے۔ پھر یہ کہ جن مسائل کی وجہ سے اہل بدعت کی تکفیر کی جاتی ہے وہ حد درجہ پیچیدہ اور دقیق ہوتے ہیں؛ کیوں کہ ان کے شعبہ جات کثیر، مدرکات دقیق، قرائن ایک دوسرے کے مخالف اور اسباب متفاوت ہیں اور جو اس میں حق کا احاطہ کرلے، اس پر لازم ہے کہ مقامات مختلفہ پر تاویل کے حقائق وشرائط پر مطلع ہو، احتمال تاویل رکھنے اور نہ رکھنے والے الفاظ کی معرفت کے سلسلے میں خطائی المعرفت کے جملہ وجوہات سے واقف ہو، اور یہ اس وقت ہوگا جب جملہ قبائل عرب کی زبان کے حقائق،

مجازات اور استعارات میں جمیع طرق کی معرفت حاصل ہو جائے۔ نیز علم توحید اور اس کے علاوہ دیگر علوم کے دقیق امور کی معرفت رکھتا ہو جس کا حصول اکثر علما کے لیے انتہائی متعذر رہے۔

امام سبکی اس کی تفصیل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: کسی اہل ہوا و بدعت کی تکفیر کرنے کے لیے دو اہم باتیں ضروری ہیں:

''**اول**: یہ کہ اس کے اعتقاد پر واقفیت حاصل کرنا۔ لیکن کس کے دل میں کیا ہے؟ اس پر مطلع ہونا بہت مشکل ہے؛ کیوں کہ یہ بات متعذر رہے کہ ایک شخص، حاکم کے سامنے اس بات کا اعتراف کرلے جس کی وجہ سے اس کا قتل ہونا یقینی ہو۔ یہ بات 'کبریت احمر' سے بھی زیادہ سخت ہے۔ یوں ہی اس بات پر دلیل قائم کرنا بھی ناممکن ہے کہ اس کے دل میں کیا ہے؟

دوم: یہ کہ کفر ہونے کا حکم لگانا علم کلام، طرق استنباط اور حق کو غیر حق سے ممتاز کرنے کے اعتبار سے بھی بہت مشکل ہے، یہ اسی شخص کو حاصل ہو سکتا ہے جس کو اس قدر صحتِ فکر و نظر اور ریاضت نفس حاصل ہو کہ خواہشات نفسانیہ اور تعصب سے یکسر آزاد ہو چکا ہو۔ نیز وہ جملہ علوم شریعت پر دست رس رکھنے کے ساتھ ائمہ مجتہدین کے تنازعات پر بھی مطلع ہو۔ ان چیزوں کا وجود کسی ایک شخص میں بہت بعید ہے۔ جب انسان اپنے اعتقاد کو عبارت میں تحریر کرنے سے قاصر ہے تو وہ دوسرے کے دل کی بات الفاظ میں کیسے بیان کر سکتا ہے! ادب کا تقاضا ہے کہ کوئی مومن، اہل ہوا خصوصاً اہل بدعت میں سے کسی کی تکفیر نہ کرے؛ کیوں کہ ان میں اکثریت ان لوگوں کی ہوتی ہے جو ایک دوسرے کے مقلد محض ہوتے ہیں، وہ اپنے اعتقاد کے خلاف کوئی دلیل نہیں جانتے۔ چہ جائے کہ وہ بغض وعناد کے طور پر غیر مؤول نصوص صریحہ کا انکار کریں۔ علما کے لیے یہ غور و فکر کا مقام ہے۔''

میں نے اسے امام سبکی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوب سے نقل کیا ہے، یہ انتہائی نفیس اور عمدہ کلام ہے۔

احمد بن زاہر سرخسی جو شیخ ابوالحسن اشعری کے خاص اصحاب میں سے ہیں فرماتے ہیں:

''جب بغداد میں میرے گھر پر شیخ ابوالحسن کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ نے اپنے تمام اصحاب کو جمع کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ آپ لوگ گواہ رہیں کہ میں نے کسی بھی اہل قبلہ کی تکفیر گناہ کی وجہ سے نہیں کی، میں نے انہیں معبود واحد کی عبادت کرنے والا پایا، اسلام ان سب کو شامل ہے۔''

غور کرو امام اشعری نے کس طرح انہیں مسلمان شمار کیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(الیواقیت والجواہر، جلد: ۲، بحث: ۵۸، دار احیاء التراث العربی، بیروت)

○○○

تذکیر

افادات: شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی
ترتیب: ضیاء الرحمن علیمی

سلوک، حال اور مقام

حدیث جبرئیل میں سالک کے صرف دو درجے بیان کیے گئے ہیں:

۱۔ درجۂ مشاہدہ　　　۲۔ درجۂ مراقبہ

اگر کسی کو یہ دونوں ہی کیفیتیں حاصل نہ ہوں تو وہ ہالک ہے، اب وہ اپنے آپ کو ہلاکت سے نکالنے کے لیے کیا کرے؟ چنانچہ بندے کو اگر مراقبے کی کیفیت حاصل نہ ہو تو پہلے اسے اپنا محاسبہ کرنا چاہیے، اپنے گناہوں کے محاسبے کے بعد اپنے خالق و مالک کی طرف مراجعہ کرنا چاہیے، اس کی بارگاہ میں اعتراف جرم کے بعد آئندہ گناہوں سے باز رہنے اور اطاعت پر جمے رہنے کا معاہدہ کرنا چاہیے، پھر اس معاہدے کی تکمیل کے لیے صدق و اخلاص کے ساتھ مجاہدے میں لگ جانا چاہیے۔ اگر بندہ اس طرح اپنے آپ کو مذکورہ بالا مقامات سے گزار کر مقام مجاہدہ پر لے آئے گا تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اسے مراقبے کی نعمت سے نواز دے گا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ (عنکبوت: ۶۹)

جو لوگ میری راہ میں کوشش کرتے ہیں ہم انھیں اپنی راہ دکھا دیتے ہیں۔

اور جب اس مقام پر استقامت حاصل ہو جائے گی تو اللہ تعالیٰ اس کی آنکھوں میں وہ نور عطا فرمائے گا جس کے ذریعے اس کو كأنك تراه کی کیفیت حاصل ہو جائے گی، وہ مقام مشاہدہ پر فائز ہو جائے گا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے ارشاد کہ بے شک اللہ محسنوں کے ساتھ ہے۔ (وَإِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ) کی حقیقت اس پر منکشف ہو جائے گی۔

صوفیہ کے یہاں سلوک کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ سلوک علمی　　　۲۔ سلوک عملی

سلوک علمی یہ ہے کہ علمی طور پر یہ جانا جائے کہ انسان اور کائنات کی حقیقت کیا ہے، نبوت اور ولایت کسے کہتے ہیں، اللہ کی معرفت کا مفہوم کیا ہے، انسان کا انسان کے ساتھ اور اس کے خالق و مالک کے ساتھ کیا رشتہ ہونا چاہیے، اللہ کی معرفت حاصل کرنے اور اس کے منشا پر عمل کرنے کے لیے نبی کا اتباع کیوں اور کیسے ضروری ہے، اس راہ میں شیخ کی ضرورت کیوں ہے، وغیرہ وغیرہ

اکثر مسلمانوں کا یہی سلوک نامکمل ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ بعض اوقات سرے سے تصوف اور سلوک و معرفت کے ہی منکر ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ تصوف و معرفت کے قائل تو ہوتے ہیں مگر اُسے موجودہ خانقاہوں کی چند رسموں میں محدود سمجھتے ہیں۔

سلوک عملی دراصل علمی طور پر جانے ہوئے راستے پر عملی طور پر چلنے کا نام ہے۔ ایک مثال سے اس کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ کوئی ڈاکٹر اپنے مریض کے مرض کی تشخیص کرے، اس کے لیے احتیاط اور دوا تجویز کر دے، اب مریض کو معلوم ہو گیا کہ اسے صحت یاب ہونے کے لیے کیا کرنا ہے، کون سی دوا، کب، کیسے اور کتنی مقدار میں کھانی ہے، معلوم ہو گیا، لیکن صرف یہی جان لینے سے مریض صحت یاب نہیں ہو سکتا۔ مریض کو خود عملی طور پر ڈاکٹر کی تمام باتوں پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔

آج کی دنیا کے اکثر روحانی مریض یا تو اپنے کو مریض نہیں سمجھتے یا یہ نہیں سمجھتے کہ ہمیں اپنے علاج کے لیے انبیا و اولیا کے راستے پر چلنے کی ضرورت ہے یا انبیا اور اولیا سے صرف رسمی محبت کا دم بھرنے اور ان کا نعرہ لگانے ہی کو کافی سمجھتے ہیں اور عملی سلوک سے گریز کرتے ہیں۔ آج ضرورت ہے کہ صادقین اور صالحین کا راستہ کیا ہے، اُسے ہم سمجھیں اور سمجھنے کے بعد خود چلنے کی کوشش کریں۔

سیر الی اللہ اور سیر فی اللہ

اس بحث میں ایک سوال یہ آتا ہے کہ سلوک مکمل ہوتا ہے یا نہیں، مشائخ نے اس مسئلے پر تفصیل سے گفتگو کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سلوک علمی تو جلد مکمل ہو جاتا ہے لیکن سلوک عملی چلتا رہتا ہے۔ پھر سلوک عملی کی دو قسمیں ہیں؛ الی اللہ اور فی اللہ، اس کو سیر الی اللہ اور سیر فی اللہ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان میں سیر الی اللہ تو ایک حد پر جا کر مکمل بھی ہوتا ہے لیکن سیر فی اللہ کبھی مکمل نہیں ہوتا، سیر الی اللہ سے مراد اللہ کی ذات وصفات کی امکانی معرفت ہے یعنی اس بات کا عرفان کہ اللہ موجود ہے، فاعل حقیقی ہیں، اور سیر فی اللہ سے مراد اللہ کی ذات وصفات کی حقیقی معرفت ہے چوں کہ اللہ کی ذات وصفات غیر متناہی ہے لیکن بندہ اس میں عمل کے ذریعہ ترقی کرتا رہتا ہے، اس لیے عملی سلوک یا سیر فی اللہ کبھی مکمل نہیں ہوتا۔

اس کو اس طور پر بھی کہا جا سکتا ہے کہ سیر الی الذات کی کوئی انتہا ہے لیکن سیر الی الصفات کی انتہا نہیں، کہ ذات کی معرفت اس طور پر تو ہوتی ہے کہ ذات باری تعالی موجود ہے لیکن ہمارے پنجۂ

ادراک سے ماورا ہے، لیکن اس کی صفات کی معرفت ہوتی اور مسلسل بڑھتی رہتی ہے۔ رہی ذات الٰہی کی کنہ اور حقیقت کی معرفت تو یہ کسی کے لیے ممکن نہیں، اس لیے اس کے برعکس کبھی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سیر الی الصفات تو ممکن ہے لیکن سیر الی الذات یہ ممکن نہیں کیوں کہ بندہ اپنے علم وعرفان سے جو کچھ جانتا ہے اور اس پر جن تجلیات کا ظہور ہوتا ہے، یہ سب اللہ کی صفات ہیں، رہی اللہ کی ذات تو قلب اس کے ادراک سے عاجز ہے لا تدرکه الابصار کے یہی معنی ہیں کہ اللہ کی ذات کا احاطہ یا اللہ کی ذات کا کامل عرفان ناممکن ہے۔ سیر الی الذات میں بندہ صرف یہ جانتا ہے کہ اللہ ہے، رہا یہ کہ اللہ کیسا ہے تو اس کا ادراک نہیں کر سکتا، ہاں سالک اللہ کی صفات وتجلیات میں غوطہ زن رہتا ہے اور ہر لمحہ اس کی معرفت بڑھتی رہتی ہے، نہ اللہ کی صفات کی کوئی انتہا ہے اور نہ ہی ان صفات کی معرفت کی کوئی انتہا ہے۔ سالک کا یہ سفر ہمیشہ جاری رہتا ہے۔

حال اور مقام

سلوک علمی اللہ کے راستے میں چلنے کا نام ہے اور سلوک عملی اس علم پر عمل کرنے کا۔ بندہ جب مکمل حضور قلبی کے ساتھ عملی سلوک طے کرتا ہے تو اس پر ایک حال طاری ہوتا ہے جس میں سالک کو لطف ولذت ملتی ہے، مثال کے طور پر طریقہ نماز کا جاننا، یہ علمی سلوک ہے اور عملی طور پر نماز پر کاربند ہو جانا عملی سلوک ہے اور اس عمل میں بندہ جب مکمل حضور قلبی اور انہماک کے ساتھ مشغول ہوتا ہے تو اس کو ایک خاص قسم کی لذت حاصل ہوتی ہے جس کو صوفیہ حال سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ لذت بالعموم فرائض کے بعد نوافل میں حاصل ہوتی ہے کیوں کہ نوافل کی ادائیگی اور عدم ادائیگی میں بندہ مختار ہوتا ہے، اسے اپنے اختیار سے اپنے او پر واجب کرتا ہے، اللہ نے اس پر نوافل فرض نہیں کیے ہیں پھر نوافل کے قیام، رکوع، قعدہ اور سجود میں بھی اسے آسانی رہتی ہے کہ جسے چاہے جتنا دراز کرے۔

بندے کو چاہیے کہ شروع شروع میں یہ سوچے کہ وہ اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہے، جب وہ یہ سوچے گا تو پھر رفتہ رفتہ یہ تصور پیدا ہونے لگے گا کہ اللہ حاضر ہے۔ یہ کیفیت بڑھتے بڑھتے ایک دوسری کیفیت میں تبدیل ہو جائے گی کہ اسے یہ بھی احساس ہوگا کہ اللہ ناظر ہے۔ صوفیہ اسی کیفیت کو مراقبہ کہتے ہیں، جب اس کیفیت میں اور شدت پیدا ہوتی ہے تو پھر ایک نئی کیفیت پیدا ہوتی ہے جسے کانک تراہ کہا گیا ہے۔ جس میں بندے کو یہ احساس ہوتا ہے کہ گویا وہ خود اپنے مولیٰ کو دیکھ رہا ہے۔ یہ کیفیتیں اور یہ احوال آتے جاتے رہتے ہیں۔ شروع شروع میں مختصر لمحے کے لیے پھر یہ مدت بڑھتی جاتی ہے اور بندہ ہر وقت اسی کیفیت میں رہنے لگتا ہے۔ اسے صوفیہ مقام کہتے ہیں، اس منزل پر جا کر اب بندہ دوسرے کی ہدایت وتبلیغ کے لیے صحیح معنوں میں اہل ہوتا ہے۔

○○○

اسلام کی بنیادی تعلیمات
مکتوبات مخدوم جہاں کے آئینے میں

دعوت وتبلیغ، تجارتی تعلقات اور عسکری فتوحات کی مدد سے تیار برصغیر ہند و پاک کا یہ تہذیبی تاریخی منطقہ تاریخی لکیروں کا ایک ایسا معمورہ ہے جس میں اخلاقی قدروں، جمہوری روایات اور تصوف اسلامی کی تہذیبی جڑیں کافی پھیلی ہوئی اور بڑی مضبوط ہیں۔ سرزمین ہند کو زرخیزی عطا کرنے والے اس کے دوآبے گنگا اور جمنا بڑے مشہور ہیں جن کی اصل اور شاخوں سے یہ پورا وسیع خطہ جمہوری تقاضوں کے مطابق فیضیاب وشاداب ہوتا رہا ہے۔ اس خطے میں اِن دوآبوں سے کہیں زیادہ فیض بخش اور شاداب کناں پنج آبے چشتیہ، نقشبندیہ، قادریہ، سہروردیہ اور فردوسیہ بھی ہیں جن سے برصغیر ہی نہیں، کئی براعظم بھی سیراب وفیض یاب ہوتے رہے ہیں اور گنگا جمنا کی طرح یہ پنج آبے اور اُن کی شاخیں بھی کسی خاص علاقے، کسی خاص انسانی طبقے اور کسی خاص مذہبی حلقے کا مرجع ومرکز نہیں بلکہ بلاتفریق مذہب وملت سبھی انسانوں کو سیراب وشاداب کرتی رہی ہیں نیز عقل صحیح وسالم اور عمل صالح کی حسب ذائقہ لازمی آمیزش کے ساتھ شریعت و طریقت کا جام حسن عقدت اور خوش عقیدگی کے پاکیزہ پیالوں سے پلاتی رہی ہیں۔

سلطان المحققین مخدم جہاں حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری علیہ الرحمۃ والرضوان کی ذات اعلیٰ صفات انہی پنج آبے میں سے ایک روحانی دریا سلسلۂ فردوسیہ کا بشری مظہر ہے جنھوں نے اپنی مفسرانہ، فقیہانہ، محدثانہ، متکلمانہ اور عارفانہ رسالے جات، تصنیفات، ملفوظات اور مکتوبات کی شکل میں ''رشتۂ خداوندی اور شان بندگی'' کا روحانی عرفانی جام ایک زمانے تک اپنے حلقہ بگوشوں اور بندگانِ خدا کو حکمت ودانائی کے بیش قیمت چشم کشا حکایات، کشف قلب کے حقیقی واردات اور تمثیلی اشعار سے لبالب کرکے پلایا ہے اور یہی اِن خرقہ پوش اولیاء اللہ کی فطری شان اعلیٰ نشان ہے جو، اولادِ آدم کے اندر حسن تدبیر کے ساتھ احسن طریقے سے روحانی وعرفانی بصیرت

پیدا کرنے کی اخلاقی خدمت انجام دیتے ہیں اور خالص انسانیت و آدمیت کے سانچے میں ڈھالنے کا کام کرتے ہیں۔

خدا کے اِن نیک بندوں، صوفیۂ طریقت اور خداترس علمائے شریعت وطریقت کی فکری اور نظریاتی شان یہ ہوتی ہے کہ حسن عقیدت اور خوش عقیدگی کے بغیر قابل تقلید زندگی گزارنا دشوار ہے جب تک اس میں عقل صحیح اور عمل صالح کی لازمی آمیزش نہ ہو، کیوں کہ اِس آمیزش کے بغیر حسن عقیدت اور خوش عقیدگی، معرفت وحقیقت کے سامنے حجاب بن جاتے ہیں۔ اس لیے یہ خرقہ پوش صوفیہ اِس حجاب کو دور کرنے کے لئے مثالی حکمت عملی اور مؤثر ترکیبیں اپناتے ہیں اور مؤثر حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے قصبۂ شریعت سے شہر طریقت تک پہنچنے کی راہ دِکھاتے ہیں۔

مخدوم جہاں حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری اپنے حلقہ بگوشوں میں ہر دل عزیز، اپنے برادرِ عزیز اور منھ بولے فرزند حاکم چوسہ قاضی شمس الدین جنھیں اپنے علم درویشی کو ظاہر کرنے کا سبب قرار دیتے ہیں کو، مراسلاتی تعلیم وتربیت فرماتے ہوئے اُن کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

> ''تم اس بات کا یقین کرلو کہ جو شخص طریقت کی راہ کا طلب گار ہو، اسکے پاس شریعت کی پونجی ہونا ضروری ہے تاکہ قصبۂ شریعت سے شہر طریقت تک پہنچے۔ طریقت میں جہاں قدم درست ہوا، ملک حقیقت میں پہنچ جانا آسان ہے۔ جس بے علم نے شریعت ہی کو نہیں سمجھا ہے، وہ طریقت کو کیا پہچانے گا، اور جب طریقت سے ہی شناسائی نہیں ہے تو حقیقت تک کیوں کر رسائی ہوسکتی ہے؟ اس لیے بے علم ومعرفت اور ناواقف شریعت کو اِس راہ میں چلنے کی اجازت نہیں ہے۔'' (مکتوبات صدی، اردو، مکتوب 23)

اِس اقتباس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اسلامی شریعت کے بنیادی عقائد، معمولات، معاملات، احکام اور مسائل کی معلومات کس حد تک ضروری اور لازمی ہیں۔ اس لیے ہم نے اپنے مقالے کا عنوان ''مذہب اسلام کی بنیادی تعلیمات اور مخدوم جہاں'' بنایا ہے تاکہ اپنے حاصل مطالعہ میں آپ کو بھی شامل کرسکیں کہ حضرت مخدوم جہاں اپنے حلقہ بگوشوں، مریدین اور متعلقین کو کن کن طریقوں سے کیسی کیسی ضروری اور بنیادی تعلیمات دیا کرتے تھے۔

آج کل مراسلاتی نظام تعلیم خوب عام ہوتا جارہا ہے جب کہ مخدوم جہاں جیسی گوناگوں خوبیوں کی حامل اسلامی شخصیات کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی ذات صباحی اور مسائی نہیں بلکہ شب و روز کی باضابطہ، مستقل کھلی ہوئی کتاب زندگی ہونے کے ساتھ فاصلاتی اور مراسلاتی نظام تعلیم کا مرکزی ادارہ ہوا کرتی تھی جہاں عبوری کتابی تعلیم ہی نہیں بلکہ روحانی اور عملی تعلیم وتربیت اور قلبی تزکیہ کے لیے بھی مؤثر وحیرت انگیز نظام اور نصاب تعلیم وتربیت

نافذ العمل ہوا کرتا تھا۔ ہم اپنے مقالے میں اسی مخدومی نصاب و نظام تعلیم و تربیت کے تحت تعلیم و تلقین کیے جانے والے ارکان اسلام کلمۂ توحید کا اقرار و اظہار، نماز و روزہ، زکوٰۃ اور حج، بنیادی عقائد، عقیدۂ توحید و رسالت اور عقیدۂ قضا و قدر، تصورِ آخرت جیسی تعلیمات کا خلاصہ مخدوم جہاں کے اُن مکتوبات کی روشنی میں کریں گے جو آپ نے قاضی شمس الدین اور دیگر مریدوں کو لکھے ہیں۔

عقیدۂ توحید: توحید، کفر، شرک، نفاق، وحدت الٰہ، خدا کی معرفت و حقیقت

''میرے بھائی شمس الدین (اللہ تم کو سیدھا راستہ چلائے) تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ شریعت اس راہ کا نام ہے جس کو انبیاء علیھم السلام اپنی امت کے لیے مقرر فرماتے ہیں۔ اس کام میں اللہ ان کا مددگار اور پشت پناہ ہوتا ہے۔ کل نبیوں کا ہمیشہ یہی معمول رہا کہ خلق اللہ کو انھوں نے پہلے توحید کی طرف بلایا۔ اس دعوت میں سب انبیاء برابر ہیں۔ سبھوں کی ایک پکار کہ ایک دین ہے، ایک معبود ہے، باتفاق ایک زبان ہو کر سبھوں نے اپنی اپنی امتوں کو یہی کہا **والٰھکم الله واحد**، اللہ ایک اور اکیلا ہے اور یہی فرمایا **فاتقو الله و اطیعون**۔ اللہ سے ڈرو، اور اس کی بندگی کرو۔'' (مکتوبات صدی، اردو، مکتوب 25)

''طریقت کی راہ بھی شریعت ہی سے نکلی ہے۔ شریعت و طریقت میں جو فرق ہے، اس کو ہم بیان کرتے ہیں، تم اسی سے سمجھتے جاؤ۔ شریعت میں توحید، طہارت، نماز، روزہ، حج، جہاد، زکوٰۃ اور دوسرے احکام شرع اور معاملات ضروری کا بیان ہے۔ طریقت کہتی ہے کہ اِن معاملات کی حقیقت دریافت کرو۔ اِن مشروعات کی تہہ تک پہنچو، اعمال کو قلبی صفائی سے آراستہ کرو۔ اخلاق کو نفسیاتی کدورتوں سے پاک کرو جیسے ریاکاری ہے، ہوائے نفسانی ہے، ظلم و جفا ہے، شرک و کفر ہے۔ وغیرہ''

''معلوم ہونا چاہیے کہ بزرگوں کے نزدیک از روئے شریعت و طریقت و حقیقت و معرفت اجمالاً توحید کے چار درجے ہیں اور ہر درجہ میں مختلف حالت اہل توحید کی ہوا کرتی ہے۔

توحید کا پہلا درجہ یہ ہے کہ ایک گروہ فقط زبان سے **لا الٰه إلا اللّٰہ** کہتا ہے مگر دل سے رسالت و توحید حق کا منکر ہے۔ ایسے لوگ زبان شرع میں منافق کہے جاتے ہیں۔ یہ توحید مرنے کے وقت یا قیامت کے دن کچھ نفع بخش نہ ہوگی۔ سراسر وبال اور نکال آخرت کا باعث ہوگی۔ خدا محفوظ رکھے۔ آمین''

توحید کا دوسرا درجہ: اس کی دو شاخیں ہیں۔ ایک گروہ زبان سے بھی **لا اِلٰه إلا اللّٰہ** کہتا ہے اور دل میں بھی تقلیداً اعتقاد رکھتا ہے کہ اللہ ایک ہی ہے، کوئی اس کا شریک نہیں جیسا کہ ماں باپ سے اس نے سنا ہے۔ اسی پر ثابت قدم ہے۔ اس جماعت کے لوگ عام مسلمانوں میں ہیں۔ دوسرا گروہ زبان سے بھی **لا اِلٰه إلا اللّٰہ** کہتا ہے اور دل میں اعتقادِ صحیح رکھتا ہے، علاوہ اِس کے (اپنے) علم کی وجہ سے اللہ تعالٰی کی وحدانیت پر سیکڑوں دلیلیں بھی رکھتا ہے، اس جماعت کے لوگ متکلمین ہیں یعنی علمائے ظواہر کہلاتے ہیں۔

توحید کا تیسرا درجہ: موحد مومن باتباع پیر طریقت مجاہدہ و ریاضت میں مشغول ہے۔ رفتہ رفتہ یہ ترقی اس نے کی ہے کہ نورِ بصیرت دل میں پیدا ہو گیا ہے، اس نور سے اس کو اِس کا مشاہدہ ہے کہ فاعل حقیقی وہی ایک ذات ہے، سارا عالم گویا کٹھ پتلی کی طرح ہے، کسی کو کوئی اختیار نہیں ہے۔ ایسا موحد کسی فعل کی نسبت کسی دوسرے کی طرف نہیں کر سکتا کیوں کہ وہ دیکھ رہا ہے کہ فاعل حقیقی کے سوا دوسرے کا فعل نہیں ہے۔ بیت

دریں نوع ہم شرک پوشیدہ است   کہ زیدم بیازرد و عمرم بکشت

اس میں بھی شرک چھپا ہوا ہے کہ اگر کوئی کہے کہ مجھ کو زید نے ستایا اور عمر نے مار ڈالا۔

اب ہم ایک مثال دیتے ہیں۔ اس سے توحید عامیانہ، توحید متکلمانہ اور توحید عارفانہ سبھوں کے مراتب کا فرق صاف صاف ظاہر ہو جائے گا۔

مثال: کسی سرائے میں ایک سوداگر اُترا، اس کی شہرت ہوئی، لوگ اس کا مال و اسباب دیکھنے کو چلے اور ملاقات کے خواہاں ہوئے۔ ایک شخص نے زید سے پوچھا بھئی! تم کچھ جانتے ہو؟ فلاں سوداگر آیا ہوا ہے۔ زید نے کہا ہاں صحیح خبر ہے کیوں کہ معتبر ذرائع سے ہمیں معلوم ہوا ہے۔ یہ توحید عامیانہ ہے۔ دوسرے نے عمر سے دریافت کیا: اجی حضرت آپ کو اس سوداگر کا حال معلوم ہے؟ عمرو نے کہا خوب! ابھی ابھی میں اسی طرف سے آرہا ہوں۔ سوداگر سے ملاقات تو نہیں ہوئی مگر اس کے نوکروں کو دیکھا، اس کے گھوڑے دیکھے، اسباب وغیرہ دیکھنے میں آئے۔ ذرا شبہ اس کے آنے میں نہیں ہے۔ یہ توحید متکلمانہ ہے۔

تیسرے شخص نے خالد سے استفسار کیا کہ جناب اِس کی خبر رکھتے ہیں کہ سوداگر صاحب سرائے میں تشریف رکھتے ہیں؟ خالد نے جواب دیا بے شک! میں تو ابھی ابھی انہی کے پاس سے آرہا ہوں، مجھ سے اچھی طرح ملاقات ہو گئی ہے۔ یہ توحید عارفانہ ہے۔

دیکھو زید نے سنی سنائی پر اعتقاد کیا، عمرو نے اسپ و اسباب دیکھ کر دلیل قائم کی اور خالد نے خود سوداگر کو دیکھ کر یقین کیا۔ تینوں میں جو فرق مراتب ہے۔ اس کے بیان کی اب حاجت نہ رہی۔

توحید کا چوتھا درجہ: کثرت اذکار و اشغال و ریاضت و مجاہدہ کے بعد ترقی کرتے کرتے یہاں تک سالک ترقی کرتا ہے کہ بعض بعض وقت شش جہت میں اللہ تعالٰی کے سوا اس کو کچھ نظر نہیں آتا۔ تجلیات صفاتی کا ظہور اِس شدت سے سالک کے دل پر ہوتا ہے کہ ساری ہستیاں اس کی نظر میں گم ہو جاتی ہیں جس طرح ذرے آفتاب کی پھیلی ہوئی روشنی میں نظر نہیں آتے۔ دھوپ میں جو ذرہ دکھائی نہیں دیتا، اس کا سبب یہ نہیں کہ ذرہ نیست ہو جاتا یا ذرہ آفتاب ہو جاتا ہے بلکہ جہاں آفتاب کی پوری روشنی ہوگی، ذرہ کو چھپ جانے کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ جس وقت روشن

دانِ تاباں سے دھوپ، کوٹھری یا سائبان میں آتی ہے اس وقت ذروں کا تماشا دیکھو صاف نظر آتے ہیں پھر آنگن میں نکل کر دیکھو، غائب ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح بندۂ خدا نہیں ہوتا۔ **تعالیٰ اللہ و عن ذالک علواً کبیراً** (اللہ اس سے بلند تر ہے) اور نہ یہ ہوتا ہے کہ درحقیقت نیست ہو جاتا ہے۔ نابود ہونا اور چیز ہے اور نہ دیکھا جانا اور چیز ہے۔

پیشِ توحید او نہ کہنہ نہ نو ست　　ہمہ ہیچ اند ہیچ او ست کہ او ست
کے بود ما زِ ما جدا ماندہ　　من و تو رفتہ و خدا ماندہ

اس کی توحید کے سامنے، نیا اور پرانا کیا، سب ہیچ ہی ہیچ ہے، وہ وہی ہے جیسا کہ وہ ہے۔ لفظ ما سے ماکسب تک الگ رہے گا، من و تو بیچ سے اٹھ گیا تو خدا باقی رہ گیا۔'' (مکتوبات صدی، اردو، مکتوب اول)

''اے بھائی! جانو کہ اہل بصیرت اور ارباب معرفت جو، اپنے اندر کفر و شرک، نفاق اور بت و زنار دیکھتے ہیں وہ اعتباری ہے، اعتقاد کی بنا پر نہیں۔ اس کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ لوگوں کی نظروں کے سامنے تم گناہ اور فساد نہیں کر سکتے اور خلق سے پوشیدہ ہو کر تنہائی میں خدا کی نظر کے سامنے میں کرتے ہو تو معلوم ہوا کہ مخلوق سے ڈرتے ہو، اور خدا سے نہیں ڈرتے اور جو شخص خلق سے ڈرتا ہے، خدا سے نہیں ڈرتا، وہ کافر ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبران علیہم السلام دنیا میں تشریف لائے اور سب کے سب نے یہی کہا، **حب الدنیا رأس کلّ خطیئة** (دنیا کی محبت تمام برائیوں اور خطاؤں کا سرچشمہ ہے) اُن کی اِس ہدایت کے باوجود تم دنیا نہیں چھوڑتے، دنیا کو محبوب رکھتے ہو۔ اگر ایک کافر طبیب تم سے کہتا ہے کہ روٹی اور گوشت نہ کھاؤ کہ یہ تمھارے لیے نقصان دِہ ہے تو تم اسی وقت اسے ترک کر دیتے ہو، نہیں کھاتے تو، تم ہی کہو کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبران علیہم السلام طبیبانِ روحانی کے قول پر تم نے یقین نہیں کیا اور عمل پر تم عمل پیرا نہیں ہوتے۔ ایک کافر طبیب کے کہنے پر یقین کر لیا۔ اس پر یقین رکھا اور قائم رہے تو یہ کفر ہوا۔ ہاں شرک کے بارے میں کہتے ہیں کہ شرک دو ہے، ایک شرک جلی، دوسرا شرک خفی۔ شرک جلی دو معبود کا اثبات اور شرک خفی ان لوگوں کے نزدیک دو موجود کا اثبات ہے۔ اگر دو موجود کا اثبات کیا تو شرک کیا۔ شرک لایا۔ بعضوں کا قول ہے کہ نفع و نقصان کو غیر اللہ کی جانب سے جاننا شرک ہے۔'' (مکتوبات دوصدی، اردو، مکتوب **201**)

''ہاں نفاق دو طرح کا ہے، ایک عقیدتی دوسرا معاملتی، نفاق عقیدگی تو معلوم ہے مگر نفاق معاملتی یہ ہے کہ فعل برخلاف قول اور باطن کے خلاف ظاہر ہو۔ راہ سلوک میں یہ سخت ترین گھاٹی ہے اور بڑا مشکل معاملہ ہے۔ کچھ سالکین راہ ایسے ہیں جو، اِس نفاق سے مطلع ہوئے ہیں اور اس کے ازالہ سے عاجز آ گئے ہیں۔ آخر مغلوب ہو کر انھوں نے زنار گلے میں ڈال لی ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر مخلص مسلمان نہیں ہو سکا تو منافق بھی نہیں ہوں کیوں کہ منافق کافر سے بھی بدتر ہوتا ہے:

اِن المنافقین فی الدرک الأسفل من النار۔ بے شک منافقین دوزخ کے سب سے نچلے گڑھے میں رہیں گے۔'' (مکتوبات دوصدی، اردو، مکتوبات 201)

''وحدت کا معنی یگانگی یعنی یکتائی ہے۔ وحدت میں کثرت ہے دوئی نہیں ہے اور یہی وہ وحدت ہے جو طالبوں کا مطلوب ہے، سالکوں کا مقصود ہے۔ جب سالک اِس وحدت تک پہنچ جاتا ہے تو وہ شرک سے چھٹکارا پالیتا ہے، کثرت اٹھ جاتی ہے، دوئی باقی نہیں رہتی۔ حلول و اتحاد باطل ہو جاتے ہیں، تفرقہ اور سرگردانی سے گزر جاتا ہے اور توحید اعظم تک پہنچ جاتا ہے اور جب اس توحید تک پہنچ گیا جسے وحدت کہتے ہیں تو اس نے دیکھ لیا اور جان لیا کہ ہستی صرف اسی خدائے ذوالجلال کی ہے اور بس۔'' (مکتوبات دوصدی، اردو، مکتوب 202)

عقیدۂ رسالت: فضیلت انبیا، عصمت انبیا، حقیقت اولیاء اللہ، ماہیت ملائکہ

''تمھیں معلوم ہو کہ ہر وقت بجمیع وجوہ باتفاق جملہ مشائخ طریقت ولی اللہ جتنے بھی ہیں سب پیغمبروں کے تابع ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کو اولیاء پر فضیلت حاصل ہے کیوں کہ ولایت کی جو نہایت ہے، نبوت کی بدایت (ابتدا) ہے اور ہر نبی درجۂ ولایت پر فائز ہے مگر کوئی ولی نبی نہیں ہو سکتا۔ اس امر میں علمائے اہل سنت و جماعت ہوں یا محققین اہل طریقت کسی کو اختلاف نہیں ہے بلکہ سب کے سب متفق ہیں۔'' (مکتوبات صدی، اردو، مکتوب **20**)

''حضرت خضر علیہ السلام کو فضل مقید تھا یعنی اُن کو علم لدنی تھا نبوت نہ تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فضل مطلق تھا کیوں کہ پیغمبر اولوالعزم تھے۔ فضل مقید، فضل مطلق پر کیوں کر غالب ہوگا؟ اور اس کو کس طرح باطل کرے گا۔ دیکھو پارسا بی بی مریم رضی اللہ عنہا کو اِس کی فضیلت حاصل ہے کہ بغیر مسِ بشر کے اللہ تعالیٰ نے اُن کو فرزند عطا فرمایا۔ باوجود اِس کے حضرت بی بی عائشہ صدیقہ اور حضرت بی بی سیدہ فاطمہ زہرہ رضی اللہ عنہا پر اُن کو فضیلت نہیں ہے۔ فضل مقید فضل مطلق پر کیوں کر غالب ہوگا؟ یہ دونوں بیبیاں نساءِ عالم سے از آدم علیہ السلام تا یوم قیامت افضل و اعلیٰ ہیں۔'' (مکتوبات صدی، اردو، مترجم مکتوب **20**)

''ولی اللہ راہ طلب میں آتے ہیں۔ چلتے ہیں تو ہزار مشکل سے منزل مقصود تک پہنچتے ہیں جب کہ انبیاء علیہ السلام بغیر جد و جہد خدا رسیدہ ہو جاتے ہیں اور مطلوب پا لیتے ہیں۔ دعوت خلق میں جو بھی مشغول ہوتے ہیں تو، وہ مشغول ہونا باذن اللہ ہوتا ہے لاکھوں آدمی اُن سے ہدایت پاتے ہیں، مشرک موحد، کافر مومن بنتا ہے۔ اگر دنیا اولیاء اللہ سے بھری پڑی ہو، اور نبی، عالم میں ایک ہی ہو جب بھی ولیوں کی تمام فضیلت ایک جمع ہو کر نبی کے فضل کی برابری نہیں کر سکتی ہیں۔ اولیاء اللہ جب منتہائے کمال کو پہنچتے ہیں اور مشاہدات کی خبر دیتے ہیں۔ اس وقت حجاب بشریت

سے نکلتے ہیں۔ رسول کو جس دن خلعت نبوت ملتی ہے، اسی وقت مشاہدہ کی بات چیت اس سے سر زد ہوتی ہے۔ نبی کی ابتدا جب ولی کی انتہا ہے پھر اس کو اِس پر قیاس کرنا ہی فضول امر ہے۔''

''معراج کی حالت پر غور کرو۔ دیکھو نبی کو جو معراج ہوئی وہ کھلم کھلا شخصیت کے ساتھ ہوئی یعنی جسمانی ہوئی اور ولی کی معراج کا تعلق ہمت و اسرار کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جو چیز انبیاء کو اظہار کے ساتھ روا ہے، اولیاء کو اسرار کے ساتھ ہوگی۔ دوسرے انبیاء کا جسم مبارک صفاء و پاکیزگی و معنی قربت میں اولیاء کے دل اور سر کے مقابلے میں ہے۔ اب دیکھو کتنا فرق ہے درمیان اس شخص کے جس کو تشخص کے ساتھ معراج ہوئی اور جس کی معراج از روئے سرّ ہو۔

اب تم فضل انبیاء کو اولیاء پر جب اچھی طرح جان چکے تو ایک مسئلہ اور بھی اس کے مناسب سن لو۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ بالاتفاق اہل سنت و جماعت و جمہور مشائخ طریقت انبیاے معصوم و اولیاے محفوظ فرشتوں سے بھی افضل ہیں... فضل اس کو ہے جس کو خدا افضل بنائے اور جس کو قبول کرے۔'' (مکتوبات صدی، اردو، مکتوب **20**)

''سبحان اللہ کیا بارگاہ رسالت ہے اور کیا شان محمدی ہے۔ ذرا جبریل علیہ السلام کے مراتب پر نظر رکھ کر اس بات کو دیکھو تو سہی کہ تمام عمر کی جان توڑ عبادت کے صلہ میں اُن کو کیا ملتا ہے۔ یہ دولت دی جاتی ہے کہ معراج کی شب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے براق کی وہ خدمت کرتے ہیں اور اس کو سجا کر سامنے لاتے ہیں اور اسی خلعت شاہی پر ان کو ناز ہوتا ہے۔ پھر ہم یہی کہیں گے کہ فرشتے اس شخص سے افضل کیوں کر ہو سکتے ہیں جو نفس امارہ کو مارتا ہے۔ رات دن ریاضت و مجاہدہ کرتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس پر عنایت کہ اپنا دیدار اس کو کراتا ہے۔ ہر قسم کے خطرات سے محفوظ رکھتا ہے۔ حاصل کلام یہی ہے کہ خدا جس کو فضل دے وہی افضل ہے اور جس کے سر پر فضل کا تاج رکھے وہی بادشاہ ہے۔'' (مکتوبات صدی، اردو، مکتوب **20**)

''میرے بھائی شمس الدین! (اللہ تعالیٰ تمھیں بزرگ بنائے) سنو! پیغمبران علیہم السلام کی لغزشوں کے بارے میں کہ اُن سے گناہ صغیرہ ہو سکتا ہے یا نہیں؟ لوگوں کا اختلاف ہے۔ عام اہل سنت و جماعت کا اِس پر اتفاق ہے کہ اُن سے لغزش ہو سکتی ہے یعنی گناہ صغیرہ بلا قصد ممکن ہے اور کبیرہ تو ممکن ہی نہیں۔ انبیاء علیہم السلام سے کفر سرزد نہیں ہو سکتا، اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔''
(مکتوبات صدی، اردو، مکتوب **21**)

''مبتدعین کا ایک گروہ اس بات کا قائل ہے کہ جس طرح تمام مومنین سے گناہ کبیرہ اور کفر ممکن ہے اسی طرح انبیاء علیہم السلام سے بھی ممکن ہے۔ وہ اس کی دلیل یہ بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے متعلق خبر دی ہے: وَاجۡنُبۡنِیۡ وَ بَنِیَّ

أن نَعبدَ الأصنام (اے اللہ! تو مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی پوجا سے بچانا) اگر اصنام کی پرستش پیغمبروں سے ممکن نہ ہوتی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ دعا کیوں کر مانگتے؟ بلکہ ایسی دعا کرنا محال تھا کیوں کہ دعا ممکن الوقوع کے لیے ہوتی ہے۔ جس کا وجود ہی محال ہو، اس کے لیے دعا مانگنا کیا؟ جواب یہ ہے کہ اس دعا سے اُن کی اولاد مراد ہے وہ خود نہیں۔ اگر چہ آپ اس سے مامون اور بری تھے مگر اپنے آپ کو شامل کر دیا تا کہ آپ کی شمولیت سے برکت ہو، اور دعا مقبول و مستجاب ہو جائے جیسا کہ ہمارے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں حکم ہوا: وَ اسۡتَغۡفِرۡ لِذَنۡبِکَ و للمؤمنین (الآیة) اپنے اور کل مومنوں کی مغفرت مانگو۔ کیا نعوذ باللہ حضور سے گناہ سرزد ہوئے تھے مگر اس برکت کا پہلو یہاں بھی تھا۔ یہ تو شرعی جواب ہوا مگر... (مکتوبات صدی، اردو، مکتوب **21**)

لیکن گناہ کبیرہ انبیاء علیہم السلام سے سرزد ہونے کے متعلق ایک گروہ یہ کہتا ہے اور یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے آخر کیوں کر کیا؟ اہل سنت و جماعت کے نزدیک تو انبیاء علیہم السلام سے کفر ممکن ہی نہیں کیوں کہ گناہ کبیرہ بھی کفر ہے۔ جب ایک کبیرہ جائز ہوا تو دوسرا کبیرہ بھی جائز ہو سکتا ہے؟ برادران حضرت یوسف علیہ السلام کے کبیرہ کا جواب تو یہ ہے کہ وہ نزول وحی سے پیشتر کا واقعہ ہے اور وہ الشاذ کالمعدوم کا درجہ رکھتا ہے۔ دوسرے یہ کہ کس قدر جلدی آپ لوگوں نے توبہ کر لی اور صلاح و تقویٰ کی طرف آ گئے۔ انبیاء علیہم السلام سے ذِلّت (لغزش) البتہ ممکن ہے۔ زلت کی تعریف یہ ہے کہ اس گناہ سے پہلے قصد ہو، نہ گناہ کے بعد اس پر قرار ہو جیسے کوئی پھسلتے پھسلتے راستے میں چلے اور اچانک گر پڑے اور جلد سے اٹھ کر کھڑا ہو جائے۔ (تو یہاں) نہ گرنے سے پہلے اس کی نیت گر پڑنے کی تھی نہ گر پڑنے کے بعد پڑے رہنے کی۔ لیکن انبیاء علیہم السلام کی شان اس سے کہیں زیادہ اعلیٰ و ارفع ہے۔'' (مکتوبات صدی، اردو، مکتوب **21**)

جب تک عشق و محبت باقی ہے، اپنوں پر عتاب بھی ہوتا رہے گا

''اپنے مرتبے کی بلندی اور مقام کی اونچائی کی وجہ سے بڑے لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں میں پکڑے جاتے ہیں اور چھوٹے لوگ بڑے گناہ پر پوچھے نہیں جاتے۔ **المخلصون علی خطر عظیم**۔ مخلص لوگ بڑے خطرے میں ہیں۔ بڑے گناہوں پر نہ پکڑا جانا چھوٹے پن کی دلیل اور چھوٹی باتوں پر باز پرس اور عتاب بزرگی اور بڑائی کی دلیل ہے۔ **و کان جزراً لغیرھم**۔ یہ غیروں کے لیے تنبیہ ہے تا کہ عام لوگ ہوشیار ہو جائیں اور سمجھیں کہ جب بڑوں کے ساتھ ایسا معاملہ ہے تو ہم جیسوں کو کون پوچھتا ہے۔ عتاب میں ایک راز، اور بھی ہے کہ یہ زیادتِ محبت کی دلیل ہے۔ جب تک عشق و محبت باقی ہے طرح طرح کے عتاب اور نازِ معشوقانہ ہوتے رہیں گے۔ عالم محبت میں یہی چلن برابر جاری رہے گا'' (مکتوبات صدی، اردو، مکتوب **21**)

عقیدۂ قضاوقدر: تقدیر پر صبر کے سوا کوئی چارہ وتدبیر نہیں

''اے بھائی شمس الدین! سنو، اصحابِ صدق لِیَسأَلُ الصَّادِقِیۡنَ عَنۡ صِدۡقِھِم (صدیقوں سے ان کے صدق کے بارے میں پوچھا جائے گا) کے خوف سے لرزاں ہیں، اہل طاعت وَ الۡمُخۡلِصُوۡنَ علٰی خَطَرٍ عَظِیۡمٍ (مخلصین بڑے خطرے میں ہیں) کے تیر سے زخمی۔ عابد وزاہد اور عارف وعالم اس کی تیغ بے نیازی کی ہیبت سے سرگرداں و پریشان ہیں: اِنّ اللّٰہ لَغَنِیٌّ عَنِ الۡعَالَمِیۡنَ (بیشک اللہ دونوں جہاں سے بے پرواہ ہے)

بزرگوں کا کہنا ہے کہ غفلت دلوں پر وہ کام کرتی ہے کہ دوزخ بھی کافروں کے ساتھ نہیں کرتی۔ اے بھائی! دنیا قرار وآرام کی جگہ نہیں۔ آب وگل کی ایک مورتی بنا کر مشیت کے سامنے اندوہ و بلا کے میدان میں ڈال دی گئی ہے۔ اگر اس نے پیٹ بھر کر کھایا تو مست ہے، بھوکا رہا تو دیوانہ، سورہا تو مُردار ہے اور جاگتا ہے تو حیران۔ عاجزی اور ناتوانی اس کی صفت لازم بن گئی ہے۔ اگر معرفت کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تو جواب ملتا ہے و مَا قدرُو اللّٰہ حَقَّ قَدۡرِہٖ (انھوں نے اللہ تعالیٰ کا حق قدر ادا نہیں کیا) اگر عبادت میں مشغول ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے وَ مَا اُمِرُو اِلّا لِیَعۡبُدُو اللّٰہَ مُخۡلِصِیۡنَ له الدین (اس کے سوا اُن کو اور کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ خدا کی بندگی کرو تو نہایت اخلاص کے ساتھ) اگر اِن دونوں کو چھوڑ کر کنارے بیٹھ جاتا تو کہتے ہیں وَ مَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَ الۡاِنۡسَ اِلّا لَیَعۡبُدُوۡنَ (ہم نے جنات اور انسان کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ ہماری عبادت کریں) اگر غافل ہوکر بیٹھ رہتا ہے تو ڈراتے ہیں اِنَّ رَبَّکَ لَشَدِیۡدُ الۡعِقَابِ (جان لو کہ تمھارے پروردگار کی پکڑ بہت سخت ہے) اگر کسی کو شفیع بناتا ہے تو فرماتے ہیں لَا یَتَکَلَّمُوۡنَ اِلَّا مَنۡ اَذِنَ لَهُ الرَّحۡمٰنُ وَ قَالَ صَوَابًا (کوئی بول نہیں سکتا مگر وہ جس کو خدا نے حکم دیا، اس نے ٹھیک بات کہی) اگر اپنی یا غیر کی طرف نظر کی تو کہتے ہیں لَئِنۡ اَشۡرَکۡتَ لَیَحۡبَطَنَّ عَمَلُکَ (اگر تو نے کسی کو شریک گردانا تو تیرے اعمال برباد کردیے جائیں گے) اگر چاہے کہ اپنے دل ہی میں کوئی سودا کرے، تو کہا جاتا ہے و اِنَّ عَلَیۡکُمۡ لَحَافِظِیۡنَ (البتہ تمھارے اوپر ہر وقت محافظ مقرر ہے) اگر چاہے کہ دل ہی دل میں کوئی منصوبہ باندھے تو کہا جاتا ہے یَعۡلَمُ السِّرَّ وَ اَخۡفٰی (وہ دلوں کے چھپے ہوئے رازوں کو جانتا ہے) اگر بھاگ کر کسی گوشے میں چھپ جاتا ہے تو کہا جاتا ہے اَیۡنَ الۡمَفَرُّ (کہیں فرار کی جگہ بھی ہے) اگر بھاگ جاتا ہے تو بلا کر کہتے ہیں وَ اِلَیۡهِ الۡمَصِیۡرُ (اسی طرف سب کی بازگشت ہے) اگر سب کو چھوڑ کر بےکار بیٹھ جاتا ہے تو کہا جاتا ہے وَ الَّذِیۡنَ جَاهَدُوۡا فِیۡنَا لَنَهۡدِیَنَّهُمۡ سُبُلَنَا (جنھوں نے ہمارے لیے جدوجہد کی ہم انھیں اپنا راستہ دکھا دیتے ہیں) اگر کوشش ومحبت کرتا ہے تو کہتے ہیں یَخۡتَصُّ بِرَحۡمَتِهٖ مَنۡ یَّشَاءُ (وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے لیے چھانٹ لیتا ہے) اگر کوئی

ناامید ہوجاتا ہے تو کہتے ہیں لَا تَقۡنَطُوۡا مِنۡ رَحۡمَةِ اللّٰہِ (خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہو) اگر پُرامید ہوکر بےخوف ہوجاتا ہے تو کہتے ہیں اَفَامِنُوا مَکۡرَ اللّٰہِ (کیا وہ لوگ اللہ کی تدبیر سے محفوظ ہیں) اگر فریاد کرتا ہے تو کہتے ہیں لَا یُسۡئَلُ عَمَّا یَفۡعَلُ (یہ نہیں پوچھا جاسکتا کہ ایسا کیوں کیا)

عارفون کا قول ہے دَخَلۡنَا الدُّنۡیَا فِیۡهَا مُضۡطَرِیۡنَ وَ بَقِیۡنَا فِیۡهَا مُتَحَیِّرِیۡنَ وَ خَرَجۡنَا مِنۡهَا کَارِهِیۡنَ (ہم بےقراری کی حالت میں دنیا میں داخل ہوئے۔ یہاں حیرانی کے ساتھ زندگی گزاری اور کراہت کے ساتھ یہاں سے چلے گئے) حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم جب ایک رات آرام فرما کر بیدار ہوئے تو آپ کے سترہ موئے مبارک سفید ہوگئے تھے۔ اصحاب نے عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ایسا کیوں ہوا؟ آپ نے فرمایا، رات سورۂ ھُود نازل ہوئی ہے اور یہ اس خطاب کی وجہ سے ہے کہ فرمایا فَاسۡتَقِمۡ کَمَا اُمِرۡتَ (جو کچھ کہا گیا ہے اس پر قائم ہو جاؤ) اے بھائی! راہ خطرناک، منزل بہت دور، محبوب ومطلوب کے مقام کی کوئی حد و نہایت نہیں، انسان کا جسم کمزور، دل بےسہارا، جان عاشق اور سر شوریدہ ومشتاق، کیا کرے۔

کتنی طاعتوں کے انبار کو جان کنی کے وقت وَ قَدِمۡنَا اِلٰی مَا عَمِلُوۡ (اُن کے اعمال کی جزا ہم نے پہلے ہی دے دی ہے) کی بادِ بے نیازی کے جھونکوں سے اُڑا کر برباد کردیا اور کتنے آباد سینوں کو سکراتِ موت کے وقت وَ بَدَا لَهُمۡ مِنَ اللّٰہِ مَا لَمۡ یَکُوۡنُوۡا یَحۡتَسِبُوۡنَ (انھیں خدا کی طرف سے وہ کچھ ظاہر ہوا جس کا انھیں گمان تک نہ تھا) سے خراب و ویران کرکے رکھ دیا۔ کتنوں کے چہرے قبر میں قبلے کی طرف سے پھیر دیے اور کتنے آشناؤں کو پہلی ہی رات میں بیگانہ بنادیا۔ ایک کو کہا نَم کَنَوۡمَةِ العُرُوۡسِ (دلہن کی طرح میٹھی نیند سوجا) دوسرے سے کہا نَم کَنَوۡمَةِ الۡمَنۡحُوۡسِ (منحوس کی طرح سوجا) ایک راندۂ درگاہ آتا ہے جو کسی طاعت سے بھی مقبول بارگاہ نہیں ہوسکتا۔ آذر کے صنم خانے سے ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو دیکھو: وَ یَخۡرُجُ الۡحَیَّ مِنَ الۡمَیِّتِ (مردے سے زندہ پیدا کرتا ہے) پڑھو۔ حضرت نوح علیہ السلام کے گھرانے سے کنعان پر نظر ڈالو: وَ یَخۡرُجُ الۡمَیِّت مِنَ الۡحَیِّ زندے سے مردہ پیدا کرتا ہے) اس کو جانو اور سمجھو۔ حضرت آدم کی ثابت قدمی دیکھو کہ لغزش کا نقصان بھول نہ سکے اور شیطان کی محویت دیکھو کہ طاعت کا ثبوت کوئی فائدہ نہ پہنچا سکا۔ چنانچہ جو لوگ بلائے گئے ہیں ان کے لیے لَهُمُ الۡبُشۡرٰی (ان کو بشارت ہے) کا مژدہ ساتھ ساتھ ہے اور جو راندے گئے ان کی راہ میں لَا بُشۡرٰی یَوۡمَئِذٍ لِلۡمُجۡرِمِیۡنَ (آج مجرموں کو کوئی بشارت نہیں ہے) کا خطاب ہے۔ جس طرح سِیۡمَاهُمۡ فِیۡ وُجُوۡهِهِمۡ مِنۡ اَثَرِ السُّجُوۡدِ (اُن کی پیشانیوں پر سجدوں کے نشان ہیں) کا بیان ہے۔ اسی طرح یُعۡرَفُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ بِسِیۡمَاهُمۡ (گنہگار اپنی پیشانیوں سے پہچانے جائیں گے)

تم سے جہاں تک ہو سکے شکستہ دل اور خراب حال رہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا سے گفتگو کرتے وقت کہا **یَا رَبِّ اَیْنَ اَطْلُبُکَ قَالَ عِنْدَ الْمُنْکَسِرَۃِ قُلُوْبَھِمْ لِاَھْلِی** (اے پروردگار میں تجھے کہاں ڈھونڈوں؟ جواب ملا اُس دل میں جو میری قضا کی چوٹ سے ٹوٹا ہوا ہے) آپ نے کہا، خداوندا تجھ سے زیادہ شکستہ دل اور نا امید کوئی اور نہ ہوگا۔ ارشاد ہوا میں بھی وہیں ہوں جہاں تو ہے۔ آدمی کے ہاتھ میں جب تک ڈھال ہوتی ہے وہ اپنی زندگی سے ہاتھ نہیں دھوتا۔ جب سپر پھینک دی، گھوڑے کی کوچیں کاٹ ڈالیں اور تلوار کھینچ کر زمین پر اُتر آیا۔ البتہ اُس وقت کہا جاسکتا ہے کہ یہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ ایک بزرگ کہتے ہیں میں ایک فقیر کی عیادت کو گیا اور کہا **لیس بصادق فی حبه من لم یصبر علی ضربه** (جو کوئی معشوق کی محبت میں اُس کے جور و جفا پر صبر نہیں کرتا وہ محبت میں سچا نہیں ہے) اس سے سر اٹھا کر کہا **لیس بصادق فی حبه من لم یتلذذ بضربه** (جو کوئی معشوق کے جور و جفا میں لذت نہ پائے، وہ محبت میں سچا نہیں ہے عراق کے مشائخ نے کہا ہے، وہ شخص معرفت کی سرحد میں قدم نہیں رکھ سکتا جس کے نزدیک منع وعطا (دینا اور نہ دینا) برابر نہ ہوجائے۔

جب حضرت امام شبلی نے یہ سنا تو فرمایا، یہ غلط ہے۔ آدمی اس وقت عارف ہوتا ہے جب اس کے نزدیک منع کو عطا بر فوقیت حاصل ہوجاتی ہے کیوں کہ منع خصوصیت کے ساتھ مرادِ حق ہے اور بخشش وعطا بندے کی مراد سے تعلق رکھتی ہے اور حقیقتاً عارف وہی ہے جو، اپنی مرادیں اللہ کی مراد پر قربان کردے۔'' (مکتوبات صدی، اردو، مکتوب **77**)

''لوح محفوظ میں جو پہلی سطر لکھی گئی وہ یہ تھی: **من لم یرض بقضائی و لم یشکر علی نعمائی و لم یصبر علی بلائی فلیطلب ربا سوائی۔** جو میرے فیصلے پر راضی نہ ہو، جو میری نعمتوں پر شکر نہ کرے، جو میری بلاؤں پر صبر نہ کرے تو اس سے کہہ دو کہ وہ میرے سوا کوئی دوسرا پروردگار ڈھونڈ لے) اس حدیث شریف کی تنبیہ اور اس کی دہشت سے مردانِ خدا کا پتہ پانی ہو رہا ہے اور ان کے دل کباب ہو رہے ہیں۔ نہ تو دن میں کسی کو چین وسکون ہے اور نہ رات کو نیند۔ بیوی بال بچوں کے کھانے پینے کا کسے ہوش ہے؟ ان سب کے بعد دنیا کا کاروبار، تجارت، زراعت کہ یہ سب سامان زندگی ہیں، انھیں جینے کی کیا فکر ہے؟ یہ تو اپنے سامنے موت کو رکھے ہوتے ہیں۔ کہاں یہ مردانِ خدا، کہاں یہ عام مسلمانان۔ مسلمان رہنا، اور مسلمان ہوجانا یہ کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ تقدیر پر صبر کرنے کے سوا کوئی چارہ وتدبیر نہیں ہے تو دنیا سے ایمان سلامت لے جائیں۔'' والسلام فقیر شرف منیری

(مکتوبات دوصدی، اردو، مکتوب **57** بنام خواجہ سلیمان)

''اے بھائی! قضاوقدر کے راز سے جبریل ومیکائیل آگاہ نہیں۔ غریب عقل کی اس کے قضاو قدر کے اسرار تک پہنچ کہاں؟ ہوسکتا ہے کہ ہماری بھلائی اس چیز میں ہو جو ہمیں اپنے لیے ناپسند و ناگوار ہوتی ہے۔ **عسیٰ ان تکرھو شیئاً و ھو خیر لکم۔**'' (مکتوبات دوصدی، اردو، مکتوب **51** بنام ملک خضر)

عقیدۂ حشر ونشر: حیات وموت، تصورِ آخرت

دنیا خواب ہے، آخرت بیداری ہے، درمیان میں موت ہے اور ہم خواب غفلت میں ہیں۔

''حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صحابی نے اپنی سختی دل کی شکایت کی تو حضور نے فرمایا: **اِطلع فی القبور و اعتبر بالنشور۔** گورستان (قبروں) پر نظر کرو، حشر ونشر پر اعتبار کرو۔''

(مکتوبات دوصدی، اردو، مکتوب **21**)

''کل قیامت کے دن جب قبر سے اٹھائے جائیں گے تو **کما تموتون تبعثون** (تم جس حال میں مرے ہو، اسی حال میں اٹھائے جاؤ گے) کا معاملہ ہوگا۔ یہی بات ایک بزرگ نے کہی ہے: **مِن کل الف واحدٌ للرحمن و تسع مائة و تسعون للشیطان۔** ہر ایک ہزار آدمی جو قبر میں رکھے جائیں گے، ان میں کا ایک اللہ کے لیے اور بقیہ نو سو ننانوے شیطان کے حصہ کے ہوں گے۔''

(مکتوبات دوصدی، اردو، مکتوب **91** بنام قاضی حسام الدین)

حضرت مخدوم جہاں نے تصور آخرت کے پس منظر میں ابن آدم کو تین خانوں میں تقسیم کیا ہے: (۱) حریص لالچی (۲) تائب مبتدی (۳) عارف منتہی۔ حریص کبھی موت کو یاد نہیں کرتا۔ اور کبھی یاد بھی کرتا ہے تو صرف اس لیے کہ اپنی جمی جمائی دنیا چھوٹ جانے پر افسوس کرے لیکن تائب مبتدی موت کو اس لیے یاد کرتا ہے تا کہ اس کے دل میں خوف خدا، خشیت الٰہی پیدا ہو اور وہ پوری طرح استقامت پر قائم رہے کیوں کہ وہ خدا کے دیدار سے کراہت نہیں کرتا بلکہ اپنی تقصیر اور دیدار الٰہی کے فوت ہونے سے ڈرتا ہے جس کا پختہ تصور یوں رکھتا ہے: **من اکرہ لقاء اللہ کرہ اللہ لقائه۔** جس نے حدا کے دیدار سے کراہت کی، اللہ تعالیٰ اسکو دیکھنا پسند نہیں فرماتا۔ لیکن عارف منتہی ہمیشہ ہر آن موت کو یاد کرتا ہے کیوں کہ موت لقائے دوست کی وعدہ گاہ ہے اور عاشق کبھی لقائے دوست کی وعدہ گاہ کو فراموش نہیں کرتا۔ حدیث شریف کی معقول ومرغوب تلقین وتعلیم یوں کرتے ہیں: **لو اَن البھائم تعلم من الموت ما تعلمون ما أکلتم منھا سمینا۔** اگر چوپائے موت کے متعلق اتنا جانتے جتنا تم جانتے ہو تو تم کسی فربہ جانور کا گوشت نہیں کھاتے۔ دوسری حدیث پاک کی تعلیم فرما کر موت کو زندگی کی تکمیل اور پرکشش قیمتی چیز بناتے ہیں۔ **تحفة المؤمن الموت**، موت مومن کا تحفہ ہے کیوں کہ دنیا مومن کا قید خانہ ہے کہ وہ جب تک اس دنیا میں رہتا ہے، ہمیشہ رنج ومصیبت میں رہتا ہے اور موت اس قید سے رہائی ہے اور قید سے رہائی ایک تحفہ ہوتی ہے۔ موت کا ایک منفرد تعارف یوں کراتے ہیں:

"الموت کفارۃ لکلّ مسلم موت ہر مسلمان کے لیے کفارہ ہوتی ہے۔ اس لیے وہی شخص موت کا طالب ہوگا جو حقیقت میں مسلمان ہے نہ کہ ہماری اور تمھاری طرح۔"

(تلخیص مکتوب **97** مکتوبات صدی، اردو)

"امام نووی سے منقول ہے کہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے کوفہ کی مسجد میں ایک بوڑھے آدمی کو دیکھا وہ کہتا تھا "میں اس مسجد میں تیس سالوں سے موت کا انتظار کر رہا ہوں کہ کب آتی ہے۔ اگر آ جائے تو پھر کسی چیز کا انتظار نہ کروں گا۔ ذرا بھی دیر نہ ہونے دوں گا (کیوں کہ) میرا کسی پر یا کسی کا میرے اوپر کوئی حق نہیں ہے جس کا خیال آئے۔"... "ایک بزرگ نے کسی کو خط لکھا کہ "دنیا خواب ہے اور آخرت بیداری ہے اور اُن دونوں کے درمیان موت ہے اور ہم خواب غفلت میں مبتلا ہے۔" (مکتوبات صدی، اردو، مکتوب **97**)

کلمۂ طیبہ ــــ اول رکن اسلام: مقام توحید، وحدت الوجود کی حقیقت

برادرم شمس الدین! تم جانتے ہو کہ مرید کو کیا چاہیے؟ اس کو لازم ہے کہ **کلمۂ لا الہ الا اللہ** کی حمایت میں اپنی جائے پناہ بنالے۔ خلوت ہو، انجمن ہو، پوشیدہ ہو، ظاہر ہو، ایک چشم زدن میں اس کلمہ کے حصار سے باہر نہ جائے۔ خواجۂ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث قدسی ہے: **لا الہ الا اللہ حصنی فمن دخل حصنی امن من عذابی۔** پروردگار نے یوں فرمایا کہ **لا الہ الا اللہ** میرا حصار (پناہ گاہ) ہے، جو شخص میرے حصار میں آ گیا، عذاب و عتاب سے میرے محفوظ رہا...... مقام توحید کے معاملات بہت نازک ہیں۔ جس وقت مرید کی چشم باطن پر عالم توحید منکشف ہوتا ہے۔ عالم ایجاد کے کل موجودات اس کو غیر نظر آتے ہیں۔ اس وقت غیر کی نفی کو وہ شرط توحید سمجھتا ہے۔ آخر آتش غیرت لپک اٹھتی ہے اور ماسوا اللہ کو جلا کر خاک سیاہ کر دیتی ہے۔ نفی و اثبات اگرچہ صفات بشریت سے ہے اور مرید جب تک صفات بشریت سے نہیں نکلتا، عالم توحید میں نہیں پہنچتا۔ فقہا کے نزدیک نفی بعد اثبات ہے۔ اہل لغت کے نزدیک اثبات بعد نفی ہے مگر عرفا کے نزدیک نفی و اثبات دونوں شرک ہیں کیوں کہ اثبات میں تین چیزوں کی ضرورت ہے ((**1** مثبت ((**2** ثابت ((**3** اثبات۔ اس طرح نفی میں نفی، نافی اور منفی کی ضرورت ہے۔ جس مقام میں دوئی شرک ہے یعنی فوراً آدمی مشرک و ملحد ہو جاتا ہے وہاں تین اور تین، چھ چیزوں کا گزر کیوں کر ہوگا؟ اور کس طرح وہ شخص مخلص و موحد باقی رہے گا؟ برادرِ عزیز! ہم تم سے کیا کہیں! وحدت الوجود کی حقیقت یہی ہے کہ وجودِ غیر معدوم ہے۔ یہ تو بڑے تماشے کی بات ہے کہ جو چیز سرے سے موجود نہ ہو، اس کی نفی کیا ہوگی؟ اور جب نفی کرنے والا خود نہیں ہے تو اِثبات کیا کرے گا؟"

(مکتوبات صدی، اردو، مکتوب **40**)

"لا الہ الا اللہ کا ذکر کریں اس لیے کہ جتنی چیزیں لفظ کُن کے تحت وجود میں آئی ہیں جب اُن سب کی لا الہ کے ذریعے نفی ہوئی تو الا اللہ حاصل ہو گیا۔" (مکتوبات دوصدی، اردو، مکتوب **35** بنام قاضی زاہد)

"ترک و معرفت دونوں کلمۂ شہادت کا معنی ہیں اور کلمۂ شہادت نفی و اثبات سے مرکب ہے۔ نفی دنیا کا ترک ہے اور اثبات معرفت خداوند تعالیٰ ہے تو جس نے دنیا کی نفی کر دی اس نے مکمل نفی کی اور جس نے خداوند تعالیٰ کی معرفت حاصل کی اس نے کامل اثبات کیا۔ لا الہ الا اللہ حقیقی طور پر کہنا یہی ہے۔ اگر عادت کے طور پر **لا الہ الا اللہ** کہتے ہو تو اِس کا کیا فائدہ؟"

(مکتوبات دوصدی، اردو، مکتوب **129**)

نماز ــــ اہم فرائض: طہارت کی حقیقت، نماز کل ارکان اسلام کی جامع عبادت

"برادرِ عزیز! تم اس بات کو اچھی طرح جان لو کہ دونوں جہاں میں آدمی کی قدر طہارت سے ہوتی ہے۔ ہر قسم کی دولت ہر طرح کی سعادت کا زینہ یہی طہارت و پاکی ہے... شریعت کا فتویٰ اس پر ہے: **بنی الاسلام علی النظافۃ۔** بنائے اسلام ہی پاکی پر رکھی گئی ہے۔ وہ کسی قسم کی آلودگی کو قبول نہیں کر سکتا اور نہ جمال اپنا، کسی آلودۂ روزگار کو دکھا سکتا۔ کب کی بات ہے کہ اس آیت کی قہارانہ سیاست نے جتنے جتنے آلودہ نجاست ہیں سبھوں کو حلقۂ اسلام سے باہر کر دیا ہے: **لا یمسہ الا المطھرون۔** پاک لوگوں کے سوا قرآن کا چھونا منع ہے۔... بہرکیف اس راہ کا دستور العمل یہ ہے کہ بدن کپڑا پاک صاف، کھانا پینا حلال ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ حواس خمسہ کا گناہ، معصیت اور خلاف شرع سے پاک و مصفا ہونا ضروری ہے۔" (مکتوبات صدی، اردو، مکتوب **29**)

"معلوم ہونا چاہیے کہ ایمان جب کامل ہو گیا، اور توبہ درست ہو گئی تو مرید کو چاہیے کہ ہمیشہ باوضو رہے۔ ہرگز ہرگز ایک ساعت بھی بے وضو نہ رہے، رات کا وقت جاڑے کا موسم سرد سے سرد پانی کیوں نہ ہو... پانچوں وقت کی نماز باجماعت ادا کرے۔ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرتا رہے اس لیے کہ **المنتظر للصلوٰۃ کانہ فی الصلوٰۃ** (جو کوئی نماز کا انتظار کرتا ہے گویا وہ نماز ہی میں ہے) جب صبح صادق ظاہر ہو تو دو رکعت نماز سنت فجر ادا کرے۔ پہلی رکعت میں **قل یایھا الکافرون**، دوسری رکعت میں سورہ اخلاص پڑھے۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی فرمایا ہے۔... جب آفتاب نکل کر تھوڑا بلند ہو جائے۔ دو رکعت نمازِ اشراق پڑھا کرے۔ کم سے کم اشراق کا یہ درجہ ہے۔ نمازِ صبح کے بعد جائے نماز پر اس وقت تک بیٹھنا کہ آفتاب نکل آئے اور طلوع کے بعد دو رکعت نماز پڑھنا۔ اِن اعمال کی بہت فضیلت آئی ہے اور جب آفتاب بہت زیادہ بلند ہو جائے تو نمازِ چاشت ادا کرے باتباع سنت جس قدر اس نے اپنے لیے لازم کر لیا ہے۔

فاذا قضیت الصلوٰۃ فانتشرو فی الارض۔ (جب نماز ادا ہو جائے تو زمین پر پھیل

جاؤ) پرعمل کرے اورفکر معاش میں مشغول ہو جائے۔... اگر اِن چیزوں کی ضرورت نہ ہوتو فی النوم سلامة (سونے میں سلامتی ہے) پرعمل کرے اور سو رہے پھر جب نمازِ ظہر کا وقت آجائے تو جاگ اٹھے۔ طہارت کرے، پہلے چار رکعت سنت پڑھے۔ اس کے بعد فرض ادا کرے پھر دو رکعت سنت پڑھے اور جاے نماز پر دوسری نماز کے انتظار میں بیٹھا رہے... یہاں تک کہ عصر کا وقت آجائے۔ ''نماز فرض مسجد میں ادا کی جائے اور نمازِ نفل گھر میں کہ دین کی سلامتی اور خاطر جمعی اس میں ہے۔'' خیر جب عصر کا وقت آجائے تو مزید چار رکعت سنت ادا کرے، بعد اس کے چار رکعت فرض پڑھے۔ ذکر وفکر میں مشغول ہو یہاں تک کہ آفتاب غروب ہو جائے۔ عصر و مغرب کے درمیان میں دنیاوی کام نہ کرنا، عبادت میں مشغول رہنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص آخر شب میں اٹھے اور طلوع آفتاب تک عبادت کرتا رہے... پھر نماز مغرب کی تیاری کرے پہلے تین رکعت فرض بعدہ دو رکعت سنت پڑھے۔ اس کے بعد بیس رکعت صلوٰۃ اوّابین پڑھے۔ اگر ممکن ہوتو بیسوں رکعت پڑھا کر، ورنہ جس قدر ہو سکے مقرر کر لے۔ **تتجافی جنوبھم عن المضاجع** (ان کے پہلو بستر سے لگے رہتے ہیں) کے مصداق وہی لوگ ہیں جو درمیانِ مغرب وعشا یادِ حق میں رہتے ہیں اور اس وقت کو زندہ رکھتے ہیں۔ جب عشا کی نماز کا وقت آجائے تو چار رکعت سنت پھر چار رکعت فرض ادا کرے، پھر دو رکعت سنت پڑھے، وتر کو آخر شب کے لیے اٹھا رکھے اگر اٹھ جانے پر قادر ہو، جاگنے پر اعتماد ہو، اور سمجھتا ہو کہ نیند ضرور ٹوٹ جائے گی۔ اگر خوف سونے کا ہوتو عشا کے ساتھ وتر پڑھ لے۔

اس طرح پر عمل درآمد جو شخص کرے گا وہ غافل نہ سمجھا جائے گا۔ خاصروں میں اس کا شمار نہ ہوگا بلکہ اس کو حاضر باش سمجھیں گے۔...... جس شخص کو ایسا دیکھو کہ مدعی طریقت ہو کر شریعت کے موافق نہیں چلتا تو سمجھ لو کہ اس کو طریقت سے کچھ حاصل نہیں ہونے والا ہے...... یہ تو ملحدوں کا مذہب ہے کہ طریقت کا قیام وہ بغیر شریعت کے جائز رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب حقیقت منکشف ہو جاتی ہے تو شریعت کی پابندی باقی نہیں رہتی۔ ایسے اعتقاد پر خدا کی پھٹکار۔ سنو! ظاہر اگر باطن کے مطابق نہیں ہے تو یہ نفاق کی علامت ہے...... اور باطن آراستہ ہو، ظاہر خلاف حکم شریعت ہو تو یہ زندیقیت کی نشانی ہے۔ اگر شریعت پر عمل ہے اور باطن طریقت سے بے بہرہ ہے، ایسا شخص نقصان و نادانی میں ہے۔ باطن کی درستگی چاہنا بغیر عمل ظاہر کے، ہوسِ بے جا کرنا ہے۔ ظاہر باطن کے ساتھ اس طرح شیر و شکر ہے کہ اس کو کوئی شخص جدا نہیں کر سکتا۔ **لا الہ الا اللہ** حقیقت ہے اور **محمد رسول اللہ** شریعت ہے۔ صحت ایمان جس کو قائم رکھنا ہے وہ ایک جملہ کو دوسرے جملہ سے علاحدہ کر کے مومن باقی نہیں رہ سکتا ہے۔''

(نماز مومن کی معراج ہے) دیکھو تمھیں معراج کس طرح نصیب ہوتی ہے۔ پہلے تم نے طہارت کی۔ پاک و صاف کپڑا پہنا، اس کے بعد خراماں خراماں مسجد آسمان رفعت میں داخل ہوئے۔ وہاں اول اول مومنانِ ملک صفت کے ساتھ بندگانہ و عاجزانہ کھڑے ہو گئے پھر اس وقت تک واپس نہ ہوئے جب تک اچھی طرح خلوت راز میں نشست کی نہ ٹھہرا۔ سبحان اللہ و بحمدہ۔ اس کے علاوہ ان باتوں پر غور کرو۔ اللہ رب العزت نے اپنے لطف و کرم سے ہر نماز میں کل ارکان شرع جمع کر دیے ہیں یعنی حج، زکوٰۃ، حج، جہاد۔ ان کے اشارات کو بھی سنو! نماز میں جو شخص کھڑا ہوا، اس نے روزہ بھی رکھا، روزہ پر کچھ اضافہ بھی کیا۔ جس طرح روزہ میں آدمی نہیں کھاتا پیتا ہے، نماز میں بھی نہیں کھاتا پیتا مگر روزے میں سونے کی اجازت ہے، چلنے کی پھرنے کی اجازت ہے اور دوسرا کام کرنے کی اجازت ہے۔ نماز میں جو روزہ ہے، اس میں اِن باتوں کی اجازت نہیں، اس لیے یہ روزہ، روزۂ رمضان سے اور بڑھا چڑھا ہوا ہے۔ زکوۃ کا قاعدہ یہ ہے کہ جب دو سو درم یعنی چالیس روپیہ یا اتنے کا سونا چاندی موجود ہو تو پانچ درم سال بھر کے بعد کسی درویش کو دے دیا کریں تاکہ اس حاجت مند کی حاجت پوری ہو۔ نمازی جس وقت **الھم اغفرلی و لوالدیّ و لمن توالد و لجمیع المؤمنین** پڑھتا ہے تو سب کو آسودہ کرتا ہے۔ نماز میں حج کا لطف بھی ہے۔ حج میں اگر احرام واہلال ہے تو نماز میں تحریمہ و تحلیل ہے۔ نماز میں جہاد کا انداز بھی ہے۔ دیکھو نمازی نے جب وضو کیا تو گویا اس نے زرہ پہن لی اور جماعت جب کھڑی ہوئی تو امام کی حالت سپہ سالار کی ہوگئی اور مقتدیوں کی حالت لشکر کی مثل سمجھو کہ صف باندھ کر کھڑے ہیں۔ مقام جنگ گویا محراب ہے۔ سب لوگ امام کی اقتدا میں قدم جمائے ہوئے ہیں اور نصرت و فتح کے طالب ہیں۔ جہاد میں جب فتح نصیب ہوتی ہے تو مال غنیمت تقسیم ہوتا ہے اور نماز میں امام جب سلام پھیرتا ہے تو فضل ذوالجلال تقسیم کرتا ہے۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

نتیجہ یہ نکلا کہ جن مومنین مخلصین نے نماز ادا کی، انھوں نے زکوٰۃ بھی دی۔ اگرچہ اس کے پاس مال نہ تھا۔ اس نے حج کیا گو، اس کو استطاعت نہ تھی، اس نے روزہ بھی رکھا گرچہ اس کو قدرت نہ تھی۔ اس نے جہاد بھی کیا، گو، اس کو قوت سے سروکار نہ تھا۔ اسی سے اب سمجھو کہ نماز کیا چیز ہے؟''

(مکتوبات صدی، اردو، مکتوب **32**)

روزہ: بدنی زکوۃ روحانی عبادت

''برادرم شمس الدین! تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ جو لوگ محقق ہیں جن کے قول و فعل میں صدق و اخلاص ہے، وہ کہتے ہیں جس طرح قوت جسمانی کھانے پینے پر موقوف ہے، اسی طرح روحانی طاقت بھوکے پیاسے رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔ **الجوع طعام اللہ فی أرضه**۔ بھوک خدا کی زمین میں خدائی

غذا ہے۔ روزہ دار میں ایک خاص صفت معبود کی پائی جاتی ہے۔ **و ھو یطعم و لا یطعم**۔ حق تعالیٰ کھلاتا ہے خود نہیں کھاتا۔ روزہ دار کا اس صفت باری تعالیٰ کے ساتھ موصوف ہونا کیا معمولی بات ہے؟''

''حضرت خواجۂ دنیا و آخرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فتویٰ ہے: **للصائم فرحتان**۔ روزہ دار کے لیے دو قسم کی فرحت رکھی گئی ہے۔ ایک فرحت تو روزہ کھولنے کے وقت اس کو حاصل ہوتی ہے دوسری فرحت اس وقت حاصل ہوتی ہے جس وقت وہ جمالِ باکمال اپنے خداوندا اپنے رب اپنے مالک کا دیکھتا ہے۔ اس عالم میں دل کی آنکھ سے لقا ہوتی ہے اور آخرت میں اس چشم سر سے روزہ دار دیکھے گا جو دیکھنے کا حق ہے۔

صوموا الرُّویتہ (اس کے دیدار کے لیے روزہ رکھو)

حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: **حاکیاً عن اللہ تعالیٰ کل عمل ابن آدم یضاعف الی سبعین إلا الصوم فانه لی و أنا اجزی به**۔ ہر وہ عمل جو انسان کرتا ہے اس کا اجر دو گنا ملے گا۔ ایک کا ستر تک مگر روزہ ایسا عمل ہے جو خاص میرے لیے ہے، اس کی جزا خاص میں دوں گا۔ اس کی جزا میں خود ہوں گا۔ دیکھو اس کی بلاغت کو **إلا الصوم فانه و انا اجزی به**۔ یعنی **الصائم لی**۔ اہل عرب کا قاعدہ ہے کہ صفت کا ذکر کرتے ہیں مگر مراد اُن کی اس سے موصوف ہوتا ہے۔ یہاں پر دو بات وجد کرنے کے قابل ہے۔ ذرا بارگاہ عزت پر غور کرو، اور انسان ذرۂ بے مقدار کو دیکھو۔ اگر یہ کہا جاتا کہ تیری حقیقت کیا ہے تو، تو میرے در کا کتا ہے تو یقین جانو یہ ایسی نوازش ہوتی کہ دولت رکھنے کی جگہ نہ ملتی چہ جائے کہ بادشاہ عالم جل جلالہ روزہ دار کی شان میں یہ فرمائے کہ تو میرے لیے ہے اور تیری جزا میری لقا و رویت ہے۔''

''خواجہ ذوالنون مصری فرمایا کرتے تھے: **الدنیا یوم و لنا فیها صوم**۔ دنیا درحقیقت ایک دن سے زیادہ نہیں اور ایک دن کا روزہ کیا دشوار ہے۔ ایک دوسرے بزرگ نے فرمایا: **صم عن الدنیا و اجعل فطر تک الموت**۔ دنیا روزہ رکھ اور موت سے افطار کر۔۔۔ بھائی کچھ سمجھتے ہو کہ یہ سارا حکم انسان ہی کو کیوں ہوا؟ سنو! **فعل الحکیم لا یخلو عن الکمة**۔ حکیم کا کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔'' (مکتوبات صدی، اردو، مکتوب **34**)

زکوۃ: مالی عبادت، بندوں کی حاجت روائی کا قدرتی منصوبہ

''برادرم شمس الدین! تمھیں معلوم ہو کہ عبادت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک بدنی، دوسری مالی۔ مالی عبادت کو بدنی عبادت پر فضیلت ہے کیوں کہ مالی عبادت سے دوسرا شخص بھی نفع اٹھاتا ہے۔ عبادات میں اس گروہ صوفیہ کا حال کچھ نہ پوچھو، جان و مال دونوں کو وقف کر دیتے ہیں بلکہ ماسوی اللہ سے کچھ غرض ہی نہیں رکھتے۔''۔۔۔

لوگوں کا قول ہے کہ دنیاوی مال و دولت کے باعث زکوۃ دینا کوئی بڑا کام نہیں کیوں کہ زکوۃ وہی شخص دے گا جس کے پاس سو درم نقد سال بھر رہ جائے۔ ایسا شخص اس گروہ کے نزدیک بخیل ہے اور بخالت صفت پسندیدہ نہیں ہے۔''

''ایک فقیر نے حضرت ابوبکر شبلی سے بطورِ آزمائش سوال کیا کہ اچھا فرمائیے تو سہی! زکوۃ کتنے درم سونے چاندی پر واجب ہوتی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ تم کون سا جواب چاہتے ہو، مذہب فقہا کی رو سے یا مذہب فقرا کے اعتبار سے؟ فقیر نے کہا دونوں طور سے جواب ارشاد ہو۔ آپ نے فرمایا فقہا کا مذہب تو یہ ہے کہ دو سو درم پر جب ایک سال گزر جائے تو پانچ درم نکال دے اور فقرا کا مذہب یہ ہے کہ جو کچھ مال و دولت ہو، سب خدا کی راہ میں لٹا دے۔ اس کے بعد جانِ عزیز شکرانہ میں پیش کرے۔ فقیر نے کہا کہ میں نے تو ائمۂ دین سے مذہب حاصل کیا ہے اس میں تو یہ نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میں مذہب صادق رب العالمین سے حاصل کیا ہے اس میں وہ نہیں ہے۔ دیکھو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس جو کچھ تھا حضور میں سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش کر دیا اور جگر گوشہ کو شکرانہ میں نذر کیا۔''

خیر سنو! برادرِ عزیز، انسان جب ایمان لایا تو دل کو اس نے بذل کیا۔ جب نماز ادا کی تو بدن کو بذل کیا، اور جب اس نے زکوۃ دی مال کو بذل کیا۔ یہ تینوں صفتیں دوست کی ہیں۔''

(مکتوبات صدی، اردو، مکتوب **34**)

''اے بھائی **الدنیا مزرعة الآخرة**۔ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ جہاں تک ممکن ہو آخرت کی کمائی میں مشغول ہونا چاہیے۔ اپنے ہاتھ، زبان، قلم اور کاغذ، اپنے نقد و جنس سے لوگ کے دلوں کو خوش کریں۔ راحت و آرام پہنچائیں۔ اس عمل کو ایک عظیم کام جانیں۔ دنیا کے عیوب اس کی آفتیں اتنی زیادہ ہیں کہ جلد کے جلد سیاہ کیے جائیں تو بھی اس کے دسویں حصہ کا دسواں حصہ بیان نہ ہو سکے لیکن اس کے ساتھ اس دنیا میں اس کا ایک ہنر بھی ہے کہ یہ مزرعۂ آخرت ہے یعنی آخرت کمانے کی جگہ ہے۔'' (مکتوبات دو صدی مکتوب **72**، بنام ملک مفرح)

حج — پانچواں رکن اسلام: مکان کی زیارت سے مکین کی زیارت کا بہانہ

''برادرم شمس الدین! تمھیں معلوم ہو کہ حج میں مالی اور بدنی دونوں عبادت کی شرکت ہے۔ حج کے متعلق گروہ صوفیہ کا حال کچھ نہ پوچھو۔ اس میں بڑے بڑے اسرار، عجیب عجیب معاملات ہیں۔ درحقیقت زیارت کعبہ معظّمہ زیارت خداوند جل وعلا ہے یعنی مکان کی زیارت سے مکین کی زیارت حاصل ہوتی ہے۔ اس عزت و توقیر کا منشا اس کا کرم عمیم ہے۔ حق تو یہ ہے کہ طالبانِ صادق کا مقصودِ حج، خانہ سے خداوند خانہ ہے۔ خانہ صرف درمیان میں بہانہ ہے۔''

’’اپنے سخن گہر بار میں حضرت سید مختار احمد علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا ہے: **حجۃ مبرورۃ خیر من الدنیا و ما فیھا**۔ حج پسندیدۂ بارگاہ بہتر ہے دنیا سے اور جو کچھ دنیا میں ہے۔ کیوں نہ ہو **حوالیہ من کل فج عمیق**۔اس کے گرداگرد ہر طرف کشادہ عمیق راہیں ہیں۔ دیکھو سفر حج میں انسان اہل و فرزند کی محبت دل سے نکال دیتا ہے اور ہمہ تن متوجہ الی اللہ ہو جاتا ہے... **حجۃ مبرورۃ خیر من الدین و ما فیھا** کہو کیسا چسپیدہ ہوا بلکہ **خیر من العقبیٰ**۔آخرت سے بھی اچھا کہا جائے تو زیبا ہے۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: **حجۃ مبرورۃ ما لھا جزاء الا الجنۃ**۔ پسندیدہ حج کی جزا سوائے جنت کے کچھ نہیں ہے۔‘‘ (مکتوبات صدی، اردو، مکتوب **35**)

حقیقی بندگی اور کامیاب زندگی

’’دیکھو قرآن شریف کس طرح گہر ریز ہے: **فاتبعونی یحببکم اللہ**۔ میری پیروی کرو اللہ تم کو دوست بنائے گا۔یعنی اپنے شہنشاہ کی فرماں برداری کا طوق گلے میں ڈالو، حلقۂ اطاعت کانوں میں یہیں لو، حکم سرکاری بجالاؤ، نواہی سے دور رہو، سراپا قصر ایماں کو طاعت کے گل دستوں سے سجالو، سنتوں سے واقفیت تامہ حاصل کرلو، اس پر ایسا عمل کرو جیسا عمل کرنے کا حق ہے پھر دیکھو گے کہ وہ عہد نامۂ دوستی جو لکھا گیا ہے اور خطبۂ عقد محبت جو پڑھا گیا ہے، بسند اتباع حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم یقینی نافذ ہو کر رہے گا۔ اور ضرور مکمل سمجھا جائے گا۔ جب یہ فرمان شاہی اور یہ وثیقہ سندی و سِرّی تمھارے پاس رہے گا تو یہاں بھی مزہ لوٹو گے عیش کرو گے پھر جس وقت حضرت محبوب حقیقی کے دربار میں حاضری ہوگی تو وہاں بھی مقعد صدق کے مقام میں خدائے بلند و برتر کے پاس ہو گے۔ ذرا سمجھنے کی بات ہے۔ مقعد صدق عہد پاک مقتدر کا دل چسپ گہوارہ، خوش نما چھپر کھٹ، کیا دوسرے مہمان عزیز کے لیے آراستہ ہوا ہے؟ نہیں صرف تمھارے لیے یعنی غلامان مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے۔‘‘ (مکتوبات صدی، اردو، مکتوب **27**)

(نوٹ: یہ مقالہ حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری انٹرنیشنل سیمینار
منعقدہ ۲۲۔۲۳۔۲۴ نومبر ۲۰۱۱ء، بہار شریف، بہار میں پڑھا گیا تھا۔)

○○○

ڈاکٹر سید شاہد علی

اخلاقیات قرآن اور نفس انسانی

اخلاقیات (Morality) کا مطلب ہوتا ہے علم الاخلاق یا کوئی مخصوص اخلاقی نظام یا ضابطہ(۱) (A particular system of Moral principles) اخلاقیات قرآن کا مطلب ہوتا ہے اخلاقی اصولوں کا قرآنی نظام(۲) (Quranic system of Moral Principles) یعنی ’’انسانی رویوں میں صحیح و غلط کے قرآنی اصول‘‘۔

انسان کے وجود کے مختلف پہلو ہیں۔ وہ سماجی، جذباتی، روحانی، عقلی، مادی، معاشی اور ایک مزہ لینے والا وجود رکھتا ہے۔ انسان ایک اخلاقی وجود بھی رکھتا ہے۔ انسانی وجود کا یہ پہلو سب سے اہم اور دیگر سب پہلوؤں پر غالب ہوتا ہے؛ کیوں کہ یہی فیصلہ کرتا ہے کہ سب کے لیے کیا صحیح ہے اور کیا غلط؟

انسان کی بناوٹ ایسی بنی ہی نہیں کہ وہ اکیلا رہ سکے۔ انسان انحصار کرتا ہے اپنے جیسے دوسرے انسانوں پر۔ اجتماع، یعنی مل کر رہنے کے لیے انسان کو کچھ اقدار یعنی انسانی رویوں میں صحیح و غلط کے معیار کو ماننا پڑتا ہے جس کا دوسرا نام اخلاق ہے۔

انسان کا ہر ایک کام خواہ شعوری ہو یا غیر شعوری، اس کے پیچھے صحیح و غلط کا ایک پیمانہ ہوتا ہے کہ یہ کام صحیح ہے اور یہ کام غلط، جو لوگ رویوں کی صحیح و غلط تقسیم کو نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ کچھ صحیح یا غلط نہیں ہوتا، ایک کام ایک جگہ صحیح ہوتا ہے وہی کام دوسری جگہ غلط بن جاتا ہے، وہ بھی مانتے ہیں کہ ان کی طرح سوچنا صحیح ہے اور دوسری طرح سوچنا غلط۔

دینا کی تاریخ میں کوئی ایک انسان بھی ایسا نہیں ملتا جس کی نظر میں صحیح و غلط، اچھائی و برائی کا کوئی تصور ہی نہ ہو، جو وفاداری و دھوکہ، قربانی و خود غرضی اور ہمدردی و حسد میں کوئی فرق ہی نہ کرتا ہو۔ یہ بات انسان کے اخلاقی وجود کو ثابت کرتی ہے۔ اخلاقی دجود سے ارادہ و اختیار کی آزادی ثابت ہوتی ہے اور آزادی سے سزا و جزا کا جواز ملتا ہے۔

اخلاق انسان کی زندگی کے اس اہم بنیادی سوال کا بھی جواب دیتا ہے کہ انسان کے لیے دنیا میں زندگی گزارنے کا صحیح رویہ کیا ہے؟

اسلامی تعلیمات کے مطابق حضرت آدم سے لے کر حضر محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک سبھی انبیا نے حسن اخلاق کی تعلیم دی۔ آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کا ایک اہم مقصد یہ بتایا: میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاق کی تکمیل کر دوں۔ (۳) قرآن بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اہم خوبی یہ بتاتا ہے کہ بے شک تم ایک اعلیٰ اخلاق پر ہو۔ (۴) اسلام میں دین کا دوسرا نام اخلاق ہے۔ حدیث میں دین کا لفظ اخلاق کے لیے استعمال ہوا ہے۔ (۵)

اخلاق کی دو قسمیں ہیں:

ایک وہ اخلاق جو خدا و آخرت کے تصور پر مبنی نہیں ہے۔

اور دوسرا وہ اخلاق جو خدا و آخرت کے تصور پر مبنی ہے۔

اس اخلاق میں جو خدا و آخرت کے تصور پر مبنی نہیں ہے، صحیح و غلط کا پیمانہ؛ فرض برائے فرض، کمال اور خوشی کو مانا گیا ہے۔ اس کا ماخذ، علم، تجربہ اور عقل کو سمجھا گیا ہے۔ اس کا محرک؛ ریاست یا حکومت سے بدلہ ملنے کی امید، سماج کا خوف یا محبت، کمال کی خواہش، خوشی کے لالچ و دکھ سے بچنا مانا گیا ہے۔ اس میں قوت نافذہ، خوشی، کمال، سماج اور ریاست (قانون) کو بتایا گیا ہے۔ لیکن ان سبھی باتوں پر آج تک کوئی اجماع نہیں ہو سکا ہے۔

اخلاقیات قرآن کا تعلق دوسری قسم کے اخلاق سے ہے، یعنی وہ اخلاق جو خدا اور آخرت کے تصور پر مبنی ہے۔ قرآنی اخلاقیات کا ماخذ؛ وجدان (۶) عقل (۷) اور وحی (۸) کو مانا گیا ہے۔ محرکات عمل انسانی، فائدہ حاصل کرنے اور نقصان سے بچنے کو مانتے ہوئے جنت و دوزخ کا تصور دیا گیا ہے۔ قرآنی اخلاقیات میں انسان کے برتر کمتر ہونے کا پیمانہ ''تقویٰ'' کو مانا گیا ہے۔ اس میں قوت نافذہ، خدا کے قانون اور ذاتی رضا و رغبت (ترہیب و ترغیب کے ذریعے) کو بتایا گیا ہے۔ قرآنی اخلاقیات کا مقصد ''رضائے الٰہی'' کو مانا گیا ہے۔ (۹)

انسان کے لیے ہمیشہ سے کچھ سوال بہت بنیادی اہمیت کے حامل رہے ہیں جیسے کائنات میں انسان کا مقام کیا ہے؟ ۵۰۰ ق م سے لے کر ۴۰۰ ق م کے دوران سقراط، افلاطون، ارسطو ۱۶۰۰ء سے سن ۲۰۰۰ء کے دوران بیکن، ہابس، ڈیکارٹ، ہیوم، نٹشے، شوپنہار، جیمز، ہربٹ اسپینسر، رسل اور کانٹ وغیرہ سبھی نے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

ان سب کے خیالات کو تین حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے: (۱) انسان کا مقام کائنات میں مشین کے ایک پرزے کی طرح ہے۔ اہمیت مشین کی ہوتی ہے نہ کہ پرزے کی۔ (۲) انسان اور کیڑے

سب یکساں ہیں۔ انسان کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ (۳) انسان و کائنات کا ایک مقصد ہے۔

دوسرا اہم سوال انسان کی بناوٹ کے بارے میں ہے کہ وہ اچھی ہے یا بری؟ اس سلسلے میں سبھی فلاسفہ و مفکرین کی آرا کو چار حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے: (۱) انسان کی بناوٹ بری ہے۔ (۲) انسان کی بناوٹ نہ اچھی ہے نہ بری، سفید کاغذ کی طرح ہے، جو چاہو لکھ دو۔ (۳) انسان کی بناوٹ میں اچھائی اور برائی دونوں ہیں۔ (۴) انسان کی بناوٹ اچھی ہے، برائی اس میں بالکل اسی طرح ہے جس طرح شیشے پر دھول جم جاتی ہے۔ (۱۰)

کچھ دوسرے بنیادی سوالوں میں سے یہ سوال بھی اہم ہے: کیا انسان کا کوئی خالق ہے؟ اگر ہے تو وہ کیا چاہتا ہے؟ زندگی کیوں ہے؟ مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ جبر و اختیار، خیر و شر، دنیا و آخرت میں سزا و جزا اور انسان کے لیے دنیا میں زندی گزارنے کا صحیح رویہ کیا ہے؟ ان سبھی سوالوں پر قرآنی اخلاقیات میں سیر حاصل بحث ملتی ہے۔ جیسے انسان کا ایک خالق ہے جس نے دنیا کو انسان کے لیے امتحان گاہ بنایا ہے۔ مرنے کے بعد ابدی زندگی ہے۔ انسان آزاد بھی ہے اور مجبور بھی۔ دنیا میں انسان کو ارادہ و اختیار کی آزادی حاصل ہے مگر نتائج کی نہیں۔ خیر خدا کی طرف سے ہے اور شر خود انسان کی طرف سے ہے۔ زندگی گزانے کے صحیح رویے کی تفصیلی تشریح قرآن میں بتادی گئی ہے۔

انسان کو خدا نے بنایا اور اس کی ایک فطرت (۱۱) بنائی۔ قرآن خدا کی طرف سے انسان کے لیے ہدایت پر مشتمل کتاب ہے۔ قرآنی تعلیمات انسان کی فطرت کی تشریح ہیں۔ دونوں میں مکمل ہم آہنگی ہے نہ کہ کوئی تضاد۔ اخلاقیات قرآن کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے قرآن کے نقطۂ نظر سے انسانی فطرت کو سمجھا جائے، کیوں کہ تبھی جانا جا سکے گا کہ قرآنی اخلاقیات فطری اخلاقیات ہے۔ (۱۲)

انسان مجموعہ ہے جسم اور نفس (روح) کا۔ (۱۳)۔ انسان کے اندر دماغ (فواد) اور دل (قلب) ہوتا ہے۔ (۱۴) کبھی دماغ دل کو متأثر کرتا ہے اور کبھی دل دماغ کو۔ دونوں ایک دوسرے کے احکامات کو مانتے ہیں۔ (۱۵) انسان کے اندر تین خاص طرح کے جذبات ہوتے ہیں (۱۶): نفرت و محبت، خوف و امید اور دکھ اور خوشی۔ اسی طرح انسان میں تین خاص طرح کی خواہشات ہوتی ہیں: کھانے کی خواہش، اقتدار کی خواہش اور جنسی تسکین کی خواہش۔ یہ سب جذبات و خواہشات اپنے آپ میں اچھے ہیں اگر افراط و تفریط کا شکار نہ ہوں۔

انسان کے اندر نفس ہے جسے روح یا ذات انسانی یا سانس کہا جا سکتا ہے۔ نفس کہاں ہے؟ لاشعور میں یا قویٰ میں، یا عضلات و اعصاب میں، کوئی نہیں جانتا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ نفس و

جسم کا تعلق ایسے ہی ہے جیسے دودھ میں مکھن یا پھول میں خوشبو۔

نفس کی تین مختلف حالتیں یا اوصاف یا انواع یا خصوصیات ہوسکتی ہیں: نفس امارہ (Seducing Soul)، (۱۷) نفس لوامہ (Self-accusing Soul) (۱۸) اور نفس مطمئنہ (Satisfied Soul)۔ (۱۹)

انسان کے اندر نفس امارہ ہے جو برائی پر ابھارتا ہے (۲۰) اور نفس لوامہ ہے جو برائی کرنے پر ملامت کرتا ہے اور اچھائی پر ابھارتا ہے۔ انسان کے ساتھ ایک فرشتہ اور ایک شیطان ہے۔ (۲۱) فرشتہ دوست ہے نفس لوامہ کا اور شیطان دوست ہے نفس امارہ کا۔ یہ بالکل ایسا ہی رشتہ ہے جیسا لوہے اور مقناطیس کا۔ باہر سے (دماغ کے اندر) شیطان اور فرشتے کے ذریعے برا اور اچھا خیال ڈالا جاتا ہے اور اندر سے امارہ ولوامہ کے ذریعے اس برے یا اچھے خیال کو رد یا قبول کیا جاتا ہے۔ کسی برے یا اچھے خیال کو رد یا قبول کرنا انسان کے اختیار وارادہ کی آزادی (Free Will) پر مبنی ہوتا ہے۔ (۲۲) جیسے ہی اچھا یا برا خیال دماغ میں ڈالا جاتا ہے، انسان اپنی آزادی کا استعمال کرتے ہوئے کسی ایک خیال کو چنتا ہے، تب امارہ یا لوامہ حرکت میں آتا ہے، اسے رد یا قبول کرتا ہے۔ جب انسان نفس امارہ کا کہنا مانتا ہے تو امارہ مضبوط ہوجاتا ہے اور نفس لوامہ کم زور ہوجاتا ہے۔ جب انسان نفس لوامہ کا کہنا مانتا ہے تو نفس لوامہ مضبوط ہوجاتا ہے اور نفس امارہ کم زور ہوجاتا ہے۔ انسانی قوت ارادہ یا اختیار کا کام ان میں سے کسی ایک کی بات مان کر اسے مضبوط بنانا اور دوسرے کو کم زور کرنا ہے۔ (۲۳)

انسان کے اندر نفس امارہ ونفس لوامہ کے بیچ چلتی اس کشمکش کے نتیجے میں دو کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں: ایک جب نفس امارہ طاقت ور اور نفس لوامہ کم زور ہوجاتا ہے۔ (دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ نفس امارہ، نفس لوامہ پر غالب آجاتا ہے۔) دوسرے جب نفس لوامہ طاقت ور اور نفس امارہ کم زور ہوجاتا ہے۔ (دوسرے لفظوں میں نفس لوامہ، نفس امارہ پر غالب آجاتا ہے۔)

پہلی حالت میں جب امارہ، لوامہ سے زیادہ طاقت ور ہوجاتا ہے، یا اس پر غالب آجاتا ہے، یہ پانچ ردعمل ہوتے ہیں:

۱۔ عقل جذبات وخواہشات کی غلام بن جاتی ہے۔ (۲۴)
۲۔ دل غافل یا مردہ ہوجاتا ہے۔ (۲۵)
۳۔ شیطانی دھوکے طاقت ور وبااثر بن جاتے ہیں۔ (۲۶)
۴۔ برائی میں کشش بڑھ جاتی ہے اور اچھائی کی کشش کم زور ہوجاتی ہے۔ (۲۷)
۵۔ اور برائی میں مزہ آنے لگتا ہے۔ (۲۸)

دوسری حالت میں جب لوامہ، امارہ سے زیادہ طاقت ور ہوجاتا ہے، یا اس پر غالب آجاتا ہے، یہ پانچ ردعمل ہوتے ہیں:

۱۔ جذبات وخواہشات غلام بن جاتی ہیں۔
۲۔ دل ہوشیار یا زندہ ہوجاتا ہے۔
۳۔ شیطانی دھوکے کم زور وبے اثر ہوجاتے ہیں۔
۴۔ اچھائی میں کشش بڑھ جاتی ہے
۵۔ اور اچھائی میں مزہ آنے لگتا ہے۔

نفس لوامہ وامارہ کے بیچ اس کشمکش کی مختلف کیفیتیں ہوسکتی ہیں؛ کبھی لوامہ، امارہ سے کم طاقت ور ہوتا ہے، یا زیادہ، یا بہت زیادہ، اسی طرح کبھی امارہ، لوامہ سے کم طاقت ور ہوتا ہے، یا زیادہ یا بہت زیادہ، ایسا بھی ممکن ہے کہ کبھی دونوں برابر ہوں۔ ایک کی کم زوری دوسرے کی طاقت اور ایک کی طاقت دوسرے کی کمزوری ہے۔ جس طرح ان کی کیفیت مختلف ہوتی ہے اسی طرح ان کے پانچ اثرات میں بھی کم، زیادہ، بہت زیادہ تبدیلی آتی رہتی ہے۔

انسان جب نفس لوامہ کا بار بار اور ہر بار کہنا مان کر اسے بہت زیادہ طاقت ور بنادیتا ہے اور نفس امارہ کا کہنا نہ مان کر اسے بہت زیادہ کم زور کردیتا ہے، تب لوامہ وامارہ کی یہ کشمکش رک جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں لوامہ، امارہ پر پورے طور پر غالب آجاتا ہے۔ تب نفس کی ایک تیسری کیفیت پیدا ہوتی ہے جسے قرآن نفس مطمئنہ (Satisfied Soul) کہتا ہے۔ (۲۹)

ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ نفس لوامہ (جسے میں انسان کے اندر کا Self-Corrective Mechanism بھی کہتا ہوں) کا کہنا مان کر انسان اسے اتنا زیادہ مضبوط بنادیتا ہے کہ وہ نفس مطمئنہ میں بدل جاتا ہے۔ یہی وہ کیفیت ہے جہاں نفس ''رضائے الٰہی'' کا مستحق بن جاتا ہے۔

قرآن انسانی بناوٹ کا مقدس (Holistic) تصور دیتا ہے۔ خدا نے انسان کی فطرت کو اچھا بنایا۔ (۳۰) انسان کو عزت دی۔ (۳۱) انسان کی بناوٹ میں اچھائی یا برائی کی سمجھ رکھی، اسے عقل دی اور وحی کے ذریعے اس کی رہ نمائی کا انتظام کیا۔ (۳۲) قرآن بتاتا ہے کہ انسان مجبور بھی ہے اور آزاد بھی۔ (۳۳) انسان کو ارادہ واختیار کی آزادی دی گئی ہے۔ (۳۴) جس کی وجہ سے وہ مکلف ہے اسے سزا وجزا ملتی ہے۔ قرآن انسان کے Unconcscious Mind کی بات کرتا ہے۔ (۳۵) جس میں اس دنیاوی امتحان کا صحیح جواب یعنی توحید ثبت ہے۔ اسی لیے قرآنی اخلاقیات انسان کے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہیں، صرف یاددہانی (Remindings) ہیں۔ یہ اندر سے باہر آتی ہیں نہ کہ باہر سے اندر۔ (۳۶)

حوالے اور حواشی

(۱) Oxford English -Urdu Dictionary، 1995، ص1039

(۲) فلسفہ کی تعریف ہے" موجودات واقعیہ کو بقدر بشری جاننے کی کوشش کرنا" (الکندی) ۔فلسفہ کی ایک شاخ ہے Ethics یعنی علم الاخلاق یا معیار اخلاق سے تعلق رکھنے والا علم ۔Ethics اور Morality میں فرق یہ ہے Ethics (انسانی زندگی میں) اچھے رویوں کے معیار سے بحث کرتا ہے (Standards of good behavior) جب کہ Morality اچھے رویوں کا علم یا باضابطہ علمی مطالعہ (Science of good behavior) ہے، نظری کے مقابلے یہ زیادہ عملی ہے۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی ضروری ہے کہ اخلاقیات قرآن Moral Theology, Ethical Theology اور Moral Philosophy سے الگ ہے۔ دراصل اسلامی اخلاق کا چار الگ الگ شعبوں کے تحت مطالعہ کیا جاتا ہے: قرآن وسنت، تصوف (اخلاق النفس)، ادب (حدیث میں اخلاق کے لیے ادب کا لفظ استعمال ہوا ہے) اور فلسفہ۔

(۳) مؤطا، مسند احمد،" الدین النصیحۃ" (بخاری ومسلم)

(۴) قرآن ۶۸:۴

(۵) حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے درمیان اخلاق کو اس طرح تقسیم فرمایا ہے جس طرح اس نے تمہارے رزق کو تمہارے درمیان تقسیم فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ دنیا کے اس شخص کو بھی دیتا ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے اور اسے بھی دیتا ہے جس سے وہ محبت نہیں کرتا ہے۔ لیکن دین (اخلاق) صرف اس کو عطا کرتا ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے۔ پس جس کو اللہ نے دین (اخلاق) دیا ہے اسے وہ محبوب رکھتا ہے" (مسند احمد)

(۶) وجدان (فطرت) انسان کے علم کا ماخذ ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ انسان میں اچھائی و برائی کی سمجھ رکھی گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ جاہل وغیر مذہبی ہونے کے باوجود اچھائی و برائی میں تمیز کرتے ہیں۔ دنیا کے اجتماعی ضمیر نے کبھی بھی بدی کو خیر نہیں کہا ہے۔ (قرآن 91:7-8، 90:8-10، 75:14-15)
قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ علم انسان کے اندر رکھا گیا ہے (قرآن 2:31) علم کے بارے میں قرآن اندر سے باہر کا نظریہ (Deductive Approach) رکھتا ہے۔ تعلیم اندر رکھے ہوئے علم کو باہر لانے کا طریق عمل ہے۔ (۷) عقل؛ غور وفکر، فہم وذکا، تخیل وتامل، قیاس واجتہاد اور استنباط واستخراج کی صلاحیتیں رکھتی ہے۔ عقل کے لیے قرآن میں فعل کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے یعنی استعمال کرنے کے لیے ہی ہوتی ہے۔ عقل کا استعمال نہ کرنے والوں کو قرآن جانور سے تشبیہ دیتا ہے۔ (قرآن 8:22)۔ مگر عقل اپنی صلاحیتوں کے باوجود محدود ہوتی ہے۔ وہ Time & Space کے باہر کام نہیں کرسکتی۔ عقل کا کام مختلف چیزوں کے

درمیان تعلق کی نوعیت کو دریافت کرنا اور اس کا تخمینہ لگانا ہوتا ہے۔ عقل اس وقت عاجز ہو جاتی ہے جب اخلاقی رد وقبولیت کا معاملہ پیش آتا ہے۔

(۸) انسان کی رہنمائی کرنے میں جہاں وجدان (فطرت) ناکام ہو جاتا ہے وہاں عقل مدد کرتی ہے۔ جہاں عقل ناکام ہو جاتی ہے وہاں وحی (اللہ کی ہدایت انسانوں کے لیے جو انبیا پر نازل ہوئی ہے) مدد کرتی ہے۔ اسی لیے جہاں عقل رکتی ہے وہیں سے وحی شروع ہوتی ہے جیسے عقل بتاتی ہے خالق ہے، مگر وہ چاہتا کیا ہے؟ یہ نہیں بتاسکتی، یہ وحی بتاتی ہے۔ عقل بتاتی ہے کہ اگر خالق ہے تو اس کی عبادت کرنی چاہیے، مگر کیسے؟ یہ بات وحی بتاتی ہے۔ عقل بتاتی ہے کہ مرنے کے بعد زندگی ہونی چاہیے، مگر کیسے؟ یہ بات وحی بتاتی ہے۔ اسی طرح انسان کا خود سے، مرد کا عورت سے، انسان کا کائنات سے، زندگی کا موت سے کیسا رشتہ ہو؟ یہاں عقل گڑبڑا جاتی ہے، اس لیے یہ بات وحی بتاتی ہے۔

(۹) قرآن (51:56) کے مطابق انسان، خدا کو معبود (آقا) مان کر خود، عبد (غلام) بن جاتا ہے، تب اس کی پوری زندگی عبادت (غلامی) کہلاتی ہے۔ فلسفہ میں انسان کو مقصود مانا گیا ہے، قرآن رضائے الٰہی کو مقصود بتاتا ہے۔

(۱۰) Will Deurant, The story of Philosophy

S.E.Frost , The basic teachings of great Philosophers

(۱۱) فَطَرَ یَفطُرُ کے معنی پیدا کرنے، شروع کرنے اور پھاڑنے کے ہیں۔ اسی سے فطرت بنا ہے جس میں خلقت، طبعی حالت، پیدائشی خصوصیات، دین، سنت، عادات اور فطرت کے مفاہیم شامل ہیں۔ (لسان العرب، ابن منظور الافریقی، دار صادر بیروت 1955ء ج5 ص56)

انسانی فطرت یعنی انسان کی بناوٹ خدا کے مقرر کیے نہ بدلنے والے قوانین پر چلتی ہے، خدا کا اٹل قانون جس طرح کائنات میں جاری ہے اسی طرح انسان کی بناوٹ میں بھی جاری ہے، اسے ہی فطرت کہا گیا ہے۔ سرسید احمد خاں نے بھی نیچر کو حائق موجودات یا اصول نظام کائنات کہا ہے۔ قرآن کہتا ہے: ''تم یکسو ہو کر اپنا رخ اس دین کی طرف رکھو، اللہ کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو بنایا ہے۔ اس کے بنائے ہوئے کو بدلنا نہیں، یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔'' (قرآن 30:30)۔ حضرت ابوہریرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ کوئی بچہ ایسا نہیں جو فطرت پر پیدا نہ ہوتا ہو، پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی یا عیسائی یا مجوسی بنا لیتے ہیں، جیسا کہ جانور کے پیٹ سے صحیح وسالم جانور پیدا ہوتا ہے۔ کیا ان میں سے کسی کو تم ناک، کان، کٹا پاتے ہو۔ (ان کے کان تو بعد میں لوگ اپنے جاہلانہ رسوم کی وجہ سے کاٹتے ہیں)۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد)

(۱۲) اخلاقیات دو طرح کی ہیں: فطری وسماجی۔ فطری اخلاقیات نہ بدلنے والی ہوتی ہیں اور سماجی

اخلاقیات بدلنے والی۔ جیسے بزرگوں کا ادب کرنا؛ یہ دنیا کے ہر ملک میں پایا جاتا ہے مگر ہر جگہ اس کے اظہار کے طریقے الگ الگ ہیں۔ ہندو پاک میں لڑکیاں سر ڈھک کر اس کا اظہار کرتی ہیں جب کہ امریکا و یورپ میں لڑکیاں ایسا نہیں کرتیں مگر وہ بھی ادب کرتی ہیں۔ فطری و سماجی اخلاقیات میں فرق اس طرح کیا جاتا سکتا ہے کہ فطری اخلاقیات وہی ہیں جن کو انسان اپنے لیے پسند کرتا ہے، جیسے ظالم بھی پسند نہیں کرتا کہ اس پر ظلم کیا جائے۔ غدار بھی پسند نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ غداری کی جائے۔ (جاوید غامدی، یوٹیوب)

(۱۳) اہل لغت نے نفس کے ۱۶/ معنی بیان کیے ہیں۔ ''ابوبکر بن الالباری کا قول ہے کہ روح اور نفس ایک ہی چیز ہے البتہ عربی زبان میں روح مذکر ہے اور نفس مؤنث، اس کے برعکس اردو زبان میں روح مؤنث اور نفس مذکر۔ لغراء کے نزدیک روح وہ چیز ہے جس پر انسانی زندگی کا انحصار ہے۔ اس کی حقیقت و ماہیت کے بارے میں اللہ نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ ابوالہیثم نے سانس (نفس) ہی کو روح قرار دیا۔'' (دائرۃ المعارف اسلامہ، مقالہ: الروح، ص ۴۲۳)

''قران مجید میں نفس کے معنی روح کے بھی ہیں اور پیام لانے والے فرشتے کے بھی۔ جمع کی صورت میں اکثر ذات اور شخصیت مراد ہے، خصوصا شخصیت داخلی۔ چھ آیات میں اس کی نسبت خدا کی ذات کی طرف ہے۔ قدیم عربی شاعری میں نفس بمعنی ذات یا شخص اور روح بمعنی سانس یا ہوا۔ مابعد قرآن کے ادب میں نفس اور روح بالعموم مترادف ہیں اور دونوں کا اطلاق روح، ملائکہ اور جنات پر کیا گیا ہے۔ نفس کی جمع انفس اور نفوس آتی ہے۔ بعض موقعوں پر قلب بمعنی روح بھی مفہوم میں شامل ہو جاتا ہے۔'' (دائرۃ المعارف اسلامیہ، مقالہ: علم النفس، ص: ۱۴۲)

قرآن میں نفس، اس کی جمع نفوس اور انفس کا مختلف صورتوں میں استعمال ہوا ہے: ذات انسانی یا شخصیت انسانی (۳:۲۵، ۱۶:۱۳، ۱۳۰:۶، ۲۱_۲۰:۵۱، ۱۲:۵۴، ۶۱:۳، ۱۶:۵۰، ۴۱_۴۰:۷۹)، نفس کا اشارہ اللہ کی طرف (۴۱:۲۰، ۱۲:۶، ۱۱۶:۵)، اللہ کے عذاب کی طرف (۳۰، ۲۸:۳)، جان و روح (۶:۹۳)، نفس سے مراد وحی و رسالت اور منشا و ارادۂ الٰہی (۴۱:۲۰)۔ (دائرۃ المعارف الاسلامیہ، مقالہ: النفس، ص: ۴۲۱، ۴۲۲)

بعض علما روح کو نفس سے الگ مانتے ہیں۔ قرآن میں روح کے بارے میں کہا گیا ہے کہ انسان اسے سمجھ نہیں سکتا۔ (قرآن 17:85/ 38:72/ 15:29)

(۱۴) فواد اور قلب دونوں کا مطلب دماغ بھی ہو سکتا ہے اور دل بھی۔ قرآن میں اس بات کی گنجائش موجود ہے کہ دل و دماغ دونوں کو الگ بھی مانا جا سکتا ہے اور ایک بھی، یعنی ایک کے اندر دو حصے بھی ہو سکتے ہیں۔ (الگ الگ رہتے ہوئے ایک دوسرے کو متأثر کرتے ہیں یا ایک کے اندر کے دو حصے جو ایک دوسرے کو متأثر کرتے ہیں۔) دونوں میں سے کسی ایک بات کو ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ قرآن کا فوکس عملی چیز پر

ہوتا ہے، اس لیے وہ نظریاتی بحثوں میں نہیں الجھتا۔ میں نے قرآن میں جب دل سے متعلق آیات کو گنا تو ان کی تعداد ۱۴۰ پائی۔ قرآن میں دل کی کئی قسمیں بیان کی گئی ہیں:

سخت دل: (6:42/ 3:159/ 2:74/ 5:13/ 39:22/ 22:53_54)، بیمار دل: (8:49/ 9:124_125/ 5:52/ 2:10/ 24:47/ 33:10_12/ 47:29_30)، زندہ دل (89_26:88)، نرم دل: (11:75/ 39:33/ 57:27)، ہوشیار دل: (37:83_84)، مرعوب دل: (59:2) غافل دل: (18:28/ 21:2-3)، مطمئن دل: (13:27/ 8: 10/ 2: 260/ 3:126/ 5:112-13)، گنہگار دل: (2:283)، ٹیڑھے دل: (3:7/ 61:5)، جمے ہوئے مضبوط دل: (8:14-11/ 11:120/ 25:32)، شک کا شکار دل: (9:45)، اندھے دل: (45:46)، مردہ دل: 40:35/ 47:16)

(۱۵) صدیوں سے انسان سمجھتا آ رہا ہے کہ عقل کا مرکز دماغ ہے اور جذبات کا دل، جسے فلسفہ و سائنس میں Dualism کہا گیا ہے۔ کچھ عرصے سے سائنس کہتا رہا ہے کہ عقل و جذبات دونوں کا تعلق Mind سے ہے اسے Moanism کہا گیا۔ مگر پھر سائنس میں دونوں کو الگ الگ مانا جانا شروع ہو گیا ہے۔

علم نفسیات میں اب اس بات کو مانا جا رہا ہے کہ دل کا دماغ سے رابطہ ہوتا ہے اور وہ اسے متأثر بھی کرتا ہے۔ دل کی اپنی Logic ہوتی ہے جس سے مطمئن نہ ہونے کے باوجود اکثر دماغ اسے مانتا ہے (جسے Head -heart conflict کہتے ہیں)

Lacey J.I. & Lacey B.C. (1978), Two way communacation between the heart & the brain, Significance of time within the Cardiac Cycle, American Psychologist , February , PP 99-113

"The heart communicates with the brain and the rest of the body in four ways: Neurologically (through transmissions of nerve impulses), Biochemiclly (through hormones & neuro transmitters), Biophysically (through pressure waves), and Energeticallly, (through electromagnetic field interactions)." (Mc Craty, R. (2002). Influence of Cardiac Afferent input on Heart-brain Synchronization and Cognitive performance, International Journal Psycho-Physiology, 45(1-2), PP.72-73

(۱۶) عقل اور جذبات میں فرق یہ ہے کہ عقل مختلف چیزوں کا تجزیہ کر کے نتیجہ بتا دیتی ہے۔ کسی کام کو کرنے یا

نہ کرنے کا کام جذبات کا ہے۔ یہ جذبات ہی ہیں جو اچھے یا برے راستے پر چلاتے ہیں۔ پہلے عقل، صحیح وغلط دونوں راستے دکھا دیتی ہے پھر انسان اپنی آزادی کی وجہ سے کوئی ایک راستہ چلتا ہے اور پھر جذبات اس پر چلاتے ہیں، گویا جذبات ایک انرجی یا Driving Force کا کام کرتے ہیں۔

(۱۷) قرآن 12:53

(۱۸) قرآن 2۔75:1

(۱۹) قرآن 30۔89:27

(۲۰) نفس امارہ منفی صفات کا حامل ہے؛ جیسے نفاق، کبر، خواہش، انا، لالچ، غفلت، بے چینی، ریا وغیرہ۔ ناجائز غصہ اور ناجائز جنسی بھوک کا تعلق بھی اسی سے ہے۔

(۲۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے ہر شخص کے ساتھ ایک شیطان اور ایک فرشتہ ہے۔ صحابہ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا آپ کے ساتھ بھی؟ آپ نے فرمایا: میرے ساتھ بھی، لیکن میرے رب نے میری اس کے خلاف مدد کی اور وہ مسلم (مطیع) ہو گیا۔ (صحیح مسلم)

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شیطان بھی انسان سے تعلق رکھتے ہیں اور فرشتے بھی۔ شیطان کا کام برائی کی طرف لے جانا اور حق کو جھٹلانا ہے جب کہ فرشتے کا کام اچھائی کی طرف بلانا اور حق کو منوانا ہے۔ پس جس شخص کو یہ (اچھی) بات معلوم ہو، تو اسے اللہ کی رحمت سمجھے اور اس پر اس کی حمد کرے اور جس کو اس کے خلاف (برائی) ملے، تو وہ شیطان سے اللہ کی پناہ مانگے۔ (ترمذی، نسائی)

مگر یاد رہے کہ قرآن میں جن اور انسان دونوں کے لیے شیطان کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ (قرآن 6۔114:1)

شیطان کا لفظ ''شطن'' سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ''دوری''؛ کیوں کہ شیطان خود رحمت الٰہی سے دور ہے اور انسانوں کو بھی اس سے دور کرنا چاہتا ہے۔ کچھ دوسرے علما کے نزدیک لفظ شیطان ''شیط'' سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ''جلنا''؛ کیوں کہ شیطان خود آگ سے بنا ہے اور غرور اور غصہ کی آگ میں جلتا رہتا ہے۔ شیطان پر تفصیلی بحث کے لیے میری کتاب ''شیطان اور انسان: اسلام کے پس منظر میں'' (ہندی/اردو) دیکھئے۔

(۲۲) انسان کو اختیار و عمل کی آزادی ملی ہے، اسی لیے اس نے سزا و جزا کی ذمہ داری قبول کی۔ (قرآن 33:72)

(۲۳) امام غزالی کے بقول نفس کے دو پہلو (Dimension) ہیں: Upward Dimension اور Downward Demenasion یعنی نفس لوامہ و نفس امارہ۔ انسان جب نفس امارہ کا بار بار کہنا مانتا ہے تو وہ اپنی خواہشات کا ہی غلام بن جاتا ہے جسے قرآن اس طرح کہتا ہے کہ انسان نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنالیا۔ (قرآن 25:43) قرآن اس شخص کا بھی ذکر کرتا ہے جو امارہ کا کہنا مان کر نیچے سے نیچے گر گیا۔ (قرآن 176۔7:175)

(۲۴) جب انسان بار بار نفس امارہ کا کہنا مانتا رہتا ہے تو ایسی صورت میں عقل؛ خواہشات وجذبات کا غلام بن کر ان کی خدمت کرتی ہے، وہ ان کی تسکین کے جائز و ناجائز راستے بتاتی ہے اور انسان کا Cognitive Process مفلوج ہو جاتا ہے اور اس کی بصیرت (Insight) پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ (القرآن 59۔58: 83:13۔14/7:179/45:23/4:155/31)

(۲۵) (قرآن: 3-21:2/ 18:28/ 47:16/ 40:35/ 45:46)

(۲۶) شیطان انسان کے اندر یعنی اس کی سوچ اور تخیل میں اس کو بہکاتا ہے۔ وہ زبردستی انسان سے کوئی برا کام نہیں کرواتا۔ وہ صرف برائی اور گناہ کو اچھا بنا کر اور بڑھا کر پیش کرتا ہے اور اچھائی اور نیکی کو برا بنا کر اور گھٹا کر دکھاتا ہے۔ (قرآن: 8:48/35:8/41:25/15:39-40/114:1-6/41:36/14:22)

(۲۷) حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''دوزخ کی آگ نفسانی مرغوبات (شھوات) سے ڈھانکی گئی ہے اور جنت ان چیزوں سے ڈھانکی گئی ہے جو نفس کو ناگوار (مکارہ یعنی مشقتوں اور تکلیفوں سے گھری) ہوتی ہیں۔'' (بخاری ومسلم)

مسلم کی روایت میں حُجِبَتْ کی بجائے حُفَّتْ آیا ہے یعنی جنت کو ان چیزوں سے گھیر رکھا ہے جو نفس کو ناگوار ہوتی ہیں اور دوزخ کو ایسی چیزوں سے گھیر رکھا ہے جو نفس کو مرغوب اور پسند ہوتی ہیں۔ دراصل خواہشات نفس کے پیچھے پڑ کر انسان حق و باطل کی تمیز کھو بیٹھتا ہے۔'' (محمد فاروق خاں، کلام نبوت، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی۔ ج ۲ ص ۲۶۶)

۲۸۔ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ایمان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: جب تمہیں اپنے اچھے کام سے خوشی اور اپنے برے کام سے تکلیف اور افسوس ہو تو تم مؤمن ہو۔ اس نے عرض کی: گناہ کیا چیز ہے؟ فرمایا: جب تیرے دل میں کوئی چیز تردد پیدا کردے اور مشتبہ معلوم ہو تو اسے چھوڑ دے۔'' (مسند احمد)۔ اس حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ ایک کیفیت ایسی ہوتی ہے جس سے اچھے کام کرنے میں مزہ اور برے کام کرنے میں تکلیف ہوتی ہو، اسی طرح دوسری کیفیت ہو تو برے کام کرنے میں مزہ اور اچھے کام کرنے میں تکلیف ہوتی ہے۔

(۲۹) نفس مطمئنہ کو اس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ انسان کے اندر جو روح (نفس) ہے وہ Divine Spark ہے کہ خدا نے فرشتوں سے خود کہا تھا: جب میں اس کو مکمل کرلوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک لوں تو تم اس کے لیے سجدے میں گر پڑنا۔ (قرآن 15:29) ''یہی وہ نور یزدانی ہے جس کا تحقق اگر ہو جائے تو انسان کمال کا وہ درجہ پائے گا جو اس کی فطرت میں مضمر ہے۔'' (امین احسن اصلاحی، فلسفے کے بنیادی مسائل قرآن کی روشنی میں، فاران فاؤنڈیشن، لاہور، 1991ء، ص: 122)

(۳۰)خلقنا الانسان فی احسن تقویم (القران)

(۳۱) قرآن17:70

(۳۲)قرآن8-91:7/39-2:38

(۳۳)(قرآن 7،17:15) قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے ایمان نہ لائے (یعنی انسان آزاد ہے۔) اللہ جس کو چاہے ہدایت دے اور جس کو چاہے گم راہ کرے۔(یعنی انسان مجبور ہے۔) جو ہماری طرف رجوع کرے اسے ہم ہدایت دیتے ہیں۔(گویا خدا کا انسان کے لیے قانون ہدایت یہ ہے کہ پہلے انسان طلب کرے پھر خدا اسے عطا کرے گا۔)

(۳۴)انسان کو صرف نیت اور کوشش کی آزادی ہے، نتیجے کی آزادی حاصل نہیں ہے، نتیجے کو خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے، یعنی وہ مشیت الٰہی کے تابع ہے۔ یہ اختیار و عمل کی آزادی ہی ہے جس کی وجہ سے انسان پہلے اپنی فطرت بگاڑتا ہے، پھر کہتا ہے کہ یہ فطری ہے۔انسان کے برعکس جانوروں کی جبلت ہوتی ہے جسے وہ بدل نہیں سکتے۔

(۳۵) قرآن: 7:172

(۳۶) قرآن 23:84-89

○○○

ایک عبرت آموز ایمانی سفر

جانکی پرساد پرجاپتی ابن لکشمن پرساد پرجاپتی ۱۹۷۶ء میں نئ گڑھی ، ضلع ریوا مدھیہ پردیش کے ایک پس ماندہ کمہار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ باشعور ہونے کے بعد ہی سے اپنے والد کے ساتھ کبھی کبھی مزدوری شروع کردی۔ جب ۲۳ سال کی عمر ہوئی تو والد نے آپ کی شادی کردی۔ ۲۵ سال کی عمر میں آپ نے کسی طرح ہائی اسکول پاس کیا۔ ۲۰۰۲ء میں مئوگنج ، ضلع ریوا کے رہنے والے مٹھو بابا اور فاروق بابا سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ ان دونوں بزرگوں سے ملاقات ہی جانکی کے لیے اسلام کی طرف آنے کا سبب بنی اور پھر جلد ہی جانکی خانقاہ عالیہ عارفیہ، سید سراواں ، الہ آباد کے صاحب سجادہ حضرت داعی اسلام مد ظلہ العالی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ داعی اسلام مدظلہ العالی سے ملاقات کے بعد آپ کے دل کی دنیا ہی بدل گئی ۔ پھر آپ خوشی خوشی بلا کسی اکراہ کے کامل طور سے اسلام میں داخل ہو گئے ۔موصوف اللہ و رسول کی اطاعت، اپنے شیخ کی غلامی اور اپنے والدین کی خدمت کو اپنے لیے دارین کی کامیابی تصور کرتے ہیں ۔ ہر ماہ عربی کی ۲۱ تاریخ کو خانقاہ عارفیہ میں ایک دینی و روحانی محفل منعقد ہوتی ہے۔ جانکی پابندی سے اس میں حاضر ہوتے ہیں اور خانقاہ عارفیہ اور جامعہ عارفیہ کی صفائی ستھرائی کو اپنی سعادت مندی سمجھتے ہیں ۔نئ گڑھی میں ایک چھوٹی سی دکان ہے، جس سے رزق حلال حاصل کرتے ہیں اور بیوی ، بچوں اور والدین کی ضرورتوں کا سامان کرتے ہیں ۔آپ متوسط قد، سیاہ رنگ اور نہایت کم گو شخص ہیں۔ سنجیدگی و متانت اور عمدہ اخلاق آپ کی فطرت ہے۔صبر و شکر آپ کا وظیفۂ حیات ہے۔ شیخ نے آپ کا نام جان محمد عرف جانکی رکھا ہے۔کفر سے اسلام تک کے ان کے ایمانی سفر اور دین اسلام پر استقامت کی کہانی میں ہم جیسے خاندانی مسلمانوں کے علاوہ تمام انسانیت کے لیے خیر و صلاح اور فلاح و کامرانی کا پیغام ہے۔(ادارہ)

....

میں جانکی پرساد پرجاپتی، پتا کا نام لکشمن پرساد پرجاپتی، نئ گڑھی، ضلع ریوا (ایم پی) میں ۱۹۷۶ء میں پیدا ہوا۔ میرے پتا کمہار کا کام کرتے اور گھر والوں کی پرورش کرتے تھے۔ کبھی کبھی دوسرا کام بھی کرتے۔ میں بھی ان کے ساتھ کبھی مزدوری کرتا اور کبھی اسکول جاتا۔ اسی طرح زندگی گزرتی رہی، میری شادی بھی ہوگئی اور میں نے کسی طرح ہائی اسکول بھی کرلیا۔

آج سے تقریباً گیارہ سال پہلے کی بات ہے کہ عاشق علی جس کا پرانا نام اشوک کمار تھا، ان کے ذریعے مئوگنج کے رہنے والے مٹھو بابا جو نئ گڑھی آیا کرتے تھے اور فاروق بابا سے نئ گڑھی ہی میں میری ملاقات ہوئی۔ یہ لوگ مالک (داعی اسلام شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی مدظلہ العالی) کا ذکر کرتے رہے، میں غور سے سنتا رہا، خوب اچھا لگا اور دل میں مالک سے ملاقات کا شوق پیدا ہوا۔ کچھ دنوں بعد ریوا سے مٹھو بابا کے ساتھ سائیکل سے خانقاہ، سید سراواں کے لیے میں بھی چلا۔ فجر کی نماز پڑھ کر ہم چلے تھے اور تقریباً ۹ / یا ۱۰ / بجے خانقاہ پہنچ گئے۔ یہاں آنے کے بعد مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ جس طرح دل میں شوق تھا اسی طرح پایا۔ مالک سے ملاقات ہوئی۔ ان کو نماز پڑھتے دیکھا۔ ان کے ساتھ ہم نے بھی نماز ادا کی۔ نماز میں ہم کو بہت لذت ملی۔ زندگی میں پہلی بار ہم کو اتنا سکون ملا۔

نماز تو میں مٹھو بابا سے ملاقات کے وقت سے ہی پڑھنے لگا تھا۔ مٹھو بابا اور فاروق بابا مالک کا ذکر کرتے رہے۔ جب نماز کا وقت آیا تو وہ لوگ نماز کی تیاری بنانے لگے۔ ہم نے پانی دیا اور چٹائی بچھائی اور ان لوگوں کو مالک کی پوجا کرتے ہوئے دیکھ کر شوق ہوا اور ہم بھی ان کے ساتھ نماز میں کھڑے ہوگئے۔ بہت اچھا لگا۔ اس دن میں بہت خوش تھا۔ خوشی خوشی گھر گیا اور ماتا پتا سے بتایا کہ آج میں نے نماز پڑھی ہے۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ مجھ کو نماز میں بہت آنند آیا۔ گھر کے لوگ بھی خوش ہوئے۔ کسی نے کچھ نہ کہا اور نہ مٹھو بابا نے ہم کو نماز پڑھنے کے لیے کہا تھا اور نہ سید سراواں خانقاہ شریف میں کسی نے مجھ کو نماز کا حکم دیا۔ بس دل میں شوق ہوا اور ہم نماز میں کھڑے ہوگئے۔

یہاں آنے سے پہلے میں ماں درگا اور ہنومان جی کی پوجا کرتا تھا اور سوچتا تھا کہ کہیں اچھی جگہ لگ جاؤں۔ ۶ مہینے پوجا کیا تھا کہ مٹھو بابا سے ملاقات ہوگئی اور اللہ نے اپنے فضل سے ہم کو اپنے سچے دین کی طرف بلالیا۔ میں یہاں بہت خوش تھا۔ جب یہاں سے واپس ہوا تو نماز اب پانچوں وقت پڑھنے لگا۔ پہلے یہ حال تھا کہ کبھی ایک وقت، کبھی دو وقت اور کبھی تین وقت ہی پڑھتا تھا، مگر اب پانچوں وقت نماز پڑھتا ہوں۔ نماز کے بغیر راحت نہیں ہوتی ہے۔

اب ہر مہینے خانقاہ شریف میں جو پروگرام ہوتا ہے، اس میں پابندی کے ساتھ آنے لگا۔ دوتین بار آیا تو محسوس ہوا کہ یہاں سب لوگ پڑھے لکھے ہیں، میں کیا خدمت کروں اور کیا کرسکتا ہوں۔ دل میں آیا کہ میں جاہل آدمی ہوں، یہاں کا باتھ روم وغیرہ ہی صاف کروں۔ پھر میں اس کام میں لگ گیا۔ میں ہر ماہ خانقاہ پابندی سے آنے لگا اور یہ کام کرتا رہا، اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ اب تو جتنا صاف کرتا ہوں اتنا ہی زیادہ صاف کرنے کا دل کرتا ہے، جی ہی نہیں بھرتا۔ اب کوئی میرے ساتھ آئے یا نہ آئے، ہر مہینے میں وقت پر حاضر ہوجاتا ہوں، راستے میں چاک گھاٹ میں رات گزارتا ہوں، اور دوسرے دن خانقاہ پہنچ جاتا ہوں۔ نئ گڑھی میں لوگ مجھ کو حافظ جی اور راستے میں لوگ مولوی صاحب کہتے ہیں۔

مٹھو بابا سے ملاقات کے بعد میں نے مزدوری چھوڑ دی اور بساطی کا کام شروع کردیا۔ کھلونا وغیرہ بیچنے لگا۔ مٹھو بابا کی بیٹی بساط خانہ چلاتی تھی۔ انھوں نے ہی مجھے سمجھایا اور کہا کہ یہ کام شروع کردو۔ انھوں نے ہی کچھ مال خریدوایا اور پھر میں نے نئ گڑھی میں ایک جگہ دوکان لگائی۔ شروع میں جب لوگ سامان خریدنے آتے تو میں سامان کا دام دیکھنے لگتا تھا، لوگ کہتے کہ یہ سامان بیچتا ہے یا لسٹ دیکھتا ہے، اس طرح شروع میں نقصان بھی ہوا، کچھ سامان جتنی قیمت میں خریدا تھا اتنی ہی قیمت میں بیچ دیا اور کچھ سامان کا پتہ بھی نہ چلا۔ یہ حال سن کر مٹھو بابا کی لڑکی نے ایک لڑکے کو میری دوکان پر لگادیا، پھر دھیرے دھیرے میں بھی جان گیا۔ اب نفع کے ساتھ سامان بیچنے لگا اور میلہ وغیرہ میں بھی جانے لگا۔ اس سے کچھ فائدہ ہوا، مگر میلہ میں جانے سے نماز میں دقت آتی تھی۔ کبھی کبھی بے وقت نماز پڑھنی پڑتی تھی۔ جس سے تکلیف ہوئی، کبھی ایسا لگتا کہ میری نماز خراب ہوگئی۔ میں نے سوچا کہ اب میلہ میں دوکان نہ لگاؤں گا، چاہے ایک وقت ہی روٹی کھاؤں، مگر دوکان ایک جگہ ہی رکھوں گا۔ پھر نئ گڑھی میں ایک جگہ دوکان لگانا شروع کیا، مگر رزق پہلے سے کم ہوگیا۔ میں نے سوچا مولیٰ! تو نے چار کو میرے پیچھے لگایا ہے اور تو رزق نہ دے گا تو کیسے ہوگا؟ میں نے مالک کو یاد کیا اور کھانا پینا چھوڑ دیا۔

تین دن بھوکے رہا، تیسرے دن سامان کا بکسا اٹھا رہا تھا تو ایسا لگا کہ میں گر جاؤں گا۔ ایک جگہ بیٹھ گیا، ایک سموسہ منگوایا اور کھالیا مگر کمزوری بڑھتی گئی، پھر میں نے اپنے مالک کو یاد کیا اور کھانا کھانے لگا۔ اسی زمانے میں میرے مالک (داعی اسلام مدظلہ العالی) نے مجھ کو کچھ روپیہ دیا اور کہا کہ بیٹا! اسے اپنی دوکان میں لگالینا۔ میں نے اس روپے سے کچھ سامان خرید کر دوکان میں رکھ دیا۔ مالک کا کرم ہوا، اس کے بعد میرے رزق میں برکت ہوتی گئی اور آج تک کوئی دقت نہ آئی۔ کبھی میں نے کوئی حساب نہیں لگایا کہ کتنا نفع ہوا، لیکن اللہ تعالیٰ اب دونوں وقت بھی کھلاتا ہے

اور پانچوں وقت نماز بھی ادا کراتا ہے۔ دوکان ہی میں نماز کے لیے ایک جگہ بنالی ہے۔ وضو کی جگہ بھی ہے، پردہ لگا دیا ہے، جب نماز کا وقت آتا ہے تو پردہ کھینچ لیتا ہوں اور نماز ادا کر لیتا ہوں۔

اس وقت میرے گھر میں ماتا، پتا کے علاوہ میری بیوی اور ایک چھ سال کی بیٹی ہے اور سب لوگ خوش ہیں۔ ماتا، پتا کو اسلام کی دعوت دی تھی، ماتا جی کا کہنا ہے تم جس طرح کہو گے، میں کروں گی۔ پتا جی کہتے ہیں کہ میں نماز کیسے پڑھ پاؤں گا۔ مجھ کو چھوڑ دو، میں جیسے ہوں، رہنے دو۔ ایک بار مالک کا حکم ہوا تھا، تو بیوی کو خانقاہ لایا تھا، تب سے وہ نماز پڑھنے لگی ہے، مگر کبھی کبھی سستی بھی کرتی ہے۔ بیٹی ابھی چھ سال کی ہوئی ہے، مالک کا حکم ہوا تھا کہ اس کو پڑھاؤ، خرچ کی ضرورت ہو تو مجھ کو بتانا، اسکول میں نام لکھوا دیا ہے، اس کے بعد مدرسے میں اس کا نام لکھوا دوں گا۔

اسلام قبول کرنے کے بعد میرے گھر اور خاندان والوں کی طرف سے کوئی دقت نہ آئی۔ پہلے سے زیادہ اب ہم کو لوگ چاہتے ہیں۔ ہاں! نئی گڑھی میں جہاں میں دوکان لگاتا ہوں، میرے گھر سے تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر دور ہے۔ وہاں کے لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ یہ نماز پڑھتا ہے تو وہاں کے کچھ پنڈتوں نے مجھے تکلیف دی۔ میں صبر کرتا رہا۔ ایک بار ایک پنڈت نے مجھ کو خوب گالی دی۔ مارکیٹ کے لوگ بھی جمع ہو گئے۔ اس نے کہا کہ اگر تم نے اسلام دھرم نہ چھوڑا تو میں تمہاری دوکان اکھاڑ دوں گا اور بہت بری بری گالی دی۔ مجھ کو بہت تکلیف ہوئی، صبر کیا اور اپنے مالک کو یاد کیا۔ دوتین دن کے بعد سننے میں آیا کہ وہ سرکاری نوکری میں تھا، وہاں سے سسپنڈ کر دیا گیا ہے۔ کچھ دنوں بعد دیکھا کہ وہ پاگل سا ہو گیا، تقریباً چھ مہینے اسی طرح رہا۔ پھر اس کی طبیعت ٹھیک ہوئی اور بہت دوڑ دھوپ کرنے کے بعد پھر سے بحالی بھی ہو گئی۔ اس کے بعد اچھی طرح رہنے لگا۔ یہ دیکھ کر اللہ پر اور اپنے مالک پر اور یقین بڑھا اور یہ یقین ہوا کہ اللہ ہے جو سب کی سنتا ہے، سب کو پالتا ہے اور سب پر رحم کرتا ہے۔ وہی ساری کائنات کا رچیتا اور پالنہار ہے۔

اسی طرح ایک بار کچھ لوگوں کے کہنے پر نئی گڑھی کے سی، ایم، او صاحب نے بھی پریشان کیا اور ایک دن دوکان پر آئے۔ دوکان ہٹانے کی دھمکی دی اور برا بھلا کہا۔ اس بار بھی میں نے صبر کیا اور مالک کو یاد کیا۔ دوتین دن کے بعد سی، ایم، او صاحب بھی سسپنڈ ہو گئے۔ یہ بھی اپنے آپ میں پریشان رہنے لگے۔ تقریباً سات یا آٹھ مہینوں کے بعد پھر سے ان کی بھی بحالی ہو گئی اور بحالی کے دو ہی چار روز کے بعد ان کا ٹرانسفر بھی ہو گیا۔ اس بار بھی میرے ایمان میں اور مضبوطی آئی اور اللہ کا شکر ادا کیا۔

میری دوکان کے پاس ہی ایک پاگل عورت رہتی تھی۔ لوگ اس کو گالی دیتے اور اس کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آتے۔ مجھ کو تکلیف ہوئی۔ سوچا عورت ذات ہے، اگر اچھی رہتی تو اپنے

گھر دوار رہتی، اپنے بچوں کے ساتھ عزت سے زندگی بسر کرتی۔ ایک دن صبح کے وقت یہی سوچ رہا تھا کہ وہ عورت میرے دوکان پر آئی اور مجھ سے کچھ کھانے کو مانگا۔ رات کی بچی ہوئی روٹی تھی، میں نے مالک کو یاد کر کے اس کو دے دیا، اس دن سے دھیرے دھیرے وہ عورت ٹھیک ہونے لگی۔ جب ٹھیک ہو گئی تو اس نے اپنے بچوں اور گھر کے بارے میں بتایا اور دوتین دن مزدوری کی۔ مزدوری سے جو روپیہ ہوا، اس کو لے کر اپنے گھر چلی گئی۔ اس سے بھی میرا ایمان اور پختہ ہوا۔ میرا یقین اللہ پر بڑھتا گیا کہ اللہ سب کی سنتا ہے، وہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔

مالک کا کرم ہے کہ اب کوئی پریشانی نہیں ہے۔ مارکیٹ میں سب لوگ اب حافظ جی کہتے ہیں۔ سب عزت کرتے ہیں۔ ہماری باتوں کو غور سے سنتے ہیں۔ دعا کروانے کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔ جب کوئی دعا کے لیے کہتا ہے تو سوچتا ہوں کہ لوگ ہمارے لباس کی وجہ سے دھوکا کھاتے ہیں اے اللہ! میرے پیر کے صدقے ان کے گمان کے مطابق بنا دے اور ان کی مراد پوری کر دے۔ اللہ بہت کریم ہے۔ وہ سب کی سنتا ہے اور اپنے گناہ گار بندوں کی بھی عزت رکھتا ہے۔ مالک کا کرم ہی ہے کہ اس جاہل آدمی کو لوگ حافظ جی اور مولوی صاحب کہہ کر بلاتے ہیں اور اپنے مالک و خالق کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ جب کوئی اللہ کے بارے میں سوال کرتا ہے تو میں اپنے پیر کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور ان کی نقل کرتا ہوں اور ان سے سنی ہوئی بات بتانے لگتا ہوں۔ لوگوں کو اچھا لگتا ہے۔ مجھ کو نہیں معلوم کہ میں کیا کیا کہتا ہوں۔ سب مالک کا کمال ہے، میرا کوئی کمال نہیں، میں تو لاؤڈ اسپیکر کے ڈبہ کی طرح ہوں، اصل کمال اسپیکر کا ہے، نہ کہ لاؤڈ اسپیکر کا۔

خانقاہ میں سب جانکی بھائی کہتے ہیں۔ جب کوئی بھائی کہتا ہے تو بہت اچھا لگتا ہے۔ یہاں سب لوگ فرشتے کی طرح لگتے ہیں۔ مالک کا دیدار کر لیتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سر سے پاؤں تک نور بھر گیا۔ ایک مہینے تک پورا سکون رہتا ہے۔ مالک کا دیدار ہی ہمارے لیے کافی ہے۔ دیدار ہی میں ہمارے لیے سب کچھ ہے۔ دیدار ہی سے ہمارے سارے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ مالک کا ہر لفظ اچھا لگتا ہے۔ مالک کی کس بات کو میں کہوں کہ اچھی ہے، مالک کی زبان پاک سے جو بھی نکلتا ہے وہ سب اچھا ہی ہے۔ یہ نہیں بولتے ہیں مگر اللہ کی مرضی سے۔ ان کا ہر کام اللہ کے لیے ہوتا ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے کہ جب بندہ قریب ہو جاتا ہے تو میں اس کی زبان ہو جاتا ہوں، جس سے وہ بولتا ہے، میں اس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں، جس سے وہ پکڑتا ہے، اسی طرح شریر کے دوسرے انگ کے بارے میں فرمایا ہے۔

اللہ تک پہنچنے اور اسے راضی کرنے کا بس ایک ہی راستہ ہے۔ پیروں کے ذریعے ہی اللہ تک پہنچا جا سکتا ہے۔ اللہ نے انبیا اولیا کی صورت میں اپنی رسی کو اس دنیا میں اتارا ہے۔ اس کو پکڑ

کر ہی اللہ تک پہنچا جا سکتا ہے، ورنہ پوری زندگی ہم کوشش کرتے رہیں، اللہ کی معرفت نہ ملے گی۔ اللہ ہم سے دور نہیں ہے، وہ اپنے بندوں سے بہت قریب ہے، اللہ موجود ہے، بندہ جب اپنی خواہش اور گناہ سے نکل جاتا ہے، تو اللہ کا جلوہ نظر آتا ہے۔

پیر کے بغیر اس تک پہنچنا بہت مشکل ہے اور اگر کوئی پہنچ بھی گیا تو وہ جل جائے گا۔ اس کے نور کی تیزی کو وہ برداشت نہیں کر پائے گا۔ پیروں کی مثال لائن مین کی ہے کہ یہ چاہیں تو بجلی سے فیکٹری چلا دیں اور چاہیں تو بلب جلا دیں۔ پیروں کے دامن سے لگ جانے میں ہی بھلائی ہے۔ ان کے پاس مردہ کی طرح ہو جائے، اپنی کوئی خواہش نہ رہے، وہ چلائے تو چلے، وہ ہنسائے تو ہنسے، جس طرح مردہ نہلانے والے کے ہاتھ میں ہوتا ہے، وہ گرم پانی سے نہلائے، یا ٹھنڈا پانی سے، مردے کی کوئی خواہش نہیں رہتی۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ گرم لگ رہا ہے، ٹھنڈا پانی سے نہلاؤ، اور نہ وہ یہ کہتا ہے کہ ٹھنڈا لگ رہا ہے، گرم پانی سے نہلاؤ۔ مرید کو پیر کے ہاتھ میں اسی طرح ہو جانا چاہیے۔ اگر ایسا ہو گیا تو اللہ ضرور اپنا جلوہ دکھائے گا۔ نماز میں لگے گا کہ سفید نور سا چمکا، کبھی کبھی دیر تک رہے گا، پھر کیا کہنا نماز میں چار چاند لگ جائے گا۔ لگے گا کہ ہماری نماز قبول ہو گئی۔

مسلمان وہی ہے جو اللہ کے سوا کسی کو نہ پوجے، اپنے ہاتھ اور اپنی زبان سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچائے، اپنی ان آنکھوں سے غلط نہ دیکھے، اپنے کانوں سے غلط نہ سنے، اپنی زبان سے غلط بات نہ کہے اور نہ اپنے ہاتھوں کا غلط پریوگ کرے۔ پانچ وقت اللہ کی عبادت کرے، نبی کے نقش قدم پر چلے، ان کے بتائے ہوئے راستے اور اسلام کے قانون پر عمل کرتا رہے، چاہے دنیا جوتا اور چپل مارے، سر پر کوڑا ڈالے، مومن کو چاہیے کہ اللہ کے لیے صبر کرے، اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دے بلکہ ظلم کرنے والوں کے لیے دعا کرے کہ اے اللہ! تو ہمارے بھائی کو نیک بنا اور نیکوں کا راستہ چلا اور ان کو بھلا برا سمجھنے کی توفیق دے۔

انسان کو چاہیے کہ ماتا پیتا کا دل کبھی نہ دکھائے۔ اگر ماتا پیتا بدن چیر کر اس میں نمک بھی بھر دیں تو بھی اولاد کو چاہیے کہ ان کی عزت کرے۔ اگر ہم ایسا کرتے ہیں تو مسلمان کہے جائیں گے ورنہ مسلمان قوم میں جنم لینے سے کچھ نہیں ہونے والا۔ مسلمان کسی ذات پات کا نام نہیں، نبی کے طریقے پر جو چلتا ہو وہی مسلمان ہو سکتا ہے۔

مرنے کے بعد مردے کو چاہے جس طرح الوداع کیا جائے، مردہ چاہے دنیا میں جس پوسٹ پر رہا ہو، قبر یہی کہے گی کہ مجھے یہ مت بتاؤ کہ تو راشٹر پتی کا بیٹا ہے یا پردھان منتری کا، مجھے صرف اتنا بتاؤ کہ تو نے کیا اچھا کیا اور کیا برا۔ قبر سے اچھا برا کرم کرنے کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔ جو اچھا برا کرم کرنا تھا وہ دنیا میں کر چکے، اب اس کے بدلے کا وقت آ چکا ہے۔ مرنے کے بعد اللہ کی

بارگاہ میں کوئی جھوٹ بولنا بھی چاہے تو وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اللہ نے جن فرشتوں کو اچھائی و برائی لکھنے کے لیے لگا رکھا ہے وہ سب انسان کے سامنے ہوگا۔ آدمی کے شریر کا انگ انگ اس کے خلاف گواہی دینے لگے گا۔ جس طرح ہم کیمرے کے ذریعے اپنے اچھے برے کو دیکھتے ہیں اور اس کو جھٹلا نہیں پاتے، اس سے بھی زیادہ اچھی طرح ہمارے کیے ہوئے کاموں کا ریکارڈ ہمارے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔ ہم نے اس دنیا میں اگر اچھا کیا ہوگا تو اس کا بدلہ بھی اچھا ہوگا اور اگر ہم نے برا کیا ہوگا تو اس کا بدلہ بھی برا ہوگا۔

ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی زندگی کے ہر موڑ پر یہ یقین رکھیں کہ اللہ ہم کو دیکھ رہا ہے۔ ہمارا ہر کام اس کے سامنے ہے، وہ موجود ہے، جس طرح آتما کے بغیر یہ شریر باقی نہیں رہ سکتا، اسی طرح اللہ کے وجود کے بغیر یہ دنیا موجود نہیں رہ سکتی۔ آتما ہے تو یہ شریر باقی ہے اور آتما کے نکلنے کے بعد یہ شریر مٹی کا ڈھیر ہے۔ شریر کا زندہ رہنا گواہی دیتا ہے کہ آتما ہے، اسی طرح کائنات کا باقی رہنا اور دن رات کا آنا جانا ہم کو بتاتا ہے کہ اللہ موجود ہے، جو اس کائنات کو چلا رہا ہے۔ جس طرح بلب کا نور ہم کو بتاتا ہے کہ بجلی موجود ہے، اسی طرح چاند و سورج کی چمک دمک ہم کو اللہ کے وجود کا پتا دیتی ہے۔ جس طرح ہم بجلی کے تار میں بجلی کو نہیں دیکھ پاتے، لیکن اس کے وجود کا یقین کرتے ہیں، اس سے بھی زیادہ ہم کو اس دنیا کو دیکھ کر اللہ کے وجود کا یقین رکھنا چاہیے۔ تب ہم اللہ پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کر سکتے ہیں، ورنہ نہیں۔

اللہ اپنے بندوں کے ساتھ ہے۔ جس طرح مہندی کے پتوں میں لالی موجود ہے، اسی طرح اللہ مخلوقات یعنی اپنے ارادے کے ظہور کے پردے میں موجود ہے۔ بندہ اس کی فرماں برداری کر کے اس کو راضی کر سکتا ہے اور اس کے قرب میں داخل ہو سکتا ہے، اس کے جلوے کو دیکھ سکتا ہے۔ اللہ نے اس دنیا میں انبیا و اولیا کی صورت میں اپنی رسی کو اتارا ہے، اس رسی کو پکڑ کر اللہ تک پہنچا جا سکتا ہے۔ بغیر مرشد کے اللہ تک پہنچنا اور اس کو راضی کرنا مشکل ہے۔ بغیر مرشد کے اللہ کو پانا ایسے ہی ہے جیسے کہ ہرن کا مشک کو پانا۔ مشک اس کے نابھی میں موجود ہوتا ہے، اس کی خوشبو اس کو ملتی ہے اور اس خوشبو کی تلاش میں وہ ادھر ادھر بھاگتا ہے، لیکن وہ خوشبو کو نہیں پاتا اور مر جاتا ہے۔ اگر اس کو کوئی مرشد مل جاتا جو اس کو یہ بتا دیتا کہ مشک تیرے نابھی میں موجود ہے، جس کو تو ادھر ادھر ڈھونڈھ رہا ہے، وہ تیرے ہی ساتھ ہے۔ تو شاید اس کو مشک بھی مل جاتا اور مرنے سے بھی بچ جاتا۔

اللہ تک پہنچنے کے لیے پیر کو خوش رکھنا ضروری ہے؛ کیوں کہ پیر کی رضا، اللہ اور اس کے رسول کی رضا ہے۔ جو اپنے پیر کا فرماں بردار ہوا اور ان کے حکم کو بجا لایا گویا وہ اللہ اور رسول کے

حکم کو بجالایا۔ جو اپنے پیر کے مطابق چلا وہ اللہ تک پہنچ گیا اور جس نے اپنے پیر سے منہ موڑا اس نے اللہ ورسول سے رشتہ توڑا۔ پیر اپنے چاہنے والے سے یہ کہتے ہیں کہ تم اپنے گناہوں کی گٹھری باندھ کر ہماری ارادت اور محبت کی آگ سے اس کو جلا دو۔ جب تمہارے سارے گناہ اور تمہاری ساری خواہشیں جل جائیں، صرف اللہ اور اس کے رسول کی رضا کی طلب باقی رہے، تب تم ہمارے ساتھ چلنے کے قابل ہو۔

کھڑے پیر بازار میں لیے لوا ٹھاٹھار
جو گھر اپنا پھونک سکے وہ چلے ہمارے ساتھ

فرائض وواجبات کے علاوہ نوافل کے ذریعے بھی اللہ کو راضی کرنے کی کوشش کرتا رہے، کسی کو پتا نہ چلے۔ دودھ سے دہی اور دہی سے گھی بنایا جاتا ہے۔ دودھ، دہی تک تو خراب ہوسکتا ہے لیکن گھی جلدی خراب نہیں ہوتا ہے۔ اسی طرح بندہ عبادت کرتے کرتے نوافل کے ذریعے اللہ کے قرب میں پہنچ جاتا ہے، تو اس کے بدلے میں اللہ اس کو ایک ایسی کیفیت اور ایک ایسا ذوق عطا کرتا ہے، جو دیر پا ہوتا ہے اور اسے اس میں مزہ ملتا ہے۔ اب وہ عام بندہ نہیں ہوتا، بلکہ اللہ کا خاص دوست ہوتا ہے۔

میرا اسلامی نام تو مالک ہی جانیں، ہاں! ایک بار میں جھاڑو باندھ رہا تھا، مالک نے دیکھا تو فرمایا: جھاڑو شاہ آگئے کیا؟ میں نے سوچا کہ میرے مالک کی زبان سے نکلا ہے، یہی ہمارا نام رہے گا، اس دن سے میں اپنا نام جھاڑو شاہ سمجھتا ہوں۔

○○○

شاہ صفی اکیڈمی کی فخریہ پیش کش

داعی اسلام عارف باللہ شیخ **ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی** مد ظلہ العالی
کی قلبی واردات، گنجینۂ معانی، بحر حقائق ومعارف، مثنوی

نغمات الاسرار فی مقامات الابرار

جو

سلیس اردو زبان میں شریعت ومعرفت کا انمول خزانہ ہے

تیسرا ایڈیشن

اپنے نئے رنگ وآہنگ اور ضروری توضیحی حواشی کے ساتھ
منظر عام پر آچکا ہے۔

حواشی نگار

ذیشان احمد مصباحی

زیرِ اہتمام

شاہ صفی اکیڈمی، خانقاہ عارفیہ/جامعہ عارفیہ سید سراواں، کوشامبی، الہ آباد

تحقیق وتنقید

تحریر: ڈاکٹر مفتی علی جمعہ
ترجمہ: اظہار احمد ثقافی

موسیقی اور نغمے کی شرعی حیثیت

غنا کی لغوی تحقیق

غَنَاء نفع کے معنی میں ہے، غین کے فتحہ اور مد کے ساتھ اور غِنَاء کسرہ اور مد کے ساتھ سماع کے معنی میں ہے جب کہ غَنَا کسرہ اور قصر (یعنی آخر میں ہمزہ کے بغیر) کے ساتھ مال داری اور بے نیازی کے معنی میں ہے۔

غَنِيَ غِنًى غَنِيٌّ تَغَنّٰى سب اسی سے ماخوذ ہیں جو بے نیاز ہونے کے معنی میں ہیں۔

اسی سے ہے تَغَانَوْا: وہ ایک دوسرے سے بے نیاز ہو گئے۔

اَلْمَغْنٰی اس محل کو کہتے ہیں جس کے رہنے والے خوش حال ہوتے ہیں۔ اس کی جمع المغانی ہے۔

اسی سے غَنّٰی يُغَنِّي أُغْنِيَّةً اور تَغَنّٰى بِأُغْنِيَّةٍ حَسَنَةٍ ہے۔ نغمہ سرائی کرنے کے معنی میں۔ أُغْنِيَّة (نغمہ) کی جمع اَغَانِيُ ہے۔(۱)

سماع نغمہ کا حکم

اس مقام پر لغوی بحث سے صرف نظر کرتے ہوئے غناء کا مفہوم نغمہ ہے، اگر یہ بغیر موسیقی کے حدود شرع میں رہ کر ہو تو کوئی حرج نہیں، اللہ اور اس کے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدح وثنا میں ہو، یا شجاعت و بہادری، جوش وجذبہ اور حب الوطنی کے لیے ہو تو مستحب ہے، اور اس کے علاوہ دیگر مقاصد حسنہ کے لیے ہو تو مباح ہے۔

اسی طرح مسلم معاشرے میں عید، شادی، مفقود شخص کی آمد، ولیمہ، عقیقہ، بچے کی پیدائش اور اس طرح کی خوشی کے مواقع پر اظہار خوشی اور تفریح طبع کے لیے غناء معروف ومروج ہے، جس کی اباحت پر احادیث صحیحہ سے بہت ساری واضح دلیلیں موجود ہیں جن میں سے چند ملاحظہ ہوں۔

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ نے ایک عورت کی شادی انصار کے ایک شخص سے کرائی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے دریافت فرمایا کہ اے عائشہ! کیا تمہارے ساتھ لہو ولعب کا سامان نہ تھا؟ کیوں کہ انصار اسے پسند کرتے ہیں۔(۲)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک عورت کی شادی انصار کے ایک شخص سے کرائی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ تم لوگوں نے اس کے ساتھ کسی لڑکی کو بھیجا یا نہیں؟ صحابہ نے عرض کی، ہاں! بھیج دیا ہے۔ پھر آپ نے فرمایا: کسی گانے والے کو بھیجا ہے یا نہیں؟ ام المومنین نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ انصار ایسے لوگ ہیں جو نغمہ کو پسند کرتے ہیں، کتنا اچھا ہوتا کہ تم ان کے ساتھ کسی ایسے شخص کو بھیج دیتے جو یہ کہتا پھرتا:

اتیناکم اتیناکم   فحیاناو حیاکم(۳)

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔ آپ فرماتی ہیں کہ عید الاضحیٰ کے دن میرے پاس دو لڑکیاں جو میری ہم عمر تھیں، گا بجا رہی تھیں اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چادر مبارک اوڑھے آرام فرما تھے۔ اسی اثنا میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف لائے، لڑکیوں کو گاتے بجاتے دیکھ کر ڈانٹنا شروع کیا، اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چہرۂ انور سے چادر شریف کو اٹھایا اور فرمایا کہ اے ابوبکر! انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو؛ کیوں کہ یہ عید کے ایام ہیں۔(۴)

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میرے پاس انصار کی ایک بچی تھی، جب میں نے اس کی شادی کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی شرکت فرمائی لیکن لہو ونغمہ نہ پاکر فرمایا کہ اے عائشہ تم لوگوں نے اس موقع پر کچھ گایا نہیں، یا گاؤ گے نہیں؟ پھر فرمایا کہ انصار کے اس قبیلے کے لوگ گانا پسند کرتے ہیں۔(۵)

حضرت عامر ابن سعد سے روایت ہے، آپ فرماتے ہیں کہ میں، ثابت بن ودیعہ، اور قرظہ بن کعب رضی اللہ عنہما کے ساتھ ایک ایسی شادی میں شریک تھا جس میں گانے کا اہتمام تھا۔ مجھے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ میں نے ان دونوں حضرات سے پوچھا: آپ لوگ کچھ سن رہے ہیں؟ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ شادی میں گانے کی رخصت ہے۔(۶)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔ آپ فرماتی ہیں کہ عید الفطر کے دن حضرت حسان بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کی ایک باندی جس کے بال بکھرے

ہوئے تھے، دف کے ساتھ شعر گنگناتے ہوئے حاضر ہوئی تو میں نے اسے ڈانٹا، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ام سلمہ! اسے اس کے حال پر چھوڑ دو؛ کیوں کہ ہر قوم کی ایک عید ہوتی ہے اور آج ہماری عید ہے۔(۷)

حضرت ربیع بنت معوذ عفرا سے روایت ہے، آپ فرماتی ہیں کہ میری شب عروسی کی صبح اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے پاس آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے فرش پر ایسے ہی بیٹھے جیسے تم بیٹھے ہو، (۸) اتنے میں چند لڑکیاں غزوۂ بدر میں شہید ہونے والے میرے آبا واجداد کی شان میں دف بجا کر کچھ گانے لگیں، یہاں تک کہ ان میں سے ایک نے کہا:

فینا نبی یعلم مافی غد

(ترجمہ: ہمارے مابین ایک ایسے نبی ہیں جو مستقبل کی خبریں جانتے ہیں۔) اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اسے چھوڑ کر وہی گاؤ جو پہلے گا رہی تھی۔(۹)

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ آپ فرماتی ہیں کہ ایک دن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جلوہ افروز تھے کہ اسی مابین کچھ شور سنائی پڑا، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھڑے ہو گئے، دیکھا کہ ایک حبشی عورت دوڑ رہی ہے اور اس کے ارد گرد بچے تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عائشہ جلدی آؤ، وہ دیکھو، حضرت ام المومنین فرماتی ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شانۂ مبارک پر اپنی ٹھوڑی رکھ کر اس حبشی عورت کی طرف دیکھنے لگی، کچھ دیر کے بعد آپ نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ عائشہ کیا ابھی تک تم آسودہ نہیں ہوئی؟ حضرت ام المومنین فرماتی ہیں کہ یہ دیکھنے کے لیے کہ سرکار مجھ سے کتنی محبت فرماتے ہیں، میں نے یہ کہہ دیا نہیں یا رسول اللہ، ابھی تک میں آسودہ نہیں ہوئی! حضرت ام المومنین فرماتی ہیں کہ اتنے میں اچانک نہ جانے کہاں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپڑے کہ انھیں دیکھتے ہی لوگ اس عورت کے پاس سے کھسکنا شروع ہو گئے، یہ دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں جن وانس کے شیطانوں کو عمر کے خوف سے بھاگتے دیکھ رہا ہوں، پھر حضرت ام المومنین فرماتی ہیں کہ اس کے بعد میں بھی لوٹ آئی۔(۱۰)

اس قسم کے واقعات حضرات صحابہ کرام سے بھی مروی ہیں:

حضرت زید بن اسلم نے اپنے والد سے روایت کی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو سنگ لاخ وادی میں گانا گاتے ہوئے سنا تو یہ فرمایا کہ گانا مسافر کا زاد سفر ہے۔(۱۱)

علما کا ایک طبقہ مزامیر کے بغیر بھی سماع نغمہ کی حرمت کا قائل ہے، مگر دلائل ان کے اس

موقف کی مؤیدنہیں ہیں۔حضرت قاضی ابوبکرابن ابی العربی نے ''کتاب الاحکام'' میں فرمایا کہ حرمت پرکوئی بھی حدیث صحیح مروی نہیں ہے، یہی امام غزالی کا بھی موقف ہے۔العمدہ میں ابن نحوی نے بھی یہی قول کیا ہےاور ابن طاہر نے یہاں تک کہہ دیا کہ حرمت کےقول کی تائید میں ایک حرف صحیح نہیں ہے، جب کہ ابن حزم کا کہنا ہے کہ حرمت کے تعلق سے جتنی بھی روایتیں وارد ہوئی ہیں سب باطل اور موضوع ہیں۔(۱۲)

عقلی بحث

عقلی نقطۂ نظر سے بھی دیکھا جائے تواس میں کوئی قباحت نہیں، کیوں کہ غناء دنیا کی ان پر لطف چیزوں میں سے ہے جن سے دل کیف وسرور حاصل کرتا ہے، عقلیں فرحت وانبساط حاصل کرتی ہیں،مزید برآں یہ کہ غناء کان کی وہ لذت ہےجس سے سماعتیں ایسے ہی لطف اندوز ہوا کرتی ہیں جیسے کہ عمدہ قسم کے کھانے سے معدہ، حسین وجمیل مناظر سے آنکھ،معطر فضاؤں سے قوت شامہ لطف اندوز ہوا کرتی ہے، پھراسلام حسن وجمال اور راحت واطمینان کو پسند کرنے والا دین ہے، یہی وجہ ہے کہ اسلام نے وہ پاک چیزیں جن سے قلوب اورعقول سلیمہ لطف اندوز ہوتے ہیں،ان ساری چیزوں کواس امت پرحلال فرمادیا ہے،جس کا مقصد یہ ہے کہ اس امت کے لیےآسانیاں ہوں اور رسالت محمدی عام و تام ہونے کے ساتھ قیامت تک باقی رہے۔فرمان باری تعالیٰ ہے: **يَسْأَلُونَکَ مَاذَا أُحِلَّ لَهُمْ قُلْ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ**۔(۱۳)ترجمہ:محبوب آپ سے وہ لوگ سوال کرتے ہیں کہ ان کے لیے کیا حلال ہے؟ آپ فرمادیجئے کہ تمہارے لیے پاک چیزیں حلال ہیں۔

لہٰذااب کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اللہ کی حلال کردہ چیزوں کواپنے لیے یا دوسرے کے لیےحرام کرے، اگرچہ بہ نیت خیراور طلب رضاے مولیٰ ہی کے لیے کیوں نہ ہو۔''کیوں کہ حلال وحرام اللہ کے اختیار سے ہے بندے سے متعلق نہیں ہے۔فرمان باری تعالیٰ ہے: **قُلْ أَرَأَيْتُم مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ مِنْ رِزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِنْهُ حَرَامًا وَ حَلاَلاً قُلْ آللّٰهُ أَذِنَ لَكُمْ أَمْ عَلَى اللّٰهِ تَفْتَرُونَ**۔ (۱۴)ترجمہ:اے نبی! آپ فرمادیں کہ تمھیں کیا ہوگیا ہے کہ اللہ کے عطا کردہ رزق میں سے بعض کوحرام کرتے ہواور بعض کوحلال کرتے ہو، کیا اللہ تعالیٰ نے تمھیں اس کی اجازت دی ہے، یا تم اللہ پر بہتان تراشی کررہے ہو؟

اوراگر بنظر غائر دیکھیں تو یہ امر ہم پر منکشف ہوگا کہ نغمے کی محبت اورخوش الحانی سے لطف اندوزی فطرت بشری اورطبیعت انسانی میں داخل ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ گھوارے میں پڑا دودھ پیتا بچہ بھی لوریاں سن کر رونا بند کردیتا ہےاور رلانے والے اسباب کو بھلا کرغور سے لوریاں سننے لگتا ہے۔اوراسی سبب سے قدیم زمانے سے ہی ماؤں، دودھ پلانے والی عورتوں اور

دائیوں میں لوریاں گانے کا چلن رہا ہے۔اسی پر بس نہیں بلکہ ہمارا مشاہدہ توہمیں اس نتیجے تک لے جاتا ہے کہ چوپائے اور چرندو پرند بھی اچھی آواز اور موزوں نغمات سے متاثر ہوجایا کرتے ہیں۔حجۃ الاسلام امام غزالی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

''سماع سے جس کے اندر حرکت پیدا نہ ہوتو وہ ناقص، اعتدال سے ہٹا ہوا، روحانیت سے دور سخت طبیعت والا ہے، بلکہ اس کی قساوت قلبی؛ اونٹ، چرندو پرند اور بہائم سے بھی بڑھی ہوئی ہے؛ کیوں کہ اونٹ اپنی ناقص طبیعت کے باوجود بھی حدی خوانی سے ایسا سرشار ہوجاتا ہے کہ اپنی مستی میں وہ لمبے سفر اور بھاری بھرکم بوجھ کو بھی ہلکا اور معمولی سمجھنے لگتا ہےاوراس کے اندرنشاط ومستی کا ایسا خمار چھاجاتا ہے جواسے بالکل مدہوش اور دیوانہ بنادیتا ہے۔تم دیکھتے ہوکہ اونٹ جب حدی سنتا ہےتوفوراً گردن لمبی کرلیتا ہے اورکان کھڑے کرکے اسے بغور سننے لگتا ہے اوراپنی چال کواتنی تیز کردیتا ہے کہ اس پہ لدے سامان زور سے ہلنے لگتے ہیں۔''(۱۵)

اس پوری بحث سے یہ واضح ہوگیا کہ نغمہ اس وقت حرام ہوگا جب مخالف شرع کلمات پرمشتمل ہواور اگر اللہ اوراس کے پیارے حبیب ﷺ کی مدح وثنا یا شجاعت وبہادری، جوش وجذبہ اور حب الوطنی جیسے مضامین پرمشتمل ہوتو جائز بلکہ مستحب ہے۔واللہ تعالیٰ اعلیٰ واعلم۔

موسیقی کی بحث

موسیقیٰ یونانی لفظ ہے جس کا اطلاق طرب انگیز آوازیں نکالنے والے مختلف آلات پر ہوتا ہے۔فن موسیقی ایک ایسافن ہےجس میں متناسب اورغیرمتناسب نغموں کے اصول زیر بحث ہوتے ہیں اوراس بات کی بحث ہوتی ہے کہ نغموں کے درمیان کے وقفات کیا ہوں گے تاکہ ان سے دھن کی ترکیب کا ادراک ہوسکے۔موسیقِی اس کو کہتے ہیں جس کا تعلق موسیقیٰ سے ہو اور موسیقار اس شخص کو کہتے ہیں جس کا پیشہ موسیقیٰ ہو۔

اصطلاحی تعریف

موسیقی ایسافن ہےجس سے نغموں اور وقفوں کے احوال اور راگ اورسر بنانے اورآلات مزامیر ایجاد کرنے کا طریقہ معلوم ہو۔(۱۶)ایسے ہی موسیقی کا اطلاق ان آلات سے نکلی ہوئی آواز پربھی ہوتا ہے۔

موسیقی سننے کا حکم

موسیقی سننے کا مسئلہ ایک مختلف فیہ فقہی مسئلہ ہے، ضروریات دین یا اعتقادی اصول میں سے نہیں ہے، اس لیے مسلمانوں کے لیے مناسب نہیں کہ اس کی وجہ سے ایک دوسرے کی تفسیق

کریں۔ان اختلافی مسائل کی وجہ سے ایک دوسرے کا رد یا انکار بھی نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کہ رد یا انکار متفق علیہ مسئلہ میں ہوتا ہے، مختلف فیہ میں نہیں ہوتا، جب کہ بعض فقہا ایسے بھی ہیں جنھوں نے موسیقی کو مباح قرار دیا ہے اور وہ بھی ایسے ویسے نہیں، بلکہ ایسے فقہا ہیں جن کی بات بحیثیت سند قبول کی جاتی ہے اور ان کی تقلید کی جاتی ہے، لہٰذا اس قسم کے اختلافی مسائل کی بنا پر امت میں تفریق پیدا کرنا جائز نہیں ہے، خاص طور سے یہ بات قابل توجہ ہے کہ موسیقی کی حرمت پر شریعت میں کوئی صریح صحیح نص وارد نہیں ہوئی ہے، اگر ایسا ہوتا تو فقہا کے مابین اس میں اختلاف نہیں ہوتا۔

آلات مزامیر کو مباح قرار دینے والے علما میں حجۃ الاسلام امام غزالی علیہ الرحمہ بھی ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

''لہو جہد وسعی میں معین و مددگار ہے؛ کیوں کہ عمل پیہم میں لگے رہنا اور صبر کر لے جانا یہ صرف انبیا کی شان ہے، اس لیے کہ دل میں ضعف کا مرض لاحق ہو جائے تو اس مرض کی دوا لہو ہے، لہٰذا اسے مباح ہونا چاہیے، لیکن یہ حد سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے جیسے کہ دوا حد سے زیادہ نہیں استعمال کی جاتی۔ اس نیت سے لہو باعث ثواب ہے۔ یہ اس سامع کے لیے ہے جس کے اندر سماع کے ذریعے صفت محمودہ جو کہ مطلوب ہے پیدا نہ ہو سکے لیکن خالص سکون اور لذت حاصل ہو تو بھی مناسب یہی ہے کہ اس کے لیے مستحب مانا جائے تاکہ وہ اس کے ذریعے اس مقصد تک پہنچ جائے جسے ہم نے ماسبق میں ذکر کیا ہے۔ ہاں! یہ الگ سی بات ہے کہ یہ کمال انسانی کا نقص ہے، اس لیے کہ کامل شخص صرف اللہ کی ذات سے اپنے قلب کی تسکین حاصل کرتا ہے، لیکن نیکوں کی اچھائیاں مقربین کے لیے برائیاں ہوتی ہیں۔ ہاں! جس شخص کو یہ قطعی طور پر معلوم ہو کہ اس کے دل کا علاج یا اس کی نرمی یا اس کے دل کا سیر الی اللہ میں انہماک ان چیزوں کے بغیر نہیں ہو سکتا تو اس کے لیے ان امور سے تسکین قلب حاصل کرنا، ایسی دوا ہے جس سے بے نیازی جائز نہیں۔''(۱۷)

امام غزالی مزید فرماتے ہیں:

''اگر وہ آلہ (Musical Instrument) شرابیوں اور اوباشوں کا شعار ہو مثلاً بانسری، سارنگی، ڈمرو، تو ایسے تینوں قسم کے آلے شرعاً ممنوع ہیں۔ ان کے علاوہ جتنے بھی آلے ہیں وہ اصل اباحت پر باقی رہیں گے جیسے دف، اگرچہ اس میں گھونگھرو ہوں، طبل، شاہین، تاشہ بجانا اور دیگر آلات۔

اس کے علاوہ بعض اہل علم تو غنا اور سماع میں اس شخص کے لیے عبرت کے قائل ہیں جو اشارے کو سمجھ جائے اور اسے روحانی لطف ملنے لگے۔ انہی علما میں حضرت قاضی عیاض شبلی علیہ الرحمہ (۱۸) ہیں۔ ان سے سماع کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: ''سماع کا ظاہر فتنہ ہے اور باطن عبرت ہے۔ لہٰذا جو شخص اشارہ کو سمجھ لے اس کے لیے برائے عبرت سماع حلال ہے۔''(۱۹)

اسی طرح سلطان العلماء عز بن عبدالسلام سے منقول ہے کہ غنا، خواہ مزامیر کے ساتھ ہو یا اس کے بغیر، بہرصورت، یہ بسا اوقات اصلاح قلب کا ذریعہ ہوتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

''اصلاح قلب کے مختلف طریقے ہیں، ان میں سے بعض کا تعلق خارج سے ہے، یہ کبھی قرآن کے ذریعے ہوتا ہے اور قرآن سے اصلاح قلب کرنے والے اہل سماع میں سب سے افضل ہیں، کبھی وعظ و تذکیر کے ذریعے ہوتا ہے، کبھی حدی خوانی و نغمہ سرائی کے ذریعے ہوتا ہے اور کبھی مزامیر کے ساتھ نغمہ سرائی کے ذریعے، جس کے سماع میں دوشیزاؤں سے سماع کی طرح اختلاف ہے، ایسی صورت میں ان آلات مزامیر کا سننے والا اگر اسے حلال سمجھتا ہے تب تو وہ اپنے ان احوال میں جو اسے حاصل ہوتے ہیں صادق ہے اور ایک مختلف فیہ چیز کو سننے کے سبب تارک تقویٰ ہے۔''(۲۰)

امام قرطبی نے ''جامع احکام القرآن'' میں امام قشیری کا یہ قول نقل کیا ہے

''جس دن اللہ کے رسول ﷺ مدینہ پاک تشریف لائے آپ کے سامنے دف بجایا گیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے منع کرنا چاہا، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ابوبکر! انھیں چھوڑ دو تاکہ یہودیوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارا دین وسعت والا ہے۔ اس وقت لڑکیاں دف بجا بجا کر گا رہی تھیں:

نحن بنات النجار حبذا محمد من جار

(ہم قبیلہ بنی نجار کی دوشیزائیں ہیں، کیا خوش نصیبی ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ ہمارے پڑوسی ہیں۔)''

پھر امام قرطبی فرماتے ہیں:

''یہ بھی قول کیا گیا ہے کہ نکاح میں طبل اور اعلان نکاح کے لیے اس طرح کے دوسرے آلات، دف ہی کی طرح ہیں، جن کا استعمال اچھے کلام کے ساتھ جائز ہے، جس میں کوئی بے حیائی کی بات نہ ہو۔''(۲۱)

علامہ شوکانی نے نیل الاوطار، باب ماجاء فی ألۃ اللھو میں قائلین حرمت اور قائلین

اباحت کے اقوال نقل کیے ہیں اور ہر فریق کے دلائل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پھر حدیث رسول: **کل لھو یلھو به المومن فھو باطل الا ثلثة، ملاعبة الرجل اھله، و تادیبه فرسه و رمیه عن قوسه۔** (۲۲) (ہر وہ لہو جس سے مومن دل بہلائے وہ باطل ہے، سوائے تین کے: آدمی کا اپنی بیوی کے ساتھ دل لگی کرنا، گھوڑسواری کرنا اور تیراندازی کرنا۔) ذکر کرنے کے بعد اس پر امام غزالی کا یہ تبصرہ نقل کیا ہے: ''اللہ کے رسول ﷺ نے جو یہ فرمایا ہے ''**فھو باطل**'' اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ لہو حرام ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ لہو بے فائدہ ہے۔'' پھر اس کے بعد شوکانی نے کہا کہ یہی صحیح جواب ہے۔ اس لیے کہ جس میں فائدہ نہ ہو تو وہ مباح کی قسموں میں سے ہے۔ (۲۳) علامہ شوکانی نے اس کے ساتھ اس بارے میں دیگر دلائل بھی نقل کی ہیں، انھیں میں سے ایک وہ حدیث شریف بھی ہے کہ ایک عورت نے نذر مانی کہ رسول اللہ ﷺ کو اگر اللہ تعالیٰ نے غزوے سے صحیح وسالم لوٹا دیا تو وہ آپ ﷺ کے سامنے دف بجائے گی اور رسول اللہ ﷺ نے اس عورت کو اپنی نذر پوری کرنے اور اپنے سامنے دف بجانے کی اجازت بھی مرحمت فرمادی۔ آپ ﷺ کا اجازت عطا کردینا خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس مقام پر عورت نے جو کیا وہ گناہ نہیں ہے۔ علامہ شوکانی نے مزید کے لیے اپنے رسالے **ابطال دعویٰ الاجماع علیٰ تحریم مطلق السماع** کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ابن حزم نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: **انما الاعمال بالنیات ولکل امری مانویٰ۔** (۲۴) (اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہوتا ہے اور ہر نیت کرنے والے کو اس کی نیت کا اجر ملے گا) لہٰذا جو معصیت کی نیت سے غنا سنے وہ فاسق ہے، بلکہ غنا ہی کیا ہر شئے کا یہی معاملہ ہے کہ اگر نیک نیت سے ہو تو ثواب اور بری نیت سے ہو تو حرام ہے۔ اگر کوئی شخص اس نیت سے تسکین قلب حاصل کر رہا ہے کہ دل کو سکون حاصل ہوجانے کے بعد اللہ عزوجل کی اطاعت میں مکمل سرگرمی اور چستی کے ساتھ حصہ لے گا تو وہ مطیع و محسن ہے اور اس کا یہ فعل حق ہے اور جس نے طاعت و معصیت دونوں میں سے کسی کی نیت نہ کی ہو تو وہ لغو ہے، معاف ہے، اس کی مثال ایسی ہی ہے، جیسے کہ اگر کسی شخص نے فرحت طبع کے لیے اپنے باغ کا قصد کیا، پھر گیا اور اس کا دروازہ کھول کر وہیں بیٹھ گیا۔'' (۲۵)

ان ساری تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ سماع نغمہ، آلۂ موسیقی کے ساتھ ہو یا بغیر آلہ کے ہو، یہ ایسا مسئلہ ہے جس میں قدیم زمانے سے ہی علما کے مابین سخت اختلاف رہا ہے، بعض مقام پر متفق ہیں بعض دوسرے مقام پر مختلف ہیں، البتہ اگر وہ نغمہ فحش، فسق و فجور اور معصیت پر ابھارنے والا ہو تو اس کی حرمت پر ہر ایک کا اتفاق ہے، اس لیے کہ نغمہ بھی کلام ہے، اگر کلام اچھا

ہو تو اچھا ہے اور اگر برا ہو تو برا ہے اور اگر ایسا قول جو حرام پر مشتمل ہو تو وہ حرام ہے۔ بھلا اس سے کیا فرق پڑتا ہے اگر اس کے ساتھ موزونیت، نغمگی اور اثر انگیزی جمع ہوجائے۔

شرعی اعتبار سے خوشی کے مواقع جیسے شادی، غائب شخص کی آمد، عید کے ایام، ان سارے مواقع پر غناء فطری، جو فحش و فسق اور آلات سے خالی ہو، اس کی اباحت پر سب کا اتفاق ہے، بایں شرط کہ مغنی عورت نہ ہو جس کو سننے والے غیر محرم ہوں، رہا نغمہ مع مزامیر اور دیگر مسائل، تو ان سب میں علما کا اختلاف ہے۔

اس لیے نغمہ کے سلسلے میں ہمارا موقف یہ ہے کہ اگر وہ معصیت کا داعی یا تعلیمات شریعت کے مخالف نہ ہو، تو وہ چاہے مزامیر کے ساتھ ہو یا بغیر مزامیر کے ہو، ہم اس کے جواز کے قائل ہیں، ہاں! یہ خیال رہے کہ اس پر مداومت یا حد سے زیادہ اس میں مشغولیت اس کو دائرۂ اباحت سے نکال کر کراہت بلکہ کبھی کبھی حرمت کے دائرے تک میں پہنچا دیتی ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلیٰ و اعلم۔

(البیان لما یشغل الاذھان، از ڈاکٹر مفتی علی جمعہ، ص: ۳۶۰-۳۶۸، المقطم للنشر والتوزیع، قاہرہ، ۲۰۰۹ء)

حوالے اور حواشی

(۱) لسان العرب: ۲۲۰/۱

(۲) صحیح بخاری، ج: ۵، ص: ۱۹۸۰، ط: دار ابن کثیر)

(۳) ابن ماجہ، ج: ۱، ص: ۶۱۲، ط: دار الفکر، مسند احمد بن حنبل، ج: ۳، ص: ۳۹۱، ط: مؤسسہ وطنیہ، طبرانی، ج: ۳، ص: ۳۱۵، ط: دار الحرمین)

(۴) بخاری، ج: ۱، ص: ۳۳۵، ط: دار ابن کثیر/ مسلم، ج: ۲، ص: ۶۰۸، ط: احیاء التراث العربی/ ابن حبان، ج: ۱۳، ص: ۱۷۷، ط: مؤسسۃ الرسالۃ/ بیہقی، ج: ۷، ص: ۹۲، ط: دار الباز)

(۵) صحیح ابن حبان، ج: ۱۳، ص: ۱۸۵، ط: مؤسسۃ الرسالۃ)

(۶) مستدرک، ج: ۲، ص: ۲۰۱، ط: الکتب العلمیہ)

(۷) مجمع الزوائد، ج: ۲، ص: ۲۰۶، ط: دار ریان)

(۸) ربیع بنت معوذ کے مخاطب خالد بن ذکوان ہیں، جو راوی حدیث ہیں۔

(۹) بخاری، ج: ۴، ص: ۱۴۶۹ / ابوداؤد، ج: ۴، ص: ۲۸۱، ط: دار الفکر/ ترمذی، ج: ۳، ص: ۳۹۹ / ابن ماجہ، ج: ۱، ص: ۶۱۱)

(۱۰) نسائی، ج: ۵، ص: ۳۰۹، ط: دار الکتب العلمیۃ)

(۱۱) سنن کبریٰ للبیہقی، ۶۸/۵

(۱۲) المحلی، ج:۹،ص:۶۰، ط: المنیریہ)

(۱۳) المائدہ:۴)

(۱۴) یونس:۵۹)

(۱۵) احیاء العلوم، کتاب السماع، ص:۱۱۵۲، ۱۱۵۳

(۱۶) الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ، ج:۸ ۳، ص:۱۶۸، حرف المیم، معازف

(۱۷) الفروع لابن المفلح، ج:۵، ص:۶ ۲۳، ۷ ۲۳، دار الکتب العلمیہ

(۱۸) یہ شیخ الصوفیہ ہیں، جن کے متعلق عجیب وغریب روایات منقول ہیں، یہ علوم شریعت کے ماہر صوفی تھے، مذہب مالکی کے عالم وفقیہ تھے، ان کے احوال کے لیے دیکھیے: سیر اعلام النبلاء:۲۰/ ۲۱۲، الدیباج المذہب:۱۶۸

(۱۹) التاج والاکلیل، للعبدری المالکی:۲/ ۶۲ ۳۔

(۲۰) ایضاً

(۲۱) تفسیر قرطبی، ج:۱۴، ص:۵۴)

(۲۲) مسند احمد:۴/ ۱۴۴، ترمذی:۴/ ۱۷۴، ابن ماجہ:۲/ ۹۴۰)

(۲۳) نیل الاوطار، ج:۸، ص:۱۱۸)

(۲۴) مسند احمد:۱/ ۲۵، صحیح بخاری:۱/ ۳، صحیح مسلم:۳/ ۱۵۱۵، ابن ماجہ:۲: ۱۴۱۳، الفاظ ابن ماجہ کے ہیں۔

(۲۵) المحلی، لابن حزم:۷/ ۵۶۷

ؔ موسیقی کا لفظ عربی میں الف مقصورہ کے ساتھ ہے جب کہ اردو میں اس کے بغیر، اس لیے اس کا عربی تلفظ موسیقا اور عربی موسیقی ہے۔ (مترجم)

○○○

تحریر: ڈاکٹر یوسف القرضاوی
ترجمہ: محمد ذکی

حضرت رابعہ کی شخصیت: شرعی اور تاریخی نقطۂ نظر

ڈاکٹر یوسف القرضاوی عالم اسلام کی نہایت معروف، مقبول، آزاد خیال، معتدل اور متنازع شخصیت ہیں، چوں کہ ڈاکٹر صاحب کا شمار اہل تصوف میں نہیں ہوتا، اس لیے ان کا یہ فتویٰ تصوف اور اہل تصوف کے حوالے سے متشددین کے لیے چشم کشا ہے۔ (ادارہ)

سوال

میں نے ایک شہرت یافتہ خطیب کو معروف صالحہ خاتون حضرت رابعہ بصریہ کی شان میں زبان درازی کرتے ہوئے سنا، وہ اپنی تقریر میں کہہ رہے تھے کہ رابعہ عدویہ کی پوری داستان، صوفیہ کی طبع زاد ہے، جس میں انہوں نے رابعہ کی طرف ایسے اقوال واشعار منسوب کیے ہیں جو غیر معقول اور نا قابل قبول ہیں، جیسے ان کی طرف منسوب مناجات کے بعض یہ اشعار:

فلیتک تحلو و الحیاة مریرة
و لیتک ترضی و الانام غضاب!
و لیت الذی بینی و بینک عامر
و بینی و بین العالمین خراب!

۱۔کاش ایسا ہوتا کہ صرف تو مجھے لگتا، بقیہ پوری زندگی سے مجھے نفرت ہو جاتی، تو خوش رہتا اور پوری دنیا مجھ سے روٹھ جاتی۔

۲۔کاش میرا رشتہ تجھ سے جڑ جاتا اور سارے جہان سے میرے رشتے ٹوٹ جاتے۔

کلھم یعبدونک من خوف نار
و یرون النجاۃ حظا جزیلا
او لان یدخلوا الجنان فیحظوا

بنعیم و یشربوا سلسبیلا
لیس لی فی الجنان و النار حظ
انا لا ابتغی بحبی بدیلا

۱۔سارے لوگ دوزخ کے خوف سے تیری عبادت کرتے ہیں اور نجات حاصل کر لینے ہی کو بڑی کامیابی سمجھتے ہیں۔
۲۔ یا ان کی عبادت کا مقصد جنت میں داخل ہو کر نعمتوں سے لطف اندوز ہونا اور نہر سلسبیل سے سیراب ہونا ہے۔
۳۔ مجھے جنت اور دوزخ سے کوئی غرض نہیں، نہ مجھے اپنی محبت کا کوئی بدلہ چاہیے۔

احبک حبین حب الھویٰ
و حبا لانک اھل لذاک
فاما الذی ھو حب الھویٰ
فشغلی بذکرک عما سواک
و اما الذی انت اھل له
فکشفک لی الحجب حتی اراک
و ما الحمد فی ذا و لا ذاک لی
و لکن لک الحمد فی ذا و ذاک

۱۔ مجھے تجھ سے دوطرح کی محبت ہے، ایک محبت شوق ہے اور دوسری محبت یہ ہے کہ تو ہی اس محبت کے لائق ہے۔
۲۔ میرے شوق محبت کا یہ عالم ہے کہ میں تجھ کو یاد کر کے تیرے ماسوا کو بھول چکا ہوں۔
۳۔ رہی یہ بات کہ تو ہی میری محبت کا اہل ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تو نے میرے لیے سارے حجابات اٹھا دیے اور میری نگاہوں کے سامنے آ گئے۔
۴۔ ان دونوں محبتوں میں میری اپنی کوئی خوبی نہیں؛ کیوں کہ ہر خوبی، بہر صورت تیرے ہی لیے ہے۔

خطیب نے ان اشعار اور اپنے وہم و گمان کے مطابق ان میں پائے جانے والے کفر و ضلال کا جم کر رد کیا۔ سوال یہ ہے کہ جو باتیں خطیب نے کہی ہیں کیا وہ واقعی صحیح اور قابل تسلیم ہیں؟ کیا حقیقتاً اس صالحہ خاتون کا کوئی وجود نہیں؟ کیا متذکرہ بالا اشعار یقینا کفر و ضلال پر مشتمل ہیں؟
امید ہے کہ آپ کتاب و سنت کی روشنی میں اپنی معتدل رائے پیش کریں گے۔

جواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین، و صلی اللہ علی سیدنا محمد خاتم النبیین، و علی آلہ و اصحابہ اجمعین و بعد!

مسلمانوں میں پائے جانے والے اس طرح کے رجحانات پر مجھے شدید افسوس ہوتا ہے۔ اس قسم کے لوگوں کو جملہ اقدار کو پامال کرنے اور ہماری قریب و بعید تاریخ کے تمام فکری و سلوکی کارناموں کو مسخ کرنے میں لذت محسوس ہوتی ہے، جب کہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ یہ لوگ ان کارناموں کے محاسن پیش کرتے اور اگر ان کو واقعی ان میں کوئی عیب نظر آتا تو ان محاسن کے مقابل جہاں تک ممکن ہوتا ان عیوب سے صرف نظر کرتے۔

دو بڑی خطائیں

اگر قول مذکور کی نسبت قائل کی طرف درست ہے تو میرے نزدیک یہاں خطیب نے دو بڑی خطاؤں کا ارتکاب کیا ہے۔

اول: کسی بھی چیز کا محض انکار قابل قبول نہیں

خطیب نے تاریخی حقائق کو غلط ثابت کرنے کے لیے محض انکار کا سہارا لیا ہے، جو علمی دنیا میں بالکل غیر مقبول ہے، ورنہ تو کوئی بھی شخص کچھ بھی کہنے لگے۔ خطیب اور ان جیسے دوسرے لوگوں کو ایسا کہنے کا حق اس وقت تھا جب وہ تاریخ، سوانح اور طبقات کی ان کتابوں کی طرف رجوع کرتے جن میں اکابر امت کا ذکر عموماً اور عابدین و زاہدین کا ذکر خصوصاً کیا گیا ہے، لیکن ان کو ان کتابوں میں کہیں بھی اس عابدہ، زاہدہ خاتون کا ذکر نہیں ملتا، جس کو صوفیہ نے اختراع کر کے رابعہ عدویہ کے نام سے معروف کر دیا ہے، بلکہ ان کے مطالعے سے ثابت ہوتا کہ ثقہ مؤرخین نے ان کے وجود ہی کا انکار کر دیا ہے اور صوفیہ کا اپنی کتابوں میں ان کا تذکرہ کرنے پر طعن کیا ہے۔

اگر خطیب مذکور نے اس طرح کی گفتگو کی ہوتی تو اس کی بات علمی، قابل قبول اور درست ہوتی، مگر خطیب ایسا کہنے کی ہرگز جرات نہیں کر سکتا تھا؛ کیوں کہ علمی حقائق اور تاریخی واقعات اس کی تکذیب کر رہے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت رابعہ کا ذکر جہاں صوفیہ نے اپنی کتابوں میں کیا ہے، وہیں تاریخ و سوانح کی بہت سی کتابیں ان کا وجود تسلیم کرتی ہیں، نیز ان کتابوں میں حضرت رابعہ کے بہت سے اقوال، اشعار اور اعمال کا ذکر موجود ہے۔

ابونعیم نے حلیۃ الاولیاء میں، ابن الجوزی نے صفۃ الصفوۃ (۴/ ۸۱۰) میں، ابن خلکان نے وفیات الاعیان (۱/ ۸۲۱۰) میں، ذہبی نے سیر اعلام النبلاء (۸/ ۱۵۲۰) میں، ابن کثیر نے

البدایہ والنہایہ (۱۰/۱۸۶) میں، ابن عماد نے شذرات الذہب (۱/۱۹۳) میں، صاحب در المشور نے طبقات ربات الخدور (۲۰۲) میں، زرکلی نے الاعلام (۳/۳۱) میں اور امام قشیری نے الرسالہ میں، شیخ ابو طالب مکی نے قوت القلوب میں، امام غزالی نے احیاء العلوم میں، شیخ سہروردی نے عوارف المعارف میں اور امام شعرانی نے طبقات میں اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگوں نے آپ کے حالات لکھے ہیں۔ ابن جوزی نے صفۃ الصفوۃ (۴/۱۹) میں تحریر کیا ہے کہ انہوں نے رابعہ عدویہ کے بارے میں ایک مستقل کتاب تالیف کی ہے جس میں انہوں نے ان کے اقوال واخبار کو جمع کیا ہے۔

دوم: اشتعال انگیز اسلوب

دوم: خطیب کی دوسری خطا یہ ہے کہ اس نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اشتعال انگیز اسلوب اختیار کیا جس میں تحقیق وتوضیح کا عنصر مفقود ہے۔ یہ اسلوب اشتعال انگیزی کے رسیا حضرات کو ضرور پسند آتا ہے جنہیں کسی پر بھی نقد وجرح کی جرات اور عامۃ الناس کے مسلمات کی خلاف ورزی میں بڑا لطف آتا ہے، لیکن شائستہ اور روشن خیال افراد جو مسائل کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں اور ہر سنی ہوئی بات کو حقیقت واقعہ کا درجہ نہیں دیتے، وہ اس اسلوب کو بالکل پسند نہیں کرتے۔

خطیب کو چاہیے تھا کہ مسئلے کی تنقیح کے لیے مندرجہ ذیل دو طریقے اپناتا جن کو کوئی بھی سلیم الحواس مسترد نہیں کرسکتا۔

طریق اول

پہلا طریقہ رابعہ عدویہ یا ان کے علاوہ کسی کی بھی طرف منسوب قول وفعل کی تحقیق کرنا ہے؛ کیوں کہ کوئی ضروری نہیں کہ ان کی طرف منسوب ہر بات صحیح اور مستند ہو، بلکہ ہوسکتا ہے کہ بہت سی چیزوں کی نسبت مشکوک یا پھر سرے سے ہی غلط ہو، جیسے کہ بعض لوگوں نے ان کی طرف مناجات کے یہ چند اشعار منسوب کیے ہیں:

فلیتک تحلو و الحیاة مریرة
و لیتک ترضی و الانام غضاب!
و لیت الذی بینی و بینک عامر
و بینی و بین العالمین خراب!
اذا صح منک الود فالکل هین
و کل الذی فوق التراب تراب!

۳۔ اگر تیری محبت حاصل ہوجائے پھر تو سب کچھ ہیچ ہے اور اس روے زمین پر جو کچھ ہے سب کو مٹی میں ملنا ہے۔ (بقیہ دو اشعار کا ترجمہ پیچھے گزر چکا۔)

یہ تمام اشعار حضرت رابعہ بصریہ کے نہیں ہیں، بلکہ ان میں سے پہلے دو شعر ابو فراس حمدانی کے ہیں جن میں وہ اپنے چچا زاد بھائی، مشہور بادشاہ سیف الدولۃ سے مخاطب ہے، یہ دونوں شعر اس کے دیوان کے ایک قصیدے میں مذکور ہیں جس کا مطلع یہ ہے:

ا ما لجمیل عند کن ثواب
و لا لمسئ عند کن متاب
لقد ضل من تحوی هواه خریدة
و قد ذل من تقضی علیه کعاب

۱۔ کیا کسی نیکی کا تمہارے یہاں کوئی بدلہ نہیں اور نہ ہی کسی خطا کار کے لیے توبہ کی کوئی گنجائش۔

۲۔ یقینا جس کے حواس پر کوئی دوشیزہ چھا جاتی ہے وہ اعتدال کھو بیٹھتا ہے اور جسے حسینائیں برباد کرتی ہیں وہ ذلیل وخوار ہوتا ہے۔

اس قصیدے کے چند مشہور اشعار یہ ہیں:

بمن یثق الانسان فیما ینوبه
و من این للحر الکریم صحاب
و قد صار هذا الناس الا اقلهم
ذئابا علی اجسادهن ثیاب

۱۔ انسان مصیبتوں کے وقت کس پر اعتماد کرے؟ اور کسی شریف انسان کو دوست کہاں سے ملیں؟

۲۔ باستثنائے چند، سارے انسان بھیڑیے بن گئے ہیں، جنہوں نے اپنے جسموں کو لباس سے ڈھانپ رکھا ہے۔

ابو فراس چوتھی صدی کا شاعر ہے، جب کہ رابعہ بصریہ دوسری صدی کی ہیں۔ ان کی سن وفات میں لوگوں کا اختلاف ہے بعض کا کہنا کہ آپ کی وفات ۱۳۵ میں ہوئی، جب کہ بعض ۱۸۵ کی طرف گئے ہیں۔ میرے نزدیک دوسرا قول راجح ہے۔ ان اشعار میں آخری شعر متنبی کے ایک قصیدے کا ہے جو انہوں نے کافور کی مدح میں قلم بند کیا تھا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ صالحین کو ان اشعار کے حوالے سے یہ محسوس ہوا کہ ان سے صرف اللہ تعالی کو مخاطب کیا جاسکتا ہے۔ لہذا انہوں نے ان اشعار سے اللہ تعالی ہی کو خطاب کیا جو اس کا

اہل ہے۔لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ آخر کس نے ان اشعار کو خاص طور سے حضرت رابعہ عدویہ کی طرف منسوب کر دیا اور نہ ہی اس بارے میں مجھے کسی معتبر کتاب میں کوئی قول نظر آیا، اگر چہ عامۃ الناس میں یہی مشہور ہے کہ یہ اشعار حضرت رابعہ کے ہیں، لیکن عامۃ الناس کی زبانوں پر جاری ہر کلام حجت تو نہیں ہوتا۔

اسی طرح ان کی طرف چند اشعار اور منسوب ہیں جن کے آخر میں وہ کہتی ہیں:

لیس لی فی الجنان والنار حظ

انا لا ابتغی بحبی بدیلا

مجھے جنت یا دوزخ کی کوئی فکر نہیں، میں اپنی محبت کا کوئی بدلہ نہیں چاہتی۔

مجھے نہیں معلوم کہ اس شعر کی نسبت ان کی طرف کس قدر درست ہے۔مگر ہاں ان سے بعض ایسے اشعار بھی مروی ہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ دوزخ سے ڈرتی تھیں۔قیامت، موت اور مابعد موت کا خوف ان پر طاری رہتا تھا۔لوگوں نے ذکر کیا ہے کہ وہ اپنی مناجات میں کہتی تھیں۔

الھی، تحرق بالنار قلبا یحبک؟

مولیٰ! کیا تو ایسے دل کو آگ سے جلا دے گا جو تجھ سے محبت کرتا ہے؟

ابن جوزی نے صفۃ الصفوۃ (۵۴/۱۷) میں حضرت رابعہ کے احوال کے ضمن میں عبداللہ ابن عیسی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں رابعہ عدویہ کے گھر میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ان کے چہرے پر نور تھا اور آپ کثرت سے گریہ وزاری کر رہی تھیں۔ایک شخص نے ان کے سامنے قرآن کی ایسی آیت تلاوت کی جس میں جہنم کا ذکر تھا آپ نے ایک چیخ ماری اور زمین پر گر گئیں۔آپ فرماتے ہیں کہ رابعہ عدویہ جب کبھی موت کو یاد کرتیں تو آپ پر رعشہ طاری ہو جاتا تھا۔

عبدہ بنت ابوشوال (جو اللہ کی نیک بندی تھیں اور حضرت رابعہ کی خدمت کیا کرتی تھیں) سے منقول ہے کہ حضرت رابعہ پوری رات نماز پڑھا کرتی تھیں۔جب طلوع فجر کا وقت ہوتا تو کچھ دیر کے لئے اپنی جائے نماز پر ہی سو جاتیں، پھر جب خوب روشنی پھیل جاتی تو آپ اچانک گھبراتی ہوئی بیدار ہوتیں، اس وقت میں آپ کو یہ کہتے سنتی تھی کہ: اے نفس آخر کتنا سوئے گا اور کب اٹھے گا بہت جلد تو ایسی نیند سونے والا ہے جس سے تو قیامت کے دن ہی اٹھے گا۔عبدہ بنت ابوشوال کہتی ہیں کہ آپ مرتے دم تک اپنی اسی روش پر قائم رہیں۔

ان سے منقول اقوال میں سے ایک قول یہ بھی ہے کہ میں اللہ سے بخشش چاہتی ہوں کہ میرے قول استغفر اللہ میں صدق بہت کم تھا۔

یہ تمام اقوال اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ رابعہ عدویہ بیک وقت اہل محبت وخشیت

دونوں تھیں۔یعنی آپ کو اللہ سے محبت بھی تھی اور اس کا خوف بھی دل میں سمایا ہوا تھا اور بیک وقت ان دونوں کے اجتماع میں کوئی منافات نہیں۔

ان کی طرف جو یہ منسوب ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ: الٰہی! میں نے تیری عبادت نہ تو دوزخ کے خوف سے کی ہے اور نہ ہی جنت کی لالچ میں، بلکہ میری عبادت کا مقصد صرف تیری محبت اور ملاقات ہے۔شاید اس سے وہ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ اللہ تعالی اس کا اہل ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور اسی سے ڈرا جائے تا کہ اس کا حق ادا ہو سکے اور اس کی نعمتوں پر شکر بجالایا جائے۔

جیسا کہ ابن قیم نے کہا ہے کہ:

هب البعث لم تاتنا رسله و جاحمة النار لم تضرم

الیس من الواجب المستحق ثناء العباد علی المنعم

ترجمہ: فرض کرو کہ ہماری طرف رسول مبعوث نہ کیے گئے ہوتے اور نہ ہی دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ روشن کی گئی ہوتی، تو کیا یہ واجب نہ ہوتا کہ بندے اپنے منعم کی حمد وثنا کرتے۔

یا پھر انہوں نے ایسا اس وقت کہا ہوگا جب ان کی محبت خوف ورجا پر غالب ہوگی اور انس باللہ میں اس قدر مستغرق ہوں گی کہ جنت وجہنم سے ذہول ہو گیا ہوگا؛ لیکن اس طرح کے احوال دائمی نہیں تھے جیسا ان کے اقوال واحوال اس پر شاہد ہیں۔

ہم نے اپنی کتاب ''**العبادۃ فی الاسلام**'' میں ایسے متصوفین کا رد کیا ہے جو طلب ثواب اور خوف عقاب کی وجہ سے عبادت کرنے سے انکار کرتے ہیں۔اس کتاب میں ہم نے علامہ ابن قیم کی کتاب ''مدارج السالکین'' سے اطمینان بخش اور واضح مباحث نقل کیے ہیں۔

رہے ان کے وہ اشعار جو حب الٰہی کے حوالے سے ان کی طرف منسوب ہیں، جیسے:

احبک حبین حب الھوی

و حبا لانک اھل لذاک

فاما الذی ھو حب الھوی

فشغلی بذکرک عما سواک

و اما الذی انت اھل له

فکشفک لی الحجب حتی اراک

و ما الحمد فی ذا ولا ذاک لی

و لکن لک الحمد فی ذا و ذاک

امام ابوحامد غزالی نے احیاء العلوم میں ان اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ: شاید
حب ھویٰ سے ان کی مراد اللہ سے اس وجہ سے محبت کرنا ہے کہ وہ ان کو دنیوی نعمتوں سے سرفراز
فرما کر ان پر انعام واحسان فرماتا ہے اور اللہ سے اس لیے محبت کرنا کہ وہ اس کا اہل ہے، اس سے
ان کی مراد یہ ہے کہ وہ اللہ سے اس کے جمال وجلال کی وجہ سے محبت کرتی ہیں، جو ان کے سامنے
منکشف ہو چکا ہے اور یہی محبت ان دونوں محبتوں میں اعلیٰ اور قوی تر ہے۔ جمال ربوبیت کے
مشاہدے کی لذت وہ لذت ہے، جس کو رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب سے روایت کرتے
ہوئے بیان فرمایا ہے کہ: میں نے اپنے صالحین بندوں کے لیے ایسی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جن کو نہ
کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا اور نہ ہی کسی بشر کے دل پر اس کا خیال گزرا۔ (بخاری)

امام غزالی فرماتے ہیں کہ: ان لذتوں میں سے بعض کچھ لوگوں کو دنیا میں ہی مل جاتی ہیں
یہ وہ لوگ ہیں جن کا دل مکمل طور سے پاک وصاف ہو جاتا ہے۔

لیکن یہاں یہ جان لینا ضروری ہے کہ جمال ربوبیت کا یہ مشاہدہ محض دل کی آنکھ سے ہوتا
ہے، سر کی آنکھوں سے نہیں۔

علامہ ابن قیم مدارج السالکین میں اسی نور کشف کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرماتے
ہیں جس کے بارے میں صوفیہ گفتگو کیا کرتے ہیں کہ نور کشف، صوفیہ کے یہاں مبدأ شہود کو کہتے
ہیں۔ یہ وہ نور ہے جو اسمائے حسنیٰ کے معانی کی تجلیات سے قلب پر پڑتا ہے، جس سے قلب کی
تاریکی روشنی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور مشاہدہ وکشف کا حجاب اٹھ جاتا ہے۔

اس تقریر کے علاوہ کسی اور بات کی طرف التفات نہ کرنا، ورنہ پائے ثبات میں لغزش
آجائے گی۔ تجھے بعض صوفیہ کے کلام میں ملے گا کہ: تجلی ذات فلاں فلاں چیز کا تقاضا کرتی ہے،
تجلی صفات فلاں فلاں چیز کا تقاضا کرتی ہے اور تجلی افعال فلاں فلاں چیز کی مقتضی ہے، لوگ چونکہ
الفاظ پر غور کرتے ہیں، لہٰذا کسی کو وہم ہو سکتا ہے کہ ان سب سے صوفیہ کی مراد یہ ہے کہ ذات
، صفات اور افعال کی حقیقت مشاہد کے لیے متجلی ہو جاتی ہے۔ اس اعتقاد کی وجہ سے وہ شخص
شطحات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ حالاں کہ صادقین عارفین اس اعتقاد سے بری ہیں۔

وہ تو محض کمال معرفت کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں، جس کے بعد غفلت، شک اور
اعراض کی تمام ظلمتیں ختم ہو جاتی ہیں اور قلب بالکلیہ ماسوا کو محو کر کے معرفت الٰہی میں غرق ہو جاتا
ہے جس کے بعد قلب کو معروف ومطلوب کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ اس کی نظیر وہ طلوع شمس سے
پیش کرتے ہیں کہ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو ستاروں کا نور ماند پڑ جاتا ہے، جب کہ ستارے
معدوم نہیں ہوتے، بلکہ سورج کی روشنی ان کو ڈھانپ لیتی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کا وجود ظاہر

نہیں ہوتا، حالاں کہ حقیقت میں وہ اپنی جگہ پر موجود ہوتے ہیں۔ ٹھیک یہی اثر نور معرفت کا ہوتا
ہے۔ جب یہ نور قلب پر چھا جاتا ہے اور دل پر اس کا قبضہ ہو جاتا ہے تو جملہ موانع اور حجابات قلب
سے دور ہو جاتے ہیں۔ اس بات کا انکار وہی شخص کر سکتا ہے جو اس کا اہل نہیں۔

کسی کو یہ اعتقاد نہیں رکھنا چاہیے کہ ذات وصفات کی تجلی کا ظہور بندے پر اسی طرح
ہوتا ہے جیسے کہ اللہ سبحانہ نے کوہ طور پر تجلی فرمائی تھی اور جیسے قیامت کے روز اہل جنت کے لیے تجلی
فرمائے گا، کیوں کہ اس اعتقاد کی وجہ سے جہلا غلطی میں مبتلا ہو گئے اور اکثر و بیشتر یہ غلطی اس وقت
ہوتی ہے جب گفتگو، عبادت وریاضت اور ذکر کے نور سے متجاوز ہو کر ذات وصفات کے نور تک
پہنچ جاتا ہے کیوں کہ عبادت صحیحہ، ریاضت شرعیہ اور ذکر لسانی وقلبی میں ہمیشہ مشغول رہنے کی وجہ
سے قلب پر بندے کی قوت وضعف کے مطابق تجلی پڑتی رہتی ہے۔ بسا اوقات یہ تجلی یا نور اتنا
قوی ہو جاتا ہے کہ سر کی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کر لیا جاتا ہے۔ ایسے میں وہ لوگ جو ضعیف العلم
ہونے کے ساتھ خصائص ربوبیت اور مقتضیات عبودیت میں تمیز کرنے سے قاصر ہوتے ہیں
، غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ذات الٰہی کا نور ہے۔ خبردار! نور ذات کے
سامنے تو کوئی بھی چیز ٹھہر ہی نہیں سکتی۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنی ذات سے حجاب کو اٹھا دے تو تمام عالم
ریزہ ریزہ ہو جائے جیسے کہ کوہ طور ریزہ ریزہ ہو گیا تھا۔

حدیث صحیح میں آیا ہے کہ بے شک اللہ تعالیٰ نہیں سوتا اور سونا اس کی شایان شان نہیں۔ وہ
میزان کو اوپر نیچے کرتا ہے، رات کے اعمال دن کے اعمال سے پہلے اور دن کے اعمال رات سے
پہلے، اس کے حضور پیش کیے جاتے ہیں، اس کا حجاب نور ہے اگر وہ اس حجاب کو اٹھا دے تو اس کی
ذات کی تجلیاں تمام مخلوق کو جلا دیں۔

اسلام ایک نور ہوتا ہے اور ایمان بھی ایک نور ہوتا ہے جو نور اسلام سے قوی ہوتا ہے، پھر
احسان بھی ایک نور ہوتا ہے جو اول الذکر دونوں نوروں سے زیادہ قوی ہوتا ہے۔ جس وقت یہ تینوں
عناصر جمع ہو جاتے ہیں اور اللہ سے دور رکھنے والے تمام موانع ختم ہو جاتے ہیں تو قلب وجوارح اس
نور سے بھر جاتے ہیں؛ لیکن یہ وہ نور نہیں، جو باری تعالیٰ کی صفت ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات
کسی مخلوق میں حلول نہیں کرتیں، جس طرح کوئی مخلوق ذات باری میں حلول نہیں کر سکتی، بلکہ خالق
سبحانہ تو اپنی ذات وصفات کے ساتھ مخلوق سے جدا ہے، لہٰذا خالق ومخلوق میں کوئی اتحاد ہے، نہ حلول
اور نہ اتصال۔ **تعالی اللہ عن ذالک کلہ علوا کبیراً** (مدارج السالکین: ۳/۱۱۰۔۱۱۲)

حب الٰہی سے متعلق ان کے چند اشعار کو شیخ شہاب الدین سہروردی نے ''عوارف
المعارف'' میں ذکر کیا ہے، ان اشعار میں وہ اللہ سے مناجات کرتے ہوئے کہتی ہیں:

و لقد جعلتک فی الفؤاد محدثی
و ابحت جسمی من اراد جلوسی
فالجسم منی للجلیس مؤانس
و حبیب قلبی فی الفؤاد جلیسی

۱۔میں نے اپنے دل میں تجھ کو اپنا ہم کلام بنالیا ہے اور جو شخص میرے پاس بیٹھنا چاہتا ہے اس کو میرے جسم کے سوا کچھ نہیں ملتا ہے۔

۲۔میرا جسم میرے پاس بیٹھنے والے کے ساتھ ہے جب کہ میرے دل کا حبیب میرے دل میں بیٹھا ہے۔

ان اشعار سے حضرت رابعہ عدویہ کی مراد یہ ہے کہ وہ لوگوں سے محض جسم اور چہرے کے ساتھ ملاقات کرتی ہیں جبکہ ان کا قلب بہر حال اللہ کے ساتھ ہوتا ہے۔

ان کے فضائل ومناقب کثرت کے ساتھ موجود ہیں اکثر بڑے بڑے علما،محدثین اور زاہدین وعابدین نے ان کی ثناخوانی کی ہے اوران کوایک بڑے مقام کی حامل گردانا ہے۔

ابن کثیر نے بدایہ میں ذکر کیا ہے کہ ابوداؤد سجستانی نے حضرت رابعہ عدویہ پر جرح کی ہے حتی کہ ان کو زندیقیت سے متہم کر دیا۔ابن کثیر کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ ان تک کوئی اس طرح کی بات پہنچی ہو!

امام ذہبی نے سیر الاعلام میں ابوسعید اعرابی کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ رابعہ عدویہ سے لوگوں نے بہت سی حکمتیں حاصل کی ہیں سفیان اور شعبی وغیرہ نے ان کی کافی حکایتیں نقل کی ہیں جن سے ان کی طرف منسوب غلط باتوں کا بطلان ظاہر ہوتا ہے، جیسے:

ولقد جعلتک فی الفؤاد محدثی
وابحت جسمی من اراد جلوسی

بعض لوگوں نے نصف شعر کو لے کر ان کی طرف حلول کی اور پورے شعر کو لے کر اباحیت پسندی کی نسبت کی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ سب غلو اور جہل ہے،شاید کہ جس شخص نے شعر کو رابعہ عدویہ کی طرف منسوب کیا ہے وہ حلولی اور اباحی ہے اور اس شعر سے وہ اپنے کفر وضلال پر استدلال کرنا چاہتا ہے۔جیسا کہ اس قسم کے لوگ حدیث ”**کنت سمعه الذی یسمع به الخ**“(**رواہ البخاری عن ابی ہریرۃ وهو حدیث قدسی**) سے استدلال کرتے ہیں۔

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے انصاف کی بات کہی ہے:

شاید اسی قسم کی باتیں ابوداؤد تک پہنچی ہوں گی جن کی بنیاد پر انہوں نے تحقیق کیے بغیر حضرت رابعہ عدویہ کو زندیقہ کہہ دیا۔

خیال رہے کہ بہت سے معاصرین نے حضرت رابعہ کے بارے میں مختلف کتابیں اور مقالے تصنیف کیے ہیں،بعض حضرات نے ان کو”**شهيدة العشق الالٰهی**“ سے یاد کیا ہے حالاں کہ یہ ایک ایسی تعبیر ہے جس کو حس اسلامی ناپسند سمجھتی ہے، کیوں کہ اللہ اور بندوں کے تعلق کو قرآن وسنت کی زبان میں ”حب“ سے تعبیر کیا جاتا ہے نہ کہ عشق سے جیسا کہ قرآن شریف میں آیا ہے ”**یحبهم و یحبونه**“(المائدۃ:۵۴)،”**والذین آمنوا اشد حبا لله**“(البقرۃ:۱۶۵)اور متفق علیہ حدیث میں آیا ہے”**ثالث من کن فیه وجد حلاوۃ الایمان ان یکون الله ورسوله احب الیه من ما سواهما**“ الحدیث

اور اس کے علاوہ بہت ساری احادیث ہیں جو اس بات پر دلالت کر رہی ہیں کہ اللہ کی محبت اسلام کا جزء لاینفک ہے، یہ بعد کا اضافہ نہیں جیسا کہ کچھ لوگوں کا زعم ہے۔حضرت رابعہ کے تمام اشعار محبت الٰہی پر مشتمل ہیں۔آداب بارگاہ الٰہی کی رعایت کرتے ہوئے اس سے آگے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔**وبالله التوفیق**

(**نوٹ:** یہ فتویٰ ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی ویب سائٹ سے لیا گیا ہے،اسے ۲۴/دسمبر ۲۰۱۳ء کو سائٹ پر اپ لوڈ کیا گیا تھا۔)

○○○

بیعت وخلافت: امام احمد رضا قادری کی نظر میں

امام احمد رضا قادری علیہ الرحمہ کی ذات بیسویں صدی عیسوی کی ایک عظیم علمی، تحقیقی شخصیت گزری ہے، آپ اپنے دور کے تقریبا تمام متداولہ علوم وفنون سے خاطر خواہ حصہ رکھتے تھے، آپ نے مختلف علوم وفنون پر سیکڑوں تصنیفات چھوڑی، فقہ وفتاوی میں آپ اپنے ہم عصر علما پر فوقیت رکھتے تھے، آپ کے فتاوی کا مجموعہ ''**العطایا النبویة فی الفتاوی الرضویة**'' کے نام سے مشہور ہے، جس کے مطالعہ سے فقہ وفتاوی میں آپ کی گرفت اور تبحر علمی کا صحیح اندازہ ہوتا ہے، آپ نے اپنے فتاوی میں ہرطرح کے مسائل کا احاطہ کیا ہے''**نقاء السلافة فی احکام البیعة والخلافة**'' نامی رسالہ جو آپ کے فتاوی کے مجموعہ میں موجود ہے، اس میں بیعت وخلافت کے مسائل پر، جس عمدگی کے ساتھ آپ نے گفتگو فرمائی ہے، وہ آپ ہی کا حصہ معلوم ہوتا ہے، جس کے مطالعے کے بعد آپ کے بارے میں یہ رائے قائم کرنا آسان ہوجاتا ہے کہ آپ عارف باللہ ہونے کے ساتھ، گروہ صوفیہ کے ترجمان اور صف شکن مجاہد تھے، اسی مذکورہ رسالے کی روشنی میں، افادۂ عام کے پیش نظر، بیعت وارادت اور خلافت کے حوالے سے مندرجہ ذیل تحریر قارئین کی خدمت میں پیش ہے، سب سے پہلے شریعت وطریقت اور حقیقت ومعرفت کے تعلق سے امام احمد رضا علیہ الرحمہ کا کیا خیال ہے، ملاحظہ فرمائیں:

شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت

''شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت میں باہم اصلا کوئی تخالف نہیں، اس کا مدعی اگر بے سمجھے کہے تو نرا جاہل ہے اور سمجھ کر کہے تو گمراہ، بددین، شریعت حضور اقدس سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اقوال ہیں، اور طریقت حضور کے افعال، اور حقیقت حضور کے احوال، اور معرفت حضور کے علوم بے مثال۔'' (فتاوی رضویہ، ج:۲۱ص:۴۶۰)

اے عزیز من شریعت قال ہے
اور طریقت فعل، حقیقت حال ہے
معرفت اس حال کا انجام ہے
جو خدا کا فضل اور احسان ہے

(نغمات الاسرار فی مقامات الابرار ص:۶۶ مطبوعہ شاہ صفی اکیڈمی. الہ آباد)

بیعت کی اہمیت وضرورت

کسی نے یہ سوال کیا کہ ایک شخص یہ کہتا ہے کہ قیامت کے دن ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گروہ میں اٹھیں گے، تو پھر بیعت کرنے اور کسی سلسلے میں داخل ہونے کی کیا ضرورت ہے؟

اس سوال کے جواب میں آپ نے تحریر فرمایا:

''قرآن وحدیث میں شریعت، طریقت، حقیقت سب کچھ ہے، ان میں سے سب سے زیادہ ظاہر وآسان مسائل شریعت ہیں، ان کی تو یہ حالت ہے کہ اگر ائمہ مجتہدین ان کی شرح نہ فرماتے، تو علما کچھ نہ سمجھتے، اور علمائے کرام، اقوال ائمہ مجتہدین کی تشریح وتوضیح نہ کرتے، تو ہم لوگ ارشادات ائمہ کے سمجھنے سے بھی عاجز رہتے اور اب اگر اہل علم، عوام کے سامنے مطالب کتب کی تفصیل اور صورت خاصہ پر حکم کی تطبیق نہ کریں، تو عام لوگ ہرگز ہرگز کتابوں سے احکام نکال لینے پر قادر نہیں، ہزار جگہ غلطی کریں گے اور کچھ کا کچھ سمجھیں گے، اس لیے یہ سلسلہ مقرر ہے کہ عوام، آج کل کے اہل علم ودین کا دامن تھامیں، اور وہ تصانیف علمائے ماہرین کا، اور وہ مشائخ فتاویٰ کا اور وہ ائمہ ہدیٰ کا، اور وہ قرآن وحدیث کا، جس شخص نے اس سلسلے کو توڑا، وہ اندھا ہے، جس نے دامن ہادی ہاتھ سے چھوڑا، عنقریب کسی عمیق کنویں میں گرا چاہتا ہے۔''

(فتاویٰ رضویہ، ج:۲۱ص:۶۲_۴۶۱)

اس کے بعد مزید گفتگو کرتے ہوئے صاحب فتاوی نے احکام شریعت کے توارث اور ائمہ مجتہدین کی ضرورت کو ثابت کیا اور پھر آگے یوں تحریر فرمایا:

''جب احکام شریعت میں یہ حال ہے، تو صاف روشن، کہ دقائق سلوک اور حقائق معرفت، بے مرشد کامل، خود بخود قرآن وحدیث سے نکال لینا کس قدر محال ہے۔ یہ راہ سخت باریک اور بے شمع مرشد نہایت تاریک ہے، بڑے بڑوں کو شیطان لعین نے اس راہ میں ایسا مارا، کہ تحت الثریٰ تک پہنچادیا، تیری کیا حقیقت کہ بے رہبر کامل، اس راہ میں چلے اور سلامت نکل جانے کا ادعا کرے، ائمہ کرام فرماتے ہیں: آدمی اگر چہ کتنا ہی

بڑا عالم، زاہد، کامل ہو اس پر واجب ہے کہ (وہ کسی) ولی عارف کو اپنا مرشد بنائے، بغیر اس کے ہرگز چارہ نہیں۔'' (فتاویٰ رضویہ، ج:۲۱ص:۴۶۳)

مزید اپنے موقف کی تائید میں امام شعرانی قدس سرہ کی تصنیف میزان الشریعہ۔۔۔کا مندرجہ ذیل اقتباس پیش کیا ہے:

''فعلم من جميع ماقررناه وجوب اتخاذ الشيخ لكل عالم طلب الوصول الى شهود عين الشريعة الكبرى ولو اجمع جميع اقرانه على علمه وعمله وزهده و ورعه ولقبوه بالقطبية الكبرى فان لطريق القوم شروطا لايعرفها الا المحققون منهم....الخ۔

ترجمہ: معلوم ہوا ان تمام بحثوں سے جس کو ہم نے ثابت کیا ہے، کہ شیخ کا پکڑنا واجب ہے، ہر اس عالم کے لیے جس کو عین شریعت کبریٰ کے مشاہدہ تک پہنچنا مطلوب ہے، اگر چہ اس کے تمام ہم عصر، اس کے علم وعمل اور زہد وورع پر جمع ہو جائیں اور اس کو قطبیت کبریٰ کا لقب دیں، اس لیے کہ اس قوم (یعنی صوفیہ) کے طریق کی کچھ شرطیں ہیں، جن کو سوائے محققین صوفیہ کے کوئی نہیں پہچان سکتا۔'' (المیزان الکبریٰ، فصل: ان القائل کیف الوصول الخ مصطفی البابی مصر ا / ۲۲، بحوالہ فتاوی رضویہ، ج:۲۱ص:۶۴، ۴۶۳)

لیکن کوئی پست ہمت ہو، جو معرفت اور مشاہدہ ربانی کے جام سے سیرابی کا حوصلہ نہ رکھتا ہو، تو اس کے تعلق سے آپ تحریر کرتے ہیں:

''یہ اس کے لیے ہے جو اس راہ کا چلنا چاہے اور ہمت پست، کوتاہ دست لوگ، اگر سلوک نہ بھی چاہیں، تو انھیں توسل کے لیے شیخ کی حاجت ہے، یوں اللہ عزوجل اپنے بندوں کو بس تھا۔ قال اللہ تعالیٰ: **الیس اللہ بکاف عبدہ**۔ کیا خدا اپنے بندوں کو کافی نہیں۔ مگر قرآن عظیم نے حکم فرمایا: **وابتغوا الیہ الوسیلۃ**۔ اللہ کی طرف وسیلہ ڈھونڈو۔ اللہ کی طرف وسیلہ، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف وسیلہ، مشائخ کرام، سلسلہ بہ سلسلہ، جس طرح اللہ عزوجل تک بے وسیلہ (رسول) رسائی محال قطعی ہے، یوں ہی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک رسائی بے وسیلہ (مرشد) دشوار عادی ہے۔'' (ج:۲۱ص:۴۶۴)

پھر متعدد احادیث اور اقوال ائمہ سے اپنے مذکورہ موقف کی تائید کرتے ہوئے، بیعت کی اہمیت وضرورت اور شیخ کی دستگیری، سلاسل واسانید اولیاے کرام کے فیوض و برکات پر نہایت مدلل گفتگو فرمائی ہے، جس کا مطالعہ اہل علم کے لیے نہایت مفید ہے۔

خلافت وجانشینی کا بیان

خلافت وجانشینی کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے خلافت کی تقسیم کرتے ہوئے جواباً تحریر فرمایا:

''خلافت حضرات اولیائے کرام نفعنا اللہ ببرکاتھم فی الدنیا والاخرۃ۔ (اللہ تعالیٰ دنیا وآخرت میں ہم کو ان کی برکات سے نفع پہنچائے) دوطرح ہے: عامہ اور خاصہ۔'' (ج:۲۱ص:۴۶۷)

خلافت عامہ کا بیان

''عامہ یہ کہ مرشد، مربی اپنے مریدین، اقارب اور اجانب سے جس جس کو صالح ارشاد ولائق تربیت سمجھے اپنا خلیفہ ونائب کرے اور اسے اخذ بیعت وتلقین اذکار واشغال، اوراد واعمال، اور تربیت طالبین، وہدایت مسترشدین کے لیے مثال خلافت کرامت فرمائے۔'' (ج:۲۱ص:۴۶۷)

خلافت خاصہ کا بیان

خلافت کی دوسری قسم، خلافت خاصہ کو بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''اور خاصہ یہ ہے کہ اس مرشد مربی کے بعد وصال، یہ شخص اس کی مسند خاص پر، جس پر اس کی زندگی میں سوا اس کے دوسرا نہ بیٹھ سکتا، جلوس کرے اور تمام نظم ونسق، ورتق وفتق، وجمع وتقسیم، وعزل ونصب خدام، وتقدیم وتاخیر مصالح، وتولیت اوقاف درگاہی، وقوامت مصارف خانقاہی میں اس کی جگہ قائم ہو، یہ معنی بھی ہر چند باطن ان کا دین ہے، مگر روئے بظاہر بسوئے دنیا رکھتے ہیں۔ (ج:۲۱ص:۴۶۷)

جانشینی اور تولیت میں فرق

امام احمد رضا قادری علیہ الرحمہ جانشینی اور تولیت کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

''شخص مذکور (جس کو جانشیں بنایا جائے) اس مرشد مربی (جس کا جانشیں بنایا جائے) سے خلافت عامہ بطور مقبول رکھتا ہو، ورنہ بسبب تعامل، یا ہمارے بلاد میں، بوجہ عدم قضاۃ، اتفاق ناس سے تولیت اوقاف اگر چہ صحیح ہو جائے، مگر سجادہ نشینی ہرگز درست نہ ہوگی، کہ وہ خلافت خاصہ ہے، اور کوئی خاص بے عام کے متحقق نہیں ہوسکتا، اور خلافت عامہ بے اجازت صحیحہ زنہار حاصل نہیں ہوتی۔'' (ج:۲۱ص:۴۶۹)

معلوم ہوا کہ اولیائے کرام کی روحانی نعمتوں کا وارث وہی ہوگا، جس کو ان نفوس قدسیہ نے ان نعمتوں کے لیے منتخب فرمایا ہو، ورنہ مال ودولت، زمین وجائداد کی وراثت تو مل سکتی ہے،

باطنی وروحانی نعمتوں سے کوئی حصہ نہ ملے ہوگا ، کیونکہ جانشین ہونے کے لئے اجازت یافتہ ہونا، اور دین میں کامل ہونا ضروری ہے، ورنہ ان صوفیہ صافیہ کی جگہ بیٹھنے والا ناظر، مشرف اور نگراں تو کہا جاسکتا ہے، جانشین ہرگز نہیں کہا جائے گا، بلکہ جانشین اگر کہا بھی جائے تو بھی حقیقت میں جانشین نہیں ہے۔

تعدد بیعت

تعدد بیعت کے سلسلے میں جب آپ سے سوال ہوا، تو آپ جواب دیتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''ارباب وفا، آقایان دنیا کا دروازہ چھوڑ کر، دوسرے در پر جانا، کورنمکی جانتے ہیں۔

سراینجا، سجدہ اینجا، بندگی اینجا، قرار اینجا

پھر احسانات دنیا کو احسانات حضرت شیخ سے کیا نسبت، عجب اس سے کہ محبت واخلاص پیر کا دعوٰی کرے اور اس کے ہوتے، این وآن کا دم بھرے: ؎

چو دل بادلبری آرام گیرد
ز وصل دیگرے کے کام گیرد
نہی صد دستہ ریحاں پیش بلبل
نخواہد خاطرش جز نکہت گل

(فتاوی رضویہ، ج:۲۱، ص:۴۷۶، ۴۷۵)

اسی بحث کے تحت پیر کی عظمت بیان کرتے ہوئے یوں تحریر کرتے ہیں:

''باپ پدر گل ہے اور پیر پدر دل، مولی معتق مشت خاک ہے اور پیر معتق جان پاک۔''
(ج:۲۱، ص:۴۷۶)

پیر اپنے مرید کے لیے جائے شرب ہے

مرید کو یک در گیر محکم گیر ہونا چاہیے، اس ضمن میں امام احمد رضا قادری علیہ الرحمہ نے، ایک بزرگ کا مندرجہ ذیل واقعہ نقل کیا ہے:

''حضور پرنور سید الاولیاء الکرام امام العرفاء العظام حضرت سیدنا غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت سیدی علی بن ہیتی قدس سرہ الملکوتی کے یہاں رونق افروز ہوئے، حضرت علی بن ہیتی نے اپنے مرید خاص، ولی بااختصاص، سیدی ابوالحسن علی جوسقی رحمۃ اللہ تعالی علیہ کو حکم دیا کہ خدمت حضرت غوثیت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ملازمت اختیار کریں، اور یہ پہلے فرما چکے تھے کہ میں حضور پرنور غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے

غلاموں سے ہوں، سیدی ابوالحسن قدس سرہٗ، پیر سے یہ کچھ سن کر اس پر رونے لگے اور آستانہ پیر چھوڑنا کسی طرح نہ چاہا، حضرت غوث الاولیاء رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انھیں روتا دیکھ کر فرمایا: **مایحب الا الثدی الذی رضع منه۔** جس پستان سے دودھ پیا ہے اس کے غیر کو نہیں چاہتا۔'' (ج:۲۱، ص:۴۷۷)

پیر اپنے مرید کے لیے جائے شرب ہے، جہاں اللہ کی نعمتوں سے وہ فیضیاب اور شہود کے جام سے سیراب ہوتا ہے، اور جو اپنے پیر کا مقبول ہوتا ہے وہ تمام مشائخ کا مقبول اور جو اپنے پیر کا مردود، تمام مشائخ کا مردود ہوتا ہے۔ مقبول یکے، مقبول ہمہ، مردود یکے، مردود ہمہ۔

احترام سب کا کرنا چاہیے مگر جبین نیاز صرف اپنے پیر کے آستانے پر ہی خم کرنا، کار دانش منداں ہے۔

اس سلسلے میں صاحب فتاوی رضویہ مرید صادق کی ارادت اور آداب شیخ کو ثابت کرتے ہوئے ''**المدخل لابن الحاج**'' سے مندرجہ ذیل عبارات نقل کرتے ہیں:

''**المرید یعظم شیخه ویؤثره علی غیره ممن هو فی وقته لان النبی صلی اللہ تعالٰی علیه وسلم یقول من رزق فی شیئ فلیلزمه (الی اٰخر ما افاد واجاد هذا مختصراً** یعنی مرید اپنے پیر کی تعظیم کرے اور اسے تمام اولیائے زمانہ پر مرجح رکھے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں، جو کسی شئ میں رزق دیا جائے، چاہیے کہ اسے لازم پکڑے۔ (المدخل لابن الحاج، حقیقۃ اخذ العہد، دار الکتب العربی، بیروت، ص: ۲۲۳ و ۲۲۴)

اسی میں ہے: **ان المرید له اتساع فی حسن الظن بهم وفی ارتباطه علی شخص واحد یعول علیه فی اموره ویحذر من تقضّی اوقاته لغیره فائدة۔** ترجمہ: مرید کے لیے وسعت اس میں ہے کہ اپنے زمانہ کے تمام مشائخ کے ساتھ گمان نیک رکھے اور ایک شیخ کے دامن سے وابستہ رہے اور اپنے تمام کاموں میں اسی پر اعتماد کرے اور بے فائدہ تضیع اوقات سے بچے۔'' (المدخل لابن الحاج فصل فی دخول المرید الخلوۃ، دار الکتب العربی بیروت ۳/ ۱۶۰، بحوالہ: فتاویٰ رضویہ، ج:۲۱، ص:۴۷۸)

یہ تمام بحثیں اس پیر کے بارے میں ہے جو صاحب ایصال ہو، یا کم از کم صاحب اتصال ہو مگر مریدین کی تربیت کرنا جانتا ہو اور اپنی صحبت میں ناقصوں کو اس لیے رکھتا ہو کہ وہ کامل ہو جائیں یا کاملین کی صحبت کے لائق ہو جائیں اور پھر اپنے سے زیادہ کامل ومکمل شیخ کی صحبت میں بھیج دے۔ اور اگر شیخ ایسا ہو کہ خود ہی کامل نہ ہو اور نہ ہی تربیت مریدین سے واقف ہو۔ یا تربیت مریدین سے واقف تو ہو، مگر تربیت کرنے اور اپنی صحبت میں رکھنے کی گنجائش نہ پاتا ہو، دینی ذمہ داریوں کی وجہ سے

طالبین کی تربیت نہ کر پاتا ہو،تو ایسے شیخ کو چاہیے کہ اپنے مریدین کوکسی کامل ومکمل شیخ ومربی کی صحبت میں ڈال دے،اور اگر شیخ ایسا نہ کرے تو طالبین مولیٰ کو چاہیے کہ اس پیر سے بدظن ہوئے بغیر کسی کامل ومکمل کی صحبت اختیار کرے اور اس کامل ومکمل کی صحبت کو پہلے شیخ کے فیضان سے جانے۔کیوں کہ بیعت وارادت کا مقصد تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب ہے،اور وہ بغیر صحبت شیخ ومربی کے ممکن نہیں۔

پیرو مرشد کے بغیر فلاح

امام احمد رضا قادری سے سوال کیا گیا کہ زید کا پیرو مرشد نہ ہو تو کیا زید فلاح نہ پائے گا؟ اس سوال کے جواب میں سب سے پہلے آپ نے متقدمین مشائخ وصوفیہ کی کتابوں،مثلاً عوارف المعارف، رسالہ قشیریہ،اور سبع سنابل شریف سے پیرو مرشد کی اہمیت وضرورت پر ایک ایک اقتباس نقل کیا اور پھر فلاح کی مختلف قسموں کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا،فلاح کی تقسیمات کا بغور جائزہ لیا جائے تو مندرجہ ذیل قسمیں نکلتی ہیں:

۱۔فلاح مطلق،جس کو فلاح ایمان بھی کہا جاتا ہے۔

۲۔فلاح ظاہر،جس کو فلاح تقویٰ کا نام دیا جاتا ہے۔

۳۔فلاح باطنی،جس کو فلاح احسان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

امام احمد رضا قادری کی تحریروں کی روشنی میں سب سے پہلے ہم فلاح ایمان اور اس کی مختلف صورتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

فلاح مطلق یعنی فلاح ایمان کی پہلی صورت

’’اول انجام کار رستگاری (نجات) اگر چہ معاذ اللہ سبقت عذاب کے بعد ہو، یہ عقیدہ اہل سنت میں ہر مسلمان کے لئے لازم اور کسی بیعت ومریدی پر موقوف نہیں،اس کے واسطے صرف نبی کو مرشد جاننا بس ہے۔بلکہ ابتدائے اسلام میں کسی دور دراز پہاڑ یا گمنام ٹاپو کے رہنے والے غافل جن کو نبوت کی خبر ہی نہ پہنچی اور دنیا سے صرف توحید پر گئے، بالآخر ان کے لیے بھی یہ فلاح ثابت۔‘‘(ج:۲۱ص:۹۸۔۴۹۷)

اتنا فرمانے کے بعد موحد کی نجات کی بحث کی اور حدیثی دلائل سے اپنی باتوں کو مدلل فرماتے ہوئے،مسئلہ شفاعت پر نہایت کافی وشافی بحث کرتے ہوئے،متعدد احادیث بھی پیش کی اور پھر فلاح ایمان کی دوسری صورت کو یوں تحریر کیا:

فلاح ایمان کی دوسری صورت

’’دوم کامل رستگاری کہ بے سبقت عذاب دخول جنت ہو۔‘‘(ج:۲۱ص:۴۹۹)

فلاح ایمان کی پہلی صورت میں سبقت عذاب کے بعد نجات کے حصول کا ذکر کیا اور

دوسری صورت میں بلا سبقت عذاب نجات کا حاصل ہونا بتایا گیا اور پھر دوسری صورت کی بھی دو قسمیں کی جس کو ہم فلاح ایمان کی تیسری اور چوتھی صورت کے طور پر شمار کرتے ہیں۔

فلاح ایمان کی تیسری صورت

’’(۱)اول وقوع یہ مذہب اہلسنت میں محض مشیت الٰہی پر ہے، جسے چاہے ایسی فلاح عطا فرمائے،اگر چہ لاکھوں کبائر کا مرتکب ہو،اور چاہے تو ایک گناہ صغیرہ پر گرفت کر لے ،اگر چہ لاکھوں حسنات رکھتا ہو۔یہ عدل ہے اور وہ فضل :**یغفر لمن یشاء و یعذب من یشاء۔**‘‘(ج:۲۱ص:۵۰۰)

امام احمد رضا قادری علیہ الرحمہ نے اتنا ذکر کرنے کے بعد مختلف دلائل سے اپنے موقف کو مدلل کیا، چند آیتیں پیش کی اور کچھ احادیث کا ذکر کیا اور پھر فلاح مطلق یعنی فلاح ایمان کی دوسری صورت کے دوسرے پہلو کو یوں بیان کیا۔جس کو ہم فلاح ایمان کی چوتھی صورت کے طور پر تحریر کرتے ہیں۔

فلاح ایمان کی چوتھی صورت

’’(۲)دوم امید یعنی انسان کے اعمال،افعال،اقوال اور احوال ایسے ہونا،کہ اگر انہی پر خاتمہ ہو،تو کرم الٰہی سے امید واثق ہو،کہ بلا عذاب،داخل جنت کیا جائے۔یہی وہ فلاح ہے جس کی تلاش کا حکم ہے کہ **سابقوا الی مغفرۃ من ربکم و جنۃ عرضھا کعرض السماء والارض۔** ترجمہ: جلدی کرو اپنے رب کی مغفرت اور اس کی جنت کی طرف، جس کی چوڑائی آسمان وزمین کے پھیلاؤ کی مانند ہے۔‘‘(ج:۲۱ص:۵۰۲)

فلاح مطلق کی ان مذکورہ صورتوں کو فلاح ایمان سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان مذکورہ صورتوں میں نجات تک رسائی کے لیے ایمان ہی مدار ہے۔

فلاح مطلق کی چوتھی صورت کی صاحب فتاویٰ رضویہ نے پھر دو قسمیں کی ہیں،جو مندرجہ ذیل ہیں:

(۱)قسم اول جس کو فلاح ظاہر کا نام دیا ہے۔(۲) دوسری قسم جس کو فلاح باطنی سے یاد فرمایا ہے۔فلاح ظاہر کو فلاح تقوی اور فلاح باطنی کو فلاح احسان بھی کہا جاتا ہے، امام احمد رضا قادری نے فلاح ظاہر کو یوں بیان کیا ہے:

فلاح ظاہر یعنی فلاح تقوی کا بیان

فلاح ظاہر جو فلاح ایمان کے مقابلے میں دوسری قسم ہے اور فلاح ایمان کی چوتھی صورت کی طرف نظر کرتے ہوئے جو اس کا مقسم ہے،پہلی قسم ہے،اس کو فلاح ظاہر کہے جانے کی

وجہ یہ ہے کہ اللہ ورسول نے جن کاموں کا حکم دیا ہے اور جن کاموں سے روکا ہے، جن میں قلبی اور باطنی امراض بھی شامل ہیں، مثلاً بغض وحسد، عجب وریا وغیرہ۔ ان تمام احکام وامراض کا شرع نے واضح طور پر ذکر کردیا ہے۔ ان کے سارے احکام ظاہر ہیں، جن پر عمل کر کے انسان فلاح ظاہر یعنی فلاح تقوی تک پہنچ سکتا ہے۔

(۱) ''اول فلاح ظاہر، حاشا اس سے وہ مراد نہیں کہ نرے ظاہر داروں کو مطلوب، جن کی نظر صرف اعمال جوارح پر مقصور، ظاہر احکام شرع سے آراستہ اور معاصی سے منزہ کرلیا اور متقی و مفلح بن گئے، اگرچہ باطن ریا وعجب، وحسد وکینہ، وحب مدح وحب جاہ، ومحبت دنیا، وطلب شہرت، وتعظیم امراء، وتحقیر مساکین، واتباع شہوات، ومداہنت وکفران نعم، وحرص وبخل وطول امل، وسوئے ظن، وعناد حق اور اصرار باطل، ومکر وغدر وخیانت وغفلت، وقسوت، وطمع وتملق، واعتماد خلق، ونسیان خالق، ونسیان موت، وجرأت علی اللہ ونفاق، واتباع شیطان، وبندگی نفس، ورغبت بطالت وکراہت عمل، وقلت خشیت وجزع، وعدم خشوع، وغضب للنفس، وتساہل فی اللہ وغیرہا مہلکات۔'' (ج:۲۱،ص:۵۰۲)

''حاشا معاملہ پڑنے دیجیے، کون سی ناگفتنی ہے کہ نہ کہیں گے، کون سی ناکردنی ہے کہ اٹھا رکھیں گے، اور پھر بدستور صالح عوام کی کیا گنتی، آج کل بہت علمائے ظاہر اگر متقی ہیں بھی تو اسی قسم کے، **الا من شاء اللہ و قلیل ماھم** میں اسے زیادہ مشرح کرتا، مگر کیا فائدہ کہ حق تلخ ہوتا ہے، اس سے نفع پانا اور اپنی اصلاح کی طرف آنا درکنار، بتانے والے کے الٹے دشمن ہوجاتے ہیں۔''

(ج:۲۱،ص:۵۰۳)

یہاں عوام کے ساتھ علمائے ظاہر دار جنہوں نے افعال جوارح کو ہی سب کچھ سمجھ رکھا ہے اور قلبی امراض سے غافل ہو چکے ہیں، پر اپنے غم وغصہ کا اظہار کرنے کے بعد مزید تحریر کرتے ہیں:

''بالجملہ اس صورت کو فلاح سے علاقہ نہیں، صاف ہلاکت ہے، بلکہ فلاح ظاہر یہ کہ دل وبدن دونوں پر جتنے احکام الٰہیہ ہیں، سب بجالائے، نہ کسی کبیرہ کا ارتکاب کرے، نہ کسی صغیرہ پر مصر رہے، نفس کے خصائل ذمیمہ اگر دفع نہ ہوں تو معطل رہیں، ان پر کاربند نہ ہو، مثلاً دل میں بخل ہے تو نفس پر جبر کر کے ہاتھ کشادہ رکھے، حسد ہے تو محسود کی برائی نہ چاہے۔ علی ھذا القیاس کہ یہ جہاد اکبر ہے اور اس کے بعد مواخذہ نہیں، بلکہ اجر عظیم ہے۔ حدیث میں ہے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

''ثلاث لم تسلم منها هذا الامة الحسد و الظن و الطيرة الا انبئكم بالمخرج منها اذا ظننت فلا تحقق و اذا حسدت فلا تبغ و اذا تطيرت فامض، رواه رسته

فی کتاب الایمان عن الامام الحسن البصری مرسلا و وصله ابن عدی عن ابی هريرة رضی الله تعالٰی عنه عن النبی صلی الله تعالٰی عليه وسلم بلفظ اذا حسدتم فلا تبغوا و اذا ظننتم فلا تحققوا و اذا تطيرتم فامضوا و علی الله فتوکلوا۔'' (کنز العمال، بحوالہ فتاوی رضویہ، ج:۲۱،ص:۴۔۵۰۳)

ترجمہ: تین خصلتیں اس امت سے نہ چھوٹیں گی، حسد، بدگمانی اور بدشگونی، کیا میں تمھیں ان کا علاج نہ بتادوں، بدگمانی آئے تو اس پر کاربند نہ رہو اور حسد آئے تو محسود پر زیادتی نہ کرو اور بدشگونی کے باعث اپنے کام سے باز نہ آؤ اور اللہ ہی پر بھروسہ رکھو۔

''یہ فلاح تقویٰ ہے، اس سے آدمی سچا متقی ہوجاتا ہے، ہم نے اسے فلاح ظاہر بایں معنی کہا کہ اس میں جو کچھ کرنا، نہ کرنا ہے، اس کے احکام ظاہر وواضح ہو چکے ہیں۔ **قد تبین الرشد من الغی۔** (ج:۲۱،ص:۵۰۴)

فلاح احسان کا بیان

علمائے ظاہر کو اپنی ظاہر داری، بدخوئی اور عیب بینی کی عادتوں سے نکل کر، صلاح وتقوی کے میدان میں کمربستہ ہونے کی دعوت دینے کے بعد امام احمد رضا قادری نے فلاح باطنی، جس کو فلاح احسان بھی کہا جاتا ہے، کو بیان کیا، فلاح احسان، فلاح ایمان کی طرف نسبت کرتے ہوئے فلاح کی تیسری قسم بنتی ہے، جب کہ فلاح ایمان کی چوتھی صورت کی طرف نظر کرتے ہوئے دوسری قسم ہے۔

فلاح باطنی، فلاح کی تیسری اور آخری قسم ہے، وہ یہ ہے کہ قلب وقالب رذائل سے بالکل خالی اور فضائل سے اس قدر روشن ومنور ہوجائے کہ **لا مقصود الا اللہ** اور **لا مشهود الا الله** تک رسائی حاصل ہو، اس فلاح کے ذریعے سالک اس مقام پر فائز ہوتا ہے، جہاں مشاہدۂ ربانی کی نعمت سے سرفراز کیا جاتا ہے۔

فلاح تقویٰ میں سالک کو دخول جنت اور جہنم سے نجات حاصل ہوتی ہے۔ جب کہ فلاح احسان میں بلندئ درجات ومقامات قرب ومشاہدات ربانی کے انعام سے سرفراز کیا جاتا ہے، اس سلسلے میں صاحب فتاویٰ رضویہ تحریر کرتے ہیں:

''دوم فلاح باطنی کہ قلب وقالب رذائل سے متخلی اور فضائل سے متجلی کر کے بقایات شرک خفی دل سے دور کیے جائیں، یہاں تک کہ **لا مقصود الا اللہ**، پھر **لا مشهود الا الله** پھر **لا موجود الا الله**، متجلی ہو، یعنی اولاً، ارادۂ غیر سے خالی ہو، پھر غیر نظر سے معدوم ہو، پھر حق حقیقت جلوہ فرمائے کہ وجود اسی کے لیے ہے (یعنی موجود بالذات صرف وہی ہے۔ علیمی) باقی سب ظلال و پرتو (یعنی ارادۂ الٰہی کا ظہور ہیں۔ علیمی) یہ منتہائے فلاح و

فلاح احسان ہے۔فلاح تقویٰ میں تو عذاب سے دوری اور جنت کا چین تھا کہ : **فمن زحزح عن النار و ادخل الجنۃفقد فاز** ۔ جوجہنم سے بچا کر جنت میں داخل کیا گیا وہ ضرور فلاح کو پہنچا۔ اور فلاح احسان اس سے اعظم ہے کہ عذاب کا کیا ذکر، کسی قسم کا اندیشہ وغم بھی ان کے پاس نہیں آتا،**الا ان اولیاء اللہ لاخوف علیھم و لاھم یحزنون**۔'' (ج:۲۱،ص:۵۰۵۔۵۰۴)

''جس کا کوئی پیر نہیں اس کا پیر شیطان ہے'' کی تحقیق اور مرشد کی تقسیم

سائل نے یہ بھی دریافت کیا تھا کہ یہ کہا جاتا ہے کہ جس کا کوئی پیر نہیں، اس کا پیر شیطان ہے، اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟اس کا جواب دیتے ہوئے سب سے پہلے مرشد کی اور بیعت کی قسمیں بیان کرتے ہیں، اس کے بعد بتائیں گے کہ کس فلاح کا حصول بغیر مرشد کے ممکن ہے اور کس فلاح کا حصول مشکل،قریب بہ ناممکن ہے۔اور یہ قول جس میں یہ کہا گیا ہے کہ جس کا کوئی پیر نہیں اس کا پیر شیطان ہے، کا انطباق کب اور کن لوگوں پر ہوگا،ان ساری بحثوں سے پہلے اقسام فلاح کی طرح، مرشد اور بیعت کی قسموں سے بھی آگاہ ہونا ضروری ہے۔بغیر اس کے یہ تمیز مشکل ہوگا کہ سلوک کا کون سا موڑ ہے جہاں یہ کہا جائے گا کہ جس کا کوئی پیر نہیں اس کا پیر شیطان ہے،اس ضمن میں امام احمد رضا قادری علیہ الرحمہ نے مرشد کی دو قسمیں کی ہے:

۱۔مرشد عام ۲۔مرشد خاص

مرشد عام یعنی مرشد مطلق کا بیان

مرشد مطلق جو ہر خاص و عام کے لیے مرشد و ہادی ہے، وہ کتاب اللہ اور مرشد اعظم نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اور ان کی سنت اور اجماع صحابہ وائمہ صالحین اور علمائے راسخین فی العلم کا قیاس ہے۔عوام کا مرشد اقوال علماے راسخین اور علما کا مرشد اقوال ائمہ مرشدین اور ائمہ کا مرشد اقوال صحابہ اور صحابہ کا مرشد رسول اور سنت رسول ہے اور رسول کا مرشد اللہ اور اس کا کلام ہے۔

مرشد مطلق کے بغیر کسی کو چارہ نہیں مرشد خاص بھی اس کا محتاج ہے، اسی لیے مرشد خاص کو مرشد مقید بھی کہا جاتا ہے؛ کیوں کہ مشائخ عظام اور مرشدین کرام حضرات بھی کتاب اللہ، سنت رسول اور اجماع صحابہ وائمۂ ہدیٰ کے محتاج اور اس کے پابند ہیں ۔مرشد مطلق کے تعلق سے امام احمد رضا قادری تحریر فرماتے ہیں:

''مرشد عام کہ کلام اللہ وکلام الرسول وکلام ائمہ شریعت وطریقت وکلام علمائے دین اہل رشد و ہدایت ہے، اسی سلسلہ صحیحہ پر کہ عوام کا ہادی کلام علماء، علماء کا رہنما کلام ائمہ، ائمہ کا

مرشد، کلام رسول، رسول کا پیشوا کلام اللہ جل وعلا وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم،فلاح ظاہر ہو یا فلاح باطن، اسے اس مرشد کے بغیر چارہ نہیں، جو اس سے جدا ہے بلاشبہ کافر ہے یا گمراہ اور اس کی عبادت برباد وتباہ۔'' (فتاویٰ رضویہ،ج:۲۱،ص:۵۰۵)

مرشد خاص یعنی مرشد مقید کا بیان

دوسری قسم مرشد خاص کہ راہ سلوک میں قدم رکھنے والوں اور قرب خدا کے طالبوں اور مشاہدۂ ربانی کے خواستگاروں کے لیے، مرشد عام کے ساتھ مرشد خاص کی بھی ضرورت ہے۔ مرشد خاص جو مرشد اعظم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے نائبین میں سے ہوں گے۔جن کو شیخ اور پیر بھی کہا جاتا ہے، اس کی دو قسمیں ہیں:

۱۔شیخ اتصال ۲۔شیخ ایصال

شیخ اتصال کا بیان

شیخ اتصال، ہر وہ مسلمان مرد ہوسکتا ہے، جو مندرجہ ذیل شرائط کا جامع ہو:

۱۔سنی صحیح العقیدہ؛ اشعری یا ماتریدی میں سے کوئی ہو مگر راسخ العقیدہ ضرور ہو اور اس آیت کریمہ کا مظہر ہو:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ۔ (الحجرات:15)

ایمان والے تو صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لائے، پھر شک میں نہ پڑے اور اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور اپنی جانوں سے جہاد کرتے رہے، یہی وہ لوگ ہیں جو (دعویٰ ایمان میں) سچے ہیں۔

۲۔اوامر کا عالم اور عامل ہو یعنی فرائض وواجبات کو جانتا اور اس پر عمل پیرا ہو۔خواہ مذہباً حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی میں سے کسی بھی مذہب پر ہو۔

۳۔نواہی کا عالم وعامل ہو یعنی حرام قطعی وظنی اور کبیرہ کی معرفت رکھتا ہو اور اس سے بچتا بھی ہو اور صغیرہ پر مصر نہ ہو۔

۴۔اس کے بیعت وصحبت (ایسی صحبت جو ارادت کے ساتھ ہو، یا جو صحبت ارادت سے بدل گئی ہو۔) اور اجازت کا سلسلہ مرشد اعظم نبی کریم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہو۔

شیخ ایصال کا بیان

شیخ ایصال وہی شخص ہوسکتا ہے جو مذکورہ شرائط اربعہ کا جامع ہونے کے ساتھ، نفس کے مفاسد اور شیطان کے مکر اور اس کی باریک چالوں سے اچھی طرح واقف، اور جادۂ علم وعقل کے ساتھ جادۂ عشق

وعرفان کا حامل بھی ہو، شریعت وطریقت کے رموز کے ساتھ، حقیقت ومعرفت کے اسرار سے واقف بھی ہو اور اپنے متعلقین پر شفقت تامہ بھی رکھتا ہو، کہ ان کو عیوب پر مطلع کرے اور شفقت کے ساتھ ان کا علاج بھی اور راہ سلوک میں جو بھی پریشانیاں آئیں ان کو حل کرے۔ جذب وسلوک کی راہ سے خود بھی گزرا، اور اس کی تمام باریکیوں کو جانتا ہو، نہ محض مجذوب ہو اور نہ فقط سالک، کیوں کہ وہ اگر صرف مجذوب ہوگا تو سالکین کی تربیت نہ کر سکے گا، کہ وہ طریقۂ تربیت سے خود ہی واقف نہیں ہے۔ اور اگر فقط سالک ہوگا تو وہ ابھی خود ہی راہ میں ہے، جب وہ خود ہی کامل نہیں تو مکمل کیسے ہو سکتا ہے۔

ان مذکورہ مفاہیم کو امام احمد رضا اپنے الفاظ میں یوں تحریر فرماتے ہیں:

''دوم شیخ ایصال کہ شرائط مذکورہ کے ساتھ مفاسد نفس، النفس کے فسادات ومکائد شیطان ومصائد ہوا سے آگاہ ہو، دوسرے کی تربیت جانتا اور اپنے متوسل پر شفقت تامہ رکھتا ہو کہ اس کے عیوب پر اسے مطلع کرے، ان کا علاج بتائے، جو مشکلات اس راہ میں پیش آئیں حل فرمائے، نہ محض سالک ہو، نہ نرا مجذوب۔ عوارف شریف میں فرمایا، یہ دونوں قابل پیری نہیں، اقول: اس لیے کہ اول خود ہنوز راہ میں ہے، اور دوسرا طریق تربیت سے غافل، بلکہ مجذوب سالک ہو یا سالک مجذوب، اور اول اولیٰ ہے۔''

(فتاویٰ رضویہ، ج:۲۱، ص:۵۰۷)

مذکورہ مفاہیم کو مرشدی حضور داعی اسلام، عارف باللہ شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی ادام اللہ ظلہ علینا یوں فرماتے ہیں:

جو نہ ہو مستغرق باری تمام
اس سے بیعت اور نسبت ہے حرام
اسوۂ حسنہ کا جو حامل نہیں
شیخ درویشی میں وہ کامل نہیں
صاحب علم وعمل ہو شیخ دیں
پیکر صدق وصفا صاحب یقیں
اہل سنت والجماعت سے ہو شیخ
شیخ کامل کی اجازت سے ہو شیخ
علم وعقل وعشق کی دولت بھی ہو
صاحب دل صاحب ثروت بھی ہو

(نغمات الاسرار فی مقامات الابرار، ص:۷۰ مطبوعہ: شاہ صفی اکیڈمی، الہ آباد)

بیعت کا بیان

شیخ مرشد کی دو قسمیں ہیں (۱) مرشد عام، مرشد خاص، پھر خاص کی بھی دو قسمیں بیان کی (۱) مرشد اتصال (۲) مرشد ایصال۔ اس کے بعد یہ جاننا کہ کس فلاح کے لیے کس مرشد کی ضرورت ہے، اس سے قبل بیعت کی قسموں اور سالک کے حوالے سے چند باتوں کا ذہن نشیں ہونا ضروری ہے۔ ہم ذیل میں بیعت وارادت کے حوالے سے گفتگو کرتے ہیں:

بیعت کی دو قسمیں ہیں: ۱۔ بیعت تبرک ۲۔ بیعت ارادت

بیعت تبرک کا بیان

بیعت تبرک وہ بیعت ہے جس کے ذریعے صرف برکت کے حصول کی نیت کی جائے، اس کے لیے بھی صالح نیت ہونا ضروری ہے۔ اس بیعت کے لیے شیخ خاص، صاحب اتصال جو شرائط شیخی یعنی شرائط اربعہ کا جامع ہو کافی ہے۔ اس ضمن میں آپ تحریر فرماتے ہیں:

''اول بیعت برکت کہ صرف تبرک کے لیے داخل سلسلہ ہو جانا، آج کل عام بیعتیں یہی ہیں، وہ بھی نیک نیتوں کی، ورنہ بہتوں کی بیعت دنیاوی اغراض فاسدہ کے لیے ہوتی ہے، وہ خارج از بحث ہے، اس بیعت کے لیے شیخ اتصال کہ شرائط اربعہ کا جامع ہو، بس ہے۔''

(فتاویٰ رضویہ، ج:۲۱، ص:۵۰۷)

آپ فرماتے ہیں کہ آج کل عام بیعتیں تبرکاً ہی ہیں وہ بھی نیک نیتوں کی، یہ آج سے تقریباً ایک سو سولہ سال پہلے کی بات ہے، آج کیا حال ہوگا؟ واللہ اعلم بالصواب۔

اس کے بعد آپ نے اپنے مذکورہ باتوں کی تاکید میں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہٗ کی معروف کتاب ''عوارف المعارف'' سے مندرجہ ذیل اقتباس نقل کیا:

''سیدنا شیخ الشیوخ شہاب الحق والدین سہروردی رضی اللہ تعالیٰ عنہ عوارف المعارف شریف میں فرماتے ہیں: **واعلم ان الخرقة خرقتان خرقة الارادة وخرقة التبرک والاصل الذی قصده المشایخ للمریدین خرقة الارادة وخرقة التبرک تشبه بخرقة الارادة فخرقة الارادة للمرید الحقیقی وخرقة التبرک للمتشبه ومن تشبه بقوم فهو منهم**۔ ترجمہ: واضح ہو کہ خرقے دو ہیں: خرقۂ ارادات وخرقۂ تبرک، مشائخ کا مریدوں سے اصل مطالبہ خرقۂ ارادت ہے اور خرقۂ تبرک کو اس سے مشابہت ہے تو حقیقی مرید کے لئے خرقۂ ارادت ہے اور مشابہت چاہنے والوں کے لیے خرقۂ تبرک اور جو کسی قوم سے مشابہت چاہے وہ انہی میں ہے (عوارف المعارف، الباب الثانی عشر، مطبعة المشهد الحسینی القاهرہ، ص:۹۷ بحوالہ فتاویٰ رضویہ، ج:۲۱، ص:۵۰۸)

بیعت ارادت کا بیان

''دوم بیعت ارادت کہ اپنے ارادہ واختیار سے یکسر باہر ہوکر، اپنے آپ کو شیخ مرشد، ہادی برحق ،واصل حق کے ہاتھ میں بالکل سپرد کردے، اسے مطلقاً اپنا حاکم و مالک اور متصرف جانے، اس کے چلانے پر راہ سلوک چلے، کوئی قدم بے اس کی مرضی کے نہ رکھے، اس کے لیے بعض احکام یا اپنی ذات میں خود اس کے کچھ کام، اگر صحیح نہ معلوم ہوں، انھیں افعال خضر علیہ الصلٰوۃ والسلام کے مثل سمجھے، اپنے عقل کا قصور جانے، اس کی کسی بات پر دل میں بھی اعتراض نہ لائے، اپنی ہر مشکل اس پر پیش کرے، غرض اس کے ہاتھ میں مردہ بدست زندہ ہوکر رہے۔

یہ بیعت سالکین ہے اور یہی مقصود مشائخ مرشدین ہے۔ یہی اللہ عزوجل تک پہنچاتی ہے، یہی حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ وسلم سے لی ہے، جسے سیدنا عبادہ بن صامت انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ :**بایعنا رسول اللہ صلی اللہ تعالٰی علیہ وسلم علی السمع والطاعۃ فی العسر والیسر والمنشط والمکرہ وان لاننازع الامر اھلہ**۔ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اس پر بیعت کی، کہ ہر آسانی ودشواری، ہرخوشی وناگواری میں حکم سنیں گے اور اطاعت کریں گے اور صاحب حکم کے کسی حکم میں چوں وچرا نہ کریں گے۔ (صحیح البخاری، کتاب الفتن، باب قول النبی ﷺ ستر ون بعدی اموراً، قدیمی کتب خانہ کراچی، ۲/ ۱۰۴۵ بحوالہ فتاویٰ رضویہ، ج:۲۱، ص:۵۰۹)

شیخ ہادی کا حکم، رسول کا حکم ہے اور رسول کا حکم، اللہ کا حکم اور اللہ کے حکم میں مجال دم زدن نہیں۔ اللہ عزوجل فرماتا ہے: **وما کان لمؤمن ولامؤمنۃ اذا اقضی اللہ ورسولہ امرا ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم ومن یعص اللہ ورسولہ فقد ضل ضلا لامبینا**۔ (القرآن، ۳۳/ ۳۶) کسی مسلمان مرد وعورت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ جب اللہ ورسول، کسی معاملہ میں کچھ فرمادیں، تو پھر انھیں کام کا کوئی اختیار رہے اور جو اللہ ورسول کی نافرمانی کرے وہ کھلا گمراہ ہوا۔ عوارف شریف میں ارشاد فرمایا :**دخولہ فی حکم الشیخ دخولہ فی حکم اللہ ورسولہ واحیاء سنۃ المبایعۃ**۔ شیخ کے زیر حکم ہونا، اللہ ورسول کے زیر حکم ہونا ہے اور اس بیعت کی سنت کا زندہ کرنا۔ نیز فرمایا :**ولایکون ھذا الالمرید حصر نفسہ مع الشیخ وانسلخ من ارادۃ نفسہ وفنی فی الشیخ بترک اختیار نفسہ**۔ یہ نہیں ہوگا مگر اس مرید کے لیے جس نے اپنی جان کو شیخ کی قید میں کردیا اور اپنے ارادے سے بالکل باہر نکل گیا اور اپنا اختیار چھوڑ کر شیخ میں فنا ہوگیا۔

(عوارف المعارف، الباب الثانی عشر، مطبعہ المشھد الحسینی، قاہرہ، ص:۷۸، بحوالہ فتاویٰ رضویہ، ج:۲۱، ص:۵۰۹-۵۱۰)

پیروں پر اعتراض

پیروں پر اعتراض کے سلسلے میں صاحب فتاویٰ رضویہ نے ''عوارف شریف'' سے مندرجہ ذیل اقتباس کو نقل کیا ہے جو اہل محبت وادب کے لیے کافی ہے۔

''فرمایا: **ویحذر الاعتراض علی الشیوخ فانہ السم القاتل للمریدین، وقل ان یکون مرید یعترض علی الشیخ بباطنہ فیفلح، ویذکر المرید فی کل ما اشکل علیہ من تصاریف الشیخ قصۃ الخضر علیہ السلام کیف کان یصدر من الخضر تصاریف ینکرھا موسی، ثم لما کشف لہ عن معناھا بان لموسی وجہ الصواب فی ذٰلک فھکذا ینبغی للمرید ان یعلم ان کل تصرف اشکل علیہ صحتہ من الشیخ عند الشیخ فیہ بیان وبرھان للصحۃ**۔ پیروں پر اعتراض سے بچے، کہ یہ مریدوں کے لئے زہر قاتل ہے۔ کم کوئی مرید ہوگا، جو اپنے دل میں شیخ پر کوئی اعتراض کرے، پھر فلاح پائے، شیخ کے تصرفات سے جو کچھ اسے صحیح نہ معلوم ہوتے ہوں، ان میں خضر علیہ الصلاۃ والسلام کے واقعات یاد کرلے، کیونکہ ان سے وہ باتیں صادر ہوتی تھیں بظاہر جن پر سخت اعتراض تھا (جیسے مسکینوں کی کشتی میں سوراخ کردینا، بے گناہ بچے کو قتل کردینا) پھر جب وہ اس کی وجہ بتاتے تھے تو ظاہر ہوجاتا تھا کہ حق یہی تھا، جو انھوں نے کیا، یوں ہی مرید کو یقین رکھنا چاہئے کہ شیخ کا جو فعل مجھے صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ شیخ کے پاس اس کی صحت پر دلیل قطعی ہے۔''

(عوارف المعارف، الباب الثانی عشر، مطبعہ، المشھد الحسینی، قاہرہ، ص:۷۹، بحوالہ، فتاوی رضویہ، ج:۲۱ ص ۵۱۰)

خلاصہ

شیخ ومرشد اور بیعت کی قسموں کو بیان کرنے کے بعد خلاصے کے طور پر امام احمد رضا قادری تحریر فرماتے ہیں:

"جب یہ اقسام معلوم ہولیے تو اب حکم مسئلہ کی طرف چلئے، مطلق فلاح کے لیے مرشد عام کی قطعاً ضرورت ہے، فلاح تقویٰ ہو یا فلاح احسان اس مرشد سے جدا ہوکر ہرگز نہیں مل سکتی، اگرچہ مرشد خاص رکھتا، بلکہ خود مرشد خاص بنتا ہو۔"

(فتاویٰ رضویہ، ج:۲۱، ص:۵۱۱)

مرشد عام یعنی مرشد اعظم صلی اللہ علیہ وسلم جو تمام عالم کے لیے ہادی بنا کر بھیجے گئے ان پر ایمان لانا اور ان کو اپنا مرشد وہادی جاننا ہر اس شخص پر ضروری ہے جو فلاح کے کسی درجے پر فائز ہونا چاہتا ہو، خواہ فلاح ایمان ہو، یا فلاح احسان، مرشد عام کے بغیر کسی بھی فلاح کا حصول محال ہے۔

فلاح کی تین قسمیں کی گئیں ہیں:

۱۔فلاح ایمان ۲۔فلاح تقویٰ ۳۔فلاح احسان

آپ فلاح تقویٰ اور یہ قول ''جس کا کوئی پیر نہیں اس کا پیر شیطان ہے'' کے سلسلے میں تحریر کرتے ہیں:

''اس کے لیے (یعنی فلاح تقوی کے حصول کے لیے) مرشد خاص کی ضرورت بایں معنی نہیں کہ بےاس کے یہ فلاح مل ہی نہ سکے، یہ جیسا کہ اوپر گزرا، فلاح ظاہر ہے، اس کے احکام واضح ہیں، آدمی اپنے علم سے، یا علما سے پوچھ پوچھ کر متقی بن سکتا ہے، اعمال قلب میں اگرچہ بعض دقائق ہیں مگر محدود، اور کتب ائمہ مثلاً امام ابوطالب مکی وامام حجۃ الاسلام غزالی وغیرہما میں مشروح، تو بے بیعت بھی اس کی راہ کشادہ اور اس کا دروازہ مفتوح، یہ جب کہ اسی قدر پر اقتصار کرے، تو ہم اوپر بیان کر آئے کہ غیر متقی سنی بھی بے پیرا نہیں۔ متقی کیوں کر بے پیرا، یا معاذ اللہ! مرید شیطان ہوسکتا ہے، اگرچہ کسی خاص کے ہاتھ پر بیعت نہ کی ہو، کہ یہ جس راہ میں ہے اس میں مرشد عام کے سوا، مرشد خاص کی ضرورت ہی نہیں، تو جتنا پیرا سے درکار رہے، حاصل ہے، تو اولیا کا قول دوم کہ جس کے لیے شیخ نہیں اس کا شیخ شیطان ہے، اس سے متعلق نہیں ہوسکتا۔ اور قول اول کہ بے پیرا فلاح نہیں پاتا، یہ تو بداہتاً اس پر صادق نہیں، فلاح تقویٰ بلاشبہ فلاح ہے، اگرچہ فلاح احسان اس سے اعظم واجل ہے۔'' (فتاویٰ رضویہ، ج:۲۱،ص:۱۳۔۵۱۴)

جس طرح فلاح ایمان تک رسائی کے لیے مرشد خاص کی ضرورت نہیں، مرشد عام ہی کافی ہے، اسی طرح فلاح تقویٰ کے حصول کے لیے بھی مرشد عام کافی ہے، اس راہ میں مرشد خاص بنانا ضروری نہیں، کیوں کہ اس راہ کی تمام باریکیوں اور قوانین کو شرع مطہرہ اور صوفیہ کرام نے ظاہر و مشرح کردیا ہے اور تقویٰ یعنی احکام الٰہی کو بجالانا خواہ اس کا تعلق جسمانی و بدنی افعال و اعمال سے ہو، یا قلبی امراض سے، بندۂ مومن شریعت کے قوانین اور تشریحات کی روشنی میں عمل پیہم اور جہد مسلسل کے ذریعے اس تقویٰ کو حاصل کرسکتا ہے، مرشد خاص کا محتاج نہیں، اگرچہ مرشد خاص کے بغیر قلبی امراض سے اپنے آپ کو پاک و منزہ کرنا مشکل ضرور ہے لیکن محال نہیں، جس کے بغیر فلاح تقویٰ کے حصول کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ فلاح تقویٰ نام ہے بدنی اور قلبی صالحیت کے مجموعے کا، فلاح تقویٰ کا حصول مومن کی کامیابی ہے مگر فلاح احسان اس کامیابی سے زیادہ بلند اور عظیم ہے۔ اخیر میں فلاح احسان کے بارے میں امام احمد رضا قادری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

''فلاح احسان کے لیے بے شک مرشد خاص کی حاجت ہے، اور وہ بھی شیخ ایصال کی، شیخ اتصال اس کے لیے کافی نہیں، اور اس کے ہاتھ پر بھی بیعت ارادت ہو، بیعت برکت یہاں بس نہیں، اس راہ میں وہ شدید باریکیاں اور سخت تاریکیاں ہیں، کہ جب تک کامل، مکمل اس راہ کے جملہ نشیب وفراز سے آگاہ و ماہر حل نہ کرے، حل نہ ہوں گی، نہ کتب سلوک کا مطالعہ کام دے گا، کہ یہ دقائق تقوی کی طرح محدود نہیں، جن کا ضبط کتاب کر سکے، **الطرق الی اللہ بعدد انفاس الخلائق**، اللہ تک پہنچنے کے اتنے راستے ہیں، جتنی کہ تمام مخلوقات کی سانسیں۔''

(عوارف المعارف، باب:۱۲، مطبعہ المشہد الحسینی، قاہرہ، ص:۷۹، بحوالہ فتاویٰ رضویہ، ج:۲۱، ص:۵۱۶)

یہ وہ راہ ہے جس راہ کے چلنے والے کے لیے مرشد عام کے ساتھ مرشد خاص بھی رکھنا ضروری ہے، بغیر اس کے چارہ نہیں، وہ مرشد خاص جو صاحب ایصال یعنی مجذوب سالک یا سالک مجذوب ہو، جذب وسلوک کی راہ خود چلا ہو، اور اس کی باریکیوں سے اچھی طرح واقف بھی ہو۔

اس راہ کے طالبوں کو یہ بات بھی یاد رہے کہ فلاح احسان تک پہنچنے کے لیے شیخ و مرشد کا کامل و مکمل ہونا ہی کافی نہیں، بلکہ طالب وسالک کا مرید حقیقی ہونا بھی لازم ہے۔ طالب صادق کی ارادت اگر مضبوط ہو تو ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اس فلاح تک رسائی کے لیے شیخ اتصال ہی کافی ہوجائے، من طلب وجد۔ طلب کا صدق اور ارادت کی پختگی ازحد ضروری ہے، اس راہ میں مرید صادق ہی کامیاب ہوتا ہے۔ فلاح احسان کی راہ میں کچھ وہ باریکیاں ہیں جن کی تشریحات شرع مطہرہ اور کتب سلوک میں بھی موجود نہیں، اور مرشد عام اس فلاح کے حصول میں کافی نہیں، یہ مرشد عام کا عجز نہیں ہے، بلکہ اس راہ کی باریکیوں کے سمجھنے میں سالک کا عجز ہے، ورنہ مرشد عام میں سب کچھ موجود ہے، مگر ان تک رسائی مرشد خاص کے بغیر عادتاً محال ہے۔ جو سالک اس راہ میں قدم رکھے اور مرشد خاص نہ بنائے، تو یہی امید ہے کہ شیطان اس کو اچک لے جائے گا، اور بہت ممکن ہے کہ فلاح احسان تو دور ایمان بھی جاتا رہے گا، یہی وہ راہ ہے جہاں صوفیہ کا وہ قول جس میں کہا گیا ہے کہ ''جس کا کوئی پیر نہیں اس کا پیر شیطان ہے'' کا صدق وانطباق سمجھ میں آتا ہے، اس سلسلے میں امام احمد رضا قادری علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

''اور ہر راہ کی دشواریاں، باریکیاں، گھاٹیاں جدا ہیں، جن کو نہ یہ خود سمجھ سکے گا، نہ کتاب بتائے گی، اور وہ پرانا دشمن مکار پرفن ابلیس لعین ہر وقت ساتھ ہے، اگر بتانے والا، آنکھیں کھولنے والا، ہاتھ پکڑنے والا، مدد فرمانے والا، ساتھ نہ ہو تو خدا جانے کس کھوہ میں گرائے، کس گھاٹی میں ہلاک کرے، ممکن ہے کہ سلوک در کنار معاذ اللہ ایمان تک ہاتھ سے جائے، جیسا کہ بارہا واقع ہوچکا ہے۔'' (فتاویٰ رضویہ، ج:۲۱، ص:۵۱۶)

سراج الائمہ امام اعظم ابوحنیفہ قدس سرہٗ کے حوالے سے یہ بات بہت مشہور ہے جس کو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی جیسے محققین علمانے بھی اپنی کتابوں میں تحریر کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: **لولا السنتان لهلک النعمان** ۔اگر میری زندگی کے وہ دو سال نہ ہوتے تو نعمان ہلاک ہوجاتا۔شارحین کے بقول امام اعظم کی زندگی کے وہ خاص دوسال کا زمانہ وہ مبارک زمانہ ہے جو حضرت امام جعفر صادق قدس سرہ کی صحبت فیض میں گزرا۔گویا امام اعظم جیسے لوگوں کا تو یہ حال ہے کہ فرماتے ہیں کہ اگر دوسال حضرت امام جعفر صادق قدس سرہٗ کی صحبت میں نہ رہا ہوتا تو ہلاک ہوجاتا۔افسوس! کہ ہم حنفی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور صادقین کی صحبت سے بھاگتے ہیں۔ایک حنفی حقیقت میں کامل حنفی اور نعمانی اسی وقت ہوسکتا ہے جب کسی صادق کی صحبت کو لازم پکڑے، صادق کی پہچان یہ ہے کہ اس کی صحبت میں دل کو سکون اور روح کو تازگی حاصل ہو، آخرت کا تصور مستحکم ہو اور دنیا کی بے ثباتی واضح ہو، اللہ یاد آئے اور ہمارے اس دل کو روشنی ملے جو گناہوں کی زنگ سے سیاہ پڑ چکا ہے۔مردہ دل جس کی صحبت میں زندہ ہوجائے اور اس کے اندر اپنے مالک حقیقی کی لقا کا اشتیاق پیدا ہوجائے، وہی صادق ہے۔اس کی صحبت ہم کو ہلاکت سے بچا سکتی ہے اور اللہ رب العزۃ کے قرب خاص تک لے جا سکتی ہے۔

(نوٹ: یہ مقالہ نقاء السلافة فی احکام البیعة و الخلافة نامی رسالے کی روشنی میں تیار کیا گیا ہے ۔رسالے کا یہ تاریخی نام ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳۱۹ھ میں یہ رسالہ تحریر کیا گیا۔فتاویٰ رضویہ جدید ایڈیشن، مطبع: مرکز اہل سنت برکات رضا، پور بندر گجرات، سنہ طباعت: شعبان المعظم ۱۴۲۴ھ/ اکتوبر ۲۰۰۳ء کی اکیسویں جلد میں یہ رسالہ شامل ہے، جو صفحہ ۴۶۱ سے ۵۲۰ تک ۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔)

○○○

ضیاء الرحمٰن علیمی

تصوف اور صوفیہ قاضی شوکانی کی نظر میں

تیرہویں صدی ہجری میں جو شخصیتیں اپنی گونا گوں افکار ونظریات کی بنیاد پر علما کے درمیان بحث کا موضوع بنی رہیں، ان میں ایک نام قاضی شوکانی کا بھی ہے، جنھوں نے اپنے مختلف ادوار میں اپنی ہی آرا کی تردید کی اور کبھی کسی مسلک ومشرب سے جڑے تو دوسرے مرحلے میں اس کی مخالفت بھی کی، اس طرح ان کا تعلق کس جماعت سے رہا، ایک معمہ بنا رہا، ہم یہاں پر ان کی ہچکولے کھاتی فکری وعلمی زندگی کا ایک مختصر جائزہ پیش کر رہے ہیں۔

نام ونسب

قاضی شوکانی نے جہاں اپنی سوانح بیان کی ہے وہاں اپنا نام محمد بن علی بن محمد بن عبداللہ شوکانی صنعانی لکھا ہے۔(۱) اور جہاں اپنے والد کے احوال زندگی کو بیان کیا ہے وہاں اپنے والد کا نام علی بن محمد بن عبداللہ شوکانی نقل کیا ہے اور اپنا سلسلۂ نسب حضرت آدم علیہ الصلاۃ والسلام تک پہنچایا ہے۔(۲) ہجرۃ شوکان نامی ایک مقام جو کہ صنعا سے ایک دن سے کم کی مسافت پر واقع ہے، کی طرف نسبت کرتے ہوئے شوکانی کہلاتے ہیں۔(۳) آپ کے والد آپ کی ولادت سے قبل ہی صنعا ہجرت کر گئے تھے چنانچہ صنعا میں ہی ۲۸/ذوالقعدہ ۱۱۷۳ھ/ ۱۲ جولائی ۱۷۶۰ء کو آپ کی ولادت ہوئی (۴) اور اسی وجہ سے صنعانی بھی کہلائے۔

تعلیم وتربیت

چوں کہ شوکانی کے والد صنعا کے قاضی اور اس زمانے کے بڑے علما میں تھے اس لیے آسودہ حالی کے ماحول میں پرورش پائی، ان کی تعلیم وتربیت اور شخصیت سازی میں ان کے والد کا بڑا رول رہا، کیوں کہ جہاں ایک طرف شفیق باپ نے اپنے بیٹے کو کسب ومعاش کے مسائل سے بے نیاز کر کے ان کی توجہ تعلیم کی طرف مرکوز کی (۵) تو وہیں وہ علمی طور پر ان کے استاذ بھی رہے۔ چنانچہ انھوں نے

دوسرے طلبہ کے ساتھ اپنے والد سے کم سنی میں شرح الازہار اور شرح الناظری پڑھی۔(۶)

بچپن میں متعدد اساتذہ سے قرآن پڑھنا سیکھا، صنعا کے مشائخ کی ایک جماعت سے علم تجوید حاصل کیا۔ باضابطہ تعلیم کے آغاز سے قبل ہی اس زمانے میں رائج متون میں امام فقیہ مہدی کی ازہار، عصیفر ی کی مختصر الفرائض، حریری کی ملحقہ، ابن حاجب کی کافیہ، شافیہ، تفتازانی کی تہذیب، قزوینی کی تلخیص المفتاح، اصول فقہ میں ابن حاجب کی مختصر المنتھی، قرأت میں منظومۃ الجزری، عروض میں منظومہ الجزاز، عضد کی آداب البحث والمناظرۃ اور ان جیسے دوسرے متون کو حفظ کرلیا۔(۷) اور پھر پوری توجہ اور کامل انہاک کے ساتھ تحصیل علم کی طرف متوجہ ہوئے۔ شوکانی کی خوش قسمتی یہ تھی کہ ان کو اچھے اساتذہ بھی ملے جنھوں نے ان کی تعلیم میں خصوصی دل چسپی دکھائی اور پھر ایک وقت وہ آیا جب کہ شوکانی نابغۂ عصر کی حیثیت سے علمی دنیا میں متعارف ہوئے۔ ان کا تعلیمی سلسلہ صنعا ہی میں جاری رہا کیوں کہ ان کے والد کی طرف سے سفر کی اجازت نہیں تھی،(۸) چنانچہ وہیں رہ کر انھوں نے علوم متداولہ مثلاً قرأت، تفسیر، فقہ، اصول فقہ، حدیث، تاریخ، ادب اور علوم عربیہ وغیرہ کی تکمیل کی۔

اساتذہ ومشائخ

جو کتابیں انھوں نے مختلف اساتذہ سے پڑھیں یا سنیں ان کی ایک طویل فہرست ہے اس کی تفصیل خود انھوں نے اپنی کتاب البدر الطالع میں بیان کی ہے۔ ان کے علاوہ بہت سی ایسی کتابیں بھی ہیں جن کی اجازت انھیں مختلف اساتذہ عصر سے حاصل تھی، ان مقروءات ومسموعات اور اجازات کی پوری تفصیل **اتحاف الاکابر باسناد الدفاتر** نامی ان کے ایک مستقل رسالے میں دیکھی جاسکتی ہے۔(۹)

قاضی شوکانی نے البدر الطالع میں جن اساتذہ کا ذکر کیا ہے ان کی تعداد سترہ ہے۔ جن میں چار نمایاں نام یہ ہیں:

۱۔علی بن محمد الشوکانی (۱۲۱۱-۱۱۳۰ھ)(۱۰)

۲۔عبدالقادر بن احمد الکوکبانی (۱۱۳۵-۱۲۰۷ھ)(۱۱)

۳۔حسن بن اسمٰعیل المغربی (۱۲۰۸-۱۱۴۰ھ)(۱۲)

۴۔احمد بن محمد الحرازی (۱۲۲۷-۱۱۵۸ھ)(۱۳)

شوکانی کی زندگی میں ان چاروں اساتذہ کا کردار مختلف حیثیتوں سے ہے۔ چنانچہ شوکانی کے والد ان کی شخصیت میں بنیاد کی اینٹ کی حیثیت رکھتے ہیں، عبدالقادر کوکبانی کا رول علمی گیرائی اور تحقیقی شان پیدا کرنے کے لحاظ سے بہت نمایاں ہے، روحانیت اور اخلاق وتزکیہ میں حسن بن اسمٰعیل مغربی کی چھاپ گہری ہے تو فقہ وفتویٰ میں احمد بن محمد حرازی کا کردار مثالی ہے۔

تلامذہ

شوکانی نے افادہ اور فیض رسانی کا سلسلہ طالب علمی کے زمانے میں ہی شروع کردیا تھا۔ چنانچہ صنعا کی جامع مسجد اور مدرسہ شرف الدین میں ان کی درسگاہ لگتی۔ دن بھر میں طلبہ کی دس کلاسیز ہوتی۔ عمر کی بیسویں دہلیز پر قدم رکھتے ہی بغیر کسی عوض کے فقہ وفتویٰ کی خدمت انجام دینے کے لیے، ۳۶ سال کی عمر میں نہ چاہتے ہوئے بھی دینی تقاضوں کے پیش نظر منصب قضا کو قبول کرلیا۔(۱۴) اس طرح وہ اپنے علم سے ایک عالم کو سیراب کرتے رہے۔ چنانچہ ان کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کرنے والوں کی بھی ایک لمبی تعداد ہے۔ ان میں بعض کا ذکر البدر الطالع میں موجود ہے لیکن ان میں سے چار نام ایسے ہیں جن پر شوکانی کا اثر سب سے نمایاں ہے۔ وہ یہ ہیں:

۱۔محمد بن حسین شنجی ذماری (۱۲۰۰-۱۲۸۶ھ)(۱۵)

۲۔عبدالرحمن بن احمد بن الحسن بھلکی ضمدی (۱۱۸۰-۱۲۲۷ھ)(۱۶)

۳۔محمد بن احمد بن سعد سودی (۱۱۷۸-۱۲۳۶ھ)(۱۷)

۴۔لطف اللہ بن احمد جحاف (۱۱۸۹-۱۲۴۳ھ)(۱۸)

علمی آثار

شاگردوں کی ایک بڑی جماعت تیار کرنے کے علاوہ شوکانی نے اپنے قلم سے علم وفن اور اسلامی علوم کی بھی بڑی خدمت انجام دی اور اپنی تالیفات کا ایک بڑا ذخیرہ یادگار چھوڑا، ان میں سے بعض کا ذکر خود انھوں نے البدر الطالع میں بڑے فخر کے ساتھ کیا ہے اور اس بات کی صراحت کی ہے کہ جن کتابوں کا نام یہاں انھوں نے لیا ہے ان سے کہیں زیادہ وہ کتابیں ہیں جن کا انھوں نے تذکرہ نہیں کیا ہے۔(۱۹)

ذیل میں ان کی چند تصانیف کے اسما ذکر کیے جاتے ہیں: ۱۔**نیل الاوطار**، ۲۔**فتح القدیر فی علوم التفسیر**، ۳۔**قطر الولی علی حدیث الولی**، ۴۔**البدر الطالع بمحاسن من بعد القرن السابع**، ۵۔**در السحابة فی مناقب القرابة و الصحابة**، ۶۔**الدر الثمین فی اثبات وصایة امیر المؤمنین**، ۷۔**الصوارم الحداد القاطعة لعلائق مقالات ارباب الاتحاد**، ۸۔**زهر النسرین الفاتح بفضائل العمرین**، ۹۔**ارشاد الغبی الی مذهب اهل البیت فی اصحاب النبی**، ۱۰۔**الفوائد المجموعة فی الاحادیث الموضوعة**، ۱۱۔**شرح الصدور فی تحریم رفع القبور**، ۱۲۔**الدر النضید فی اخلاص التوحید**، ۱۳۔**الدواء العاجل فی دفع العدو الصائل**۔(۲۰)

ان کتابوں کے علاوہ ان کی تالیفات کے حوالے سے سب سے بڑا کام یہ ہوا ہے کہ ان

کے فتاویٰ کا مجموعہ جس میں ان کے تمام بڑے رسائل بھی شامل ہیں ۴۳۷ ۶۳ صفحات پر ابو مصعب محمد صبحی بن حسن حلاق کی تحقیق سے ۲۰۰۰ء میں یمن سے شائع ہو چکا ہے۔

وفات

۶۴ سال سات ماہ کی زندگی گزارنے کے بعد ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۵ء میں علم وفضل کا یہ آفتاب وماہتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا اور صنعا کے مشہور ومعروف قبرستان خزیمہ میں ہمیشہ کے لیے آسودۂ خاک ہوگیا۔(۲۱)

قاضی شوکانی کا عقیدہ

شوکانی کے عہد میں یمن میں جو اسلامی جماعتیں اپنا اثر ورسوخ رکھتی تھیں ان میں روافض، زیدیہ (شیعوں کی ایک معتدل اور اہل سنت سے قریب جماعت جو صحابہ پر سب وشتم نہیں کرتی) وہابیہ (یہ جماعت اس زمانے میں ظاہر ہو رہی تھی) اور صوفیہ کی جماعت سب سے ممتاز ہے۔ چنانچہ قانون فطرت کے مطابق شوکانی بھی اپنے گردوپیش کے مذہبی رجحانات سے متأثر ہوئے، مجموعی طور پر ہم ان کے معتقدات کو زیدیہ، سلفیہ، صوفیہ تینوں جماعتوں کے معتقدات کا مجموعہ قرار دے سکتے ہیں۔ ان معتقدات کو انھوں نے تقلید کی بنا پر نہیں بلکہ اپنے علم وتحقیق کی بنا پر اختیار کیا تھا اور جو معتقدات ان کو باطل نظر آئے، انہوں نے شدت کے ساتھ ان کی تردید بھی کی جس میں خصوصیت کے ساتھ روافض شامل ہیں۔(۲۲) اور بعض مقامات پر انھوں نے بعض متصوفین کے عقائد، اعمال واشغال عقائد پر بھی کاری ضرب لگائی ہے۔

زیدی اصل

شوکانی ایک زیدی عقائد سے تعلق رکھنے والے گھرانے میں پیدا ہوئے اور اسی ماحول میں تعلیم وتربیت پائی اس لیے ان کا زیدی عقائد سے متأثر ہونا فطری تھا۔ زیدی مذہب شیعہ مذہب سے اس بنا پر بھی ممتاز ہے کہ ان کے یہاں فکری آزادی پائی جاتی ہے اور اجتہاد ان کے نزدیک کوئی شجر ممنوعہ نہیں بلکہ ان کے یہاں اجتہاد پر ابھارا جاتا ہے اور اسی وجہ سے زیدیہ میں بہت سے ایسے علما پیدا ہوئے جنھوں نے اجتہاد کے نتیجے میں زیدی مذہب چھوڑ کر اہل سنت وجماعت کے معتقدات کو اختیار کرلیا۔ یہی معاملہ شوکانی کے ساتھ بھی پیش آیا کہ انھوں نے فقہ تو زیدی مذہب کے مطابق ہی سیکھی لیکن بہت جلد انھوں نے تقلید کی زنجیریں توڑ دیں اور اپنی وسعت کے مطابق قرآن وسنت سے استفادہ اور استنباط عقائد واحکام شروع کر دیا۔(۲۳)

وہابی دعوت کا اثر

جس زمانے میں شوکانی علمی وفکری تربیت کے مراحل سے گزر رہے تھے وہ زمانہ وہابی

تحریک کے نشوونما کا زمانہ تھا، یہ تحریک اب درعیہ کی حدود سے نکل کر پورے نجد بلکہ اطراف کے علاقوں مثلاً حساء، قلیف اور جزیرۂ عرب کے دوسرے اکثر علاقوں میں پھیل چکی تھی۔ ایک دوسری بات یہ تھی کہ زیدی علما اس تحریک کی حمایت کر رہے تھے اور اسی بنا پر دونوں طرف کے سرکاری ذمے داران کے درمیان خط وکتابت کا سلسلہ بھی جاری ہوا۔ چنانچہ شوکانی جو ایک زمانے میں یمنی سلطنت کے قاضی، وزیر اور مشیر بھی تھے انھوں نے بھی مکاتیب اور مراسلت میں بڑا کردار ادا کیا۔(۲۴) جو یمنی علما اس زمانے میں وہابی تحریک سے متأثر ہوئے ان میں ایک بڑا ہی نمایاں نام شوکانی کے دادا استاذ محمد بن اسمٰعیل بن صلاح معروف بہ امیر صنعانی (متوفی: ۱۱۸۲ھ/ ۱۷۶۸) کا بھی ہے انھوں نے پہلے ابن عبدالوہاب کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا جس کا مطلع یہ تھا:

سلام علی نجد و من حل فی نجد وان کان تسلیمی علی البعد لا یجدی

(ترجمہ: نجد اور باشندگان نجد پر سلام ہو اگر چہ دور سے میرا اسلام کوئی نفع پہنچانے والا نہیں ہے)(۲۵)

لیکن بعد میں بہت سے نجدی وفود اور بعض نجدی علما سے ان کی ملاقات ہوئی، پہلے شیخ عبدالرحمٰن نجدی سے وہابی تحریک کے عقائد اور ان کے سیاہ کارناموں پر ان کو اطلاع ہوئی اور پھر شیخ مرید حنبلی سے ان باتوں کی تصدیق ہوئی اور وہابی تحریک کی حقیقت ان پر منکشف ہوئی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے سابقہ قصیدے سے رجوع کرلیا اور پھر اس کی مذمت کرتے ہوئے یہ قصیدہ لکھا جس کا مطلع یہ ہے:

رجعت عن القول الذی قلت فی النجدی فقد صح لی فیه خلاف الذی عندی

(ترجمہ: میں نے نجدی کے بارے میں جو قول کیا تھا اس سے رجوع کر رہا ہوں کیوں کہ جو علم مجھ کو تھا اس کے برخلاف بات صحت کے ساتھ ثابت ہوگئی)

ان اشعار میں جہاں انھوں نے وہابی تحریک کے تکفیری رویے کا ذکر کیا ہے وہیں اس کے سربراہ کو غلو سے کنارہ کش ہونے اور اصلاح قبول کرنے کی دعوت بھی دی۔ بعد میں انھوں نے اپنی کتاب **ارشاد ذوی الالباب الی حقیقة ابن عبدالوهاب** میں اس قصیدے کی شرح کی۔(۲۶)

امیر صنعانی کے علاوہ اور دوسرے بہت سارے علما کے ساتھ یہی پیش آیا کہ انھوں نے آغاز میں وہابی تحریک کی اس بنا پر حمایت کی کہ وہ توحید خالص کے نام پر اٹھی تھی لیکن بعد میں جب حقیقت حال ان پر منکشف ہوئی تو انھوں نے اپنی حمایت کا ہاتھ کھینچ لیا۔

کچھ ایسی ہی صورت حال شوکانی کے ساتھ بھی پیش آئی کہ وہ شروع میں وہابی تحریک کے بڑے معتقد رہے کیوں کہ وہ خود بھی دوسرے تمام علماء کی طرح مزارات پر ہونے والے غلو کے مظاہر کے سخت خلاف تھے لیکن گزرتے ایام کے ساتھ اس تحریک کے حقائق کھلتے گئے

اور پھر آہستہ آہستہ اس تحریک کے حوالے سے ان کی گرم جوشی ختم ہوگئی بلکہ نوبت تنقید تک پہنچ گئی۔ چنانچہ البدرالطالع جس کی تالیف سے وہ اپنی عمر کے بالکل آخری زمانے میں فارغ ہوئے اس میں انھوں نے ابن عبدالوہاب کی سوانح نہیں ذکر کی جب کہ بہت سے دوسرے معاصر علما کی سوانح بیان کی۔ انھوں نے جہاں شریف مکہ کے احوال بیان کیے صرف وہیں ضمناً ابن عبدالوہاب اور اس کی تحریک سے متعلق اپنی معلومات پیش کیں، چنانچہ اسی مقام پر عبدالعزیز بن سعود سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے پہلے انھوں نے **سمعنا** (میں نے سنا ہے) کہہ کر وہابی تحریک کی تعریف کی اور توحید کے حوالے سے ان کی کوششوں کا ذکر کیا پھر انھوں نے **بلغنا** (ہم کو خبر پہنچی ہے) کہہ کر یہ بتایا ہے کہ یہ لوگ کسی نبی اور ولی سے استغاثہ کرنے والوں کی خون ریزی کو حلال سمجھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں کہ ان کے علاوہ اور دوسری باتیں بھی ہم تک پہنچی ہیں جن کی صحت کا صحیح علم اللہ کو ہی ہے۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ خارجی عقیدہ رکھتے ہیں لیکن میرے خیال میں یہ بات صحیح نہیں ہے اور اہل مکہ تو اس کی تکفیر کرتے ہیں اور اس کو کافر قرار دیتے ہیں۔(۲۷)

عبدالعزیز بن سعود کے بارے میں انھوں نے جو اطلاعات جس لب و لہجے اور جن الفاظ میں دی ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو اس تحریک کے بارے میں بہت زیادہ معلومات نہیں اور ان کی اکثر گفتگو سنی سنائی، بلاغات اور ظن وقیاس پر مبنی ہے اور یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ عبدالعزیز بن سعود کی یہ سوانح انھوں نے اسی وقت لکھی ہے جب کہ سعودی لشکر یمن پر حملہ آور نہیں ہوا تھا۔ بعد میں وہابیہ جب یمن پر حملہ آور ہوگئے تو شوکانی کو یہ علم ہوگیا کہ خطرے کی گھنٹی بج چکی ہے اور اگر انھوں نے اس تحریک کے خلاف ایک جملہ بھی اپنی زبان سے نکالا تو وہ اگلے دن ان کے دارالقضاء پہنچ کر انھیں اپنے گھوڑوں سے روند دیں گے۔ چنانچہ انھوں نے ان کے ساتھ ملاطفت اور نرمی کا رویہ اختیار کرلیا۔ الدواء العاجل لدفع العدو الصائل میں وہ بڑی ہنرمندی سے دشمن کو **العدو الصائل** (حملہ آور دشمن) کا خطاب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> یمن کے اطراف میں رونما ہونے والے فتنے کے بارے میں ایک رات میں نے غور و فکر کیا، وہ فتنہ جس کی آگ بھڑک چکی ہے جس کے شرارے اڑ رہے ہیں، جس کی چنگاریاں اڑ اڑ کر باشندگان یمن پر گر رہی ہیں۔ اس فتنے کی وجہ سے ان علاقوں سے دور رہنے والوں کا کم سے کم نقصان یہ ہوا، اقتصادی گراوٹ آئی، روزی کے اسباب منقطع ہوگئے، بہت سارے املاک ضائع ہوگئے، نفیس قسم کے مال کا کوئی خریدار نہیں

> یہ تو دور والوں کا حال ہے اور جن لوگوں پر یہ مصیبت اتری ہے اور جن کو اس فتنے کی چنگاریوں نے خاکستر کیا ہے ان کی تو بات ہی نہ پوچھو اللہ کی پناہ نہ جانے کتنی خون کی ندیاں بہہ گئیں، کتنی جانیں ہلاک ہوگئیں، کتنے عزت داروں کی عزتیں پامال ہوگئیں اور مال مباح کردے گئے۔ جب میں نے ان فتنوں کا تصور کیا تو میرے ذہن نے کام کرنا بند کردیا۔(۲۸)

آگے چل کر انھوں نے ان مصیبتوں کے اترنے کے روحانی و دینی اسباب بیان کیے اور لوگوں کے گناہوں، شرعی احکام کی پامالی اور اس طرح کی دوسری باتوں کا ذکر کیا اور پھر اس کا روحانی حل بتایا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے معاملات درست کریں۔ یہی ہمارا علاج ہے اور پھر وہابی لشکرکشی کا اس طرح تذکرہ کیا:

> جو اہل اسلام منکرات سے باز نہیں آئے اور شریعت مطہرہ پر عمل کے لیے حریص نہیں ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے سزا کے طور پر ان کی دشمن جماعتوں کو ان پر مسلط کردیا جس طرح کہ ابتدائے اسلام میں خوارج کو مسلط کیا، پھر ان کے بعد قرامطہ اور باطنیہ کو مسلط کیا، پھر ترکوں کو مسلط کردیا کہ انھوں نے تقریباً اسلام کے نام ونشان کو مٹا دیا اور جیسا کہ آج کل بہت ہورہا ہے کہ انگریزوں اوران جیسی جماعتوں کو مسلمانوں پر مسلط کیا جارہا ہے۔ تو اے صاحب بصیرت! عبرت حاصل کرو! اس میں حضور قلب کے ساتھ کان لگانے والے کے لیے عبرت کا سامان ہے۔(۲۹)

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

> جب ہم رجوع الی اللہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ ہمارے وطن سے اور اللہ کے بندوں سے شر کو دفع فرمادے گا اور ان لوگوں کے مابین حائل ہوجائے گا جو یمن کے اطراف میں آگئے ہیں جو اللہ کے بندوں سے اس طرح قتال کرتے ہیں جیسے شرک جلی کرنے والوں سے قتال کیا جاتا ہے، بلکہ اس حد سے بھی آگے بڑھتے ہوئے وہ کام کرتے ہیں جس کو شریعت نے مباح نہیں کیا جیسا کہ ہم کو خبر پہنچی ہے کہ وہ حمل والی خواتین اور بچوں کو قتل کر دیتے ہیں، حاملہ عورتوں کا شکم چاک کردیتے ہیں، شارع صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کی حرکتوں سے منع فرمایا ہے اور زجر وتوبیخ کی ہے اور مسلمانوں کے لیے تو یہ بھی حلال نہیں کیا ہے کہ وہ مشرکین کے بچوں، بوڑھوں اور خواتین کو قتل کریں۔(۳۰)

شوکانی کے ان بیانات سے وہابی تحریک کے حوالے سے ان کے بدلتے نظریات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ سعودی فوج جب یمن سے بالکل قریب ہوئی اور ان کے قول وفعل

کی حقیقت کھلی تو انہوں نے رد میں ایک قصیدہ لکھا: اس کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

و لم يتلاعب الاقوام يوما
بآراء الى بدع تقود
فكيف يقال قد كفرت اناس
يرى لقبورهم حجر و عود
و لكن ذاک ذنب ليس كفرا
و لا فسقاً فهل فى ذا ردود؟
و الا كان من يعصى بذنب
كفورا ان ذا قول شرود
و قد ذهب الخوارج مثل هذا
و ما مثل الخوارج من يقود
و قد خرجوا بذا الاجماع حقاً
و كل العالمين به شهود
فان قلتم قد اعتقدوا قبوراً
فليس لذا بأرضينا وجود(۳۱)

(۱) قوموں نے کبھی بھی ان آرا کی سے کھلواڑ نہیں کیا جو بدعت کی طرف لے جا رہے ہیں۔
(۲) ان لوگوں کے بارے میں کیسے کہا جائے گا کہ انھوں نے کفر کیا جو قبروں کو پتھر اور لکڑی سمجھتے ہیں۔
(۳) یہ گناہ کا کام ہے، نہ کفر ہے اور نہ فسق تو کیا اس کی کوئی تردید کر سکتا ہے؟
(۴) ایمان کے ساتھ جو گنہ گار ہو وہ کافر ہے، یہ حق سے دور بات ہے۔
(۵) پہلے خوارج ایسا عقیدہ رکھتے تھے اور کوئی خوارج کی طرح سامنے کیوں آئے گا۔
(۶) اس طرح یہ لوگ اجماع کے خلاف چلے گئے اور سارا عالم اس بات پر گواہ ہے
(۷) اگر تم یہ کہتے ہو کہ یہ لوگ قبروں کے بارے میں شرکیہ اعتقاد رکھتے ہیں تو ہماری سر زمین میں اس کا کوئی وجود نہیں۔

اس مرحلے تک پہنچتے پہنچتے شوکانی کو یہ یقین ہو چلا تھا کہ یہ وہابیہ قبر، مزارات اور گنبد کے مسئلے کو لے کر تکفیر کر رہے ہیں اور توسل و استغاثہ کرنے والوں پر شرک جلی کا حکم لگا رہے ہیں اور ان کے جان و مال کو اپنے لیے حلال سمجھتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان تحریروں میں ان کے حوالے

سے وہ تیکھا پن نہیں پایا جاتا جو دوسروں کے یہاں پایا جاتا ہے اس کی وجہ اس زمانے کی سیاسی صورت حال ہی ہو سکتی ہے اس کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے البدر الطالع میں شریف حمود بن محمد حسنی کی سوانح کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔(۳۲)

صوفیہ سے قربت

پچھلے صفحات میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ ان کی زندگی کا اعتقادی سفر کس طرح زیدیت سے شروع ہوا اور اسی سفر میں ایک پڑاؤ وہابی دعوت سے اثر پذیری کا بھی آیا لیکن ان سے ان کے نظریاتی اختلافات کی تفصیل ہم پڑھ چکے۔ اب عالم اسلام میں پائے جانے والی جماعتوں میں صوفیہ کے علاوہ کوئی ایسی جماعت نہیں تھی جن کا وہ اثر قبول کر سکتے تھے۔ لیکن ان کو صوفیہ کے بعض اعتقادات، اعمال واشغال، ندا و استغاثہ اور قبور سے متعلق دوسرے اعمال سے اختلاف تھا۔ صوفیہ کے حوالے سے ان کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ وہ اپنے عہد شباب میں شیخ ابن عربی اور ان جیسے صوفیہ کی تکفیر کر چکے تھے لیکن اب عمر اور عقل دونوں میں پختگی آ چکی تھی اور جوانی کا جنون بھی ختم ہو چکا تھا اور سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کا زمانہ آ چکا تھا چنانچہ اس زمانے میں انھوں نے صوفیہ کی کتابوں کا بھی مطالعہ کیا، خصوصاً ان صوفیہ کی کتابوں کا جن کی وہ تکفیر کر چکے تھے چنانچہ انھوں نے فصوص الحکم جیسی کتابوں کو گہرائی سے پڑھا اور اب انھیں ان کی باتوں میں تاویل نظر آنے لگی، چنانچہ انھوں نے شیخ عربی وغیرہم کی تکفیر سے رجوع کر لیا اور صوفیہ کے اعتقادات و معمولات سے بہت قریب آ گئے۔

ان سب کے باوجود ان کو بعض مسائل میں صوفیہ سے اخیر تک اختلاف بھی رہا، قبور اور اہل قبور کے حوالے سے مسلمانوں کے غلو آمیز اعمال سے ان کو سخت اختلاف تھا، وہ قبروں کو اونچی کرنے کی حرمت کے قائل تھے اور اسے ہی مسلمانوں کی طرف سے کیے جانے والے غلو والے اعمال کا سبب قرار دیتے تھے، لیکن اول تو یہ کہ وہ وہابیہ کی طرح ان کو شرک و کفر نہیں قرار دیتے تھے اور نہ ہی توسل کرنے والوں کو مشرک کہتے تھے بلکہ ایسا قول کرنے والوں کا رد بھی کرتے تھے دوسری بات یہ کہ اگر انھوں نے کہیں قبوری کہہ کر خطاب کیا ہے اور اس کے اعمال کو شرک صریح قرار دیا ہے تو اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو لوگ ان کی صراحت کے مطابق اولیا کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ اولیا خود مستقلاً کارساز ہیں یا پھر اللہ کے ساتھ مل کر کارساز ہیں۔(۳۳)

میں نہیں سمجھتا کہ توحید کی ذرا سی بھی شد بد رکھنے والا ایسا عقیدہ رکھے گا۔ صوفیہ کی طرف سے اس اعتقاد کا تو تصور ہی نہیں کیا جا سکتا ہے اور ائمہ صوفیہ کی کتابیں اس بات پر شاہد ہیں کہ وہ

اوران کا عقیدہ اسی طرح کے تمام اتہامات سے بری ہے۔اور ایسا ہو بھی کیسے سکتا ہے کیوں کہ ان کی مجلسیں تو ہمیشہ لا فاعل الا اللہ کے صداؤں سے گونجتی رہتی ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ شوکانی کی زندگی کو تین ادوار میں بانٹا جا سکتا ہے:

پہلا دور: زیدیت - یہ وہ زمانہ ہے جب وہ تعلیم وتربیت کے مرحلے میں تھے اور زیدی عقائد ومعمولات کے مطابق زندگی گزار رہے تھے۔

دوسرا دور: وہابی تحریک کی اثر پذیری - یہ وہ دور ہے جب وہ تقلید سے خود کو الگ کر چکے تھے، اس زمانے میں وہ توحید خالص کا خوبصورت نعرہ لے کر اٹھنے والی وہابی تحریک سے دوسرے علما کی طرح متأثر ہوئے۔

تیسرا دور: تصوف اور صوفیہ سے قربت - یہ وہ دور ہے جب ان کی عمر پختہ ہو چکی تھی اور وہابی تحریک کے حقائق وعقائد سامنے آ چکے تھے۔اس کے نتیجے میں وہ صوفیہ کی طرف مائل ہوئے اور اسی پر ان کی زندگی کا خاتمہ معلوم ہوتا ہے۔

جب تک ہم ان کی زندگی کو ان ادوار میں تقسیم نہیں کریں گے اس وقت تک ہمیں ان کے نظریات واعتقادات میں تناقض نظر آئے گا اور ان کی کتابیں تناقضات کا مجموعہ معلوم ہوں گی۔ اگر ان کی زندگی کا مطالعہ مذکورہ بالا ادوار کو سامنے رکھ کر کیا جائے تو ان کی شخصیت اور ان کے افکار و نظریات کو سمجھنے میں بالکل کوئی دشواری نہیں ہوگی۔لیکن ان سب کے باوجود ہمیں اس اعتراف میں کوئی جھجھک نہیں کہ آخر عمر تک وہ اپنے آپ کو مکمل طور پر سے نہ زیدی اصل سے الگ کر سکے اور نہ وہابی اثرات سے کنارہ کش کر سکے اور جو زیدی اور وہابی اعتقادات ان کے یہاں اخیر تک پائے جاتے ہیں ان سے رجوع پر کوئی دلیل معلوم نہیں ہوتی۔ بلکہ سب کے اثرات باقی رہے خصوصاً تقلید کے انکار کے موقف پر وہ اخیر عمر تک قائم معلوم ہوے ہیں۔

شوکانی کے امتیازی اعتقادات

زیدی اصل کے زیر اثر اور پھر اپنے مطالعہ وتحقیق کی بنا پر جن اعتقادات کے وہ قائل تھے، وہ درج ذیل ہیں:

۱۔کسی تفصیل کے بغیر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وصی ہونے کا عقیدہ۔(۳۴)

۲۔صحابہ کرام کے سب وشتم سے گریز اور اہل بیت اطہار کے ساتھ ان کی بھی فضیلت کا عقیدہ۔(۳۵)

۳۔اختلافی مسئلے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے برحق ہونے اور حضرت معاویہ کے باطل پر ہونے کا عقیدہ۔(۳۶)

وہابی تاثیر اور خود اپنے مطالعہ وتحقیق کی بنا پر ان کے جو اعتقادات تھے وہ کچھ اس طرح ہیں:

۱۔تقلید کی حرمت کا عقیدہ۔شوکانی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ کسی معین عالم کی تقلید اور اس کی طرف انتساب اور اس کی تمام مرویات وآرا پر عمل کرنا اور دوسروں کو چھوڑ دینا سب سے بڑی بدعت ضالہ ہے۔ان کا کہنا ہے کہ جو علم کے اس رتبے تک پہنچ چکا ہو کہ قرآن کی تراکیب کو سمجھ سکے اور سلف صالحین کی مختلف تفسیروں کے مابین ترجیح کر سکے اور پھر کتب احادیث کی طرف رجوع کر سکے اور صحیح وغیر صحیح احادیث کے درمیان فرق کر سکے تو وہ مجتہد ہے اور اس کے لیے تقلید درست نہیں ہے بلکہ اس کو چاہیے کہ وہ خود اہل روایت سے روایت اخذ کرے، اہل درایت کی صحبت میں رہ کر فن درایت کی مشق وتربیت لے اور ہر فن میں قدر ضرورت کی تحصیل پر اکتفا کرے جس سے اس کو فہم وتمیز حاصل ہو جائے۔(۳۷)

اس کے باوجود شوکانی اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ ہر شخص اجتہاد کرے بلکہ لوگوں کی اکثریت جو اتنی صلاحیت نہیں رکھتی ان کو چاہیے کہ علمائے محققین سے سوال کریں اور ان سے قرآن وسنت کا حکم معلوم کریں تا کہ وہ اس پر عمل کر سکیں۔

لیکن شوکانی کے مطابق یہ عمل تقلید نہیں ہے کیوں کہ وہ اس عالم کی رائے نہیں پوچھ رہا ہے بلکہ روایت کے بارے میں سوال کر رہا ہے چوں کہ وہ عالم نہ ہونے کی وجہ سے قرآن وسنت کے الفاظ سمجھ نہیں پا رہا ہے اسی لیے اس کے لیے ایسے شخص سے پوچھنا ضروری ہے جو کتاب و سنت کو جانتا ہو اور سوال کرنے والا ایسا شخص مسئول کے واسطے سے درحقیقت کتاب وسنت پر ہی عمل کر رہا ہے۔(۳۸)

اس مقام پر شوکانی کو دھوکہ ہوا ہے کیوں کہ جو کسی معین عالم کی تقلید کرتا ہے وہ یہ سمجھتے ہوئے اس کی تقلید نہیں کرتا ہے کہ وہ اس کی رائے پر عمل کر رہا ہے بلکہ وہ بھی یہی اعتقاد رکھتا ہے کہ وہ اس عالم کے واسطے سے قرآن وسنت پر عمل کر رہا ہے، کیوں اس نے تجربے سے یہ جان لیا ہے کہ وہ دینی امور میں بغیر دلیل شرعی کوئی حکم نہیں بیان کرتا، البتہ وہ معین عالم کی تقلید اس لیے کرتا ہے کہ کسی معین عالم کے بارے میں یہ پتا لگانا اور تجربہ کرنا آسان ہوتا ہے کہ وہ اہل ذکر سے ہے یا نہیں، قرآن وسنت کی روشنی میں حکم بتاتا ہے یا نہیں، دوسرا یہ کہ علمائے سو کی کثرت کی وجہ سے عالم کی صورت میں نظر آنے والے ہر شخص سے سوال کرنا خطرے سے خالی نہیں۔

علاوہ ازیں یہ کہ یہ پیروی ہے اور صالحین کی راہ کی پیروی کا ہمیں حکم دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاتَّبِع سَبِيلَ مَن اَنَابَ اِلَيَّ (اس کے راستے کی پیروی کرو جو میری طرف مائل ہو۔ لقمان: ۱۵) ہاں اگر کوئی شخص اس اعتقاد کے ساتھ کسی عالم کی پیروی کرتا ہے کہ قرآن وحدیث کے خلاف اس کا قول ہو پھر بھی اس کے قول پر ہی عمل کرے گا تو یہ بلاشبہ حرام ہوگا۔

۲۔توحید الوہیت اور توحید ربوبیت کی تقسیم (۳۹)

یہ تقسیم خود اپنے آپ میں ایک بدعت ہے اور قرآن وسنت سے اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ اسلاف نے ایسی کسی تقسیم کا ذکر نہیں کیا۔

۳۔اولیا سے استغاثہ کے شرک ہونے کا عقیدہ (۴۰)

اس مسئلے میں شوکانی کی فکر نے زبردست ٹھوکر کھائی۔ان کی یہ گفتگو خود ان کے مسلمات کے خلاف ہے؛ کیوں کہ انہوں نے اپنے رسالے الدر النضید میں اس بات کو قبول کیا ہے کہ توسل کرنے والا جس کو وسیلہ بناتا ہے اس کو درحقیقت ندا نہیں کرتا اور اس سے مدد طلب نہیں کرتا بلکہ اللہ تعالیٰ سے ہی مدد طلب کرتا ہے۔(۴۱)

استغاثہ میں بھی استغاثہ کرنے والا دراصل اولیا کو وسیلہ ہی بناتا ہے اور اس کے عقیدے میں یہی ہوتا ہے کہ یہ نیک بندہ دراصل وسیلہ اور سبب ہے، لیکن وہ اس کی تعبیر الفاظ حقیقت میں کرنے کے بجائے مجاز کا اسلوب اختیار کرتے ہوئے اپنی غرض کی نسبت عبد صالح کی طرف کر دیتا ہے۔مثلاً اگر کوئی کسی قبر پر جا کر یہ کہتا ہے کہ مجھے اولاد عطا کر دیجیے تو اس کی مراد یہی ہوتی ہے کہ اے اللہ! تو اس نیک بندے کے توسل سے مجھے اولاد عطا فرما، البتہ وہ فعل کی نسبت فاعل حقیقی کی طرف کرنے کے بجائے سبب کی طرف کر دیتا ہے اور کلام میں حقیقت اور مجاز دونوں ہوتا ہے، اس کو بھی خود شوکانی نے قبول کیا ہے۔(۴۲)

۴۔غیر اللہ کے لیے نذر کی حرمت کا عقیدہ۔(۴۳)

یہی عقیدہ صوفیہ کا بھی ہے کہ نذر شرعی اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کے لیے نہیں ہوگی لیکن اولیا کی بارگاہوں میں عامۃ المسلمین کی طرف صدقات نافلہ کی صورت میں جو ہدایا پیش کیے جاتے ہیں ان کو ان اولیا کے نام کی نذر شرعی قرار دینا ایک صریح غلط فہمی اور مومنین سے بدگمانی ہے، کوئی بھی اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اولیاء کے نام پر روزہ، نماز یا صدقات نافلہ نہیں کرتا بلکہ نفل روزہ ونماز یا صدقات نافلہ اولیاء اللہ کے نام سے کیے جانے کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کا ثواب ان اولیاء اللہ کی ارواح کو پہنچے اور اس ایصال ثواب کے خود شوکانی بھی قائل ہیں جیسا کہ تفصیل آگے آئے گی۔

۵۔غیر اللہ کے لیے ذبح کی حرمت کا عقیدہ (۴۴)

صوفیہ بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ اگر کوئی ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کا نام نہ لے کر اولیاء اللہ کا نام لیتا ہے تو وہ ذبیحہ حرام ہوگا اور اگر ان اولیاء کو الٰہ سمجھتا ہے تو یہ شرک صریح ہوگا۔عامۃ المسلمین جو اولیاء اللہ کے نام پر جانور پالتے ہیں ہمیشہ بسم اللہ کہہ کر ہی ذبح کرتے ہیں اور اولیاء کی طرف

نسبت کرنے سے ان کا مقصود صرف یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ ان کی روح پر فتوح کے ایصال ثواب کے لیے ہے۔اور ایصال ثواب کے قائل خود شوکانی بھی ہیں۔

۶۔غیر اللہ کی قسم کھانے کی حرمت کا عقیدہ۔(۴۵)

صوفیہ بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کی بھی قسم، قسم شرعی نہیں ہوگی، اور اگر کوئی اولیاء کو معبود سمجھ کر قسم کھاتا ہے تو یہ شرعی نقطۂ نظر سے غلط ہے اور اگر ایسا نہیں تو اس کو مشرک نہیں کہا جائے گا بلکہ قائل چوں کہ مومن ہے اس لیے اس کے قول میں تاویل کر کے اسے لغوی قسم قرار دے کر اس کو دائرۂ اسلام میں داخل ہی رکھا جائے گا؛ کیوں کہ ہمیں مومنین کے ساتھ حسن ظن رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

۷۔قبروں کو بلند کرنے اور اس پر عمارتیں بنوانے کی حرمت کا عقیدہ۔(۴۶)

صوفیہ کے نزدیک بھی قبروں کو ضرورت سے زیادہ بلند کرنا خلاف سنت اور مکروہ ہے اور جہاں تک اس پر عمارت اور گنبد بنانے کی بات ہے تو یہ امت محمدیہ میں ابتدائے عہد سے ہی معمول بہا ہے اور اس پر اجماع فعلی منعقد ہو چکا ہے۔اس کی ممانعت میں جو احادیث آئی ہیں وہ اس صورت میں ہیں جب کہ یہ چیزیں عام لوگوں کے لیے اور بغیر ضرورت بنائی جائیں ورنہ تو خود نبی کریم ﷺ جس جگہ آرام فرما ہیں، وہ حجرۂ عائشہ رضی اللہ عنہا ہے جو مسقّف تھا، اگر یہ احادیث اپنے مطلق عموم پر ہوتیں تو صحابہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مسقّف عمارت میں دفن ہی نہ کرتے اور جہاں تک قبر کے پاس مسجد بنانے کی بات ہے تو حدیث رسول ﷺ کے مطابق پوری روے زمین مسجد ہے اور مسجد کے عموم میں وہ جگہ بھی ہے جو قبر کے جوار میں ہے، لہٰذا جن احادیث میں مسجد بنانے کی ممانعت ہے وہ مذکورہ بالا حدیث جو فضائل کے باب میں ہے، سے منسوخ ہوگی۔

یہاں تک ان معتقدات کو مختصراً ذکر کیا گیا ہے جن کا تعلق ان کی زیدی اصل اور وہابی تحریک کی اثر پذیری کی وجہ سے تھا۔

لیکن تصوف اور صوفیہ کے حوالے سے کیا وہ مکمل طور پر وہابی طرز تفکیر پر تھے؟ اور اگر وہ عام وہابی طرز تفکیر پر نہیں تھے تو آخر صوفیہ اور تصوف کے حوالے سے ان کا کیا نظریہ تھا؟ اور صوفیہ کے مختلف عقائد ومعمولات کو وہ قبول کرتے تھے یا نہیں؟ ان تمام سوالات کے جوابات حاصل کرنے کے لیے بلا واسطہ ان کی کتابوں کی ورق گردانی کی ضرورت ہے۔

آئندہ صفحات میں پوری امانت داری کے ساتھ انہیں سوالات کے جوابات حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

تصوف اورصوفیہ کے بارے میں شوکانی کی رائے

قاضی شوکانی سے ان کے کسی چاہنے والے نے تصوف اورصوفیہ کے بارے میں سوال کیا، انہوں نے اس کے جواب میں جو کچھ لکھا وہ دیدۂ انصاف کھول کر پڑھے جانے کے لائق ہے۔ چنانچہ وہ تصوف کے بارے میں لکھتے ہیں:

تصوف محمود کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا سے پہلے بے رغبتی اختیار کی جائے اس طرح کہ زاہد کے نزدیک سونا اور مٹی کا ڈھیلا دونوں برابر ہو جائے، پھر لوگوں کے مدح وذم دونوں سے اس طرح علیحدگی اختیار کر لی جائے کہ اس کے نزدیک لوگوں کی تعریف وتوصیف اوران کی مذمت دونوں کی حیثیت یکساں ہو جائے اور پھر اخیر میں اللہ تعالیٰ کے ذکر اوراس کی بارگاہ کا قرب عطا کرنے والی عبادت میں مشغول ہو جایا جائے۔(۴۷)

آگے چل کر صوفی اوراس کی عظمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

چنانچہ جس کے اندر مذکورہ صفتیں پائی جاتی ہوں وہی حقیقی صوفی ہے اوران صفات سے آراستہ ہونے کے بعد تو وہ صوفی دلوں کا طبیب بن جاتا ہے وہ ایسی دوائیں دیتا ہے جن کے ذریعے باطنی امراض مثلا کبر، حسد، عجب، ریا اوراس طرح کے دوسرے شیطانی فطری اوصاف دور ہو جاتے ہیں جو تمام معصیتوں میں سالک کے لیے سب سے زیادہ پرخطر اور تمام گناہوں میں سب سے زیادہ قبیح ہیں۔ پھر اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے اس صوفی بندے کے لیے وہ دروازے کھولتا ہے جو پہلے دوسروں کی طرح اس پر بھی بند تھے، لیکن جب اس نے ظاہری اور باطنی گناہوں سے اپنے آپ کو پاک کر لیا جن کی بنا پر قلب و حواس پر ظلمتیں چھا جاتی ہیں بلکہ ان کی وجہ سے اس کا ظاہر و باطن سراپا حجاب بن جاتا ہے، تو اس کا وجود کدورت کے شائبہ سے بھی پاک ہو گیا اور گناہوں کی گندگیوں سے اس کو طہارت حاصل ہو گئی، اب وہ ایسے حواس سے دیکھتا اور سنتا ہے کہ حق تعالیٰ کی حقیقتوں کو دیکھنے، سننے اور سچائی کے ادراک سے اس کو کوئی روکنے والا نہیں ہوتا۔ اوراس کی سب سے بڑی دلیل و برہان وہ حدیث ہے جو بخاری وغیرہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بیان فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **من عادیٰ لی ولیا فقد بارزنی بالمحاربة** (جس نے میرے ولی سے دشمنی کی اس نے مجھ سے جنگ مول لی۔) اور ایک روایت میں ہے: **فقد آذنته بالحرب ولا یزال یتقرب الی عبدی بالنوافل حتی احبه فاذا احببته کنت سمعه الذی یسمع به و نظره الذی ینظر به و یده التی یبطش بها و رجله التی**

یمشی بها، فبی یسمع وبی یبصر و بی یبطش و بی یمشی (میرا بندہ مجھ سے نوافل کے ذریعے قرب حاصل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ میرا محبوب ہو جاتا ہے اور جب میں اس کو اپنا محبوب بنا لیتا ہوں تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ چنانچہ وہ مجھ سے سنتا ہے، مجھ سے دیکھتا ہے، مجھ سے پکڑتا ہے اور مجھ سے چلتا ہے۔)(۴۸)

ایسی صوفی شخصیت کے مقام ومرتبے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

چنانچہ جو صالح عابد ان صفات سے آراستہ ہو، ان علامتوں کا مظہر ہو وہ دنیا کا عظیم انسان، فرید دہر اور زینت عصر ہے، اس سے نسبت قائم ہو جانے سے قلوب میں نرمی، دلوں میں خشوع پیدا ہوتا ہے اوران کی نسبت کے فیضان سے صحیح وسالم عقلوں کو وہ جذبہ ربانی حاصل ہو جاتا ہے جس کے ذریعہ وہ رب تعالیٰ کی رضا جوئی میں لگ جاتے ہیں، ان کے کلمات مجرب تریاق ہیں، ان کے اشارات قساوت والے دلوں کا مداوا، ان کی تعلیمات کیمیائے سعادت، ان کے ارشادات خیر اکبر تک پہنچانے والے اور ان دائمی کرامتوں سے بہرور کرانے والے ہیں جن کے لیے فنا نہیں ہے، نگاہوں کو حسن ظاہری و معنوی کا وہ سرمہ اور دلوں کو وہ آراستگی حاصل نہیں ہوتی جو اس جماعت کی صحبت میں حاصل ہوتی ہے۔ یہ قوم سب سے بڑا خیر اور سب سے بڑا ذخیرہ ہے۔ اس قوم کا کیا کہنا جن کی دلوں پر حکومت ہے، یہ اس قوت کے ذریعے دلوں کو اللہ کی اطاعت، اخلاص، توکل اور قرب الٰہی کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ اللہ سے غافل کرنے والی چیزوں اور اس کے وصال سے محروم کرنے والی چیزوں سے روکتے ہیں۔ ان کی صحبت بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتی ہے اور انہیں افراد کو حاصل ہوتی ہے، سعادت جن کا مقدر ہو چکی ہوتی ہے۔(۴۹)

آگے چل کر نصیحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

چنانچہ اے خیر کے طلب گار! اگر ایسے نہایت چنندہ لوگوں کی جماعت اور سرچشمہ خیر کا کوئی ایک فرد بھی تم کو مل جائے تو دونوں ہاتھوں سے ان کا دامن تھام لو اور اہل وعیال اور مال و منال، دوست، رشتے دار، وطن اور مسکن پر ان کو ترجیح دو، اس لیے کہ میزان شریعت اور دینی کسوٹی پر جب ہم ان کو جانچیں گے تو یہ لوگ اولیاء اللہ کی جماعت میں ہوں گے جن کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی غم اور ہم ان کے دشمنوں اوران کے بلند مرتبے پر دست درازی

کرنے والوں کو کہیں گے کہ تم ان لوگوں میں سے ہو جن کے بارے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت کے مطابق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: جس نے میرے ولی سے دشمنی رکھی اس نے مجھ کو جنگ کی دعوت دی اور اس سے میرا اعلان جنگ ہے۔(۵۰)

آگے چل کر صوفیہ کے بھیس میں رہنے والے بعض لوگوں کی وجہ سے حقیقی صوفیہ پر اعتراض کرنے والوں کو متنبہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اور اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ ان مدعیان تصوف میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کے اندر یہ صفتیں نہیں پائی جاتیں اور مذکورہ بالا سیدھے راستے پر قائم نہیں، اگر کسی طرف سے کوئی ایسی چیز ظاہر ہو جو شریعت مطہرہ کے مخالف اور منہاج شریعت اور کتاب وسنت کے منافی ہو تو وہ شخص صوفیہ کی جماعت کا فرد نہیں اور ہمارے اوپر لازم ہے کہ اس کی بدعت کی تردید کریں اور اسے اس کے منہ پر ماردیں اور ایسے لوگوں کے وجود سے ان اولیاء کرام کی جماعت پر کوئی حرف نہیں آتا، اسی لیے کہ اس کا شمار اس جماعت میں نہیں۔ نہ وہ ان کے طریقہ پر چلنے والا ہے اور نہ ان کی سیرت پر عامل ہے۔ اس بات کو سمجھ لو، کیوں کہ صرف کسی ایک فرد یا چند ایسے افراد کی بنا پر جو ان سے حقیقی نسبت نہیں رکھتے، کسی بھی جماعت کو طعن وتشنیع کا نشانہ بنانے کا کام وہی شخص کرسکتا ہے جو شریعت سے ناواقف ہے، جو آداب شریعت سے جاہل ہے اور جس کی آنکھیں نور شریعت سے بینا نہیں ہیں۔(۵۱)

شیخ اکبر اور ان کے متبعین کی تکفیر سے رجوع

شروع میں یہ بات ذکر کی گئی تھی کہ شوکانی ابتدا سے ہی مطلقا صوفیہ اور تصوف کے منکر نہیں رہے، بلکہ وہ محمود تصوف اور مذموم تصوف کی تقسیم کے قائل رہے۔ چنانچہ انھوں نے جہاں محمود تصوف کے نمائندہ صوفیہ کی ہمیشہ تعریف وتوصیف کی تو وہیں مذموم تصوف کے علم برداروں کے خلاف ان کی زبان ہمیشہ بے نیام رہی۔

جماعت صوفیہ میں خصوصیت کے ساتھ شوکانی اس گروہ کے بہت بڑے ناقد رہے، جس کو شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور جنھیں وحدۃ الوجودی گروہ بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن بعد میں عمر وعقل کی پختگی اور مطالعہ کی وسعت کے ساتھ اس جماعت صوفیہ کے حوالے سے بھی ان کی فکر میں تبدیلی آئی۔ شوکانی کا یہ سفر کہاں سے شروع ہوا؟ اور کہاں آکر ختم ہوا؟ اس کی تفصیل جاننے کے لیے سید قاسم بن احمد بن عبداللہ کا تذکرہ پڑھنا ضروری ہے جو ان کے گہرے دوست تھے، اور یہ شوکانی سے نظماً ونثراً دینی، علمی اور ادبی مسائل میں استفسارات کیا کرتے تھے۔ انھی سوالات میں ان کا ایک سوال صوفیہ اور تصوف کے بارے میں تھا جو انہوں

نے ایک طویل قصیدے کی صورت میں کیا تھا۔ شوکانی نے اس کا جواب اسی بحر اور اسی قافیہ میں ایک قصیدہ لکھ کر دیا اس قصیدے کا مطلع یہ ہے:

هذا العقيق فقف على أبوابه

متمايلا طربا لوصل غرابه

ترجمہ: یہ عقیق ہے تو اس کے دروازے پر ٹھہر جاؤ اپنے مقصود تک وصال کی خوشی میں جھومتے ہوئے۔

آگے چل کر اصل سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ صوفیہ کے دو گروہ ہیں کچھ لوگ وہ ہیں جنھوں نے دنیا کو طلاق دے دی ہے، وہ سنت رسول پر قائم ہیں اور محبت الٰہی کو انھوں نے اپنا شعار بنالیا ہے، اس جماعت کی تعظیم ضروری ہے کیوں کہ اس جماعت میں ابوذر غفاری، فضیل بن عیاض، جنید بن محمد، بشر حافی اور ابراہیم ادھم جیسے لوگ شامل ہیں، رہے وہ لوگ جو وحدۃ الوجود کے قائل ہیں یہ دین سے کھلواڑ کرنے والے اور اسے برباد کرنے والے ہیں۔(۵۲)

شوکانی نے اس جواب کے علاوہ **الصوارم الحداد لعلائق ارباب الاتحاد** کے نام سے ایک مستقل رسالہ بھی لکھا اور وحدۃ الوجود کے قائلین، شیخ اکبر اور ان کے متبعین کی تکفیر کی۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ اس کی تفصیل ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میں نے اس رسالے (**الصوارم الحداد**) میں ان میں (شیخ اکبر اور ان کے متبعین) سے ہر ایک کا حال واضح کردیا اور ان کی کتابوں سے عبارتیں نقل کرکے ان لوگوں کے بارے میں علما کے اقوال کو بیان کردیا۔ لیکن یہ جواب میں نے اس وقت لکھا تھا جب کہ میری جوانی کی بہار تھی اور اب میں ان حضرات کے حال کے بارے میں توقف کرتا ہوں اور ان کے جو اقوال وافعال روشن شریعت کے مخالف ہیں، ان تمام سے براءت کا اظہار کرتا ہوں۔ اور جو بظاہر اسلام پر قائم ہو اس کی تکفیر کے لیے اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنا عبد نہیں بنایا۔ اور مان لیجیے کہ جو کچھ ان کی کتابوں میں لکھا ہے اور ان سے جو قابل انکار کلمات منقول ہیں ظاہری معنیٰ اور عربی زبان کے لحاظ سے ان کا وہی مفہوم نکلتا ہے اور اس کی وجہ سے قائل پر واضح کفر اور کھلی گمراہی کا حکم نافذ ہوتا ہے لیکن اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ قائل نے ان اقوال سے توبہ نہیں کی۔ اور ہم اگر ان کے زمانے میں ہوتے بلکہ ان کے شہر میں ہوتے بلکہ ان کے گھر میں ہوتے جہاں وہ عالم سکرات سے گزر رہے ہوتے تب بھی ہم یہ یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ انہوں نے توبہ نہیں کی،

کیوں کہ غرغرۂ موت کی حالت تک پہونچنے سے پہلے صرف دل میں رجوع کے محکم ارادے سے بھی توبہ ثابت ہوجاتی ہے پھر ہم ان کے تائب نہ ہونے کا کیسے یقین کر سکتے ہیں جب کہ ہمارے اوران کے درمیان کئی سو سال کا فاصلہ ہے؟ (۵۳)

آگے چل کر لکھتے ہیں:

اور ہمارے پشت کو بوجھل کرنے والے ہمارے گناہ کے محاسبے میں مشغول ہونا اور اس کی فکر کرنا ہمارے لیے درحقیقت سب سے بڑا مشغلہ ہے، اور وہ شخص مبارکبادی کا مستحق ہے جو اپنے عیوب کو دیکھنے میں مشغول ہو، اور ایک انسان کے اسلام میں یہ حسن کی بات ہے کہ وہ لایعنی باتوں کو ترک کردے۔

چنانچہ جس سواری پر پہلے سے ہی ناقابل برداشت بوجھ ہو اس پر مزید بوجھ ڈال دیا جائے تو اس کی کمر ٹوٹ جائے گی اور منزل تک پہونچنے سے پہلے ہی بیٹھ جائے گی، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جن کا اسلام مشکوک ہو ان کی بھی عزت کو نیلام کرنا نامحمود جرأت ہے تو پھر جن کے اسلام کا یقین ہو ان کی عزتوں کو تار تار کرنا کہاں تک درست ہوگا؟ کیوں کہ بسا اوقات گمان جھوٹا ہوتا ہے اور باتیں جھوٹ ہوتی ہیں، شک کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور بدگمانیوں کی تاریکیاں دور ہوجاتی ہیں۔ دقائق طشت از بام ہوجاتے ہیں اور حقائق ثابت ہوجاتے ہیں۔

جس دن انسان اپنے والد سے بھاگے گا اور اپنے دوستوں اور رشتے داروں سے بھی اپنے حسنات کے معاملے میں بخل سے کام لے گا اس دن کے لیے انسان اپنی نیکیوں کی حفاظت کرے، کہیں ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن اس کی وہ نیکیاں ایسے لوگ چھین لے جائیں جو اس کے اس دنیا میں آنے سے سینکڑوں سال پہلے منوں مٹی کے نیچے جا چکے، حساب وکتاب کے لیے حاضری کے وقت خدائے جبار کی بارگاہ میں غیبت اور چغلی کرنے والوں ہماز اور لماز لوگوں کے ساتھ ایسا ہی کیا جائے گا۔ اس لیے کہ دینیات کا یہ واضح مسئلہ ہے کہ عزت کا بدلہ مال اور خون کے ہی بدلے کی طرح ہے اور ظلم کا کوئی بدلہ معافی کے بغیر ساقط نہیں ہوتا۔ اور جب تک معافی نہ مل جائے ظالم کی سزا اور اس کا بدلہ باقی رہے گا جو قیامت کے دن پورا ہوگا۔

اب تم بتاؤ جس نے کسی مردہ کی عزت پر حملہ کیا ہو وہ اس سے معافی کی امید کیسے رکھے گا اور اللہ کی بارگاہ میں کون اس کو معاف کرے گا جب کہ اس روز تو جہنم سے بچانے والی چیزوں کی اسے سب سے زیادہ حاجت ہوگی؟ (۵۴)

آگے چل کر لکھتے ہیں:

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تکفیر اور لعنت غیبت کی قسموں میں سب سے بری اور نقصان دہ

قسم ہے اور اس کا عذاب سخت ہے۔ اس لیے کہ یہ بات صحت سے ثابت ہے کہ مومن کی تکفیر کفر ہے اور اگر کوئی لعنت کرتا ہے تو اس کی لعنت خود اسی کی طرف لوٹ آئے گی۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا ہے، اور جس کی تکفیر کی گئی ہو، جس پر لعن طعن اور سب وشتم کیا گیا ہو اس کے حصہ کا بدلہ تو ایسے لوگوں کے سر پر باقی رہتا ہے۔ تو دیکھیے کہ کیسے تکفیر کرنے والا خود کافر ہو گیا، لعنت کرنے والا خود ملعون ہو گیا، اور گالی دینے والا خود فاسق ہو گیا۔ یہیں پر سزا ختم نہیں ہوتی بلکہ میدان محشر میں اس کا قرض خواہ اس کی نیکیوں کو لینے اور اپنے گناہ اس کے سر ڈالنے کے لیے اس کا انتظار کر رہا ہوگا، اس کے علاوہ کچھ اور عذاب بھی ہوگا اور اس بات کی بھی سزا ہوگی کہ اس نے اللہ کے حکم کی مخالفت کی اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اور اپنے رسول کی زبانی غیبت کی تمام اقسام سے منع فرمایا ہے۔ اور منہیات الٰہیہ کی مخالفت کرنے والا حرام کا مرتکب ہے اور حرام کے مرتکب کو عذاب ہوگا۔ (۵۵)

شیخ ابن عربی اور ان کے متبعین کی تکفیر سے رجوع کے بارے میں تو البدر الطالع کے حوالے سے صراحت گزر چکی۔ تکفیر سے رجوع پر ان کی جانب سے ایک دوسری شہادت بھی ہے۔

یہ ذکر کیا جا چکا ہے کہ شیخ اور ان کے متبعین کی تکفیر کرتے ہوئے انہوں نے **الصوارم الحداد** کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی تھی لیکن بعد میں جب ان کے افکار کا ارتقا ہوا تو انہوں نے آخری عمر میں اپنے قلمی نسخے پر یہ نوٹ لگایا:

مؤلف هذه الرسالة غفر الله له، هو تائب الى الله من جميع ما حرره فيها بما لا يرضى الله وقد طالعت بعد تاليفها الفتوحات والفصوص فرأيت ما للتأويل فيه مدخلا، لا سيما عند هؤلاء القوم الذين هم خلاصة الخلاصة من عباد الله عز وجل وكان تحرير هذا بعد تحرير الرسالة بزيادة على أربعين سنة۔ كتبه محمد بن على الشوكانى غفر الله لهما۔

ترجمہ: اس رسالے کا مؤلف۔ اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس رسالے میں مذکور ان تمام باتوں سے توبہ کرتا ہے جس سے وہ راضی نہیں ہے۔ میں نے اس رسالے کی تالیف کے بعد فتوحات اور فصوص کا مطالعہ کیا تو مجھے اس میں تاویل کی گنجائش نظر آئی۔ خصوصا اس جماعت کے نزدیک جو اللہ کے بندوں میں اخص الخواص ہیں۔ یہ تحریر اس رسالے کی تالیف کے چالیس سال سے زیادہ عرصے کے بعد لکھی گئی۔ کاتب محمد بن علی شوکانی۔ اللہ دونوں کی مغفرت فرمائے۔

شوکانی کے مجموعۂ فتاویٰ **الفتح الربانی** کے محقق اور **الصوارم الحداد** کے محقق محمد صبحی حلاق نے رجوع والی اس تحریر کو جو نسخہ کے پشت پر موجود تھی، شائع نہیں کیا۔ لیکن المعهد العالی للقضاء، صنعاء (مطبع اکلیل) کی طباعت میں وہ تحریر شائع ہوئی اور اسی نے صبحی حلاق والی طباعت کا پول کھول دیا۔ اس تحریر کا ذکر شوکانی کے ایک تذکرہ نگار عبدالغنی قاسم غالب شرجی نے بھی کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ **الصوارم الحداد** کے جس نسخے پر یہ نوٹ ہے اسے انھوں نے دیکھا ہے اور وہ مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ یہ صنعاء کی ایک خاندانی لائبریری میں موجود ہے۔ (۵۶)

شوکانی اور نقش بندی نسبت

شوکانی کے فکری ارتقا کا مرحلہ یہیں پر ختم نہیں ہوا کہ انہوں نے شیخ اکبر اور ان کے متبعین کے تکفیر سے رجوع کیا بلکہ انہوں نے نقش بندی نسبت بھی حاصل کی۔ اس بات کا ذکر خود انہوں نے اپنی کتاب **البدر الطالع** میں کیا ہے۔ اور اپنے نقش بندی شیخ کے احوال بھی بیان کیے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنے شیخ کے احوال میں لکھتے ہیں:

> سید عبدالوہاب بن محمد شاکر بن عبدالوہاب بن حسین بن عباس بن جعفر، والدہ کی طرف سے حسنی اور والد کی طرف سے حسینی ہیں۔ موصل آپ کی جائے ولادت اور وطن ہے، ۱۱۸۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۳۴ صنعاء منتقل ہو گئے۔ یہاں مجھ سے بہت زیادہ تعلق قائم ہو گیا، وہ علم ادیان وابدان کے جامع ہیں، اچھی فہم رکھتے ہیں، زبان میں فصاحت ہے اور ان کے عبارات واشارات میں حسن پایا جاتا ہے، مصر، شام، عراق اور حرمین شریفین کی معلومات رکھتے ہیں، روم کئی بار گئے، وہاں کے علما واعیان اور بادشاہوں سے تعلق قائم کیا اور ہمیں ان علاقوں اور وہاں کے باشندوں کے بارے میں اچھی اچھی خبریں پوری سچائی اور ایمانداری کے ساتھ بھیجیں اور عمدہ اشعار بھی لکھ کر ارسال کیے۔
>
> ایک عجیب وغریب خبر جو انہوں نے لکھ کر بھیجی یہ تھی کہ شام کے ایک پہاڑ جبل قیسون میں ایک جنات تھا جو قاضی الجن کہلاتا تھا، اس کا نام شمہورس تھا۔ اس کی ملاقات امام بخاری سے تھی اور اس نے ان سے تحصیل علم بھی کیا تھا۔ چنانچہ حضرت عبدالوہاب بن شاکر نے بتایا کہ ان کو اسماعیل بن عبداللہ الایدین جکلی رومی نے خبر دیا۔ انہوں نے نقل کیا کہ احمد بن محمد منینی نزیل دمشق نے ان کو خبر دیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم کو شیخ عبدالغنی بن اسماعیل نابلسی نے خبر دیا انہوں نے فرمایا کہ ان سے قاضی شمہورس قاضی الجن نے بتایا کہ اس نے امام بخاری سے صحیح بخاری پڑھی۔ (۵۷)

آگے چل کر لکھتے ہیں:

> صاحب ترجمہ نے مجھ سے میری تالیفات طلب کیں تو میں نے ان کو درر اور اس کی شرح دراری دی اور انھوں نے مجھ کو اپنے عمدہ اشعار لکھ کر بھیجے۔ میں نے ان اشعار کو اپنے دیوان میں ذکر کیا ہے، وہاں ملاحظہ کریں۔ مجھ کو ان سے سلسلہ نقش بندیہ کے مطابق ذکر کی اجازت حاصل ہے۔ (۵۸)

یہاں پر دو باتیں قابل ذکر ہیں، ایک تو نقش بندی شیخ کے ہاتھ پر بیعت کرنا اور ان سے ذکر کی اجازت حاصل کرنا، دوسرا امام بخاری کے جنات شاگرد قاضی شمہورس کے واقعہ کو ایسی سند سے ذکر کرنا جس کی روایت کی انتہائے سند میں شیخ اکبر اور قائلین وحدۃ الوجود کے بڑے مدافع شیخ عبدالغنی نابلسی ہیں۔

اگر گہرائی کے ساتھ جائزہ لیا جائے تو شیخ اکبر کی تکفیر سے رجوع کے مسئلے کو شیخ عبدالوہاب شاکر سے تعلق کے تناظر میں سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ ۱۲۳۴ھ میں شیخ عبدالوہاب شاکر موصل چھوڑ کر صنعا منتقل ہوتے ہیں اور گہرے تعلق کے نتیجے میں کثرت کے ساتھ ان کی صحبت حاصل ہوتی ہے اور پھر اس صحبت کا اثر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نقش بندی سلسلے میں ان کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں، شیخ اکبر اور ان کے متبعین اور قائلین وحدۃ الوجود کے بارے میں ان کی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں اور اسی وجہ سے وہ شیخ اکبر کی تکفیر سے رجوع کر لیتے ہیں۔ اسی لیے وہ شیخ عبدالغنی نابلسی والی روایت کو بھی قبول کرتے ہیں اور اس روایت کو سچا بھی کہتے ہیں۔ میری اس فکر کی تائید ماقبل میں مذکور ان کے اس تحریری نوٹ سے ہوتی ہے جو انہوں نے الصوارم الحداد کی پشت پر لگایا تھا۔ اس تحریر میں انہوں نے صراحت کی ہے کہ یہ تحریر رسالے کی تحریر کے چالیس سال سے زائد عرصے کے بعد لکھی گئی ہے۔ اس رسالے کی تحریر کا زمانہ انہوں نے اپنی نوجوانی کو بتایا ہے۔ اور اسے ابتدائی تصانیف میں شمار کیا ہے۔ شوکانی کی تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بیس سال کی عمر میں انہوں نے تصنیف وتالیف کا کام شروع کر دیا تھا اور شیخ عبدالوہاب سے ان کی ملاقات کا زمانہ ۱۲۳۴ھ کے بعد ہے اور یہ رجوع شیخ عبدالوہاب شاکر کی چند صحبتوں کے بعد ہی ہوا ہوگا۔ اس طرح رسالہ کی تالیف سے لے کر ان کے رجوع کا زمانہ چالیس سال سے زائد کا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں مقالہ نگار کو ایک یہ خیال بھی گزرتا ہے کہ تکفیر سے رجوع کی ان کی پہلی تحریر وہ ہے جو انہوں نے البدر الطالع میں لکھی ہے اور الصوارم الحداد پر ان کا رجوعی نوٹ اس کے بعد کا معلوم ہوتا ہے۔ اگر دونوں تحریر کا مطالعہ کیا جائے تو زبان وبیان کے جائزے سے یہ بات ثابت ہو جائے گی۔

شوکانی اور صالحین اور ان کے آثار سے تبرک کا عقیدہ

نیل الاوطار میں لکھتے ہیں:

حدیث عتبان بن مالک (وہ حدیث یہ ہے: **انہ قال یارسول اللہ! ان السیول لتحول بینی و بین مسجد قومی، فاحب ان تاتینی فتصلی فی مکان من بیتی، اتخذہ مسجداً، فقال: سنفعل، فلما دخل قال: این ترید؟ فاشرت له الی ناحیة البیت، فقام رسول اللہ ﷺ فصففنا خلفه فصلی بنا رکعتین۔** حضرت عتبان بن مالک نے عرض کی: یارسول اللہ! میں تیز بارش کی وجہ سے اپنی قوم کی مسجد میں حاضر نہیں ہو پاتا، میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے گھر کے ایک گوشے میں کہیں نماز ادا فرمائیں، میں اس جگہ کو نماز کی جگہ بنالوں گا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ٹھیک ہے، کرلیں گے۔ جب آپ گھر تشریف لائے تو آپ نے فرمایا: کون سی جگہ تم نے منتخب کی ہے؟ میں نے گھر کے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا۔ چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ کھڑے ہوئے، ہم نے بھی آپ کے پیچھے صف بندی کی۔ پھر آپ نے دو رکعت نماز پڑھائی۔) سے کئی فائدے حاصل ہوتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ صالحین میں سے اگر کسی کو برکت حاصل کرنے کے لیے بلایا جائے تو اسے دعوت قبول کرنی چاہیے۔(۵۹)

ایک اور مقام پر حدیث کے الفاظ: **فاعطانا حقوہ** (آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب کو اپنی ازار عطا کی) کی شرح میں لکھتے ہیں:

بعض علما کا قول یہ ہے کہ غسل سے فارغ ہونے تک ازار کو نہ اتارنے میں حکمت یہ ہے کہ آپ کے جسم سے اس کپڑے کے تعلق کا زمانہ قریب ہو اور اس پر زیادہ زمانہ نہ گزرا ہو، اور یہ صالحین کے آثار سے تبرک کے سلسلے میں اصل کا درجہ رکھتا ہے۔(۶۰)

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

حدیث کے الفاظ ہیں: **فوضعتها اما علی وجهی أو صدری۔** (میں نے آپ ﷺ کے دست مبارک کو اپنے چہرے یا سینے پر رکھ لیا۔) اس میں صاحبان فضل کو مس کر کے برکت حاصل کرنے کی مشروعیت کا پتا چلتا ہے۔ (۶۱)

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

حدیث کے الفاظ ہیں: **فقبله** (حضرت ابوبکر صدیق نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بوسہ دیا) اس میں تعظیما اور تبرکا میت کو بوسہ دینے کا جواز معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ حضرت ابوبکر پر کسی صحابی کا انکار منقول نہیں چنانچہ یہ اجماع ہوگا۔(۶۲)

شوکانی اور کائنات میں اولیا کے تصرفات کا عقیدہ

شوکانی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اولیاء اللہ کو اللہ تعالیٰ خاص قدرت عطا فرماتا ہے اور اس کی وجہ سے کائنات میں ان کے محیر العقول تصرفات سامنے آتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

اور جس پر ایسی عظیم نوازشات ہوئی ہوں اور ایسی عمدہ صفات کے ذریعے فضل و احسان ہوا ہو اس کے لیے کوئی بعید اور تعجب کی بات نہیں ہے کہ اس سے ایسی کرامتوں کا صدور ہو جو شریعت کے منافی نہیں، اور ان کو اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں بڑے تصرفات حاصل ہوں، اس لیے کہ ایسا بندہ تو جب اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے وہ اس کی دعاؤں کو قبول فرماتا ہے اور جب وہ سوال کرتا ہے تو اسے عطا فرماتا ہے۔ اور وہ انسان حق وصواب پر نہیں ہے جو یہ کہتا ہے کہ بہت سارے اولیا کا تھوڑی سی مدت میں طویل مسافتوں کا طے کرنا، ان کے سچے مکاشفات اور وہ افعال جن سے اکثر انسان عاجز ہوتے ہیں یہ سب شیطانی افعال اور ابلیسی تصرفات ہیں، اس لیے کہ جو مستجاب الدعوات ہوتا ہے اس کے لیے یہ محال نہیں ہے کہ وہ اللہ سے یہ دعا کرے کہ وہ اسے مہینوں میں طے ہونے والے دور دراز مقامات چند لمحوں میں پہنچا دے۔ اور اللہ تعالیٰ قدرت والا قوت والا ہے، وہ جس چیز کا ارادہ فرماتا ہے وہ چیز ہو جاتی ہے اور جو نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا، اور اگر اللہ تعالیٰ اپنے اولیا کی اس طرح کی دعاؤں کو قبول فرمالے تو اس میں حیرانی کی کون سی بات ہے؟ (شوکانی کی یہ بات بلا دلیل نہیں ہے، بلکہ قرآن کریم میں اس کا ثبوت موجود ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ایک ہم نشیں جس کو قرآن نے عالم کتاب کہا ہے، نے چشم زدن میں بلقیس کا تخت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں حاضر کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **قَالَ الَّذِي عِنْدَهُ عِلْمٌ مِنَ الْكِتَابِ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ يَرْتَدَّ إِلَيْكَ طَرْفُكَ فَلَمَّا رَآهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهُ قَالَ هَذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي** [النمل:40] سلیمان علیہ السلام کے پاس موجود ایک حامل کتاب نے کہا کہ میں اسے چشم زدن میں حاضر کر دوں گا۔ جب سلیمان علیہ السلام نے اس تخت کو حاضر پایا تو فرمایا: یہ میرے رب کا فضل ہے۔)

حاصل یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر جیسے چاہتا ہے فضل واحسان فرماتا ہے اور تمام فضل و احسان کی کنجی اس کے ہاتھ میں ہے۔ جسے چاہتا ہے اس میں سے عطا فرماتا ہے اور جسے نہیں چاہتا نہیں عطا فرماتا اور شریعت مطہرہ نے جس کا انکار کیا ہے ہمیں صرف اسی کے انکار کا حق ہے۔ چنانچہ جو شریعت کے مخالف کوئی بات لے کر آئے گا تو ہم دفاع

کریں گے اور اسے رد کر دیں گے اور جہاں تک صرف اس بات کو بعید سمجھنے کا معاملہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی کسی بندے کو امر عظیم سے نواز دے اور وہ انعامات و احسانات اس پر فرما دے جو دوسروں پر نہیں ہوئے، تو یہ انصاف والوں کا کام نہیں ہے۔ (۶۳)

شوکانی اور توسل بالاموات

شوکانی، ابن تیمیہ اور ان کے ہم نواؤں کی طرح انبیا اور صالحین سے صرف ان کی زندگی میں ہی توسل کے قائل نہیں بلکہ وہ صوفیہ کی طرح وفات کے بعد بھی توسل کے جواز کے قائل ہیں۔ چنانچہ اس مسئلے پر انہوں نے اپنے رسالہ **الدر النضید فی اخلاص التوحید** میں گفتگو کی ہے، وہ اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ارباب علم و فضل سے توسل درحقیقت ان کے اعمال صالحہ اور ان کے فضیلت والے اوصاف کی وجہ سے ہے، اس لیے کہ کوئی بھی اپنے اعمال کی بنا پر فضیلت والا ہوتا ہے، چنانچہ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ میں فلاں عالم کو وسیلہ بناتا ہوں، تو وہ اس کے پاس جو بھی علم ہے اس اعتبار سے اس کو وسیلہ بناتا ہے۔ (۶۴)

شوکانی سے سوال ہوا کہ اگر انسان کسی بزرگ کی بارگاہ میں جاتا ہے اور وہاں اس کے وسیلے سے دعا کرتا ہے تو ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں، اس کے جواب میں شوکانی لکھتے ہیں:

ہم شروع میں ہی جواب دے چکے ہیں کہ اگر کوئی کسی نبی یا ولی یا عالم سے توسل کرتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں چنانچہ جو شخص قبر کی زیارت کے لیے آیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کو ہی ندا کرتا ہے اور اس میت سے توسل کرتا ہے مثلا اس طرح کہتا ہے: اے اللہ! تو مجھے فلاں بیماری سے شفا عطا فرما اور میں تیری بارگاہ میں اس نیک بندے کی عبادت، دین کی راہ میں اس کی کوشش اور تعلیم و تعلم کو وسیلہ بناتا ہوں تو اس کے جواز میں مجھے کوئی تردد نہیں۔ (۶۵)

اسی رسالے میں وہ مانعین توسل کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہیں سے معلوم ہو جاتا ہے کہ انبیا اور صلحا سے توسل کے باب میں مانعین کی جو مستدل آیات کریمہ ہیں مثلاً **ما نعبد هم الا لیقربونا الی الله زلفیٰ** (ہم ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں تا کہ وہ ہمیں اللہ کی بارگاہ میں قریب کر دیں۔ الزمر: ۳) اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد **له دعوة الحق والذین یدعون من دونه لا یستجیبون لهم بشیٔ**۔ (جو اللہ کے علاوہ کسی اور کو پکارتے ہیں، وہ انہیں کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ الرعد: ۱۴) یہ آیات اس سلسلے میں وارد نہیں ہیں، بلکہ یہ نزاعی مسئلے میں اجنبی دلیل سے استدلال کی قبیل سے ہے کیوں کہ پہلی آیت کریمہ میں مشرکین نے عبادت کی صراحت کی ہے اور ر

کسی بھی عالم سے توسل کرنے والا اس کی عبادت نہیں کرتا بلکہ وہ صرف یہ یقین رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کو خصوصیت اور فضیلت حاصل ہے کیوں کہ وہ علم دین کا حامل ہے اس لیے اس نے توسل کیا، اسی طرح دوسری آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے غیر اللہ کو پکارنے سے منع فرمایا ہے مثلا یا اللہ اور یا فلاں کہے۔ اور عالم سے توسل کرنے والا تو اللہ ہی کو پکار رہا ہے۔ (۶۶)

اسی کتاب میں انہوں نے مانعین توسل کے تمام دلائل کو ذکر کر کے ان کا جائزہ لیا ہے اور ان کے استدلال کی کمزوریوں کو واضح کیا ہے۔

صالحین کی قبریں قبولیت دعا کے مقامات میں ہیں

الحصن الحصین کی شرح **تحفة الذاکرین** شوکانی کی تالیف ہے، اس کتاب میں مقامات دعا کے بیان میں شیخ جزری کی عبارت: **و عند قبور الانبیاء علیهم السلام بشروط معروفة** کی شرح میں لکھتے ہیں:

میں کہتا ہوں: مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے تجربے سے ثابت مقامات دعا میں انبیاء کی قبروں کو بھی شامل کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان مقامات کو شرف و بزرگی حاصل ہے اور وہاں برکت کا نزول ہوتا ہے اور ہم یہ بات پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ جس طرح صالحین و ذاکرین کی برکت ان لوگوں کو بھی شامل ہوتی ہے جو ذکر کے لیے نہیں آتا اسی طرح مکان کی برکت دعا کرنے والے کو بھی پہنچتی ہے جیسا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: **هم القوم لا یشقی بهم جلیسهم** سے معلوم ہوتا ہے۔ (۶۷)

مصنف کے قول **و جرب استجابة الدعاء عند قبور الصالحین** کی شرح میں لکھتے ہیں:

مصنف کا یہ قول کہ صالحین کی قبروں کے پاس دعا مقبول ہوتی ہے۔ میرے خیال میں اس کی وجہ بھی وہی ہے جو یہاں مذکور ہوئی اور پہلے بھی گزر چکی ہے۔ لیکن اس میں شرط ہے کہ اس کی وجہ سے کوئی شرعی فساد نہ پیدا ہو۔ (۶۸)

شوکانی اور اولیا کے لیے علم غیب پر مطلع کیے جانے کا عقیدہ

پچھلے اقتباس میں شوکانی کی یہ صراحت گزر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ اولیاء کو سچے مکاشفات سے نوازتا ہے، اس کی تائید ان کی دوسری عبارتوں سے بھی ہوتی ہے۔ وہ احمد مکر کے احوال میں لکھتے ہیں:

یہ ایک یمنی شخص ہیں میں نے ان کو ۱۲۴ سال کی عمر میں دیکھا، اس کے باوجود ان کے عقل و حواس صحیح و سالم ہیں، مستقیم القامة اور اچھی گفتگو کرنے والے ہیں ان کو تصوف سے بڑا تعلق ہے، میں نے ان کو کثیر المکاشفہ پایا ہے۔ (۶۹)

یوں ہی البدر الطالع میں ہی عارف باللہ محمد بن حمزہ دمشقی کے تذکرے میں لکھتے ہیں:
عارف باللہ محمد بن حمزہ معروف بابن شمس الدین دمشقی رومی، دمشق میں پیدا ہوئے، اپنے والد کے ساتھ روم چلے گئے وہاں کے علما سے استفادہ کیا اور وہیں کے کسی مدرسے میں مدرس ہو گئے، پھر تصوف کی طرف مائل ہو گئے، حاجی بیرام کی خدمت کی پھر شیخ زین الدین قاضی کی خدمت کی اور دلوں کے طبیب ہونے کے ساتھ ساتھ جسم کے بھی طبیب ہو گئے، ان کے حوالے سے یہ بات مشہور ہے کہ درخت ان کو ندا دیتا ہے اور کہتا ہے میرے اندر فلاں مرض کے لیے شفا ہے، چنانچہ ان کی برکتوں کا چرچا ہو گیا اور ان کی فضیلت و بزرگی ظاہر ہو گئی، یہاں تک کہ رومی سلطان محمد خان نے جب قسطنطنیہ فتح کرنے کا ارداہ کیا تو ان کو جہاد کی دعوت دی۔ بزرگ موصوف نے سلطان سے فرمایا کہ فلاں دن مسلمان قلعے میں داخل ہو جائیں گے جو وقت انہوں نے قلعہ کے فتح کا متعین کیا تھا وہ آ گیا تو سلطان کی طرف سے خبر سچی نہ ہونے کی صورت میں ان کے بعض اصحاب کو شدید دھمکی ملی، چنانچہ وہ اسی وقت شیخ کے پاس گئے تو ان کو دیکھا کہ ننگے سر زمین پر سجدہ ریز ہیں اور تضرع و زاری فرما رہے ہیں، پھر انہوں نے اپنا سر اٹھایا، کھڑے ہوئے اور نعرۂ تکبیر بلند کیا اور فرمایا: اللہ تعالیٰ کے لیے تمام حمد ہے، اس نے ہم کو قلعے کی فتح عطا فرما دی، راوی کہتے ہیں کہ میں نے اس قلعے کی طرف نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ سارا لشکر قلعے میں داخل ہو چکا ہے، سلطان نے کہا کہ قلعے کی فتح کی وجہ سے خوشی نہیں بلکہ میرے زمانے میں ایسے لوگ موجود ہیں مجھے اس پر خوشی ہے۔
ایک دن کے بعد سلطان بزرگ مذکور کے خیمے میں آیا، اس وقت وہ لیٹے ہوئے تھے، وہ سلطان کو دیکھ کر کھڑے نہیں ہوئے، سلطان نے ان کی دست بوسی کی، اور کہا کہ میں ایک حاجت سے آیا ہوں، بزرگ نے پوچھا کون سی حاجت؟ سلطان نے کہا کہ اگر خلوت میں آنے کی اجازت دیں تو بتاؤں، انھوں نے انکار کر دیا، سلطان اصرار کرتا رہا اور وہ انکار کرتے رہے، اس کی وجہ سے سلطان ناراض ہو گیا، اور بولا کہ آپ کے پاس کوئی ترکی آتا ہے تو ایک بار میں اس کو داخل ہونے کی اجازت مل جاتی ہے؟ شیخ نے جواب دیا کہ اگر تم خلوت میں آ جاؤ گے تو تم کو وہ لذت حاصل ہوگی کہ تمہاری نگاہوں میں سلطنت کی بھی کوئی حیثیت نہیں رہ جائے گی، اور اس کی وجہ سے امور سلطنت درہم برہم ہو جائیں گے اور نتیجے میں اللہ تعالیٰ ہم سے ناراض ہو جائے گا، اور خلوت کا مقصود یہ ہے کہ انسان کے اندر عدالت کی صفت پیدا ہو جائے، چنانچہ تم فلاں فلاں کام کرو

، انھوں نے سلطان کو کچھ نصیحتیں کیں، سلطان نے آں بزرگ کو ایک ہزار دینار بھجوایا لیکن انہوں نے قبول نہیں کیا، جب سلطان باہر نکلا تو اس نے اپنے بعض اصحاب سے کہا کہ شیخ میرے لیے کیوں کھڑے نہیں ہوئے؟ تو اس نے جواب دیا کہ آپ کو ایسی فتح حاصل ہوتی ہے جو دوسرے بادشاہوں کو حاصل نہیں ہوئی، اس کی وجہ سے شاید آپ کے اندر انہوں نے کچھ غرور دیکھا تو اس مرض کو دور کرنے کی نیت سے وہ کھڑے نہیں ہوئے۔ پھر سلطان نے آں بزرگ کو رات کے تیسرے آخری پہر میں بلایا، تو ان کے اصحاب کو ان کی جان کا خوف ہوا، وہ بزرگ سلطان کے پاس گئے، جب وہاں پہنچے تو امرا تیزی کے ساتھ آگے بڑھ کر ان کی دست بوسی کرنے لگے، سلطان ان سے ملاقات کے لیے آیا، تاریک رات تھی چنانچہ اس نے نگاہوں سے نہیں بلکہ دل سے معانقہ کیا، شیخ نے بھی اس سے معانقہ کیا اور اتنی زور سے لپٹایا کہ وہ کانپنے لگا اور ہیبت کی وجہ سے قریب تھا کہ گر جائے، بعد میں سلطان نے بتایا کہ اس کے دل میں شیخ کے تعلق سے کچھ کینہ تھا، جب شیخ نے اس کو لپٹایا تو وہ بالکل دور ہو گیا، پھر شیخ سلطان کے ساتھ اس کے خیمے میں بیٹھے رہے، یہاں تک کہ انہوں نے اس کے ساتھ فجر کی نماز ادا کی، سلطان گھٹنوں کے بل بیٹھا ان کے اوراد سنتا رہا، جب انہوں نے اوراد مکمل کر لیے تو سلطان نے شیخ سے التماس کیا کہ وہ حضرت ابوایوب کی قبر متعین کر دیں، اس لیے کہ وہ تاریخ میں پڑھا کرتا تھا کہ ان کی قبر قسطنطنیہ کی شہر پناہ کے قریب ہے، چنانچہ شیخ وہاں گئے اور بولے ممکن ہے مجھے اس کا پتا مل جائے، پھر لوٹ کر آئے اور بولے کہ میں نے حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ کی روح سے ملاقات کی اور انہوں نے مجھے فتح کی مبارکباد دی، اور دعا دی کہ اللہ تعالیٰ تم لوگوں کی مساعی کو قبول فرمائے، کیوں کہ تم لوگوں نے مجھ کو کفر کی تاریکی سے نجات دلا دی تو سلطان نے کہا کہ میں آپ کی بات تصدیق کر رہا ہوں لیکن میں آپ سے یہ چاہتا ہوں کہ آپ کوئی علامت متعین کر دیں جسے میں دیکھ لوں اور میرا دل مطمئن ہو جائے، شیخ نے فرمایا کہ اس جگہ کھودو، دو ہاتھ کے بعد تم کو سنگ مرمر کا ایک پتھر ملے گا جس پر ایک تحریر لکھی ہوگی، جب دو ہاتھ کی مقدار کھودا گیا تو کتبہ والا سنگ مرمر نظر آیا، پڑھنے والے نے جب اس کو پڑھا تو اس پر لکھا تھا کہ یہ حضرت ابو ایوب کی قبر ہے، یہ دیکھ سلطان حیرت میں ڈوب گیا اور اس پر حال طاری ہو گیا اور اگر اس کو پکڑا نہ جاتا تو وہ غلبۂ حال کی وجہ سے گر جاتا، پھر سلطان نے قبر پر گنبد بنانے کا حکم دیا جب وہ لوٹا تو اس کی ملاقات اک رومی دیہاتی سے ہوئی، وہ ایک عمدہ گھوڑے پر بیٹھا ہوا تھا جس کی طرف ہر شخص کا دل

مائل ہورہا تھا، وہ شخص چلا گیا اور اس نے شیخ کی طرف نہ کوئی توجہ دی اور نہ ہی سلام کیا، ابھی وہ تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ وہ لوٹا اور اپنے گھوڑے سے اتر گیا، اور اسے شیخ کو دے دیا، شیخ سے بعض اصحاب نے اس بارے میں پوچھا تو شیخ نے جواب دیا کہ اگر کسی آدمی کے پاس کوئی غلام ہو اور وہ اس کی اطاعت میں لگا ہوا ہو اور وہ شخص اپنے غلام سے کبھی کوئی معمولی چیز طلب کرے تو کیا وہ منع کردے گا؟ ان کے اصحاب نے عرض کیا: نہیں تو انہوں نے فرمایا: کہ مجھے تیس سال ہوگئے کہ اللہ کی طاعت سے الگ نہیں ہوا، چنانچہ جب میرا دل اس گھوڑے کی طرف مائل ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے قلب میں الہام کیا اور اس نے مجھے وہ گھوڑا ہبہ کردیا۔

بزرگ موصوف کی کئی تصنیفات ہیں ان میں تصوف پر ایک رسالہ، اس کے علاوہ صوفیہ کے دفاع میں ایک رسالہ ہے اور علم طب میں بھی ایک رسالہ ہے۔

ان کا ایک چھوٹا لڑکا بھی تھا، وہ پیدائشی مجذوب تھا، ایک بار کا واقعہ ہے کہ ان کے والد کے پاس ابن قطا نامی امیر آیا اس کے چہرے پر داڑھی نہیں آئی تھی، شیخ کے اس لڑکے نے اس کو دیکھ کر کہا کہ یہ مرد نہیں ہے عورت ہے، یہ سن کر ان کے والد غصہ ہوگئے، تو امیر نے شیخ سے کہا کہ چھوڑ دیں ان کو نہ ڈانٹیں، یہ کہہ کر وہ شیخ کی بارگاہ میں منت سماجت کرنے لگا، پھر اس امیر نے اس لڑکے سے کہا: آپ دعا کردیں کہ میری داڑھی نکل آئے، مجذوب نے یہ سن کر اپنا ڈھیر سارا لعاب نکال کر امیر کے چہرے پر لگا دیا، اس کی برکت سے امیر کی داڑھی نکل آئی، جب وہ امیر سلطان کے پاس آیا تو اس نے وزراء سے کہا: اس سے پوچھو کہ اس کو داڑھی کیسے نکلی؟ تو اس نے پورا ماجرا بیان کردیا۔(۷۰)

اس پورے اقتباس میں کتنے مکاشفات غیبیہ کا اور دوسرے صوفیانہ تصرفات کا اثبات ہے وہ کسی پر مخفی نہیں ہے، یوں ہی اولیاء کی ایک خاص قسم مجاذیب کے وجود کا بھی اثبات ہے، اور اولیاء اللہ سے کیسے فیوض و برکات حاصل ہوتے ہیں اس کا بھی ذکر ہے۔

تشبیہ کا وہم پیدا کرنے والے صفات کے بارے میں شوکانی کا عقیدہ

اللہ تعالیٰ کی وہ صفات جن سے تشبیہ کا وہم پیدا ہوتا ہے ان کے بارے میں **التحف فی مذاہب السلف** سے جو عقیدہ سمجھ میں آتا ہے، اس سے اصحاب ظواہر نے یہ مطلب نکالا ہے کہ وہ ان کے مذہب پر ہیں کہ اس طرح کی صفتیں اپنے لفظ و معنیٰ دونوں کے لحاظ سے اپنے ظاہر پر ہیں البتہ کیفیت مجہول ہے لیکن پورے رسالے کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ بعض صفات کے بارے میں تو حضرات اشاعرہ کی طرح تاویل کا عقیدہ رکھتے ہیں اور مجموعی طور سے

صفات کے بارے میں ان کے عقیدہ کی جو عبارت ہے وہ کچھ اس طرح ہے:

ان المذاهب الحق فی الصفات هو امرارها علی ظاهرها من غیر تاویل و لا تکلف ولا تعسف ولا جبر ولا تشبیه ولا تعطیل ، و أن ذلک هو مذهب السلف الصالح من الصحابة والتابعین وتابعیهم:(۷۱)

ترجمہ: صفات کے بارے میں مذاہب حق یہ ہے کہ انہیں کسی تاویل، تکلف، تعسف، جبر وتشبیہ وتعطیل کے بغیر اس کو ظاہر پر محمول کیا جائے گا۔ یہی سلف صالحین، صحابہ، تابعین، تبع تابعین کا مذہب ہے۔

یہ ایک ایسی عبارت ہے جس میں کسی کا اختلاف نہیں، صوفیہ کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ صفات باری کے ظاہری پر ایمان لایا جائے گا، اس میں ایسی کوئی تاویل نہیں کی جائے گی جو عربی زبان کے لحاظ سے ممکن نہ ہو اور جس کی وجہ سے تعطیل لازم آئے مثلاً ید قرآن میں وارد ہے، یہ اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت ہے، اس کے ظاہر پر ہمارا ایمان ہے لیکن اس کا معنیٰ معلوم نہیں ہے، کیوں کہ اس کا جو معنیٰ معلوم ہے وہ جسمیت کی طرف لے جانے والا ہے، اور ید کا ایسا معنیٰ جو جسمیت کی طرف نہ لے جانے والا ہو اس کا ہمیں علم نہیں، ہم اس کے معنیٰ اور کیفیت کی کرید نہیں کریں گے، امام مالک کا اس طرح کی صفات کے بارے میں عقیدہ ہے: **الاستواء معلوم والکیف مجهول والایمان به واجب والسوال عنه بدعة**۔ اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔

اس سے یا اس طرح کی ان کی دوسری عبارتوں سے یہ سمجھنا کہ تشبیہ کا وہم پیدا کرنے والے صفات کے بارے میں بھی یہ عقیدہ ہے کہ ان کے ظاہری معنی مراد ہیں قطعاً درست نہیں، کیوں کہ ان کی عبارت "**امرارها علی ظاهرها**" اس میں عقائد صوفیہ کے معنی کی بھی گنجائش موجود ہے، اور اگر مان بھی لیا جائے کہ **التحف فی مذاهب السلف** میں وہ اسی بات کے قائل ہیں کہ ایسی صفات کے ظاہری معانی ہی مراد ہیں پھر یہ بات قابل غور ہے کہ ان کا ایک دوسرا رسالہ ہے **ارشاد الفحول الی تحقیق الحق فی علم الاصول**۔ اس میں انہوں نے ظاہری معنی کے مراد ہونے کا قول نہیں کیا ہے بلکہ ظاہری الفاظ پر ایمان رکھنے اور ان کے معانی کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کردینے کا قول کیا ہے۔ پہلے والے معنیٰ کو ابن برھان کے حوالے سے مشبہہ کا عقیدہ لکھا ہے اور خود اس کی تائید بھی کی ہے۔ اور دونوں کے سن تالیف کو معلوم کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ **التحف فی مذاهب السلف** کی تالیف سے فراغت کا زمانہ ۱۲۲۸ھ ہے کا جب کہ ارشاد الفحول کی تالیف سے فراغت کا زمانہ ۱۲۳۱ھ ہے، اب ایسی صورت میں یقیناً بعد والا قول پہلے والے قول کے لیے ناسخ ہوگا۔

ارشاد الفحول میں ایسی صفات کے بارے میں اپنا عقیدہ واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس سلسلے میں پہلا مذہب یہ ہے کہ تاویل کی کوئی گنجائش نہیں بلکہ یہ صفات ظاہری معانی پر محمول ہیں اوراس میں کسی طرح کی تاویل نہیں کی جائے گی اور یہ قول تشبیہ کے قائلین کا ہے۔ دوسرا مذہب یہ ہے کہ اس میں تاویل ہے لیکن ہم خود سے تاویل نہیں کریں گے (بلکہ اس کے معانی کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کردیں گے) کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **و مایعلم تاویلہ الا اللہ۔** ابن برہان کا قول ہے کہ یہ اسلاف کا قول ہے:

میں کہتا ہوں کہ یہی واضح اور تاویل کی کھائی میں گرنے سے بچانے والی راہ ہے؛ کیوں کہ اللہ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا، پیروی کرنے والے کے لیے سلف صالحین پیروی کے لیے کافی ہیں تیسرا مذہب یہ ہے کہ اس میں تاویل ہے، ابن برہان کہتے ہیں کہ ان میں پہلا مذہب باطل ہے اور آخری دو مذاہب صحابہ سے منقول ہیں اور تیسرا مذہب حضرت علی، ابن مسعود، ابن عباس اور ام سلمۃ رضی اللہ عنھم اجمعین سے منقول ہے۔(۷۲)

شوکانی اور حیات انبیا کا عقیدہ

صوفیہ کی طرح شوکانی انبیا کی حیات کے بھی قائل ہیں وہ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں:

میں کہتا ہوں: **الانبیاء أحیاء فی قبورھم** والی حدیث کو امام بیہقی نے صحیح قرار دیا ہے اور اس سلسلے میں انہوں نے ایک جزء تالیف کیا ہے اور اس موقف کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ شہداء اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور ان کو ان کی قبروں میں رزق دیا جاتا ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو رأس الشہداء ہیں۔ استاذ ابومنصور بغدادی نے فرمایا ہے: ہمارے اصحاب میں محققین علم کلام کا کہنا ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم وفات کے بعد بھی زندہ ہیں۔(۷۳)

شوکانی اور روحوں کی باہمی ملاقات کا عقیدہ

شوکانی صوفیہ کی طرح یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ روحیں آپس میں ملاقات کرتی ہیں اور مرنے کے بعد انسان پتھر نہیں ہوجاتا، اس موضوع پر ان کے مجموعۂ فتاویٰ میں **الاثبات لالتقاء أرواح الأحیاء و الاموات** کے نام سے ایک مستقل رسالہ موجود ہے۔

اسی رسالے میں انہوں نے آٹھ وجوہ سے اپنے موقف پر استدلال کیا ہے اور قرآنی آیات و احادیث سے اپنی رائے کو مؤید کیا ہے۔ ایک مقام پر **اللہ یتوفی الانفس حین موتھا** الخ ذکر کر کے کہتے ہیں: اس آیت میں زندوں اور مردوں کی روحوں کی ملاقات کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اس لیے کہ زندوں کی روحوں کو جب اللہ تعالیٰ ملاقات کراتا ہے وہ روحیں مردوں کی روحوں کے ساتھ جمع ہوجاتی ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ دونوں کو وفات دیتا ہے، مردوں کی وفات تو ظاہر ہے اور زندوں کو نیند کی حالت میں وفات دیتا ہے اور اس وقت یہ روحیں آپس میں سوال و جواب کرتی ہیں۔(۷۴)

شوکانی اور ایصال ثواب کی صحت کا عقیدہ

صوفیہ کا ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ بندوں کی طرف سے صدقہ مالیہ اور بدنیہ مثلا تلاوت قرآن وغیرہ میں سے جو بھی کسی مومن کو ثواب پہنچانے کی نیت سے کیا جاتا ہے وہ ان کو پہنچتا ہے۔ اس موضوع پر بھی ان کے فتاویٰ میں ایک رسالہ موجود ہے جس میں انہوں نے اس کی صحت کا قول کیا ہے، اس رسالے کا عنوان ہے: **لحوق ثواب القرأۃ المھداۃ من الاحیاء الی الأموات۔** اس رسالے میں انہوں نے آٹھ طرق سے تلاوت قرآن کے ایصال ثواب کی درستگی پر استدلال کیا ہے، اس موضوع کا خلاصہ کرتے ہوئے ایک مقام پر لکھتے ہیں:

> ہم نے ایصال ثواب کی صحت کی درستگی کی طرف اشارہ اس لیے کر دیا ہے کہ ہر زمانے میں اور ہر علاقے میں سلف و خلف کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ وہ مردوں کی روحوں کو تلاوت کے ذریعہ ایصال ثواب کرتے رہے ہیں یہاں تک کہ یہ اجماع فعلی بن گیا ہے جس کو تمام مسلمان پسند کرتے ہیں اور اسے بڑی نیکی سمجھتے ہیں۔ اب کسی عالم کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ صرف بعض عام مخصوص منہ البعض آیات کی وجہ سے اس عمل کے باطل ہونے کا یقین کرے۔(۷۵)

شوکانی اور مسئلہ سماع

مسئلہ سماع خود حضرات صوفیہ اور فقہا کے مابین مختلف فیہ رہا ہے، اس مسئلے پر شوکانی نے بھی خامہ فرسائی کی اور **ابطال دعوی الاجماع فی تحریم مطلق السماع** کے نام سے ایک رسالہ لکھا ، اس مسئلے پر قلم اٹھانے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ شوکانی کے عہد میں بعض کوتاہ نظروں نے یہ مسئلہ چھیڑا کہ سماع کی حرمت اجماعی ہے، شوکانی کو یہ بات پسند نہیں آئی کیوں کہ خود شوکانی کے مطابق یہ کھلا ہوا جھوٹ اور صحابہ و تابعین اور علمائے دین پر طعن کا ذریعہ تھا، اس لیے انہوں نے اس مسئلے پر تفصیل کے ساتھ قلم اٹھانا مناسب سمجھا۔ وہ اس رسالے میں مجوزین و مانعین کے دلائل اور مناقشات ذکر کرنے کے بعد فیصلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> جب یہ بات ثابت ہوگئی تو کیفیت استدلال سے واقف، مناظرہ اور جدال کا علم رکھنے والے شخص پر یہ بات واضح ہوجائے گی کہ سماع خواہ آلے کے ساتھ ہو یا اس کے بغیر، اس میں ائمہ علم وفن کا اختلاف ہے اور یہ ان مسائل میں سے ہے جس کے فاعل پر شدت نہیں کی جائے گی اور اسی مقصد سے ہم نے یہ رسالہ لکھا ہے کیوں کہ کچھ لوگ ہمارے درمیان ایسے ہیں جو علم استدلال سے کم واقفیت اور درایت سے محرومی کی بنا پر یہ وہم رکھتے ہیں کہ:

آلات یا ان کے بغیر سماع کی حرمت اجماعی اور قطعی ہے حالانکہ اس میں جہالت اور علم کی کمی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ کیوں کہ یہ بات کسی ہوش مند پر مخفی نہیں ہے کہ صحابہ، تابعین تبع تابعین اور ائمہ مسلمین کی ایک جماعت پر حرام قطعی کے ارتکاب کی نسبت بہت ہی شنیع بات، نہایت بری بدعت اور کھلی جہالت ہے۔ ہم نے ان حضرات صالحین کے دفاع کے لیے ہی یہ رسالہ لکھا ہے، ورنہ اللہ جانتا ہے کہ ہم کبھی سماع کی کسی مجلس میں شریک نہیں ہوئے۔ ہم نے تو بس دلیل کے تقاضے کے مطابق گفتگو کی ہے۔ لیکن وہ انسان انصاف کی راہ کیسے پائے گا جو یہ سمجھتا ہو کہ سماع اختلافی مسائل میں نہیں ہے؟ تعجب ہے ایسے شخص پر، کاش! بے چارے نے مسلمانوں کی تصانیف میں سے کسی تصنیف کا مطالعہ کر لیا ہوتا تو اس پر اس کے دعویٰ کا باطل ہونا ظاہر ہو جاتا۔(۷۶)

شوکانی اور کتب صوفیہ کی اجازت

شوکانی کے یہاں جو مظاہر تصوف پائے جاتے ہیں ان میں بعض صوفیہ کے ذکر جمیل کے ساتھ کتب صوفیہ کی اجازات بھی ہیں، انہوں نے جو بھی کتابیں اپنے مشائخ سے پڑھیں ان کی اسناد کو تفصیل کے ساتھ **اتحاف الاکابر باسناد الدفاتر** میں جمع کر دیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد یہ منکشف ہوتا ہے کہ شوکانی نے اپنے مشائخ سے کتب صوفیہ کو بھی پڑھا ہے۔ اگر انہیں صوفیہ سے کسی طرح کی کوئی دشمنی ہوتی یا ان کو بالکلیہ گمراہ سمجھتے تو اولا وہ ان کتابوں کو اپنے مشائخ سے نہیں پڑھتے اور اگر پڑھ بھی لیا تو اسے فخر کے ساتھ اپنی اسانید و اجازات میں شمار نہ کراتے، پھر یہ بات بھی قابل غور ہے جو مشائخ وہ کتب صوفیہ پڑھاتے تھے وہ خود صوفیہ کے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے تھے؟ اگر وہ صوفیہ کو گمراہ سمجھتے تھے تو پھر ان کی کتابوں کی تدریس کے ذریعہ اس کی نشر و اشاعت کرنا اور ان کی اجازت و اسانید دینے کا کیا مطلب؟ نتیجے کے طور پر یہی بات سامنے آئے گی کہ وہ اساتذہ صوفیہ سے محبت کرنے والے تھے یا کم از کم ان سے بدگمانی رکھنے والے نہیں تھے۔

شوکانی نے مذکورہ بالا کتاب میں مقالہ نگار کے مطالعہ اور علم کے مطابق جن کتب صوفیہ کے نام اور ان کی اسانید و اجازت کو ذکر کیا ہے ان کے اسما درج ذیل ہیں:

۱۔ احیاء علوم الدین، ۲۔ حزب البحر للشیخ ابو الحسن الشاذلی، ۳۔ الحکم لابن عطاء اللہ السکندری، ۴۔ الحلیۃ لابی نعیم، ۵۔ قوت القلوب لابی طالب المکی، ۶۔ الحدیث المسلسل بالمصافحۃ، ۶۔ مؤلفات امام عبد اللہ بن اسعد یافعی، ۷۔ مؤلفات الشیخ محی الدین ابن عربی۔(۷۷)

شوکانی کی شخصیت کا تجزیہ

پچھلے صفحات میں جو بحث کی گئی ہے اور شوکانی کی کتابوں سے جو اقتباسات نقل کیے گئے ہیں ان سے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں۔

۱۔ شوکانی کی زندگی مختلف ادوار سے گزری، پہلے دور میں وہ زیدی رہے، دوسرے دور میں خود کو تقلید سے الگ کر لیا اور براہ راست قرآن و سنت اور اقوال فقہاء کے مطالعہ و تحقیق کی روشنی میں فیصلے کرنے لگے، اسی زمانے میں وہ وہابی دعوت سے بھی متاثر ہوئے لیکن یہ اثر زیادہ دنوں تک باقی نہیں رہا اور آہستہ آہستہ مذہب معین کی تقلید کے مسئلے کو چھوڑ کر اکثر مسائل میں اہل سنت و جماعت کی عام شاہراہ پر قائم ہو گئے اور عقائد صوفیہ کو اختیار کر لیا۔

۲۔ جن تین ادوار سے وہ گزرے ان سب کے اثرات اخیر تک ان پر باقی رہے اسی وجہ سے ان کے یہاں بہت سے مسائل میں تفرد پایا جاتا ہے اور جن مسائل میں وہ متفرد ہیں ان میں بعض وہ مسائل ہیں جن کی جڑیں ان کی زیدی اصل میں پیوستہ ہیں۔

۳۔ بعض مسائل وہ ہیں جو وہابی تاثیر کی بنا پر ہیں اور ان کے یہاں فقہی، فروعی مسائل میں جو عام اہل سنت کے موقف سے بہت اختلاف پایا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کسی بھی مذہب معین کے مقلد نہیں۔ اگر مذہب معین کی تقلید کے مسئلے کو نکال دیا جائے تو کوئی بھی اہل سنت کا ایسا متفق علیہ مسئلہ نہیں ہے جس سے شوکانی نے اختلاف کیا ہو۔

۴۔ بعض ایسے مسائل بھی ہیں صوفیہ جن کے جواز کے قائل ہیں لیکن اس کی حرمت کا قول انہوں نے سد ذرائع کے پیش نظر کیا ہے۔ بعض جگہوں پر وہ بدگمانی کا شکار ہیں۔ بعض مقامات پر ان کو غلط فہمی بھی ہوئی ہے۔ اور عصمت تو صرف اللہ، اس کے رسولوں اور اس کے فرشتوں کے لیے ہے۔

مجموعی طور پر زندگی کے آخری مرحلے میں ان کی فکر جماعت صوفیہ کے بنیادی عقیدے کے مطابق ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ تصوف اور صوفیہ کی تعریف کرتے ہیں، ساتھ ہی گمراہوں کی تردید بھی کرتے ہیں بعض مسائل میں وہ صوفیہ سے اختلاف بھی رکھتے ہیں۔ وہ نقش بندی نسبت بیعت بھی رکھتے ہیں، صالحین اور ان کے آثار سے تبرک کے قائل ہیں، وہ بعد وفات بھی توسل کے قائل ہیں، وہ صالحین کی قبروں کو قبولیت دعا کے مقامات میں سمجھتے ہیں، وہ اولیاء کے علم غیب پر مطلع کیے جانے کا عقیدہ رکھتے ہیں، وہ باری تعالیٰ کے متشابہ صفت کے حوالے سے اہل تفویض کا مسلک رکھتے ہیں اور ظاہری معانی مراد نہیں لیتے، وہ اولیاء اللہ کے لیے تصرفات کونیہ کے ثابت ہونے کا عقیدہ قبول کرتے ہیں، وہ تلاوت قرآن کے ذریعہ ایصال ثواب کے قائل ہیں، وہ سماع کے بارے میں یہ موقف رکھتے ہیں کہ یہ ان مسائل

میں سے نہیں ہے جن کی بنا پر شدت اختیار کی جائے اور اس کو حرام قطعی قرار دیا جائے، اس لیے کہ پھر تو یہ طعن صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ مسلمین کی ایک جماعت تک منجر ہوگا۔ وہ تصوف اور صوفیہ کی کتابوں کی اسانید و اجازت بھی رکھتے ہیں، ان اسانید میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی بھی کتابیں ہیں۔

خاتمۂ بحث

خلاصہ کلام یہ ہے کہ شوکانی بھی جماعت صوفیہ کے حوالے سے معتدل موقف رکھتے ہیں اور وہ تصوف محمود و مذموم کے مابین فرق کے قائل ہیں، صوفیہ اور مستصوفین کے درمیان فرق کرتے ہیں، فلسفیانہ تصوف پہلے تو ان کو بالکل ہی قبول نہیں تھا چنانچہ انہوں نے شیخ اکبر اور ان کے متبعین کی تکفیر بھی کی تھی لیکن بعد میں اس سے رجوع کر لیا۔ وہ بہت سے ایسے صوفیانہ عقیدے رکھتے ہیں جن کو جماعت سلفیہ شرک کے زمرے میں شامل سمجھتی ہے، بلکہ ان کا آخری دور تو صوفیہ کے عقائد کے مطابق معلوم ہوتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اگر کوئی راہ احسان و سلوک طے نہیں کرنا چاہتا تو نہ کرے، اولیاء اللہ کے طریق کی پیروی نہیں کرنا چاہتا تو نہ کرے لیکن کم از کم صوفیہ کے بارے میں سب و شتم کی زبان تو نہ کھولے کہ مومن لعان نہیں ہوتا، یوں ہی یہ کہتے وقت کہ صوفیہ اپنی تمام جماعتوں کے ساتھ گمراہ اور گمراہ گر ہیں، اللہ تعالیٰ سے ڈرے اور اس کے **مالک یوم الدین** ہونے کے عقیدہ کو ہمیشہ یاد رکھے اور اس بات سے بھی خوف کھائے کہ جن حضرات کے بارے میں زبان طعن دراز کی جا رہی ہے کہیں اگر وہ اولیاء اللہ میں سے ہوئے تو اس نے اللہ تعالیٰ سے جنگ مول لے لی۔ ہمیشہ ارباب اعتدال کا دامن تھامے رہے کیوں کہ اعتدال میں ہی سلامتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حق کو حق دیکھنے اور باطل کو باطل دیکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

حوالہ جات

۱۔ البدر الطالع، ج:۲، ص:۲۱۴، مطبعۃ السعادۃ، مصر، ۱۳۴۸ھ

۲۔ نفس مصدر، ج:۱، ص:۳۲۷، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان۔

۳۔ نفس مصدر، ج:۱، ص:۳۲۹-۳۲۸

۴۔ نفس مصدر، ج:۲، ص:۲۱۵-۲۱۴

۵۔ نفس مصدر، ج:۱، ص:۳۳۱

۶۔ نفس مصدر، ج:۲، ص:۲۱۵

۷۔ نفس مصدر، ج:۲، ص:۲۱۵

۸۔ نفس مصدر، ج:۲، ص:۲۱۸

۹۔ دیکھیے نفس مصدر، ج:۲، ص:۲۱۵-۲۱۹، اتحاف الاکابر، مجلس دائرۃ المعارف النظامیۃ، حیدر آباد ۱۳۲۳ھ

۱۰۔ دیکھیے: نفس مصدر، ج:۱، ص ۳۳۲-۳۲۷

۱۱۔ دیکھیے: نفس مصدر، ج:۱، ص:۲۵۶-۲۵۱

۱۲۔ دیکھیے: نفس مصدر، ج:۱، ص:۱۳۶-۱۳۷

۱۳۔ دیکھیے: نفس مصدر، ج:۱، ص:۶۶-۶۷

۱۴۔ نفس مصدر، ج:۲، ص:۲۱۹

۱۵۔ دیکھیے: نفس مصدر، ج:۲، ص:۱۶۳-۶۴

۱۶۔ دیکھیے: نفس مصدر، ج:۱، ص:۲۲۲-۲۲۵

۱۷۔ دیکھیے: ج، ۲ ص:۱۰۳-۱۰۶

۱۸۔ دیکھیے: ج، ۲ ص:۶۰-۷۱

۱۹۔ دیکھیے: نفس مصدر، ج:۲، ص:۲۱۹-۲۲۳

۲۰۔ منہج الامام الشوکانی فی العقیدۃ: ڈاکٹر عبد اللہ نومسوک، ص:۱۰۰-۱۱۶، مکتبۃ دار القلم والکتاب۔

۲۱۔ نیل الوطر، محمد زبار، ج:۲، ص:۳۰۲ مرکز الدراسات والابحاث الیمنیۃ، صنعاء۔

۲۲۔ ادب الطلب، ص:۸۴، ۸۵، ط: دار ابن حزم۔

۲۳۔ البدر الطالع، ج:۲، ص:۲۲۴، ادب الطلب للشوکانی، تحقیق و دراسۃ: عبد اللہ یحیٰ السریحی، ص:۸۸-۸۹ ط: دار ابن حزم۔

۲۴۔ دیکھیے البدر الطالع، ج:۲، ص:۸-۷

۲۵۔ دیکھیے: ارشاد ذوی الاسباب الی حقیقۃ ابن عبد الوہاب، تحقیق عبد الکریم جدبان، ص:۴۰۔ www.almajalis.com۔

۲۶۔ دیکھیے نفس مصدر: ص:۵۸-۶۷

۲۷۔ دیکھیے: البدر الطالع، ج:۲، ص:۶-۷

۲۸۔ دیکھیے: الفتح الربانی فی فتاویٰ الشوکانی، رسالۃ العدو الصائل، ص:۵۷۳۸، مکتبۃ الجیل الجدید، صنعاء، یمن)

۲۹۔ نفس مصدر، ص:۵۷۵۱

۳۰۔ نفس مصدر، ص:۵۷۵۳

۳۱۔ دیوان الشوکانی، تحقیق: حسین بن عبد اللہ العمری، ص:۱۶۱-۱۶۳، دار الفکر۔

۳۲۔ البدر الطالع، ج:۱۔ ص:۱۶۳

۳۳۔ دیکھیے: فتاویٰ شوکانی، رسالۃ: شرح الصدور فی تحریم رفع القبور، ص:۳۰۹۸-۳۱۰۵ رسالہ: الدر

النضید فی اخلاص کلمۃ التوحید ۳۱۲-۳۱۸، ۳۲۳-۳۳۹۔

۳۴۔العقد الثمین: تحقیق: عدنان السید علی الحسینی ص:۴۲، مرکز الغدیر للدراسات الاسلامیۃ۔

۳۵۔ دیکھیں: در السحابۃ فی مناقب القرابۃ والصحابہ، تحقیق: ڈاکٹر حسین بن عبداللہ عمری اور ارشاد الغبی الی مذہب اہل البیت فی صحب النبی۔

۳۶۔نیل الاوطار: ۹/۳۰، مکتبۃ الکلیات الازہریۃ۔

۳۷۔البدر الطالع، ج:۲، ص:۸۵،۸۶

۳۸۔نفس مصدر، ج:۲، ص:۸۹

۳۹۔دیکھیے: فتاویٰ شوکانی، رسالہ الدر النضید فی اخلاص التوحید، ص:۳۳۸-۳۳۶

۴۰۔نفس مصدر، ص:۳۱۸

۴۱۔نفس مصدر، ص:۳۱۵ تا ۳۱۶

۴۲۔ارشاد الفحول، مبحث الحقیقۃ والمجاز، مطبعۃ السعادۃ، مصر

۴۳۔نفس مصدر: ۳۴۳

۴۴۔نفس مصدر، ص:۳۴۳

۴۵۔نفس مصدر، ص:۳۴۳

۴۶۔دیکھیے: شرح الصدور فی تحریم رفع القبور۔

۴۷۔فتاویٰ شوکانی، بحث فی التصوف، ص:۱۰۴۵

۴۸۔نفس مصدر ص:۱۰۴۶

۴۹۔نفس مصدر، ص:۱۰۴۹

۵۰۔نفس مصدر، ص:۱۰۵۰

۵۱۔نفس مصدر، ص:۱۰۲-۱۰۵

۵۲۔دیکھیے: البدر الطالع، ج:۱، حرف القاف، ص:۳۷۸-۳۷۶

۵۳۔نفس مصدر، ص:۳۷۸-۳۷۹

۵۴۔نفس مصدر، ص:۳۷۹-۳۸۰

۵۵۔نفس مصدر، ص:۳۸۰

۵۶۔دیکھیے: الامام الشوکانی حیاتہ وفکرہ، ص:۳۳۱، مکتبۃ الجیل الجدید، صنعاء، یمن۔

۵۷۔البدر الطالع، ج:۱، ص:۲۸۰-۲۸۱

۵۸۔نفس مصدر، ص:۲۸۱

۵۹۔ج:۳، باب اخفاء التطوع وجوازہ جماعۃ، ص:۵۷۲، دار ابن قیم للنشر والتوزیع، المکتبۃ العربیۃ السعودیۃ۔

۶۰۔نفس مصدر، ج:۵، باب صفۃ الغسل، ص:۴۵

۶۱۔نفس مصدر، ج:۳، باب الانحراف بعد السلام، ص:۳۲۶

۶۲۔نفس مصدر، ج:۵، باب تسجیۃ المیت وتقبیلہ، ص:۲۹

۶۳۔قطر الولی فی حدیث الولی، تحقیق: ڈاکٹر ابراہیم ابراہیم ہلال، ص:۲۶۰-۲۵۷، مطبعۃ حسان، قاہرہ۔

۶۴۔فتاویٰ شوکانی، رسالۃ: الدرر النضید، ص:۳۱۵۔

۶۵۔ نفس مصدر، ص:۳۸۳)

۶۶۔نفس مصدر، ص:۳۱۵ تا ۳۱۶

۶۷۔فصل فی اماکن الاجابۃ۔ص:۶۲، دار الکتاب العربی: بیروت: ۱۴۲۳ھ ۲۰۰۲ء

۶۸۔نفس مصدر

۶۹۔البدر الطالع، ج:۱، ص:۸۷

۷۰۔نفس مصدر، ج:۲، ص:۱۶۶ تا ۱۶۷

۷۱۔التحف فی مذاہب السلف، تحقیق: سید عاصم علی، ص:۲۳، دار الصحابۃ للتراث، مصر

۷۲۔ارشاد الفحول، الباب السابع فی الظاہر المؤول، مبحث ما یدخلہ التاویل: ص، ۱۶۴

۷۳۔فتاوی الشوکانی، رسالۃ الانبیاء احیاء فی قبورہم، ص: ۶۶۳، ۶۶۴

۷۴۔نفس مصدر، ص:۶۲۹، ۶۳۰

۷۵۔نفس مصدر، ص:۳۱۷۶

۷۶۔نفس مصدر، ص:۵۲۴۹۔۵۲۵۰

۷۷۔دیکھیے: اتحاف الاکابر باسناد الدفاتر

○○○

صوفیانہ تفسیر: مقبول یا مردود؟

قرآن پاک انسانی زندگی کے لیے ایک مکمل دستور العمل ہے اور اس کے متعین کردہ خطوط پوری نسل انسانی کے لیے مشعل راہ ہیں انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق اس میں واضح احکامات وہدایات موجود ہیں۔ سیاسی، سماجی، اقتصادی، معاشرتی، تمدنی وغیرہم تمام لوگوں کی صلاح وفلاح کے لیے روشن اصول وقوانین اور علوم وفنون کا بیش بہا خزانہ اس کی مقدس سطور میں پوشیدہ ہے۔ پس ضرورت ہے اس خزانے کو حاصل کرنے کی۔ مگر ان کا حصول ہر کس وناکس کے بس کا نہیں بلکہ اس کے کچھ شرائط وقواعد ہیں جن کی پابندی اس راہ میں ضروری ہے۔ انہی شرائط وقواعد کی رعایت کے ساتھ قرآن کے معانی ومراد بیان کرنے کا نام تفسیر ہے اور تفسیر کے بغیر قرآن میں پوشیدہ خزانے کا پتہ لگانا ممکن نہیں۔

شرائط تفسیر

امام جلال الدین سیوطی ''الاتقان فی علوم القرآن'' میں لکھتے ہیں: ''قرآن مجید کی تفسیر کے لیے پندرہ علوم وفنون میں مہارات تامہ شرط ہے، اور جو شخص ان پندرہ علوم وفنون میں سے کسی ایک میں بھی ناقص ہے تو اسے تفسیر کرنے کا حق نہیں۔ وہ ۱۵/علوم وفنون درج ذیل ہیں: (۱) لغت عربیہ (۲) علم النحو (۳) علم الصرف (۴) علم الاشتقاق (۵) علم المعانی (۶) علم البیان (۷) علم البدیع (۸) علم التجوید (۹) قواعد شرعیہ (۱۰) اصول فقہ (۱۱) علم اسباب النزول (۱۲) علم الناسخ والمنسوخ (۱۳) علم الحدیث (۱۴) علم الفقہ (۱۵) علم الموہبہ۔ ان کے علاوہ بعض مفسرین نے ۲۵/علوم کی شرط لگائی ہے۔ (الاتقان فی علوم القرآن)

قواعد تفسیر

تفسیر کے لیے درج بالا شرائط کے ساتھ درج ذیل قواعد کی رعایت بھی از حد ضروری ہے۔ (۱) تفسیر قرآن بالقرآن (۲) تفسیر قرآن بالحدیث (۳) تفسیر قرآن باقوال الصحابہ (۴)

تفسیر ان امور سے جو لغت عربیہ اور قواعد اسلامیہ کے متعلق ہو۔ (۵) تفسیر کی وہ قسم جو وجوہ مذکورہ میں سے کسی ذریعہ سے ثابت ومتعین ہو۔

شرائط مفسر

ان شرائط وقواعد کی رعایت کے ساتھ علمانے مفسر کے لیے پانچ چیزیں ضروری قرار دی ہیں۔ (۱) ذکی وفہیم ہو، قرآن فہمی کی مکمل مہارت رکھتا ہو۔ (۲) علوم مذکورہ باضابطہ کسی ماہر اور تجربہ کار استاذ سے سبقاً پڑھے ہوں (۳) خود رائے اور متکبر نہ ہو۔ (۴) سنی صحیح العقیدہ ہو۔ (۵) علمائے معاصرین اور فضلائے ہم زمانہ کی نظر میں اس کا علم وفہم اور تقویٰ مسلم ومعتبر ہو۔ (تفسیر روح البیان مترجم ج:۱ص:۷)

تفسیر کے لیے مفسر کو درج بالا شرائط وقواعد کی رعایت کے ساتھ مؤخر الذکر شرائط کا پورا کرنا بھی ضروری ہے اور ان میں سے کسی شرط کو پورا نہیں کرتا تو اس کو تفسیر کا حق نہیں۔ اور اگر کوئی شخص ان مذکورہ شرائط وقواعد کی رعایت کیے بغیر اپنی رائے سے تفسیر کرے تو وہ نہ صرف مردود بلکہ حرام ہے۔

یہی وجہ ہے جس کی بنا پر تفسیر صوفیانہ کو لائق اعتنا نہیں سمجھا گیا اور باطل قرار دیا گیا، اور جن کتب تفسیر مثلاً روح البیان، التاویلات النجمیہ اور تفسیر نعیمی وغیرہم میں تفسیر صوفیانہ کو درج کیا گیا وہ درجۂ اعتبار سے گری ہوئی سمجھی گئیں۔ اور ایسی کتب تفسیر کے متعلق مخالفین نے کہا کہ یہ کتابیں صرف اور صرف صوفی منش لوگوں کے لیے ہیں اور علم وتحقیق سے خالی اساطیر الصوفیہ ہیں۔ لہذا یہ لائق استناد نہیں۔ اور تفسیر کے شرائط وقواعد کی کسوٹی پر کھری نہیں اترتیں لہذا ان کو اعتبار کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ تفسیر صوفیانہ کی مخالفت میں یہ ان کی سب سے قوی دلیل ہے۔ بہر حال مخالفین نے تفسیر صوفیانہ کو باطل قرار دیا ہے۔

مگر سچی بات یہ ہے کہ تفسیر صوفیانہ کو باطل یا غیر معتبر نہیں کہا جا سکتا، اور نہ ہی وہ کتب تفسیر، جن میں تفسیر صوفیانہ کو درج کیا گیا ان کو غیر مستند کہا جا سکتا۔ کیوں کہ صوفیہ اپنے کشف کے ذریعہ قرآن کریم کے جن پوشیدہ خزانوں کو پیش کرتے ہیں یہ ان کی اپنی رائے نہیں ہوتی۔ بلکہ تزکیۂ نفس، صفائے باطنی کے ساتھ بحر ذکر الٰہی میں غوطہ زنی کے بعد ان کے مصفٰی قلوب پر رب تعالیٰ کی جانب سے القا والہام ہوتا ہے اسی کو وہ بیان کرتے ہیں اور اسی کا نام تفسیر صوفیانہ ہے۔ علم کی چوں کہ دو قسمیں ہیں: (۱) علم ظاہری اس سے لفظی معنی مراد ہے (۲) علم باطنی اس سے تاویلی مفہوم مراد ہے۔ علامہ ابن نقیب کا قول ہے ''قرآن کے ظاہری معنی وہ ہیں جو عام طور سے اہل علم کو معلوم ہیں اور قرآن کے باطنی مفہوم سے وہ اسرار مراد ہیں جو اہل حقائق ہی کو معلوم ہوتے ہیں۔

چناں چہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے:

عن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: انزل القرآن علی سبعۃ احرف لکل آیۃ منہا ظھر و بطن۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قرآن سات طریقوں پر نازل ہوا، ہر آیت کا ایک معنی ظاہر اور دوسرا باطن (پوشیدہ) ہے۔ (مسند امام احمد ج:۵ ص:۱۱۴، مجمع الزوائد ج:۷ ص:۱۵۰، معجم کبیر طبرانی ج:۳ ص:۱۷۵)

اس مفہوم کی ایک اور حدیث ہے جو حضرت ابو ہریرہ سے منقول ہے:

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قَالَ: حَفِظت عن رسول اللہ ﷺ وعائین فأما احدھما حفظت من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعائین فأما أحدھما فبثثتہ و أما الآخر فلو بثثتہ قطع ھذا البلعوم۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہتے ہیں کہ میں نے حضور اقدس ﷺ سے دو طرح کے علم سیکھے، ایک تو وہ جس کو میں نے پھیلا دیا۔ اور دوسرے کو اگر میں عام طور پر شائع کردوں تو میرا یہ حلق کاٹ دیا جائے گا۔ (بخاری شریف ج:۱ ص:۲۳)

حضرت حسن بصری سے منقول ہے:

عنِ الحسن البصری مرسلا قال رسول اللہ ﷺ لکل آیۃ ظھر و بطن، ولکل حرف حدہ ولکل حد مطلع۔

ترجمہ: حضرت حسن بصری سے مرسلا مروی ہے کہتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: ہر آیت کا ایک ظاہر اور دوسرا باطن ہے اور ہر حرف کے لیے ایک نہایت ہے اور ہر نہایت کو حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ (کنز العمال ص:۵۵ حدیث نمبر ۲۴۶۱)

ان احادیث سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ قرآن مقدس میں علم ظاہری کی دولت کے ساتھ علم باطن کا خزانہ بھی موجود ہے۔ یہی وہ باطنی علوم ہیں جن کے بارے میں فرمایا گیا ''**ھو الذی لاتنقضی عجائبہ**'' قرآن اللہ کا وہ کلام ہے کہ اس کے عجائب و لطائف کبھی ختم نہ ہوں گے۔ ارباب سلوک (صوفیہ) کے قلوب باطنی ریاضتوں کی وجہ سے منور ہوتے ہیں اور ان پر تجلیات غیبیہ کا ورود ہوتا رہتا ہے۔ جب صوفیہ نے ان اسرار وحقائق کو بیان کیا تو اسی کا نام تفسیر صوفیانہ رکھ دیا گیا۔

شیخ تاج الدین بن عطاء اللہ اپنی کتاب ''لطائف المنن'' میں لکھتے ہیں۔

''کلام اور حدیث رسول اللہ ﷺ کی تفسیر وتشریح میں حضرات صوفیہ اور عارفین کے

بیان کردہ نکات اور اس قسم کے غرائب بیان کرنا کلام اللہ کو اس کے ظاہری مفہوم سے متغیر کرنا نہیں ہے۔ اس لیے کہ آیت کا بظاہر مفہوم تو وہی مراد ہوتا ہے، جس پر آیت ناطق ہے، اور وہ قواعد عربیہ اور اصول شریعت سے سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ غرائب محض رموز واشارات اور باطنی تفہیم ہوتے ہیں، جو غیبی طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارباب باطن کے قلوب پر القا کیے جاتے ہیں: (بحوالہ مفتاح السعادۃ ص:۴۲۳)

علامہ آلوسی تفسیر روح المعانی میں لکھتے ہیں:

صوفیہ اور عارفین کا کلام آیات قرآنیہ میں بطریق تفسیر نہیں ہوتا۔ کیوں کہ تفسیر تو حضور اقدس ﷺ اور صحابہ کرام کی بیان کردہ مراد کا نام ہے۔ بلکہ وہ تو صرف رموز واشارات اور وہ لطائف ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ ان کے قلوب پر نازل فرماتا ہے۔ بر بنائے کثرت عبادات وریاضات ان کے قلوب اس قدر مجلی ومصفی ہوتے ہیں کہ گاہ بہ گاہ ان کی زبان سے آیات کلام اللہ کی تشریح میں کچھ ایسے لطائف ومعارف جاری ہوتے ہیں جن کا تعلق ظاہری علوم سے نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف روحانی تلقین اور تفہیم غیبی ہوتے ہیں۔ یہ باطنی اشارات کلام اللہ کے اس مفہوم اور مدلول قطعی کو برقرار رکھتے ہوئے معتبر ہوں گے، جو اصول شریعت، نبی کریم ﷺ اور صحابۂ کرام کی تفسیر سے ثابت ہے۔ اس لیے کہ ارباب تصوف سے کوئی ایسی چیز منقول ہو جس سے ظاہر احکام شریعت اور حدود کا انکار لازم آتا ہو تو وہ ہرگز مقبول ومعتبر نہ ہوگی۔ قابل اعتبار صرف وہی لطائف واشارات ہوں گے جن سے نہ احکام شریعت پر کوئی زد پڑتی ہو اور نہ کسی ایسے امر کا صراحۃً یا دلالۃً رد لازم آتا ہو جو حضور اقدس ﷺ اور صحابہ کی تفسیر سے ثابت ہے'' (تفسیر روح المعانی بحوالہ تفسیر روح البیان مترجم ج:۱ ص:۱۱)

علامہ ابن نقیب لکھتے ہیں:

''صوفی ریاضت کرتے کرتے ایسے مقام تک پہنچ جاتا ہے کہ جہاں اس پر عبادت کے پردہ میں کچھ اشارات قدسیہ منکشف ہونے لگتے ہیں اور اسی طرح آیات میں جو معارف وحقائق ہوتے ہیں وہ ابر عجیب سے اس پر برس پڑتے ہیں'' (تاریخ تفسیر ومفسرین، ص:۵۳۴)

مفسر قرآن امام قاضی بیضاوی آیت کریمہ'' **الذی جعل لکم الارض فراشاً والسماء بناءً**'' کی تفسیر میں اسی عارفانہ نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''**ولعلہ سبحانہ أراد من الآیۃ الأخیرۃ مع ما دل علیہ الظاھر وسیق فیہ الکلام، الإشارۃ إلی تفصیل خلق الإنسان وما أفاض علیہ من المعانی والصفات علی طریقۃ التمثیل، فمثل البدن بالأرض، والنفس بالسماء، والعقل بالماء، وما**

أفاض عليه من الفضائل العملية والنظرية المحصلة بواسطة استعمال العقل للحواس، وازدواج القوى النفسانية والبدنية، بالثمرات المتولدة من ازدواج القوى السماوية الفاعلة والأرضية المنفعلة بقدرة الفاعل المختار، فإن لكل آية ظهراً وبطناً ولكل حد مطلعاً۔''

ترجمہ: آخری آیت سے اس ظاہری معنی کے ساتھ جس پر ظاہر کلام اور سیاق کلام کی دلالت ہورہی ہے، ممکن ہے کہ حق تبارک وتعالیٰ نے تمثیلی زبان میں انسان کی تخلیق اور اس کے محاسن و معانی کی تفصیل کی جانب اشارہ کرنا چاہا ہو، اس طرح اس نے زمین سے بدن کی تمثیل دی، آسمان سے نفس کی اور پانی سے عقل کی اور وہ ثمرات جو آسمان کی قوت تاثیر اور زمین کی قوت انفعال کے امتزاج سے فاعل مختار جل جلالہ کی قدرت سے پیدا ہوتے ہیں، ان کی تمثیل انسان کے ان عملی فضائل اور نظری کمالات سے دی جو عقل کی جانب سے حواس کے استعمال اور روحانی اور جسمانی قوتوں کے امتزاج واختلاط سے حاصل ہوتے ہیں، اور یہ اشارات اس لیے جائز ہیں کہ ہر آیت کا ایک ظاہری معنی ہے اور ایک باطنی معنی اور ہر حکم تک کسی نہ کسی کی رسائی ہے۔ (تفسیر بیضاوی ج:۱ ص:۴۳)

علم ظاہری، علوم عربیہ میں مشق وممارست، ناسخ ومنسوخ، مطلق ومقید، مجمل ومؤول اور اسباب نزول وغیرہم کی معرفت سے حاصل ہوتے ہیں۔ اور علم باطن تزکیۂ نفس وقلب سے حاصل ہوتا ہے۔ علم ظاہری کی رعایت کے ساتھ قرآن کے معانی بیان کرنے کو تفسیر عالمانہ کہا جاتا ہے۔ اور علم باطن کی روشنی میں قرآن کے معانی بیان کرنے کو تفسیر صوفیانہ۔

مفسر قرآن علامہ اسماعیل حقی نے روح البیان میں آیت کریمہ ''**وإذ فرقنا بكم البحر فانجيناكم واغرقنا آل فرعون وانتم تنظرون**'' کی تفسیر صوفیانہ التاویلات النجمیہ کے حوالے سے نقل کی ہے ملاحظہ فرمائیں، فرتے ہیں:

''دو بحر سے مراد دنیا اور اس کا پانی لذت وشہوات ہیں۔ اور موسی سے قلب اور قوم سے صفات مطلوب ہیں۔ فرعون نفس امارہ ہے اور اس کی قوم سے نفس کے صفات مراد ہیں۔ یہ سب موسی (قلب) اور اس کی قوم کے اعدا ہیں۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کو بالکل مٹادیں۔ اور قلب اور ان کے صفات اللہ عزوجل کی طرف لے جانے والے ہیں۔ ان کا دشمن فرعون (نفس) ان کے پیچھے ہے اور دنیا کا دریا ان کا آگے ہے۔ انہیں اللہ کی طرف اس دریا کو عبور کرکے جانا ہے۔ لا الہ الا اللہ کے عصا کی ضرب کے بغیر پہنچنا ناممکن ہے۔ اور وہ عصائے موسیٰ (قلب) کے ہاتھ میں ہے۔ کیوں کہ اس کا بھی سفید ہاتھ

ہے۔ اگر وہ عصا اس کے ہاتھ میں نہ ہوتا تو وہ غرق ہوجاتے فرعون اور اس کی قوم غرق ہوگی اور اگر یہی عصا فرعون اور اس کی قوم (نفس امارہ اور اس کے صفات) ہاتھ میں ہوتا تو یہ معجزہ دریا کا پھٹنا ان سے سرزد نہ ہوتا۔ جب موسیٰ (قلب) کا ذکر عصا مارتا ہے تو بحر (دنیا) اور اس کا پانی (شہوت ولذت) دائیں، بائیں ہٹ جاتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنے لطف کی ہوا اور ہدایت کے سورج کو دریا کے گردے پر چلاتا ہے تو وہ دریا (دنیا) شہوت ولذت کے پانی سے خشک ہوجاتا ہے۔ پھر موسیٰ (قلب) اور اس کی قوم (صفات) دریا میں کود پڑتے ہیں اور دنیا کے دریا کو صحیح وسالم ہوکر عبور کرجاتے ہیں۔ جنہیں اللہ تعالیٰ کے لطف نے نجات بخشی وہ کنارے پہنچ کر اللہ تعالی کے ساتھ واصل ہوئے۔ فرعون (نفس) اور اس کی قوم (شہوات ولذات) کو حکم ہوا کہ تم بحر (دنیا) میں ڈوب کر جہنم کی آگ میں داخل ہوجاؤ۔'' (تفسیر روح البیان ج:۱ ص:۲۸۶)

یہ ہے تفسیر صوفیانہ اس میں ذرا غور کریں اور بتائیں کہ آخر وہ کون سا جملہ ہے جو اصول شریعت کے خلاف ہے، جس کی بنا پر اس تفسیر کو باطل ونامقبول کہا جائے۔ دراصل صوفیہ کرام قرآنی آیات کی تفسیر اور احادیث طیبہ کی تشریح میں ایسے باطنی اور خفیہ معانی بیان کرجاتے ہیں جو غیر صوفی کے لیے حیرانی کا سبب بن جاتے ہیں اور ظاہر بین شخص صوفیہ کے کلام کی تردید کرکے اس پر ناحق اور باطل کا ہوّا کھڑا کرکے خود بھی بدکتا ہے اور دوسروں کو بھی بدکاتا ہے۔

مگر ہاں اتنا ضرور ہے کہ صوفیہ اگر قرآن وحدیث کا ایسا کوئی معنی بیان کریں جو عجیب وغریب معلوم ہوں تو ان کو بجائے رد کرکے اصول تفسیر کی روشنی میں ان کا جائزہ لیا جائے اگر وہ ان اصول کے موافق ہے تو قابل قبول ورنہ یقیناً قابل رد ہے۔ کیوں کہ صوفیہ کی جماعت میں بہت سارے جاہلان بے خرد نے علم باطن کے نام پر بہت سی ایسی خرافات وضع کردی ہیں جو روح اسلام کے منافی ہیں۔ ہاں! اگر صوفیہ کے ذریعہ قرآن وحدیث کے بیان کردہ باطنی معانی عربی زبان کے اصول وقواعد سے متضاد نہ ہوں اور کوئی نص ایسی موجود ہو، جس سے باطنی معنی کی تائید ہوتی ہو اور اس کا کوئی معارض نہ ہو تو تفسیر صوفیانہ مقبول ہوگی اور لائق استناد بھی۔ ایسی تفسیر کو غلط، اور مردود بتانا خود باطل ومردود ہونے کے مترادف ہے۔ اور تفسیر صوفیانہ حق ہے۔ اس کے قابل قبول ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ اور وہ کتابیں جن میں تفسیر صوفیانہ درج ہیں وہ بھی معتبر ہیں۔ مولائے کریم ہم کو گمراہ کن نظر، شیطانی وسوسوں سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمارے قلوب، نفوس واذہان کو مزکیٰ ومصفی فرمائے۔ آمین **بجاہ طٰہٰ ویٰس**۔

○○○

تحریر: شیخ عدنان بن عبداللہ زھار
ترجمہ: مولانا غلام مصطفیٰ ازہری

علم حدیث میں صوفیہ کا منہج اوران کی خدمات

تمام تعریفیں اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے ہیں جس نے قرآن کریم کو ہر کمی وزیادتی سے محفوظ رکھااور قرآن کریم کی تفہیم کے لیے اپنے نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی حفاظت فرمائی۔ نیز اپنی مخلوق کی جماعت سے ایسے تقویٰ شعار حضرات کو منتخب فرمایا جنھوں نے اخلاص کے ساتھ نبی کریم ﷺ کی سنت کی خدمت کی اور اس کوافترا پردازوں کے افترا اور باطل کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رکھا۔ یہ حضرات عابدین کی جماعت کے سرخیل اور انوار ہدایت کے مرکز تھے۔ نبی کریم ﷺ کے مبارک کلام کی حفاظت فرمانے والے اوران کی سیرت طیبہ سے اپنے قلوب کو مزین کرنے والے تھے۔ میں گواہی دیتاہوں کہ اللہ کریم کے علاوہ کوئی معبودنہیں اوراس بات کی بھی گواہی دیتاہوں کہ ہمارے آقا ومولیٰ محمد ﷺ ہیں۔

اے اللہ! اس عظیم ذات پر درود نازل فرما جومرکز فیضان اور سرچشمۂ انوار ہے، حقیقتوں کی حقیقت اور سرالاسرار ہے اور ہمیشہ ہمیش رحمت نازل فرما ان کی آل، پاک ازواج، نیک اصحاب اوران کے متبعین پر۔

علامہ احمد بن علی ابوبکر خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ ''شرف اصحاب الحدیث''میں فرماتے ہیں: میں نے حدیث بیان کی عبدالعزیز بن جعفر فقیہ سے، انھوں نے ابوبکر خلال سے، انھوں نے زبیر بن صالح بن احمد سے، انھوں نے مہنا ابن یحییٰ سے وہ کہتے ہیں کہ میں نے احمد بن حنبل سے معان ابن رفاعہ از ابراہیم بن عبدالرحمن عذری کی حدیث کے بارے میں سوال کیاتو انھوں نے کہا کہ: آقا ﷺ نے ارشادفرمایا:

يَحۡمِلُ هَذَا الۡعِلۡمَ مِنۡ كُلِّ خَلَفٍ عُدُولُهُ يَنۡفُونَ عَنۡهُ تَحۡرِيفَ الۡجَاهِلِينَ وَ انۡتِحَالَ الۡمُبۡطِلِينَ، وَتَأۡوِيل الۡغَالِين۔

آنے والے ثقہ علمااس علم کو لے کرآگے بڑھیں گےاوراس کو جاہلوں کی تحریف، باطلوں کے الزام اورغلوپسندوں کی تاویل سے محفوظ رکھیں گے۔

میں نے امام احمد سے پوچھا کہ یہ موضوع حدیث ہے؟ انھوں نے کہا: نہیں، یہ صحیح ہے۔ پھر میں نے سوال کیا، آپ نے کس سے سنا؟ انھوں جواب دیا: متعددلوگوں سے، میں نے کہا: وہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ مجھ سے مسکین نے بیان کیا، مگرانہوں نے اس کی سنداس طرح بیان فرمائی: معان از قاسم بن عبدالرحمن احمد۔ اس کے بعدامام احمد نے معان ابن رفاعہ کے بارے میں کہا کہ اس سے حدیث لینے میں کوئی حرج نہیں۔

یہ حدیث صحیح لغیرہ ہے جوحضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما اوران کے علاوہ بھی دوسرے صحابہ سے متعدد سندوں کے ذریعے روایت کی گئی ہے۔

اس حدیث میں جس علم کی طرف اشارہ کیا گیاہے وہ لفظی، وصفی اور فعلی ہراعتبار سے علم نبوت ہے۔ اس طرح حدیث میں ثقہ سے مرادصوفیہ نہ ہوں گے توکون ہوگا؟ ظاہری عدالت کے سلسلے میں ان کا اتفاق ہے، اس کے ساتھ وہ اخلاص، صدق اوریقین پر مشتمل عدالت باطنی کے بھی قائل ہیں۔ اسی طرح صوفیہ کا اپنے محبوب، جوراحت قلب ونظر بھی ہیں اورشمع فکر وشعور بھی، سنت کی خدمت کرناایساہی واضح اورظاہر ہے جیسے ہمارے سروں پر یہ نیلگوں آسمان۔ سنت رسول کی نصرت وحمایت اور ہرطرح کی ریشہ دوانی، تبدیلی اورتحریف سے بچانے میں اہل اللہ کی کوششوں کاانکارآفتاب نیم روز کی کرنوں کاانکار کرناہے۔

الشمس حق و العيون نواظر
لكنها تخفى على العميان

سورج کاوجودحق ہے، یقیناً آنکھیں اسے دیکھتی ہیں، لیکن بےنورنگاہیں اس کی دید سے محروم ہوتی ہیں۔

علم نبوی میں سادات صوفیہ رضی اللہ عنہم کی نظر دقیق تھی، تحمل واداءاورروایت کے ساتھ ساتھ فہم وفقہ اوردرایت میں ان کا اپنا خاص نہج اورخاص اسلوب تھا، جس سے اہل فن واقف ہیں۔ لیکن جوحق سے محجوب، باطل پرست اورصدق وصداقت سے دورہیں، انھوں نے ان سادات صوفیہ کے بارے میں یہ گمان کیا کہ یہ علم سنن وآثار کے دشمن ہیں۔ علم احادیث اوراخبارواسانید سے جاہل ہیں۔

لیکن یہ بےچارے کیا جانیں کہ ان ہی کے کندھوں وراثت محمدی کا بوجھ رہااوران ہی کے سینوں میں علم احمدی محفوظ رہا، اگر یہ سادات صوفیہ نہ ہوتے تو حدیث کی سندیں نہیں ہوتیں اور نہ حدیث کے الفاظ کی صحیح معرفت حاصل ہوتی۔

سادات صوفیہ پر انکار کے اسباب

درج ذیل اسباب کی بنا پر سادات صوفیہ اور ان کی خدمات کا انکار کیا جاتا ہے:

ا۔ یہ سادات صوفیہ رضی اللہ عنہم نفوس بشریہ، احوال عرفانیہ، مقامات احسانیہ اور منازل نورانیہ سے زیادہ دل چسپی رکھتے ہیں، یہی چیزیں ان کی مجلسوں کے دسترخوان پر سجی ہوتی ہیں، خانقاہوں کے دستاویزات اور ان کی تصنیفات وتالیفات کا موضوع ہوتی ہیں، اور علم حدیث کی درایت وروایت ان کے نزدیک فقط وصول الی اللہ کا ذریعہ اور مقصود کے حصول کا سبب ہوتا ہے۔ کیوں کہ ان کا مقصود اللہ اور اس کا رسول ہے۔ اور ان کا ارادہ محض حق اور حق تک پہنچنا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کی مجلسیں اور کتابیں نہ تو اسناد وروایت سے پر ہوتی ہیں، نہ ہی اسماء الرجال اور اصول درایت سے۔ اسی لیے حق سے دور لوگوں کا گمان ہے کہ سادات صوفیہ کے سینے علوم حدیث سے خالی اور ان کی زندگی اس کے حصول سے دور ہوتی ہے۔ جب کہ حق یہ ہے کہ یہ حضرات مطلوب تک پہنچنے کے لیے ان کو وسائل کے طور پر اور منزل تک پہنچنے کے لیے زادراہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

۲۔ سادات صوفیہ اپنے علوم کی تعبیر ایک خاص زبان میں کرتے ہیں اور ایسے الفاظ میں اپنی معلومات لوگوں تک پہنچاتے ہیں جو محدثین کی تعبیر سے مختلف ہوتی ہیں۔ یہ الفاظ وتعبیر خود ان کی ایجاد کردہ ہیں جس میں دوسرا شریک نہیں۔

شیخ الاسلام مخزومی فرماتے ہیں کہ کسی عالم کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ صوفیہ کا راستہ اختیار کیے بغیر اور ان کے افعال واقوال کو کتاب وسنت کے مخالف دیکھے بغیر ان کا انکار کرے۔ اسی طرح ان کی طرف منسوب غلط چیزوں کی بنا پر انکار کرنا جائز ہے۔ مزید فرماتے ہیں کہ انکار کرنے والوں پر یہ ضروری ہے کہ سب سے پہلے صوفیہ کے اقوال، افعال اور احوال میں ستر بار غور وفکر کر لیں تب جا کر کہیں انکار کریں۔۔۔ پھر مذکورہ باتیں کہنے کے بعد فرماتے ہیں کہ جو شخص ان سادات صوفیہ کی مراد کو نہیں جانتا اس کے لیے کیسے درست ہوگا کہ ان پر کلام کرے اور ان کا رد کرے۔

۳۔ بعض سادات صوفیہ نے بغیر کسی وسیلے اور سند کے اپنے رب سے حدیث بیان کی ہے اور کشف والہام کے ذریعہ بہت سی احادیث کی تصحیح فرمائی ہے جس کو مخالفین تسلیم نہیں کرتے۔ کبھی کبھی تو وہ بیداری کی حالت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حدیث سن کر بیان کرتے ہیں۔ جس کا اہل عناد وغفلت انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ کشف والہام کے ذریعے کسی حدیث کو صحیح ٹھہرانا سادات صوفیہ کے نزدیک معتبر ہے۔ لیکن اہل ظاہر اس کا انکار کرتے ہیں۔ عجلونی نے ''کشف

الخفاء'' میں صوفیہ کے کشف والہام کا ذکر کیا ہے اور اس کے ذریعے روایت حدیث کو درست مانا ہے، اسی طرح حافظ بغدادی نے بھی ''**المغیر**'' اور ''**البرھان الجلی**'' میں ذکر کیا ہے، بلکہ صوفیہ کے کشف والہام کے ذریعے کسی حدیث اور اس کی صحت کو قبول کرنے کے لیے اصول وقواعد مقرر کیے گئے ہیں۔ امام سیدی محمد بن عبدالکبیر کتانی نے ''**الفص المختوم شرح سورۃ الضحیٰ**'' میں لکھا ہے کہ جس طرح انبیا کے لیے وحی ہوتی تھی، اولیا کے لیے بھی فیضان وحی ہوتا ہے لیکن اولیا پر شریعت نہیں اترتی۔ عام علما کے برخلاف نفوس قدسیہ کا احادیث کی تصحیح وتصنیف کرنا فیضان وحی کا نتیجہ ہے۔

کشف کے ذریعے احادیث واخبار پر حکم لگانا ایک دوسری بحث ہے جس میں اہل ظواہر اور اہل سلوک وکشف کا اختلاف ہے۔

ان ہی اختلافات میں سے ایک مسئلہ بیداری کی حالت میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھنا اور ملاقات کرنا بھی ہے۔ حالانکہ عقلاً وشرعاً اس کی تائید واثبات میں علما کی ایک کثیر تعداد نے کتابیں لکھی ہیں، ان میں امام سیوطی سرفہرست ہیں جنھوں نے ''**تنویر الملک بروحة النبی والملک**'' لکھی ہے اور شیخ الاسلام ابن حجر ہیتمی نے ''**الفتاویٰ الحدیثیة**'' میں اس پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔

کشف والہام کے ذریعے کسی حدیث پر حکم لگانے کے سلسلے میں جو اختلاف ہے، اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ کشف والہام اور براہ راست حدیث لینے اور ہم کلام ہونے کا دائرہ کیا ہے، علما کے نزدیک یہی امر مختلف فیہ ہے۔ جب کہ احادیث صحیحہ میں وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض اولیا کو ان نعمتوں سے سرفراز فرماتا ہے۔ حضرات صوفیہ کے لیے اس میں صریح دلیل ہے کہ وہ اپنے کشف والہام کے ذریعے سے کسی صحیح خبر کو غلط قرار دیں۔

صوفیہ کا محدثین کے طرز پر حدیث نبوی کی خدمات

ان تمام چیزوں کے باوجود شرق وغرب میں پھیلے یہ سادات صوفیہ محدثین کے بنائے ہوئے قواعد وضوابط کے خلاف نہیں گئے اور نہ ہی اصطلاحی قواعد کے معارض کوئی دوسرا خاص منہج گڑھ لیا۔ بعض قواعد وطرق میں ایک خاص طریقہ اختیار کر لینے سے ان کا اہل حدیث کے منہج پر اعتماد واتباع کی نفی نہیں ہو جاتی۔ عہد قدیم وجدید میں ان کی روشن خدمات اور عظیم حصہ داری کا انکار کسی طرح روا نہیں۔

جب ہم گزشتہ چند صدیوں پر نظر دوڑاتے ہیں جن میں مذہبی تعصب عام ہو گئی تھی اور لوگوں نے اپنے اشہب فکر کو علمائے سلف کے دروازے پر باندھ دیا تھا، سندوں کا اہتمام

کرنے اور حدیث پر اعتماد کرنے سے اپنی فکر وفہم کو بند کر دیا تھا، فقہا حدیث کی معرفت اور آثار پہ اعتماد کرنے سے گریز کرنے لگے تھے، ہم دیکھتے ہیں کہ صوفیہ ان کے مقابلے کے لیے کھڑے ہوئے اور حدیث میں غوطہ زنی اور علم حدیث کے حصول پر زور دیا، بلکہ انھیں نفوس قدسیہ کی خانقاہیں تھیں جہاں کتب مستندہ کی قرأت ہوئی اور صرف اور صرف یہی حضرات تھے جنہوں نے احادیث اور اعلیٰ اسانید کے لیے دور دراز کا سفر کیا۔

امام سیدی محمد بن عبدالکبیر کتانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''**سلم الارتقاء**'' میں لکھا ہے: تم اپنی معلومات میں اضافہ کرلو کہ وہ دو عظیم علم جو بڑی فضیلت و اہمیت کے حامل ہیں اور نظام عالم کی اصلاح کے لیے شارع کا مقصود ہے وہ علم حدیث اور علم تربیت نفس ہے۔ آج یہ دونوں علم گویا کہ منسوخ ہو گئے ہیں۔ حدیث؛ گویا اب اس کے ماننے والے نہ رہے کیوں کہ جب بھی کسی کے سامنے دلیل کے طور پر کسی فقہی جزئیہ کے مقابلے میں حدیث پیش کی جاتی تو وہ اس طرح غضب ناک ہوجاتا ہے، گویا اس کے سامنے دین میں کوئی ایسی چیز شامل کرنے کی بات کردی جس کی اجازت اللہ تعالیٰ نے نہیں دی ہے۔ پھر وہ اس حدیث کے مقابلے میں کسی حکیم کا قول یا امام کا جزیہ پیش کرے گا۔ زمانہ کس قدر رسول اللہ ﷺ کی حدیث سے دور ہو گیا، وہ حدیث جو وحی سماوی سے مؤید ہے، آسمانی فرشتوں کے لیے باعث راحت وسکون ہے، صبح وشام ان کا وظیفہ ہے، یہی علم اللہ تعالیٰ کی حقیقت کو کھولنے والا ہے اور اسی علم میں عبادت حقیقی کا وہ خزانہ پوشیدہ ہے جس کے لیے جن وانس پیدا کیے گئے ہیں۔

پھر بھی اگر کوئی اعتراض کرے کہ امام کے مرتبے سے یہ بعید ہے کہ وہ اس حدیث پر مطلع نہیں ہو سکے تو میں جواب دوں گا کہ علم حدیث میں لوگوں کی معلومات تشنہ رہی ہے، دیکھو یہ حضرت عمر بن خطاب ہیں جو ہمیشہ وحی سے جڑے رہے جب ان سے کوئی حدیث پوشیدہ رہ سکتی ہے تو پھر ان کے علاوہ کے لیے یہ کیوں کر جائز نہ ہوگا۔

''**العهود المحمدية**'' میں قطب ربانی، امام شعرانی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ایک عام وعدہ لیا گیا کہ ہم روایت حدیث میں جرأت نہیں کریں گے۔ بلکہ رسول اللہ کی ہر حدیث کی روایت کرتے وقت تحقیق کریں گے لہٰذا جو روایت ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہوگی بیان نہیں کریں گے۔

سیدی علی الخواص علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ کسی فقیہ کے لیے مناسب نہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے کوئی ایسی حدیث روایت کرے جس میں کوئی ایسی علامت نہ پائی جائے جس سے حدیث رسول ہونا معلوم ہو۔ خواہ یہ نقل کے طریقے سے ہو، یا یہ کہ بیداری کی حالات میں رسول

اللہ ﷺ سے سوال کیا جائے اور حضور یہ فرمائیں کہ یہ میرا کلام ہے۔ لیکن اس کی ضرورت نقل و سند میں ضعف ہونے کی صورت میں ہے، ہاں! اگر محدثین کے طریقے پر حدیث صحیح ہے اور محدثین نے اس کی تحسین بھی کی ہے تو ایسی صورت میں حضور ﷺ سے سوال کرنے کی ضرورت نہیں۔

جان برادر! جان لو کہ اس زمانے میں متصوفین کے درمیان خیانت عام ہوگئی ہے، جن کا راہ تصوف میں کوئی حصہ نہیں۔ کبھی کبھی وہ حضور ﷺ سے ایسی باتیں روایت کرتے ہیں جو حضور ﷺ کے کلام سے نہیں ہوتا، یہ علم حدیث میں عدم ذوق اور کلام نبوی اور غیر نبوی میں تمیز نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ کیوں کہ اگر یہ عارفین ہوتے تو رسول اور غیر رسول کے کلام میں ضرور فرق محسوس کر لیتے۔ اس لیے کہ نور نبوت کی چمک اس سے پوشیدہ ہی نہیں ہو سکتی جس کا دل منور ہو۔

میں نے بعض حضرات کو ابو محمد کتانی کے اس قول کی حکایت بیان کرتے ہوئے سنا ہے کہ ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا تو ان سے عرض کیا: یا رسول اللہ! (ﷺ) میرے لیے دعا فرمائیں کہ میرا دل مردہ نہ ہو تو آقا نے فرمایا کہ ہر دن چالیس مرتبہ ''**یاحی یاقیوم لا اله الا انت**'' پڑھا کرو۔

یہ خواب کی بات تھی۔ پھر بطور ابہام اس طرح روایت کی جانے لگی، گویا آقا نے یہ بات اپنے صحابہ سے کہی ہو۔ پھر اس کو ائمہ حفاظ نے بھی اسی طرح روایت کر دی حالانکہ یہ بہت بڑا وہم ہے۔ اگر یہ بات میں نہ بتاتا تو اسے معلوم نہ ہوتی۔

میں نے شیخ الاسلام زکریا رحمۃ اللہ علیہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ بعض محدثین نے صالحین کی جماعت کو سب سے جھوٹا مانا ہے؛ کیوں کہ وہ لوگ اپنے باطن کی پاکی کی وجہ سے ہر شخص کے ساتھ اچھا گمان رکھتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ لوگ رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ نہیں گڑھتے۔ شیخ زکریا نے فرمایا: یہاں پر صالحین سے محدثین کی مراد محض عبادت گزار ہیں جن کا علم بلاغت سے کوئی شغف نہیں ہوتا، جس کی وجہ سے وہ کلام نبوی اور غیر کلام نبوی میں فرق نہیں کر پاتے۔ برخلاف عارفین کے کہ ان پر یہ بات پوشیدہ رہ ہی نہیں سکتی، ان میں سے بعض تو ایسے ہیں جو پردے کے پیچھے سے بھی آواز رسول اور آواز غیر رسول میں محض خوشبوئے رسول کی وجہ سے تمیز کر لیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مجھ پر ذوق ادب عطا فرما کر احسان فرمایا جس کی وجہ سے میں کلام نبوی اور کلام غیر نبوی میں تمیز کر لیتا ہوں، کوئی بھی شخص حضور اکرم ﷺ کی طرح فصاحت پر قادر نہیں ہوسکتا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ صحابی نے حضور سے کوئی بات سنی اور بعض الفاظ یاد نہ رہ سکے مگر معنی ذہن میں محفوظ رہا تو انھوں نے ہمارے لیے اپنے الفاظ میں حدیث بیان کردی، میں اسے بھی تعبیرات اور اسلوب کی وجہ سے جان لیتا ہوں جب کہ بعض محدثین اسے موضوع حدیث شمار کر دیتے ہیں۔ حالانکہ وضع محض الفاظ کے اعتبار سے ہے اور اصل حدیث تو رسول اللہ ﷺ کی

جانب سے بالکل صحیح ہے۔ اے میرے بھائی! علم حدیث حاصل کرو، تاکہ رسول اللہ ﷺ کے کلام میں جھوٹ سے بچ سکو اگرچہ عمداً نہ ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم

صرف یہی نہیں بلکہ صوفیۂ محققین نے ان احادیث کو بھی محفوظ رکھا ہے جن کو فضائل اعمال میں شمار کیا جاسکتا ہے جب کہ اہل حدیث نے اسے ضعیف کہہ کر چھوڑ دیا۔

''**ارشاد الطالبین الی مراتب العلماء العاملین**'' میں قطب ربانی، امام شعرانی فرماتے ہیں کہ فضائل کی تمام احادیث قبول کی جائے گی۔ اگرچہ اس کی سند پر ضعف کا حکم لگایا گیا ہو۔ کیوں کہ حدیث ضعیف شریعت سے خارج نہیں، بلکہ احادیث موضوعہ بھی خارج نہیں، کیوں کہ اگر شریعت اس موضوع روایت کے مطابق نہ ہوتی تو دلیل تو دور کی بات ہے حدیث وضع کرنے والے کو اس حکم کا بھی علم نہ ہوتا جس کے لیے اس نے حدیث گڑھی ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ کے قول ''**لاسبق الا فی خف او حافر**'' (صرف شتربانی اور گھوڑسواری کا مقابلہ جائز ہے) کو دیکھو کہ واضع نے کس طرح سے جب کسی خلیفہ کو کبوتر بازی کرتے دیکھا تو اس حدیث میں ''او جناح'' (کبوتر بازی) کا اپنی طرف سے اضافہ کردیا۔ اگر خف اور حافر کا ذکر نہ ہوتا تو گڑھنے والا اجناح کا اضافہ کیسے کرپاتا۔

اسی طرح سے اگر وہ ساری حدیثیں نہ ہوتیں جو فضائل سور و ادعیہ میں وارد ہیں تو وضع کرنے والے کچھ بھی وضع نہ کرپاتے اس کے مثل حدیث نہ ہونے کی وجہ سے کس پر وہ قیاس کرتے۔ رہی وہ موضوع حدیث جو کسی چیز کے مرتبے کو گھٹاتی ہے صرف اسی طرح کی روایات کا کوئی اعتبار نہیں ہے، لیکن اس کے علاوہ فضائل میں حدیث گڑھنے والے پر صرف ایک طعن رہ جاتا ہے کہ خاص لفظ کو اس نے رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کردیا ورنہ حدیث موضوع پر عمل کرنے کا حکم مجتہدین کے اقوال کے برابر ہے کیونکہ دونوں کا ماخذ شریعت ہے۔

بالجملہ رسول اللہ ﷺ کی سنت سے صوفیہ کی محبت، شریعت کی خدمت میں ان کی جدو جہد، حدیث رسول کی حفاظت بلکہ اجمالی طور پر شریعت کی خدمت میں ان کے کارناموں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ راہ تصوف میں قدم رکھنے کے لیے علوم شرعیہ میں تبحر علمی شرط ہے جس میں علم حدیث بھی شامل ہے۔

''**الکوکب الشاھق**'' میں قطب الوقت امام شعرانی فرماتے ہیں کہ مرید صادق کے اخلاق سے یہ بھی ہے کہ وہ اہل تصوف کی راہ اس وقت تک اختیار نہ کرے جب تک علوم شرعیہ میں تبحر نہ ہوجائے تاکہ شیخ اسے اس کے بعد دوسرے معاملے کی اجازت دے۔

مجھ تک یہ خبر پہنچی کہ شیخ ابوالحسن شاذلی علیہ الرحمہ فرماتے تھے کہ جو شخص علوم شرعیہ میں اس

قدر ماہر نہ ہو کہ اپنے زمانے کے اکابر علما کو واضح دلیلوں کے ساتھ میدان مناظرہ میں شکست دے سکے، وہ ہماری صحبت اختیار نہ کرے۔

خدمت حدیث میں صوفیہ کے کارناموں کا ایک مختصر جائزہ

علم حدیث کی بنیاد اسناد پر ہے، عبداللہ ابن مبارک رضی اللہ عنہ نے اسناد کے بارے میں ارشاد فرمایا:

الْإِسْنَادُ مِنَ الدِّينِ، وَلَوْلَا الْإِسْنَادُ لَقَالَ مَنْ شَاءَ مَا شَاءَ وَلَكِنْ إِذَا قِيلَ لَهُ: مَنْ حَدَّثَكَ؟ بَقِيَ۔

ترجمہ: اسناد دین سے ہے اگر اسناد نہ ہوتا تو جس کے دل میں جو آتا کہتا لیکن جب اس سے یہ دریافت کیا جائے گا کہ تم سے کس نے بیان کیا ہے تو اس سے دین محفوظ ہوگیا۔

امام مسلم نے اپنی کتاب صحیح مسلم کے مقدمہ میں ابن سیرین کا یہ قول نقل کیا ہے:

لَمْ يَكُونُوا يَسْأَلُونَ عَنِ الْإِسْنَادِ، فَلَمَّا وَقَعَتِ الْفِتْنَةُ، قَالُوا: سَمُّوا لَنَا رِجَالَكُمْ، فَيُنْظَرُ إِلَى أَهْلِ السُّنَّةِ فَيُؤْخَذُ حَدِيثُهُمْ، وَيُنْظَرُ إِلَى أَهْلِ الْبِدَعِ فَلَا يُؤْخَذُ حَدِيثُهُمْ۔

ترجمہ: پہلے لوگ سند کے بارے میں نہیں پوچھتے تھے، لیکن جب فتنے اٹھنے لگے تو لوگوں نے یہ پوچھنا شروع کیا: تم ہمیں اس حدیث کے راویوں کو بیان کرو۔ تو جب راوی اہل سنت سے ہوتا تو اس کی حدیث قبول کرلیتے اور اگر اہل بدعت سے ہوتا تو رد کردیتے۔

امام مسلم نے عبداللہ ابن مبارک کا بھی ایک قول نقل کیا ہے:

بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْقَوَائِمُ أَيِ الْإِسْنَاد

ہمارے اور قوم کے درمیان اسناد ایک ستون ہے جس کے بغیر حدیث قابل قبول نہیں۔

اسی لیے علمائے امت رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی احادیث میں سند کا اہتمام کرتے، راویوں کے بارے میں غور وفکر کرتے، اتصال سند، سماع اور لقا کا خیال رکھتے تب حدیث سند کے ساتھ بیان کرتے تاکہ صحیح کو ضعیف سے اور سلیم کو سقیم سے الگ کیا جاسکے۔

ان اسانید اور رواۃ کی کتابوں کا مطالعہ کرنے والا صوفیہ صافیہ کی موجودگی کو واضح طور پر محسوس کرے گا، صوفیہ کی یہی وہ جماعت ہے جو فن تربیت، خلوت اور سلوک وانقطاع وغیرہ کا زیادہ اہتمام کرتی ہے تو کیا تم یہ گمان کرسکتے ہو کہ یہ لوگ بھی خیر خلق اور عین حق کی حدیث کو بغیر غور وفکر کے لے لیتے ہوں گے۔

مندرجہ ذیل عناوین کے تحت ان کے کارناموں کا ایک جائزہ پیش ہے: اسانید، کتب سنن، نقد رجال، تخریج، اصطلاحات حدیث، فن حدیث، متاخرین کی اسانید اور کتب تسعہ کے رواۃ

کتب سنن کی سندوں میں صوفیہ کی موجودگی

سند کے ساتھ جن کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث قولی، فعلی یا تقریری جمع کی گئی ہے جیسے صحاح، سنن، معاجم، مسانید، اجزا، مصنفات اور تاریخ وغیرہ۔ ان کتابوں کی سندیں صوفی راوی سے خالی نہیں ہیں، ان میں وہ صوفیہ بھی ہیں جو تحمل واداکے اعتبار سے اتقان وضبط کے اعلی درجے پر فائز ہیں، بعض متوسط ہیں اور بعض اس سے بھی کم درجے کے ہیں۔ رہا ان سے جھوٹ کا صدور حاشا یہ ان سے ممکن نہیں ہے، ان کی طرف جھوٹ کی نسبت کوئی کذاب ہی کرسکتا ہے تمثیل کے طور پر ان میں سے بعض کے نام کو ہجائی ترتیب پر ذکر کیا جارہا ہے کیونکہ تمام ناموں کا احاطہ مشکل ہے:

ممتاز صوفی احمد ابن حسن بن عبد جبار، صوفی احمد ابن حسین بن اسحاق، ابوصالح احمد بن عبد الملک بن احمد نیساپوری، ابوسعد احمد بن محمد مالینی، ابوجعفر احمد بن یحیی بن زکریا اودی کوفی، حاتم الاصم، حسن بن محمد قرشی تیمی بکری، ابوعلویہ حسن بن منصور، ابوعلی حسن بن منصور بن ابراہیم بغدادی شطوی، ابومہاصر ریاح بن عمرو قیسی، سعید بن ابوسعید، عیار، ابوعثمان سعید بن عباس، عبدالرحمن بن ثابت بن ثوبان، عبدالعزیز بن احمد بن محمد بن علی تمیمی کسنانی، عبداللہ بن مبارک، ابوالفتح محمد بن احمد بن ابوبکر ابیوردی، شیخ الصوفیہ محمد بن حسین، ابوبکر محمد بن صالح بن عبدالرحمن بغدادی انماطی، محمد بن عبدالرحمن بن محمد مسعودی خراسانی، صوفی ابوعمران موسی، یحیی بن ایوب زاہد، یحیی بن معاذ رازی۔

امہات کتب حدیث کی بہت ساری روایات کا دار ومدار اِن ہی راویوں پر یا ان جیسے راویوں پر ہے، ان میں بعض، صوفیہ کے کسی سلسلے سے منسلک ہوتے ہوئے بھی، حدیث میں درجۂ حفاظ پر فائز ہیں جب کہ اکثر محدث اور ثقہ ہیں۔ مذکورہ شخصیات ان عظیم شخصیات میں سے چند بطور مثال ہیں، جن کے لیے اللہ نے روایت ودرایت دونوں کو جمع کردیا ہے۔

علم حدیث میں سادات صوفیہ کی تالیفات وتصنیفات

کسی محقق پر یہ پوشیدہ نہیں ہے کہ بعض محدثین تدریس حدیث کی مجلس منعقد کیا کرتے تھے جس میں طلبہ حدیث اور راویان حدیث شرکت کیا کرتے تھے، حدیث لکھ لیا کرتے یا بعض یاد کرلیا کرتے پھر اس کو کتابوں میں نقل کرتے یا روایت کرتے، اسی طرح کچھ لوگ اپنی کتابوں میں حدیث لکھنے کے ساتھ ساتھ تبویب وتہذیب کا بھی کام کرتے۔ بعض اپنی کتاب میں صرف صحیح حدیث ہی جمع کرتے جیسے بخاری، مسلم، ابن سکن، حاکم، جارود، ابن خزیمہ، ابن حبان، کچھ نے اس میں تھوڑی وسعت پیدا کی اور ہر مقبول حدیث کو جمع کیا یعنی حسن، ضعیف اور معتبر معمول بہ، جیسے ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارمی، بیہقی، دارقطنی وغیرہ۔

بعض نے اپنی تمام روایات کو ایک خاص ترتیب پر جمع کیا۔ کچھ نے اسمائے صحابہ پر کتاب مرتب کی جیسے احمد بن حنبل، بزار، طبرانی معجم کبیر، ابن اعرابی، اور فریابی یا کچھ نے اپنے شیوخ کے ناموں پر ترتیب دی جیسے طبرانی کی معجم اوسط اور صغیر وغیرہ۔ اللہ تعالی ان تمام لوگوں پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے جنھوں نے حدیث کو جمع کرنے اور روایات اور اسانید کے لکھنے میں نئے نئے راستے اپنائے۔

سادات صوفیہ رضی اللہ عنہم نے بھی ان میں حصہ لیا اور اپنی سندوں سے حدیث کی ایسی کتابیں تصنیف کیں جو پورے عالم میں پھیل گئیں۔ محدثین نے ان کی تصنیفات کو بحث کا حصہ بنایا، شواہد اور متابعات میں اس کو قبول کیا بلکہ ان کی تصانیف میں اعلی اسانید وروایات کی بھی کمی نہیں۔ ان صوفیۂ کرام نے عموما نقل حدیث میں محدثین کے معروف طریقے ہی کو اختیار کیا۔ ان مشہور و معروف کتابوں میں سے بعض کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے جن کو سادات صوفیہ کے جہد وفکر نے برآمد کیا۔ یہاں پر ان کی تصنیفات کا احاطہ مقصود نہیں ہے بلکہ صرف یہ ملاحظہ کرنا ہے کہ سادات صوفیہ نے بھی اپنے علم وفن یعنی آداب، اخلاق، طریقت، سلوک میں تصنیفات کے جواہر بکھیرے ہیں۔

ابوعبدالرحمن محمد بن حسین سلمی جو عظیم محدث، زہد وورع میں یکتا، شیخ صوفیہ، عالم خراسان اور صاحب کرامات بزرگ ہیں، ان کی تصنیفات کی تعداد سو کے قریب ہے، ان کی اہم کتابوں میں **الفتوة، ادب الصحبة** اور **الاربعون فی التصوف** ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب **طبقات الصوفية** میں بعض حدیثیں اپنی سند کے ساتھ لکھی ہیں۔

عظیم محدث ابونعیم احمد بن عبداللہ اصفہانی نے بھی بہت سی اہم کتابیں تصنیف کیں، ان میں سرفہرست کتاب **حلية الاولیا وطبقات الاصفیاء** ہے، جس کے طرز پر کتابیں کم لکھی گئی ہیں، اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اگر آپ اس کو جرح وتعدیل میں شمار کرنا چاہیں تو کرسکتے ہیں، اسی طرح سنن یا تراجم میں بھی شمار کریں تو بھی بجا ہوگا، متاخرین نے ان کے ہی ترجمے پر بھروسہ کیا ہے، یوں ہی اگر اسے فن حدیث یا علل کی کتاب مانیں تو بھی مناسب ہے۔ اس کتاب کے علاوہ بھی ان کی دوسری کتابیں مشہور ہیں جیسے **تثبیت الرویا لله، مستخرج علی الصحیح، الطب النبوی، فضل العلم، فضل سورة الاخلاص، الاربعون فی التصوف، دلائل النبوة، معرفة الصحابه، تاریخ اصبهان، معجم الشیوخ، طرق حدیث، ان لله تسعة وتسعین اسما**۔

ابوعمر اسماعیل بن نجید بن احمد بن یوسف بن خالد سلمی نیساپوری زاہد وعابد اور شیخ الصوفیہ ہیں، آپ ابوعبدالرحمن سلمی کے دادا ہیں، رسالہ قشیریہ کے رجال سے ہیں، حدیث میں سند کے ساتھ ان کی ایک مختصر کتاب بھی ہے۔

ابو القاسم عبد الکریم بن ہوازن قشیری جنہوں نے دستور صوفیہ میں ایک کتاب لکھی جو **الرسالۃ** کے نام سے مشہور ہے، اس میں جتنی روایات ہیں سب کو اپنی سند سے نقل کیا ہے۔

حافظ ابو بکر آجری صاحب تصانیف کثیرہ بزرگ ہیں ان کی کتابوں میں ''**الشریعۃ فی السنۃ**'' بڑی کتاب ہے اس کے علاوہ **الرؤیۃ، الغرباء، الاربعین، الثمانین، آداب العلماء، مسئلۃ الطائفین، التہجد** وغیرہ۔

محدث ابو بکر احمد بن مروان دینوری مالکی جو **کتاب المجالسۃ** کے مصنف ہیں، یہ اپنے فن میں سب سے عمدہ کتاب ہے۔

حافظ کبیر حکیم ترمذی جن کی کتاب ''**نوادر الاصول**'' اور ''**ختم الاولیاء**'' ہے۔

شہاب الدین ابو حفص عمر سہروردی جنہوں نے دستور صوفیہ میں دوسری کتاب **عوارف المعارف** تصنیف کی ہے، یہ کتاب اہل علم کے نزدیک مستند ومعتمد ہے۔ ان مشائخ کے علاوہ اور بھی بہت سے مشائخ صوفیہ ہیں جنہوں نے حدیث میں کتابیں لکھی ہیں۔

صوفیہ اور نقد رجال

علم حدیث کی بنیاد راویوں پر ٹکی ہوئی ہے، راویوں کے احوال میں غور وفکر کرنا ایک وسیع علمی میدان ہے اور اس کے شہسوار بھی الگ ہوتے ہیں۔ اس علم کو علم جرح وتعدیل کہا جاتا ہے۔ یہ فن جرح وتعدیل، ثقہ وعدم ثقہ کے اعتبار سے راوی اور اس کے احوال میں غور کرنے کا نام ہے۔

ناقدین رجال کے اقوال میں غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ بسا اوقات ثقہ راوی کو ضعیف کہہ دیتے ہیں اور بسا اوقات ضعیف کو ثقہ قرار دیتے ہیں، اور صادق کو کاذب اور کاذب کو صادق۔ یہ ان کی کتاب اور اقوال میں بہت زیادہ ہے۔ راویوں کی تنقید میں مذہبی عصبیت سے بڑے بڑے نہ بچ سکے، یہاں تک کہ ان لوگوں نے امام بخاری جیسی شخصیت کی تضعیف کر دی، یہ کسی خاص سبب سے نہیں بلکہ صرف اعتقادی تعصب کی وجہ سے۔ اور کچھ لوگوں نے تو امام مالک کو بھی ضعیف کہہ دیا، بلکہ ان کے بارے میں بہت سخت باتیں کہیں۔

اخلاقی قدروں کی اس قدر پامالی کی وجہ سے سادات صوفیہ نے اس بات سے خوف کھایا کہ کہیں حاملین حدیث نبوی پر طعن وتشنیع کی وجہ سے ان کے اعمال برباد نہ کر دیے جائیں، اسی وجہ سے راویوں کے احوال کے بارے میں ان کے اقوال بہت کم ملتے ہیں، انہیں راویوں پر نقد اور ان سے متعلق اقوال کی حکایت سے کوئی دلچسپی نہیں رہی کہ کہیں ناحق کسی پر کوئی غلط حکم نہ لگ جائے، اس کے علاوہ بھی بہت سی وجوہات ہیں جس کی وجہ سے جرح وتعدیل کے میدان میں صوفیہ کی موجودگی نہ ہونے کے برابر رہی۔ بالخصوص متقدمین صوفیہ اس سے بالکل الگ رہے۔ اس کے

باوجود بعض صوفیۂ کرام نے نہایت احتیاط کے ساتھ دلیل کی بنیاد پر دوسروں کے کچھ اقوال نقل کیے ہیں جو جرح وتعدیل سے متعلق نہیں ہیں جیسا کہ دین اور اخلاق میں احتیاط ان کا شیوہ رہا ہے۔

حافظ ذہبی نے اپنی کتاب **الموقظۃ** میں اس باب میں امام تقی الدین ابن دقیق العید کا ایک قول نقل کیا ہے:

عدم تقویٰ، وہم اور ناقابل اعتبار قرائن کی وجہ سے جرح وتعدیل کے میدان میں خلل واقع ہوا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: **الظَّنُّ أَكْذَبُ الْحَدِيثِ** (بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے) اسی وجہ سے نقد رجال میں علم وتقوی کی سخت ضرورت ہے، اور مزکی یا ناقد میں ان تمام شرائط کے جمع ہونے کے مشکل ہونے کی وجہ سے جرح وتعدیل کا میدان عظیم اور پر خطر ہے۔ اس کے باوجود ضرورت پڑنے پر بعض صوفیہ نے رجال حدیث کے احوال واسفار پر نقد کیا ہے جیسے ابو نعیم، حکیم ترمذی، دینوری، حارث محاسبی، عبد اللہ بن مبارک اور فضیل بن عیاض وغیرہ۔

میدان تخریج اور صوفیۂ کرام

تخریج یہ ہے کہ محدث کسی حدیث کے بارے میں یہ بتائے کہ کس مصنف نے رسول اللہ ﷺ تک اپنی سند سے، حدیث کو کس صحابی سے اپنی کس کتاب میں نقل کیا ہے، اس کے ساتھ حدیث پر صحت وضعف کا حکم بھی لگائے۔ علم تخریج میں حافظ کبیر، علم حدیث میں چودھویں صدی کے مجدد، امام مجتہد حضرت احمد بن محمد بن صدیق غماری رضی اللہ عنہ کی سب سے پہلی تصنیف ''**حصول التفریج باصول التخریج**'' ہے جس میں انہوں نے اصول تخریج اور اس کے طریقے کو بیان کیا ہے۔

اس فن میں بھی علمائے صوفیہ نے حصہ لیا؛ کیوں کہ یہ علم بہت مفید ہے جیسے بعض حدیث کی اصل کتابوں کے ضائع ہو جانے کے باوجود ان احادیث کا لوگوں کے درمیان باقی رہنا اور صحیح وضعیف اور طرق واسانید کی معرفت۔

جب بھی محدثین علم تخریج کا ذکر کریں گے تو انہیں امام حافظ کبیر، مجدد وقت، شاذلی صوفی امام جلال الدین اشعری، شافعی رضی اللہ عنہ مصنف جامع کبیر وجامع صغیر، کے فضل واحسان سے بے نیازی اور انکار ممکن نہیں ہے، اسی لئے محدثین نے کہا ہے کہ امام سیوطی نے ان دونوں کتابوں کو لکھ کر پوری دنیا پر احسان کیا ہے۔

امام جلال الدین سیوطی کی شرط پر حافظ مشہور صوفی سیدی ابو العلی ادریس بن محمد عراقی فاسی نے سیکڑوں حدیثیں جمع کی ہیں جو امام سیوطی کی ان دونوں کتابوں میں نہیں تھیں۔ اسی طرح سے حافظ غماری نے اپنی مختصر سی تصنیف ''**المغیر**'' میں امام سیوطی کی شرط کے علاوہ پر حدیثیں جمع کی

ہیں،اورسب سے اخیر میں ان کے حقیقی بھائی عظیم محدث، سیدی عبدالعزیز نے بہت سی حدیث امام سیوطی کی شرط پر اپنے رسالہ ''المشیر '' میں جمع کیا ہے،اس طرح سے صوفیہ کا علم ظاہر و باطن دونوں میں تمام مخلوق پر بہت بڑا احسان ہے۔اوراصل احسان تو اللہ سبحانہ ہی کا ہے۔

اسی طرح حافظ حدیث یوسف بن عبداللہ زیلعی صوفی کی فن تخریج میں اہم کتابیں ہیں ان کی کتاب ''نصب الراية فی تخریج احادیث الهداية'' فقہ حنفی میں احادیث ہدایہ کی تخریج ہے، اہل حدیث کا ماننا ہے کہ جس نے بھی اس کے بعد فن تخریج میں کتاب لکھی ہے اس کتاب سے بھر پور استفادہ کیا،فن تخریج میں ان کی ایک دوسری کتاب ''تخریج احادیث الکشاف'' ہے، کشاف جوزمخشری کی تفسیر ہے

اورعظیم محدث وصوفی عبدالرؤف مناوی نے بھی تفسیر بیضاوی کی احادیث کی تخریج کی ہے جو بہت ہی عمدہ ہے۔

اور قاضی القضاۃ صدرالدین ابوالمعالی محمد بن ابراہیم بن اسحاق بن ابراہیم بن عبدالرحمن سلمی مناوی نے ''المناهج و التناقیح فی تخریج احادیث المصابیح'' تصنیف کی ہے۔

اور تینوں سگے بھائی سیدی احمد، سیدی عبداللہ اور سیدی عبدالعزیز، صدیق کے یہ تینوں بیٹے مغرب کے عظیم محدث صوفی شاذلی درقاوی ہیں انہیں فن تخریج میں زبردست مہارت ہے۔ سیدی احمد نے بدایۃ ابن رشد، عوارف المعارف اور شمائل ترمذی وغیرہ کی تخریج کی ہے، سیدی عبد اللہ نے اصول فقہ میں بیضاوی کی کتاب منہاج کی تخریج کی ہے، سیدی عبدالعزیز نے سیدی احمد بن عجیبہ کی کتاب ''ایقاظ الهمم'' وغیرہ کی تخریج کی ہے۔

مصطلح حدیث میں صوفیہ کی خدمات

مصطلح حدیث وہ علم ہے جس میں علم حدیث کے قواعد اور اس کے اصول قلمبند کیے جاتے ہیں اس فن کی سب سے پہلی تصنیف ''المحدث الفاصل'' حافظ رامہرمزی کی ہے، اس کے بعد اس فن میں علما نے مختلف کی قسم کی کتابیں ضبط تحریر میں لائی ہیں۔

صوفیہ نے دوسرے علوم وفنون کی طرح مصطلح حدیث کی بھی خدمت کی ہے، ان کی کتابوں میں سے سب سے اہم کتاب المقدمة فی علوم الحدیث ہے جو مصطلح حدیث یا علوم حدیث میں بعد میں لکھی جانے والی تمام کتابوں کا مرجع رہی، اس کی شرح لکھی گئی، استدراک کیا گیا، اس پر تعلیقات یا اسی اساس پر دوسری کتابیں لکھی گئیں، یہ کتاب حافظ ابوعمر عثمان ابن الصلاح کی ہے جو خود خرقہ صوفیہ پہننے اور دوسروں کو پہنانے والے ہیں، ابن ملقن نے ''طبقات الاولیاء'' میں طریقہ صوفیہ میں ان کا شجرہ امام قشیری اور امام جنید بغدادی تک ذکر کیا ہے۔

ہمارے سادات صوفیہ میں عالم الزہاد، زاہد العلما امام نووی علیہ الرحمہ نے مصطلح حدیث میں مقدمہ ابن الصلاح کا اختصار کیا جو تقریب کے نام سے منسوب ہے۔اسی طرز پر سلسلۂ شاذلیہ کے عظیم محدث امام سیوطی نے تقریب کی ایک مبسوط شرح ''تدریب الراوی'' کے نام سے لکھی، امام سیوطی کی مصطلح حدیث میں ''الفیة'' بھی ہے جو عراقی کی ''الفیة'' سے عمدہ ہے۔

شیخ الاسلام علامۃ الہمام محقق زکریا انصاری کی علم حدیث میں عمدہ تصانیف ہیں، جو مرجع کی حیثیت رکھتی ہیں ان ہی میں ''فتح الباقی شرح الفیة العراقی'' ہے جامعیت اور اختصار کے اعتبار سے اس کتاب کی نظیر نہیں ملتی۔

حافظ ابن حجر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ انہوں نے آخری عمر میں تصوف اور سادات صوفیہ کے تعلق سے اپنے موقف سے رجوع کرلیا ہے، ان کی کتاب ''نخبة الفکر'' ہے، صوفیہ کی ایک جماعت نے اس کتاب پر طبع آزمائی کی ہے جیسے شیخ ابوامداد سیدی ابراہیم بن ابراہیم اللقانی صوفی اشعری نے اس پر حاشیہ لکھا جس کا نام ''قضاءالوطر من نزهةالنظر'' رکھا، اسی طرح علامہ عبدالرؤف مناوی نے اس کی شرح ''الیواقیت و الدرر فی شرح نخبة الفکر'' لکھی، محدث مغرب امام ابوحامد سیدی عربی بن ابوالمحاسن سیدی یوسف بن محمد جو فاسی مسکنا ولقبا، قصری اصلا اور فہری نسباً ہیں، نے ''عقد الدرر فی نظم نخبةالفکر'' نامی شرح لکھی، ان کی نخبۃ پر ایک دوسری شرح بھی ہے، نیز القاب حدیث میں ان کی ایک اور مختصر منظوم کتاب ہے جس کا نام ''الطرفة'' ہے۔

اسی طرح نخبۃ کی ایک شرح ابوعبداللہ سیدی محمد (فتحا) ابن شیخ الاسلام ابومحمد عبدالقادر بن علی بن ابی المحاسن سیدی یوسف الفاسی کی ہے۔اور شیخ الاسلام مجدد دین سیدی محمد بن سیدی جعفر کتانی نے ''الرسالة المستطرفة فی بیان مشهور کتب السنة المشرفة'' لکھا ہے جس میں انہوں نے موضوع کا مکمل احاطہ کیا ہے اور پیش کش اور ترتیب میں نیا طرز اختیار کیا ہے، متاخرین اس موضوع میں ان کے عیال ہیں، ان کے شاگرد حافظ احمد غماری نے اس پر لطیف استدراکات ''الامالی المستظرفةعلی الرسالة المستطرفة'' میں جمع کیا ہے۔اس کے علاوہ اس فن میں صوفیہ کرام کی بے شمار کتابیں ہیں۔

متاخرین کی اسانید اور روایات کے مرجع سادات صوفیہ

محدثین کی ایک جماعت کے مطابق پانچویں صدی کے بعد حدیث میں روایت کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور زیادہ تر حدیثیں سند کے ساتھ کتابوں میں جمع کردی گئیں یہاں تک کہا گیا کہ کوئی حدیث اگر پانچویں صدی ہجری تک تصنیف کی گئی کسی حدیث کی کتاب میں نہیں پائی گئی تو وہ

یقیناً موضوع یا بے اصل ہے۔اس کے باوجود طلب حدیث میں لوگ سفر کرتے رہے،لیکن کسی نئی حدیث کے لیے نہیں بلکہ عالی سند، سند میں غرابت یا کثرت شیوخ کی جستجو میں ۔ یہ ساری چیزیں سنت کی حفاظت اور سندوں کی معرفت کے لیے تھیں۔

سادات صوفیہ نے بحث وجستجو میں طویل سفر کے بعد بہت ساری سندوں کو جمع کیا، انہوں نے مشیخات، مسلسلات، برامج، اور فہارس وغیرہ تصنیف کی۔

مشیخات: یہ وہ کتابیں ہیں جو ان مشائخ کے تذکرے پر مشتمل ہوتی ہیں جن سے مصنف کی ملاقات ہوا اور ان سے حدیث بھی لی ہو یا شیخ نے مصنف کو حدیث کی اجازت دی ہو اگرچہ مصنف کی شیخ سے ملاقات نہ ہوئی ہو۔صوفیہ کی ایک جماعت نے مشیخة لکھنے کا اہتمام کیا ہے ان میں سرفہرست حافظ ابوطاہر احمد بن محمد سلفی اصفہانی ہیں جو کثرت سے سفر کرنے والے تھے انہوں نے متعدد شہروں کے خلق کثیر سے سن کر مشیخة لکھا ہے جس میں انہوں نے بہت سے مشائخ کا ذکر بے شمار فوائد کے ساتھ کیا ہے، ان کی مشیخة سو سے زیادہ اجزا پر مشتمل ہے۔ان ہی میں قاضی عیاض بن موسی کا مشیخة ہے جس میں انہوں نے سو مشائخ کے تراجم قلم بند کیے ہیں اور ان کی بعض مرویات کو بھی ذکر کیا ہے، اس کا نام انہوں نے ''الغنية'' رکھا ہے، ان ہی میں سے شیخ شہاب الدین سہروردی صاحب عوارف المعارف کا مشیخۃ ہے۔

رہا فہارس تو صوفیہ اس میدان کے شہسوار ہیں، متاخرین میں سب سے جامع حافظ سیدی عبدالحی بن عبدالکبیر کتانی کی ''فہرس الفہارس'' ہے، یہ یکتائے زمانہ اور فرید عصر تھے، کون ہے جو ان کے بعد ان کی کتابوں پر اعتماد کیے بغیر حدیث، تاریخ، رواۃ اور اسانید میں کتابیں لکھے۔

صنعت حدیث میں صوفیہ کی خدمات

صنعت حدیث؛ مصطلح کی کتابوں میں مذکور قواعد حدیث کی تطبیقی پہلو کا نام ہے جس سے محدث کی مہارت، علل خفیہ اور مختلف طرق پہ وسیع مطالعہ اور رواۃ، ان کی تاریخ، ان کے انساب اور ان کی مرویات کی معرفت کا اظہار ہوتا ہے۔

کتب صنعت کے مطالعہ کرنے والے پر یہ پوشیدہ نہیں ہے کہ اس فن میں بھی صوفیہ کی خدمات موجود ہیں۔ہمیں متاخرین میں سے ایک ایسی شخصیت کا ذکر کردینا ہی کافی ہے جس میں اللہ تعالی نے حقیقت وشریعت دونوں طرح کے علم کو جمع کردیا ہو، اور وہ حافظ امام سیدی احمد بن سیدی محمد بن صدیق غماری ہیں، اس فن میں ان کی گرد راہ تک کوئی نہیں پہنچ سکا، صنعت حدیث میں ان کی ایسی کتابیں ہیں جن کی مثال نہیں ملتی، بڑے بڑے محدثین پر ان کی ایسے استدراکات ہیں جس کی کوئی استطاعت نہیں رکھتا، یہاں پر ان کی کتاب ''**فتح الملک العلی بصحة**

حدیث باب مدینة العلم علی'' قابل ذکر ہے اور اس کے بارے میں یہ تبصرہ کیا جاتا ہے۔اس کتاب میں علم حدیث کے قواعد کی تجدید کی گئی ہے ان کے حافظ حدیث ہونے کے لیے یہ جان لینا کافی ہے کہ انہوں نے یحیی ابن معین، ابن مہدی، ابن حنبل، اعمش، شعبی، اور ان کے مثل اکابر محدثین پر استدراک کیا ہے۔ان کی دوسری کتاب ''**درء الضعف عن حدیث من عشق فعف**'' ہے۔اس میں بھی دقیق اور لطیف استدراکات کیے ہیں، جس کو انہوں نے ''**لیس کذلک فی الاستدراک علی الحفاظ**'' میں جمع کیا ہے، ان کی ایک ضخیم کتاب ''**المداوی لعلل الجامع الصغیر وشرحی المناوی**'' ہے، جس کے بارے میں ان کے بھائی سیدی عبد اللہ ابن صدیق نے کہا جو صنعت حدیث جاننا چاہتا ہے اس پر مداوی کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔

شیخ امام حافظ سیدی عبدالحی کتانی اس فن کے ماہرین میں سے ہیں، اس فن میں ان کی چھوٹی بڑی مشہور کتابیں ہیں، میں نے ان کا ایک رسالہ بنام ''**استحباب وضع الید علی الراس عند قراءة اواخر سورة الحشر**'' دیکھا ہے جس میں انہوں نے حدیث کے نفیس فوائد کا ذکر کیا ہے اور متقدمین کے طرز پر سندوں پر بحث کیا ہے۔

کسی بھی محقق کے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ صنعت حدیث اور علل حدیث کے باب میں سادات صوفیہ کی خدمات کا احاطہ کرسکے، یہاں ہم نے جو کچھ ذکر کیا یہ ان کی خدمات کی ایک جھلک تھی جس کا احاطہ ممکن نہیں۔

شرح حدیث میں صوفیہ کی خدمات

سادات صوفیہ نے شریعت کے نصوص کو صحیح طور پر سمجھنے اور استنباط کرنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ وہ سب سے پہلے قرآن مقدس کے الفاظ میں غور کرتے ہیں، تراکیب کے رموز اور معانی تک رسائی حاصل کرتے ہیں، اسی لیے انہوں نے قرآن مقدس کی ایسی تفسیر کی ہے جو ان کے ذوق ووجدان اور فتوحات وکشف کے موافق ہے، یہی عمل ان کا حدیث نبوی کے ساتھ بھی ہے، ان کی خدمات کا دائرہ صرف روایت اور تحمل واداہی تک محدود نہ رہا بلکہ تفہیم وتشریح میں بھی نمایاں خدمات رہی ہیں، انہوں نے کتب سنن یا کسی معین حدیث کی بہت ہی مفید شروحات لکھیں ہیں جن پر خاص وعام نے اعتماد کیا ہے، دوست ودشمن ہر طرح کے لوگوں نے پسند کیا ہے۔

ان ہی شروحات میں بخاری کی مختصر شرح مشہور صوفی ابن ابی جمرہ کی ہے جس پر حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اعتماد کیا ہے، ابن ابی جمرہ کی یہ شرح اپنے باب میں منفرد ہے۔اسی طرح امام عبدالرؤف مناوی نے جامع صغیر کی دو شرحیں لکھ کر امام سیوطی پر احسان کیا، ایک شرح طویل ہے جس کا نام فیض القدیر ہے دوسری مختصر جس کا نام تیسیر ہے، یہ دونوں کتابیں علل اور

معرفت رجال میں بھی بہت معتبر ہیں۔

قاضی عیاض کی **اکمال المعلم** جو صحیح مسلم کی شرح مازری کا تکملہ ہے، جس کا پورا نام **المعلم بفوائد المسلم** ہے، محدثین، فقہا اور صوفیہ کی ایک جماعت نے اس کتاب پر علمی جواہر پارے بکھرے ہیں جیسے علامہ ابی نے **اکمال اکمال المعلم**، پھر اس کی کے بعد صفاقسی نے **مکمل اکمال الاکمال** لکھی، اسی طرح سے عباس قرطبی نے مسلم کی شرح "**المفہم**" لکھی، یہ کتاب ابن حجر کے نزدیک مفید اور معتبر ہے، امام ابن حجر نے اپنی شرح میں بہت سے مقامات پر علامہ داودی پر اعتماد کیا ہے، اپنی تعلیقات کے ساتھ نقل کیا ہے جن میں کچھ تعلیمات قابل اعتبار ہیں جب کہ بعض تعلیمات غیر معتبر ہیں، علامہ ابن حجر ان کی طرف بارہا "شارح" سے اشارہ کرتے ہیں، اگر علامہ ابن حجر اس کتاب کا ذکر نہ کرتے تو اس کا تذکرہ مٹ جاتا۔

صحیحین پر امام سیوطی کی دو شرحیں ہیں اور اس کے علاوہ ان کی سنن پر بھی مشہور و معروف شرحیں ہیں، امام صوفی سیدی احمد زروق مصنف "**القواعد فی التصوف**" نے بخاری کی ایک شرح لکھی ہے جس کا نام "**التعلیق و التنقیح علی الجامع الصحیح**" ہے اور شیخ شبیہی کی بھی ایک شرح بخاری ہے، اس کا نام "**الفجر الساطع شرح الصحیح الجامع**" ہے۔

سادات صوفیہ کی اس میدان میں گوناں گوں خدمات ہیں، جیسے خانقاہوں میں مستند کتابوں کے ختم کا اہتمام کرنا، ان میں سب سے مشہور ختم بخاری ہے، ختم بخاری میں سب سے اہم شیخ امام سیدی محمد بن عبد الکبیر کتانی کی ختم ہے جو لیتھو پریس میں مطبوع ہے جو معلومات و فوائد سے پر ہے، آج بھی مغرب میں ایک معمر شیخ ہیں جو اس ختم میں شریک ہوئے اور اس کی اجازت بھی حاصل کی۔

مغرب و مشرق میں سادات صوفیہ کے موطا، مسلم، اور کتب سنن کے ختم پائے جاتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ صحاح، سنن وغیرہ کی قراءۃ کے لیے لوگوں کا اتنا بڑا اجتماع صرف صوفیہ کی مجالس ہی میں ہوا اور کتب سنن کی تشریح و تفہیم ان ہی کی خانقاہ میں ہوئی۔ تاریخ اور لائبریریوں کے دستاویز اس کی شہادت دیتی ہیں، سادات صوفیہ کے حوالے سے اہل علم کے اقوال بھی اس کی وضاحت کرتے ہیں، بلکہ ہمیں یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ اللہ نے صوفیہ کے ذریعے سنت نبوی کی حفاظت فرمائی، اور ایسا کیوں نہ ہو کہ ان کا تعلق صاحب سنت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت ہی قوی ہے۔

اسی لیے علامہ غماری نے اپنی کتاب "**الاجوبۃ الصارفۃ لاشکال حدیث الطائفۃ**" میں فرمایا ہے جان لو کہ حدیث میں لفظ 'طائفۃ' (جماعت) کی تعیین میں ائمہ اور علما نے اختلاف کیا ہے بعض نے یہ کہا کہ اس سے مراد علما ہیں بعض نے محدثین، مجتہدین، اہل سنت و جماعت یا صوفیہ

مراد لیا ہے، یہ سارے اقوال بلا اختلاف ایک ہی ہیں، جب کہ وہ لوگ مذکورہ وصف سے متصف ہوں، کیوں کہ درحقیقت عرف و اصطلاح کے اعتبار سے عالم وہی ہے جو حق کو دلیل سے جانتا ہو، یہ بغیر اجتہاد کے ممکن نہیں، اجتہاد حدیث کی معرفت کے بغیر متصور نہیں، اور اہل سنت و جماعت سے وہی ہوگا جس میں یہ شرطیں پائی جائیں، اس لیے کہ قرآن و حدیث میں جہاں کہیں بھی اہل حق کا ذکر آیا ہے اس سے مراد اہل سنت و جماعت ہی ہیں اور جس میں یہ ساری شرطیں پائی جائیں وہی صوفی ہوگا، چوں کہ صوفی اخلاص کے ساتھ اپنے علم پر عمل کرنے والا ہوتا ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں، مگر یہ کہ اپنے علم کے مطابق عمل میں اس کے اخلاص کی برکت کی وجہ سے اللہ تعالی اس بندے کے ہاتھ پر کرامات کا اظہار کرتا ہے، اس پر تجلیات اور علوم کا دروازہ کھول دیتا ہے، جس میں یہ شرطیں نہ پائی جائیں وہ ان اوصاف سے متصف نہیں ہوتا اور وہ اس کا اہل نہیں ہوتا کہ اس کو جماعت حق سے شمار کیا جائے؛ کیوں کہ وہ باطل سے متصف ہے۔ **والحمد للہ**۔

خاتمہ

یہ ہمارا مختصر تذکرہ علامہ شبراوی کے اس شعر کے مصداق ہے:

کنسبۃ قطرۃ یوما اضیفت   الی بحر عظیم او بحور

ایک بڑے سمندر یا چند سمندر کی طرف نسبت کرتے ہوئے اس کی مثال ایک قطرے کی طرح ہے۔

عارفین، صالحین، اور صوفیہ کی جماعت بالعموم شریعت محمدیہ اور بالخصوص سنت ہدی کی خدمات اتنی زیادہ ہیں جنہیں اوراق میں جمع نہیں کیا جا سکتا، قلم لکھ نہیں سکتا اگرچہ ایک سمندر روشنائی بن جائے۔ نادانوں اور بے وقوفوں کے لیے ہمیں اس چیز کو بیان کرنے کی ضرورت پڑی جو روشن سورج کی طرح ہے اور اس کو ثابت کرنا پڑا جو دن کے اجالے کی طرح ہے۔

علوم حدیث اللہ و رسول کی معرفت حاصل کرنے والوں کا وسیلہ ہے، جو موحدین کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اور عابدوں کا مقصود ہے، اسی لیے سادات صوفیہ نے علم حدیث کی مختلف طریقے سے خدمت کی ہے، اس کی تحصیل میں لگے رہے، اس کے قواعد کے لکھنے میں خاص توجہ دی، اسی لیے اس فن کے علما نے ان پر بھروسہ کیا اور ان کی شاگردی اختیار کی۔

اللہ کریم سے ہم دعا کرتے ہیں کہ ہمیں عارفین کے علم سے فائدہ پہنچائے، اور ہمیں ان لوگوں میں سے بنائے جن پر ان کی نظر کرم پڑتی ہے تاکہ اللہ کے رسول ہم سے راضی ہو جائیں حبیب کی رضا کی وجہ سے رب الارباب اور الہ العالمین راضی ہو جائے۔ والحمد للہ رب العلمین۔

○○○

امام الدین سعیدی

نظریۂ وحدۃ الوجود کا علمی جائزہ

تصوف دین کا ایک اہم رکن ہے

تصوف کے افکار واحوال، نظریات وکیفیات قرآن وسنت کے عین مطابق ہیں۔ اسی کو حدیث میں احسان سے تعبیر کیا گیا ہے، جو دین کے تین اجزا: ایمان، اسلام اور احسان میں سے ایک ہے؛ کیوں کہ دین ان تینوں کے مجموعے کا نام ہے، جیسا کہ حدیث جبرئیل سے واضح ہے۔ یہ اور بات ہے کہ:

صوفیہ نے رکن احسان کے آداب واسرار پر زیادہ توجہ دی اور ان کے تفقہ کا مرکزی محور یہی رہا۔

فقہا نے رکن اسلام کے اصول و جزئیات پہ بحث کی اور ان کا مرکزی نقطۂ نظر شرعی قوانین رہے۔

متکلمین اور علماے عقائد نے رکن ایمان کے رموز ونکات اور اس کے صحیح خدو خال کو واضح کرنے پر اپنی فکری وعلمی توانائی صرف کی۔

اس لیے یہ واضح ہے کہ تصوف دین کا ایک جزو ہے، جو کتاب وسنت سے ماخوذ ہے۔ سرخیل صوفیہ سید الطائفہ شیخ جنید بغدادی قدس سرہ فرماتے ہیں:

علمنا هذا مقيد بالكتاب و السنة

یعنی ہمارا یہ علم تصوف کتاب وسنت سے ماخوذ ہے۔

(الرسالۃ القشیریہ، ج:۱،ص:۷۹، دار المعارف القاہرۃ)

دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

بناء طريقتنا و اساسها على الكتاب و السنة و كل ما هو مخالف للكتاب و السنة فهو مردود و باطل۔ یعنی ہمارے طریقے کی بنیاد واساس کتاب وسنت ہے اور جو کتاب وسنت کے مخالف ہو وہ مردود اور باطل ہے ۔(ایضا:۲)

وحدۃ الوجود اور اس کا تاریخی پس منظر

صوفیہ یا تصوف کے خلاف جن مباحث و مسائل کو لیکر محاذ آرائی کی گئی ان میں ایک باریک اور دقیق مسئلہ وحدۃ الوجود کا ہے اس مسئلہ پر ارباب علم وفکر نے بڑی معرکہ آرا بحثیں کیں، بہت کچھ لکھا گیا مذاکرے ہوئے اور متبعین ومخالفین کے درمیان ایک زبردست اور لطیف موضوع بنا رہا مگر ان سب کوششوں کے باوجود یہ مسئلہ مسئلہ ہی رہا اور اس کا صحیح حل منظر عام پر نہیں آیا بلکہ اس کی صورت حال یہ ہوئی کہ جیسے جیسے اس کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی گئی یہ اور بھی پیچیدہ ہوتا گیا، اضطراب وخلجان میں کمی کے بجائے اضافہ ہی ہوتا گیا۔

آیا نہ کوئی حرف حقیقت کا زبان تک
اک راز کے سو راز بنے شرح وبیاں تک

جہاں تک وحدۃ الوجودی نظریے کے تاریخی پس منظر کی بات ہے تو اس سلسلے میں یہی صراحت ملتی ہے کہ یہ نظریہ زمانۂ قدیم سے موجود رہا ہے۔ البتہ یہ کوئی خاص شکل وصورت اور نام سے معروف نہیں تھا اس کے پیروکار ہمیشہ رہے ہیں محققین علما ومفکرین کا ماننا ہے کہ وحدۃ الوجود کا نظریہ سب سے پہلے شیخ اکبر محی الدین ابن عربی قدس سرہ متوفی (۶۳۸ھ) نے ایک جامع فکر کی صورت میں پیش کیا اگرچہ اس نظریے کے منتشر تصورات اس سے پہلے متقدمین صوفیہ کے یہاں موجود تھے۔

اختلاف کی نوعیت و جہت

اس مسئلہ میں اختلاف و انتشار کی دو جہتیں ہیں۔ ایک تو معترضین ومعاندین کا طبقہ ہے جو اس کی بے بنیاد تعبیر وتشریح کر کے اسے اسلامی عقیدہ کے برخلاف بتاتے ہیں دوسرا طبقہ وہ ہے جنہوں نے اس کے مقابلہ میں وحدۃ الشہود کا نظریہ پیش کیا اور ایک دوسرے پر علمی وعرفانی برتری ثابت کرنے کی کوشش کی۔ یہ طبقہ صوفیہ ہی سے متعلق ہے۔ ذیل میں دونوں جہتوں پر بالترتیب ایک علمی اور تحقیقی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔ سب سے پہلے ہم اختلاف وانکار کی پہلی جہت کے اہم گوشوں اور اس کے مضمرات کو بیان کر رہے ہیں۔

مغالطہ آمیز تعبیرات

اختلاف کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ لوگوں نے وحدۃ الوجود کے سمجھنے میں صریح غلطیاں کیں۔ کچھ کا کچھ سمجھ کر اس کا انکار کر بیٹھے۔ یہ ایک نمایاں حقیقت ہے کہ کسی کلام یا قول کی مراد ومنشا کو جاننے کے لئے اس کے اعتبارات وجہات سے واقفیت ناگزیر ہے، نہیں تو غلط فہمی یقینی ہے۔ بعینہ یہی صورت حال مذکورہ مسئلے میں پیش آئی۔ غیر شرعی تعبیرات ہی مخالفت کی بنیاد بنیں۔ جس میں دو طرح کے لوگ پیش پیش رہے۔

اول: مستصوفین کا طبقہ ہے جن کے احوال وافعال سے جس قدر تصوف کو نقصان پہنچا ہے اتنا مخالفین تصوف سے بھی نہیں پہنچا، یہ ہوا پرست طبقہ صوفیہ کے بعض استثنائی احوال کا سہارا لے کر خود کو شرعی حدود وقیود سے آزاد سمجھتے ہیں اور اباحیت پسندی کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ انہوں نے وحدۃ الوجود کا بھی سہارا لے کر اسلامی اصول وعقائد کو سخت مجروح کیا اور اس کا یہ مطلب نکالا کہ بندہ اور خدا میں غیریت نہیں تو نماز روزہ یا دیگر تکلیفی احکام کا کوئی مطلب نہیں، اس طرح سے وہ محرمات کا بھی ارتکاب کرنے لگے اور یہ کہنے لگے کہ جب موجود ایک ہے تو حلال وحرام کی تفریق کیسی؟ یا جب ہمارا وجود ہی نہیں تو ہم مکلف کیسے ہو سکتے ہیں؟ اس طرح کی جاہلانہ وملحدانہ باتوں کی اشاعت کرتے رہے اور خود کو شرع کی پابندی سے آزاد خیال کرتے رہے۔ اس طرح کی فاسد تعبیر میں ان کے نفس وہوا کا دخل ہے یہ لوگ علمی وایمانی ذوق سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں قرآن میں مذکور ہے: **افرایت من اتخذ الٰھہ ھواہ** (الفرقان: ۴۳) دوسری جگہ ہے: **واتبع ھواہ وکان امرہ فرطا۔** (الکھف: ۲۸) بلاشبہ ایسا طبقہ سب کچھ تو ہو سکتا ہے مگر صوفیہ کے مقدس گروہ سے کبھی نہیں ہو سکتا یہ صوفیہ کے نام پر نفس پرست اور گمراہ لوگوں کی جماعت ہے جس سے شرعی اقدار کی پامالی ہوتی ہے۔

دوم: منکرین تصوف کا متشدد طبقہ ہے جس نے اس نظریہ کو گمراہ کن تصور قرار دیا اور اس کی ملحدانہ تصویر پیش کی ان کے نزدیک وحدۃ الوجود کا مطلب یہ تھا کہ کائنات کی ہر شی ذات واحد کا حصہ ہے کسی ایک شی میں دوسرے سے غیریت نہیں یعنی خالق ومخلوق میں معاذ اللہ عینیت ہے اور دونوں ایک ہیں۔ اس نظریے کے لحاظ سے ساری مخلوق اللہ کے عین وجود میں شامل ہے انہیں ذات الٰہی سے الگ نہیں کیا جاسکتا؛ کیوں کہ ان میں غیریت نہیں اور کائنات میں اشیا کی جو مختلف صورتیں نظر آتی ہیں یہ حس وادراک کے ظاہری پہلو کے اعتبار سے ہے حقیقت کے اعتبار سے نہیں۔ بطور الزام اس گمراہ کن فلسفہ کی نسبت شیخ اکبر کی طرف کرتے ہیں اور دلائل وشواہد میں ان کی تصنیف، فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ کی بعض عبارتوں کو پیش کرتے ہیں۔ ان کا زعم ہے کہ ابن عربی ہی امت مسلمہ کے اندر اس نظریے کے علمبردار بن کر اٹھے اور اپنی تصنیفات کے ذریعے اس کو حق ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی، اپنی پوری زندگی اس کی ترویج واشاعت میں لگا دی، اس میں سرفہرست جو نام آتا ہے وہ ابن تیمیہ اور ان کے متبعین کا ہے۔ جیسا کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنی کتاب تاریخ دعوت وعزیمت کے اندر اس کا ذکر کیا ہے۔ موصوف مسئلہ وحدۃ الوجود کے تعلق سے ابن تیمیہ کے موقف کو بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''ادھر کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ عقائد کی بحث دوبارہ چھڑ گئی اور بحث ومباحثہ کی

مجلسیں منعقد ہوئیں، اس سے بڑھ کر یہ تھا کہ وہ شیخ محی الدین ابن عربی کے مسلک وحدۃ الوجود کی برملا تردید کرتے تھے، مصر وشام میں ان کے معتقدین ومنتسبین کا بہت بڑا گروہ تھا اور علما ومشائخ کی ایک بڑی جماعت تھی جو ان کو نہایت بلند پایہ عارف ومحقق، امام مشرب توحید اور شیخ اکبر مانتی تھی۔ ابن تیمیہ کا خیال تھا کہ ان کی تحقیقات والہامات انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات اور توحید کی اس تعلیم کے بالکل معارض ہیں جو ہر پیغمبر نے اپنے وقت میں دی، اور جناب رسول اللہ ﷺ نے اس کی آخری وضاحت اور تکمیل فرمائی۔''

(تاریخ دعوت وعزیمت، حصہ دوم ص ۶۸ مجلس تحقیقات ونشریات لکھنو)

ابن تیمیہ شیخ ابن عربی کا مسلک بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ابن عربی اور ان کے متبعین کا مسلک یہ ہے کہ وجود ایک ہی ہے، وہ کہتے ہیں مخلوق کا وجود خالق کا وجود ہے دو متغائر وجودوں کے قائل نہیں، جن میں سے ایک دوسرے کا خالق ہو بلکہ کہتے ہیں کہ خالق ہی مخلوق ہے اور مخلوق ہی خالق ہے وجود میں رب وعبد کی کوئی تفریق نہیں وہاں نہ کوئی خالق ہے نہ مخلوق، نہ کوئی داعی نہ کوئی مجیب، وجود کا جب اعیان پر فیضان ہوا اور اس نے ان کے اندر ظہور کیا تو اعیان کی حیثیت سے اس میں تنوع اور تفریق پیدا ہوئی۔'' (ایضا ص ۷۹)

اسی طرح سے اور بہت سے حضرات نے شیخ کی تصنیفات کو لے کر ان پر الحاد وزندقہ جیسے مذموم الزامات ثبت کیا ہے، ان کا کہنا یہ ہے کہ شیخ کے اس فلسفہ سے حلول واتحاد جیسا باطل عقیدہ لازم آتا ہے جو سراسر بے دینی ہے، بطور استشہاد شیخ کی درج ذیل عبارتوں کو پیش کرتے ہیں۔

الرب حق والعبد حق		یا لیت شعری من المکلف
ان قلت عبد فذاک میت		او قلت رب انی مکلف

پروردگار بھی حق ہے اور بندہ بھی حق ہے کاش مجھے معلوم ہوتا ان میں سے کون مکلف ہے۔ اگر تم کہو کہ عبد ہے تو وہ مردہ ہے اور اگر کہو کہ رب ہے تو وہ کیسے مکلف ہو سکتا ہے۔

(فتوحات، ج:۱، ص:۱)

فص ہود میں مذکور ہے: انہ عین الاشیاء بے شک اللہ تعالی اشیا کا عین ہے، فتوحات میں ہے:

ففی الحق عین الخلق ان کنت ذاعین

و فی الخلق عین الحق ان کنت ذا عقل

حق میں عین خلق ہے اگر تو چشم بینا رکھتا ہے اور خلق میں عین حق ہے اگر تو عقل والا ہے۔

فان کنت ذا عین و عقل معا فما

تری غیر شئ واحد فیه بالفعل

اگرتو آنکھ اور عقل دونوں کا مالک ہے تو تو شئ واحد کے علاوہ کسی چیز کو بالفعل نہیں دیکھے گا۔

اور آگے لکھتے ہیں کہ عقل والے اس طرح نغمہ سرائی کرتے ہیں:

و فی کل شی له آیة		تدل علی انه واحد

ہر شے میں اس کی نشانی ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ ایک ہے۔

جب کہ تجلیات کا مشاہدہ کرنے والا یوں گنگناتا ہے:

و فی کل شئ له آیة		تدل علی انه عینه

ہر چیز میں اس کی نشانی ہے جو اس بات پر دلیل ہے کہ وہ اس کا عین ہے۔

(فتوحات، ج:۱، ص:۲۷۲)

شیخ کی مذکورہ عبارتوں کے سلسلے میں بڑے معذرت کے ساتھ یہ عرض کردوں کہ شیخ کے ان اقوال سے جن لوگوں نے ایک باطل عقیدہ قائم کیا ہے وہ خود ان کے قیاس وفہم کا مفروضہ ہے شیخ کا عقیدہ العیاذ باللہ ایسا ہرگز نہیں۔ شیخ کی طرف اس ملحدانہ عقیدہ کو منسوب کرنے سے پہلے شیخ اکبر کے عقائد اور ان کی علمی وروحانی عظمت وشوکت سے باخبر ہونا ضروری ہے شاید جنہوں نے شیخ کے حق میں افترا و بہتان کی جرات کی ہے وہ مقام شیخ سے بالکل ناآشنا تھے، ورنہ اس عظیم شخصیت کو متہم نہیں کرتے۔ شیخ کے ناقدین ومعترضین کے سارے اعتراضات کا جواب بھرپور طور سے امام ربانی شیخ عبد الوہاب شعرانی علیہ الرحمہ نے دیا ہے جس کی تفصیل وتحقیق کے لئے ان کی تصنیف ''الیواقیت والجواهر'' کی طرف رجوع کریں میں بطور اختصار شیخ اکبر کے دفاع میں لکھی گئی چند عبارتیں نقل کر رہا ہوں، جن سے واضح ہو جائیگا کہ شیخ کیا تھے اور ان کے عقائد کیا تھے؟

شیخ اکبر کا مقام اور ان کے عقائد

امام شعرانی نے ان کی عظمت شان اور علو مرتبت کو تفصیل کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ وہ اپنی کتاب الیواقیت والجواهر میں شیخ کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

ان میں سے جنہوں نے شیخ کی تعریف کی ہے شیخ صلاح الدین صفدی ہیں وہ ،، تاریخ علمائے مصر میں لکھتے ہیں: جو بھی صاحبان علوم دینیہ کی باتوں کو جاننا چاہتا ہے وہ شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں کو ضرور دیکھے۔ حافظ ابو عبد اللہ ذہبی سے شیخ محی الدین ابن عربی کے اس قول کے بارے میں پوچھا گیا جو انہوں نے اپنی کتاب ''الفصوص'' کے متعلق فرمایا ہے کہ میں نے اس کتاب کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے

اشارے سے ہی تحریر کیا ہے۔ اس پر حافظ ذہبی نے کہا ہے کہ میں نہیں سمجھتا کہ شیخ ابن عربی جیسے لوگ کبھی کوئی جھوٹی بات بولیں گے حالاں کہ حافظ ذہبی اور ابن تیمیہ شیخ ابن عربی اور گروہ صوفیہ کے سخت منکرین میں سے تھے۔

(الیواقیت والجواہر، ص۲۶ دار احیائ التراث العربی بیروت لبنان)

شیخ ابن عربی کے مداحین میں سے شیخ قطب الدین شیرازی بھی تھے وہ لکھتے ہیں: شیخ محی الدین علوم شریعت وحقیقت میں کامل تھے ان کے بارے میں وہی طعن کرے گا جو ان کے کلام کو نہیں سمجھتا ہو اور ان کو تسلیم نہ کرتا ہو جیسا کہ انبیاے کرام علیہم الصلاۃ والتسلیم کی طرف جنون وسحر کو منسوب کر کے زبان طعن کھولنے والے وہی لوگ تھے جو انہیں نہیں مانتے تھے۔ شیخ موید الدین خجندی فرماتے ہیں: شیخ کو جن علوم سے واقفیت تھی وہ علوم کسی اور اہل طریقت کو حاصل نہیں تھے،۔ یہی قول شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہ کا بھی ہے اور شیخ کمال الدین کاشی فرماتے ہیں: شیخ ابن عربی قدس سرہ محقق کامل اور صاحب کرامات وکمالات شخصیت کا نام ہے۔ (نفس مصدر)

امام شیخ فخر الدین رازی فرماتے ہیں:

شیخ ابن عربی ایک عظیم ولی تھے۔ مشائخ میں سے محمد مغربی شاذلی جو شیخ جلال الدین سیوطی کے شیخ تھے وہ فرماتے ہیں کہ شیخ ابن عربی قدس سرہ عارفوں کے مربی تھے جیسے حضرت جنید بغدادی قدس سرہ مریدین کے مربی تھے۔

امام مجد الدین فیروز آبادی شیخ کے طویل مناقب بیان فرماتے ہوئے کہتے ہیں:

شیخ کا انکار صرف وہی فقہائے محض کرتے ہیں جنہیں محققین کے مشروبات میں سے کچھ حصہ نہیں ملا ہو تو جمہور صوفیہ وعلما کو اعتراف ہے کہ شیخ ابن عربی قدس سرہ اہل تحقیق وتوحید کے امام ہیں اور علوم ظاہرہ میں یکتائے روزگار ہیں۔ (نفس مصدر، ص:۲۷)

عقائد

اپنے عقائد کو خود بیان کرتے ہوئے فتوحات مکیہ میں عقیدۂ صغری کے تحت فرماتے ہیں:

تعالی الحق ان تحله الحوادث او یحلها۔ (موسوعۃ التصوف الاسلامی، ص:۵۲، سلسلۃ ثامنۃ، دار الکتب العلمیۃ)

اللہ رب العزت کی شان اس سے بلند تر ہے کہ اس میں حوادث حلول کریں یا وہ کسی حادث میں حلول کرے۔

فتوحات میں اسراء کے باب میں فرماتے ہیں:

اعلم ان اللہ تعالی واحد بالاجماع و مقام الواحد تعالی ان یحل فیه شئ او یحل هو فی شئ۔ (الیواقیت والجواہر،ص:۵۸)۔

بلاشبہ اللہ تعالی کی ذات بالاجماع واحد ہے اور واحد کی شان اس سے برتر ہے کہ کوئی اس میں حلول کرے یا وہ کسی میں حلول کرے یا کسی شی میں متحد ہو جائے۔

اسرار کے بیان میں فرماتے ہیں:

لایجوز لعارف ان یقول: انا اللہ ولو بلغ اقصی درجات القرب وحاشا العارف من هذا القول حاشاہ انما یقول: انا العبد الذلیل فی المسیر و المقیل۔

(موسوعۃ التصوف الاسلامی،ص:۵۲)

کسی عارف کے لئے جائز نہیں کہ وہ انا اللہ کہے اگر چہ وہ قرب کے بلند ترین مقام پر ہو عارف کو اس بات سے گریز لازم ہے ہاں وہ ہمیشہ یہ کہے: میں گفتار و کردار میں کمترین بندہ ہوں۔

وقال فی باب التاسع و الستین و مائة: القدیم لایکون قط محلا للحوادث و لایکون حالا فی المتحدث۔ (نفس مصدر، نفس صفحہ)

باب: ۱۶۹ میں فرماتے ہیں: قدیم کبھی بھی حادث کا محل نہیں بن سکتا اور نہ ہی کسی حادث میں حلول کر سکتا ہے۔

مذکورہ بالا سطور سے شیخ کے عقائد، ان کا تبحر علمی اور عارفانہ مقام نمایاں ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی ان کے تعلق سے بدگمان ہوتا ہے تو یہ اس کا سوئے فہم اور سوئے ظن ہے، اپنے احساسات وخیالات کو حسن ظن اور حسن تاویل کا عادی بنانے کی کوشش کرنا چاہیے۔

علاوہ ازیں شیخ کے وہ مبہم اقوال جن سے ان کو مورد طعن و تشنیع ہونا پڑا۔ ان کی تاویل و توجیہ امام شعرانی نے بڑے ہی دل کش پیرایہ میں عقل ونقل سے مبرہن ومدلل کر کے پیش کی ہے۔

وحدۃ الوجود کے صحیح اور مثبت تصورات

وحدۃ الوجود کے حامیوں نے اس کی تفہیم کی دو حیثیتیں بیان کی ہیں جو ان کے درمیان شائع وذائع ہیں: (۱) فلسفیانہ ومتکلمانہ (۲) صوفیانہ وعارفانہ

فلسفیانہ تعبیر

واضح رہے کہ جو فلسفیانہ توجیہ ہے وہ تصوف یا صوفیہ کا مطمح نظر ہرگز نہیں فلسفیانہ تعبیر کا خلاصہ یہ ہے کہ ذات باری تعالی کے علاوہ جو بھی ہے وہ سب بے حقیقت ہے ان کا اصلا وجود نہیں۔ دراصل فلاسفہ کا ابتدا ہی سے ایک بنیادی ذہنی خلجان یہ رہا کہ ربط الحادث بالقدیم کے مسئلہ کو کیسے حل کیا جائے

؟ تو اس کو فلاسفہ نے علت ومعلول کے قضیہ سے حل کرنے کی کوشش کی جب کہ شیخ ابن عربی نے اسے مضبوط علمی بنیادوں پر اصطلاحات فلسفہ کے ذریعہ واضح کیا اور تنزلات وتعینات کے مراتب سے اس راز کو واشگاف کیا، بہر حال ان کے پیش کردہ دلائل کی عظمت کو نامور علما و متکلمین نے نہ صرف سراہا بلکہ اکثر نے تسلیم بھی کیا بعض سمجھنے سے قاصر رہے تو انہوں نے اپنے قصور فہم کا اعتراف کیا مگر شیخ کی تردید کرنے کی جرات نہیں کی البتہ بعض اہل علم نے اسے حلول واتحاد کے مرادف قرار دیا مگر یہ عقلا ونقلا دونوں اعتبار سے نا قابل تسلیم ہے نقلا اس طور پر کہ ایک طرف شیخ یہ فرما رہے ہیں:

لاحلول ولا اتحاد ۔۔۔وما قال با لاتحاد الا اهل الالحاد کما ان القائل با لحلول من اهل الجهل و الفضول (التصوف الاسلامی والامام الشعرانی، ۹۱ مکتبہ نہضہ قاہرہ)

نہ حلول ہے نہ اتحاد، جو اتحاد کا قائل ہے، وہ صاحب الحاد ہے اور جو حلول کا قائل ہے، وہ صاحب جہل وفضول ہے۔

پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہی شخص حلول واتحاد کا نظریہ پیش کرے اور عقلاً اس لیے کہ حلول واتحاد کا تصور اجناس کے مابین ہی ممکن ہے اور اللہ نہ جنس ہے نہ جوہر نہ عرض بلکہ وہ قدیم بالذات ہے اور قدیم کا حلول حادث میں ناممکن ہے اسی طرح حلول کے لیے ضروری ہے کہ وہ دو جسم ہوں اور ذات باری تعالیٰ جسم وجسمانیت سے بری ہے تو اس کے حق میں یہ کیسے متصور ہو سکتا ہے؟ اسی طرح جب دو شخص ایک نہیں ہو سکتے؛ کیوں کہ دونوں کی ذات میں تباین ہے تو پھر صانع اور مصنوع واجب اور ممکن، رب اور عبد کے درمیان تباین کا پایا جانا بدرجۂ اولی متحقق ہے۔

فلسفیانہ طور سے نظریۂ وحدۃ الوجود کو ثابت کرنے والوں میں ہمارے سامنے سرفہرست دو نام ہیں ایک نام علامہ عبد العلی فرنگی محلی اور دوسرا نام امام علم وفن علامہ فضل حق خیرآبادی کا آتا ہے انہوں نے اپنے اپنے رسالوں میں طویل مقدمات ومباحث کے ذریعہ اس کو درست ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ فلاسفہ ومتکلمین کا ایک طبقہ اس کا منکر تھا اور اسے بداہۃً محال قرار دیتا تھا۔ جیسا کہ علامہ عبد العلی فرنگی محلی لکھتے ہیں:

نظریۂ وحدۃ الوجود کا انکار متکلمین وفلاسفہ نے کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ بات عقل کے خلاف ہے اور کثیر میں ایک کے ظہور کو بداہۃً عقل محال سمجھتی ہے۔

(رسالہ وحدۃ الوجود از مولانا ابوالحسن زید فاروقی،ص: ۳۶، ناشر ابوالخیر اکاڈمی، شاہ ابوالخیر مارگ دہلی)

علامہ عبد العلی لفظ وجود، لفظ ماسوی اللہ، اور اللہ کی شان تشبیہی وتنزیہی، ذاتی واسمائی وصفاتی کمال کے عنوانات کی توضیح وتنقیح کے بعد بطور نتیجہ تحریر کرتے ہیں: اس بیان سے یہ بات ثابت ہوئی کہ حضرت واجب تعالیٰ کی حقیقت وجود مطلق ہے اور ممکنات کے حقائق اس کے شیونات اور تعینات

ہیں، لہٰذا واجب تعالیٰ ممکن نہیں ہوسکتا اور ممکن واجب نہیں ہوسکتا۔ حضرت واجب کا وجود وجود مطلق ہے اور وجود مطلق کے واسطے وجوب لازم ہے اور ممکن متعین ہے اور متعین کے لیے امکان ہے۔ یہ بات قطعی طور پر محال ہے کہ مطلق اس طرح پر متعین ہوجائے کہ مغائرت باقی نہ رہے اور اس کا اطلاق باطل ہوجائے اور یہ بھی یقیناً محال ہے کہ متعین عین مطلق ہوجائے۔ کیوں کہ ایسی صورت میں مطلق اور متعین کا فرق مٹ جائے گا۔ کیوں کہ متعین سے اصل تعین زائل نہیں ہوتا۔ اگر چہ دیکھنے میں اس کا زائل ہونا ثابت ہوتا ہو۔ (ایضا، ص: ۳۰۰) دراصل علامہ عبدالعلی کا مقصد یہ تھا کہ شیخ اکبر کے پیش کردہ نظریہ میں جو بعض خام فہم لوگوں کے ذہن میں اتحاد وعینیت کا شبہ ہے اسے زائل کرکے درست ثابت کیا جائے۔ علامہ فضل حق خیرآبادی نے بھی اسی کو اور واضح کرکے اپنے رسالہ الروض المجود میں خالص فلسفیانہ انداز میں علمی جولانی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ بطور نتیجہ وہ لکھتے ہیں: **بان الحقیقة المطلقه واجبة و تعیناتها ممکنة فا لواجب واجب والممکن ممکن ،والحقیقة الواجبة مطلقة لا مبهمة لانها مصداق للوجود بذاتها و لممکنات قیود لها و تعینات لا انها افرادها۔** (الروض المجود، ص: ۳۲ مطبوعہ اسرار کریمی پریس الہ آباد)

حقیقت مطلقہ واجب ہے اور اس کے تعینات ممکن ہیں مگر واضح رہے کہ واجب واجب ہے اور ممکن ممکن ہے اور حقیقت واجبہ مطلق ہے مبہم نہیں اس لئے کہ وہ بذاتہ وجود کا مصداق ہے اور ممکنات کے لئے قیود وتعینات ہیں وہ حقیقت واجبہ کے افراد نہیں۔

ان دونوں حضرات کا مدعا یہ ہے کہ یہ کل عالم امکانی وجود رکھتا ہے اور واجب الوجود صرف ایک ہے جو سارے موجودات کے لئے مصدر ومنشا ہے کیونکہ وجود کا مصداق حقیقت واحدہ ہے جس میں اشتراک محال ہے وہ حقیقت واحدہ واحد لذاتہ ہے اور واجب لذاتہ ہے۔ لہذا حقیقت میں وجود حقیقی صرف ایک ہے یہی وحدۃ الوجود کا مطلب ہے۔

فلسفیانہ تصور کی حقیقت

اس بحث کے تعلق سے میں اپنے محدود مطالعے اور معلومات کے تناظر میں یہ بات کہنے کی جسارت کررہا ہوں کہ وحدۃ الوجود کو جب بھی فلسفیانہ نہج سے حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے تو اس میں کہیں نہ کہیں اغلاق واضطراب باقی رہ گیا ہے دراصل وحدۃ الوجود فن فلسفہ ومنطق کی بحث نہیں ہے بلکہ یہ خالص ایمانی وعرفانی کیفیت کا نام ہے، لہٰذا جہاں بھی اسے فلسفہ سے حل کرنے کا بیڑا اٹھایا گیا وہاں ہزار دلائل وبراہین کے باوجود تشنگی وحیرت کو تسکین نہیں مل سکی بنابریں یہ عرصۂ دراز سے علما ومتکلمین کے لئے بہت ہی نازک اور دقیق مسئلہ کی صورت میں بحث وجدل کا موضوع رہا اس کی صورت حال یہ ہوگئی کہ حل کی شکلیں آتی رہیں اور ان شکلوں پر اشکالات وشبہات کا

تسلسل رہا اور کوئی ٹھوس اور تشفی بخش نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ بمصداق عارف رومی:

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

اس میں جو سب سے اہم اور بنیادی وجہ سمجھ میں آتی ہیں۔ وہ یہ ہے کہ یہ خالص تصوف وسلوک کی اصطلاح ہے اور جو جس فن کی اصطلاح ہو اس کو اسی زاویہ سے سمجھنا چاہئے اسے اگر بالکلیہ دوسرے فنون کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کی جائے گی تو تفکیری جہت کا صحیح توازن برقرار نہیں رہ پائے گا اور نتیجہ میں خطا کا قوی امکان ہوگا۔ مثلا ایک ہی لفظ کئی علوم وفنون کے درمیان مشترک ہو تو اس کا مفہوم مختلف المعنی ہوجاتا ہے جیسے لفظ اداۃ علم نحو ومنطق کی مشترک اصطلاح ہے اب اگر کوئی لفظ اداۃ کے نحوی اصطلاح کو منطق سے سمجھنے کی غلطی کرے یا منطقی اصطلاح کو نحو سے سمجھنے کی غلطی کرے تو وہ کبھی بھی معنی مراد تک نہیں پہنچ سکتا ایسے ہی لفظ وحدت۔ اور لفظ وجود فلسفہ وتصوف کی مشترک اصطلاح ہیں اب اگر کوئی صوفیانہ مراد کو فلسفہ کی اصطلاح سے واضح کرے گا تو افہام وتفہیم میں دشواری و پیچیدگی اور خطا یقینی ہے۔ اس لیے کہ اصطلاحات و اعتبارات کے فرق سے ایک ہی لفظ کا مذموم معنی بھی پیدا ہوتا ہے اور محمود معنی بھی۔ اور چوں کہ اصطلاح بنانے میں کسی پر کوئی جبر نہیں ہے۔ اس ضمن میں طاوس الفقراء شیخ ابونصر سراج طوسی قدس سرہ کا قول بہت معنی خیز اور اصول کی حیثیت رکھتا ہے؛ فرماتے ہیں:

> علوم شریعت کی چار قسمیں ہیں: پہلی قسم علم روایت وآثار واخبار، دوسری قسم علم فقہ واحکام، تیسری قسم علم قیاس اور مخالفین کے رد میں حجت قائم کرنا، چوتھی قسم علم حقائق ومراتب اور علم معاملات ومجاہدات، اخلاص فی الطاعات سے متعلق ہے۔ جو علم روایت میں کوئی غلطی کرے تو اس غلطی کی تحقیق کسی اہل درایت سے نہیں کی جائیگی اسی طرح جو علم درایت میں غلطی کرے تو اس تعلق سے کسی اہل روایت سے تحقیق نہیں کی جائیگی اسی طرح اگر کوئی علم حقائق واحوال میں چوک کرجائے تو اس کی صحیح صورت کسی ایسے ہی شخص سے معلوم ہوگی جو اس کا عالم ہو اور اس فن میں کامل ہو۔ (اللمع، ص: ۸-۳۷-۶-۳۷ مطبع بریل لندن)

اس سے یہ ضابطہ ملتا ہے کہ وحدۃ الوجود کی صحیح تفہیم کسی صاحب احسان وعرفان ہی سے ممکن ہے، کوئی فلسفی اس کی گہرائی اور باریکی تک نہیں پہنچ سکتا کیونکہ وہ اس کی صحیح کیفیت وحقیقت کے ادراک سے معذور ہوتا ہے اور جب وہ خود ہی حقیقت آشنا نہیں تو دوسروں کو بھلا کیسے سمجھا سکتا ہے۔

یہ کیا طرفہ تماشا ہے کہ اس راز حقیقت کو
جو خود سمجھا نہیں اب تک وہی آیا ہے سمجھانے

ایک شبہے کا ازالہ

اب رہی بات یہ کہ جب یہ مسئلہ فلسفہ سے تعلق نہیں رکھتا تو شیخ اکبر ابن عربی اور مابعد کے بعض علماء ومشائخ نے اسے فلسفیانہ طرز سے کیوں پیش کیا؟ اس سلسلہ میں یہ واضح کردوں کہ صوفیہ میں شیخ اکبر کے علاوہ شاید ہی کسی صوفی نے اسے فلسفیانہ رنگ دیا ہو البتہ علماء نے اس حوالہ سے بڑی عرق ریزی کی ہے۔ جہاں تک شیخ اکبر کی بات ہے تو میں اس سلسلہ میں وہی موقف رکھتا ہوں جو امام شعرانی کا ہے، وہ شیخ کے اس اقدام کی توجیہات بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

اعلم رحمک اللہ انہ لایجوز الانکار علی القوم الا بعد معرفۃ مصطلحھم۔

(الیواقیت ص ۳۰)

گروہ صوفیہ پر زبان انکار وہی کھولے جو ان کی اصطلاحات کی معرفت رکھتا ہو۔۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

قاموس کے مولف شیخ مجد الدین فیروزابادی فرماتے ہیں بادی النظر میں صوفیہ پر طعن وانکار کسی کے لئے جائز نہیں کیونکہ وہ فہم وبصیرت، کشف ومشاہدہ کے اعلی مقام پر ہوتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ کسی صوفی کے تعلق سے ایسی بات نہیں پہنچی کہ انہوں نے کچھ ایسا حکم دیا ہو جو دینی اقدار کو منہدم کردے نہ انہوں نے کسی کو وضو سے روکا نہ نماز سے، نہ اسلام کے فرائض ومستحبات سے۔ البتہ غلبہء حال ومکاشفہ میں وہ ایسا (الہامی) کلام ضرور کرتے ہیں جو عوام کی فہم سے بعید تر ہوتا ہے۔ (ایضا، ص:۳۱)

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

ممکن ہے کہ جیسے اللہ تبارک وتعالی نے اولیائے کرام کو کرامات عطا کئے جو نبیوں کے معجزات کی فرع ہے ایسے ہی ان کو اللہ نے عبارات بھی عطا کیے ہوں جو جید علماء کی فہم سے بالاتر ہوں۔ (ایضا)

امام شعرانی اہل کشف کے بلند احوال تک عقل وفہم کی نارسائی کی علت بیان کرتے ہوئے کتاب کے مقدمہ میں تحریر کرتے ہیں:

وذلک لان عقائد اھل الکشف مبنیۃ علی امور تشھد وعقائد غیرھم مبنیۃ علی امور یومنون بھا (ایضا۱۶)

،،وہ اس لئے کہ اہل مکاشفہ کے عقائد مشاہدہ پر مبنی ہوتے ہیں اور دوسروں کے عقائد ان امور پر مبنی ہوتے ہیں جن پر وہ ایمان لاتے ہیں،،

اپنے موقف کی صراحت کرتے ہوئے یہ بیان کرتے ہیں:

اے بھائی میں نے اہل کشف کے بے شمار رسالوں کا مطالعہ کیا ہے۔ شیخ کامل محقق، مربی العارفین شیخ محی الدین کی عبارت سے زیادہ وسیع عبارت کسی کی نہیں دیکھی اسی لیے میں نے اس کتاب کو ان کی کتاب ،،فتوحات،، وغیرہ کی عبارتوں سے مزین کیا ہے دوسرے صوفیہ کے کلام کو نظر انداز کیا ہے ہاں فتوحات کے بعض مقامات پر میں بھی سمجھنے سے قاصر رہا جس کو میں نے اس کتاب میں ذکر کر دیا ہے تاکہ علمائے اسلام اس میں غور و فکر کریں اور حق و باطل کو ثابت کریں۔ (ایضا)

شیخ کے دفاع میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

: مجھے عارف باللہ شیخ ابوطاہر مزنی شاذلی رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ شیخ محی الدین ابن عربی کی کتابوں میں جو کچھ بھی ظاہر شریعت کے مخالف ہے وہ ان پر مدسوس ہے یعنی ٹھونسا گیا ہے۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: وہ باجماع محققین ایک مرد کامل ہیں اور کامل سے خلاف کتاب وسنت باتوں کا صدور درست نہیں۔ (ایضا)

خلاصہ یہ کہ انہوں نے تصوف کے احوال ومقامات کو فلسفیانہ رنگ ضرور دیا ہے مگر مراد ومطلب وہی تھا جو جمہور صوفیہ کا ہے کیونکہ شیخ اکبر صوفیہ کے امام سمجھے جاتے ہیں نہ کہ متکلمین وفلاسفہ کے اگرچہ علوم فلسفہ پر مہارت رکھتے تھے شاید ان کی کوشش یہ رہی ہو کہ تصوف کے اسرار واحوال کو معقولی پیرایہ میں پیش کر کے اہل عقل وخرد کو بھی تصوف کی حقانیت تسلیم کرنے پر مجبور کیا جائے واللہ اعلم بالصواب۔ ہم یا کوئی بھی اس بات کی اہلیت نہیں رکھتا کہ ایسا کرنے میں ان کی اصلی حکمت کو جان سکے۔ رع

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہیں

فلسفیانہ یا عالمانہ تعبیر کی ژولیدگی میں دوسری وجہ جو رہی وہ یہ کہ جب بھی احوال وکیفیات کو لفظی پیکر کا سہارا لے کر بیان کیا گیا تو مراد واضح نہیں ہو سکی؛ کیوں کہ ذوق واحساس کی چیز کو آپ تمثیلی پیکر میں سمجھا تو سکتے ہیں مگر اس کی صحیح کیفیت وحقیقت کو نہیں بیان کر سکتے جیسے سیب کھانے والے سے کوئی سیب کے ذائقہ کے بارے میں پوچھے تو وہ پوری زندگی اگر اس کو لفظوں کی وساطت سے سمجھاتا رہے تب بھی اس ذائقہ کی حقیقت نہیں پا سکتا جب تک وہ خود نہ کھالے؛ کیوں کہ علم وقال الگ چیز ہے اور ذوق وحال الگ چیز ہے ایسے ہی وحدۃ الوجود کے بارے میں بھی خیال ہے کہ یہ ارباب عشق وعرفان کے احوال ومشاہدات کی لطیف کیفیات میں سے ہے جو نا قابل بیان ہے جو بھی اسے بیان کرے وہ از قبیل تمثیل ہے حقیقت نہیں۔ رع

بخدا ایں مے نہ شناسی تا نہ چشی۔

وحدۃ الوجود کی صوفیانہ تعبیر

وحدۃ الوجود سے جو معنی صوفیہ مراد لیتے ہیں وہ بلاشبہ عین ایمان بلکہ کمال ایمان ہے کیونکہ صوفیہ کی مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ موجود بالذات اور واجب الوجود ہے **کان اللہ ولم یکن معه شئیی غیرہ**۔(اللہ موجود تھا جب کہ اس کے ساتھ کوئی شئ نہیں تھی)اور کوئی بھی اس کی اس صفت میں شریک نہیں اور اس کی ذات تمام تغیر وتبدل سے پاک ہے۔(**وھو الآن کما کان**)اور اس کی ذات اب بھی ایسے ہی ہے جیسی تھی کیوں کہ جس طرح اس کی صفات ازلی ہیں اسی طرح ابدی بھی، ماسوا اللہ کسی کا حقیقی وجود نہیں وہ اپنے وجود میں یکتا ویگانہ ہے باقی کائنات ممکن بالذات اور موجود بالغیر ہے اللہ تعالیٰ نے جب اس کو وجود دینا چاہا تو اس کے ارادے کے ظہور کے طور پر وجود میں آئی، یہ کائنات بے حقیقت و بے ثبات ہے، اس کے لیے فنا ہے۔ چنانچہ یہاں پر ذات باری تعالیٰ کی دو جہتیں ہوئیں ایک تو یہ کہ وہ کائنات کے وجود میں آنے سے پہلے جس طرح موجود تھا اسی طرح آج بھی موجود ہے۔ اور دوسری جہت یہ ہے کہ اگر چہ وہ جس طرح پہلے ازل میں موجود تھا اسی طرح آج بھی موجود ہے لیکن اس کے ارادے کے ظہور کے طور پر اب دنیا بھی وجود میں آچکی ہے۔ یعنی اب یہاں ایک طرف رب تعالیٰ کی اس حیثیت کی طرف نظر ہے کہ وہ موجود مطلق ہے دوسری طرف اس کے موجود مطلق ہونے کے ساتھ اس حیثیت کی طرف بھی نظر ہے کہ اس کے ارادے سے ایک دنیا وجود میں آچکی ہے۔

مذاق صوفیہ کے اعتبار سے وحدۃ الوجود میں صرف پہلی والی جہت پر نظر ہوتی ہے، غیر اللہ پر کسی جہت سے نظر ہی نہیں ہوتی، چہ جائیکہ یہ بحث پیدا ہو کہ اشیاء واعیان کا وجود کس نوعیت کا ہے یا وہ عدم محض ہیں؟ اس وقت بندہ عرفان توحید میں غرق ہوتا ہے اور اس کے پیش نظر صرف اور صرف ایک ذات ہوتی ہے اور اسی ذات کی عظمت کے عرفان ویقین میں گم ہوتا ہے یہی وحدۃ الوجود کی ایمانی تشریح ہے جس میں کسی کو مجال کلام نہیں کیونکہ یہ توحید کی بنیاد اور روح ہے جیسا کہ قرآن واحادیث کے صریح نصوص اس عقیدہ کی تائید وتوثیق میں وارد ہیں یہی وہ تصور ہے جس کو پیغبر اعظم ﷺ نے لبید شاعر کے ایک مصرعہ کی تائید کرتے ہوئے واضح فرمایا تھا: امام بخاری و ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا ہے : قال رسول اللہ ﷺ : **اصدق کلمۃ قالھا الشاعر کلمۃ لبید: الا کل شئی ماخلا اللہ باطل** (بخاری کتاب االادب، رقم :۵۶۸۱ ،ترمذی کتاب الادب، رقم :۲۷۷۱) رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سب سے سچی بات وہی ہے جو لبید شاعر نے کہی کہ: اللہ کے علاوہ ہر چیز باطل ہے۔

بھلا اس نظریہ سے کسے اختلاف ہوسکتا ہے اگر کوئی اختلاف کرنے کی جرأت کرتا ہے بھی تو وہ اپنے ایمان کی خیر منائے کیونکہ یہ مسلم عقیدہ ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی کا بھی ذاتی اور

حقیقی وجود نہیں موجود بالذات صرف وہی ہے جس میں اشتراک محال ہے۔ یہیں سے مؤمن کے ایمان کی ابتدا ہوتی ہے، کوئی بھی بندہ لا الٰہ الا اللہ کہنے سے پہلے لا موجود الا اللہ پر ایمان لاتا ہے، کیوں کہ کسی کو الٰہ تو بعد میں مانا جائے گا پہلے تو اسے موجود بالذات، واجب الوجود اور موجود حقیقی مانا جائے گا اور غیر کے الٰہ ہونے کی نفی تو بعد میں کی جائے گی پہلے اس بات کی نفی کی جائے گی کہ موجود حقیقی اللہ تعالیٰ کی صفت وجود میں کسی بھی طرح غیر کی شرکت نہیں ، یہی لا موجود الا اللہ پر سالک کے ایمان بالغیب کے صدقے لا الٰہ الا اللہ کے مقامات ومنازل طے کرنے اور عرفانی کیفیات واذواق سے گزرنے کے بعد اس پر یہ حقیقت منکشف ہوجاتی ہے اور اس پر ایسا حال طاری ہوتا ہے کہ اس کے شہود سے عالم امکان بالکلیہ غائب ہوجاتا ہے اور اب اس کی نظروں میں صرف واجب الوجود ہوتا ہے، اس کی نظر صرف متجلی پر ہوتی ہے تجلی اس کے شہود سے فنا ہوجاتی ہے اور وہ شہودی بنیادوں پر پکار اٹھتا ہے لا موجود الا اللہ۔

وحدۃ الوجود کی یہ وہ صوفیانہ تعبیر ہے جس کا انکار شیخ ابن تیمیہ اور ابن قیم نے بھی نہیں کیا ہے البتہ انہوں نے اس کو فنائے شہودی کا نام دیا ہے اور یہ تسلیم کیا ہے کہ ایسی کیفیت کسی بھی سالک پر طاری ہوسکتی ہے کہ اس کے شہود سے پورا عالم فنا ہوجائے اور اس کی نگاہ میں صرف ذات واجب الوجود باقی رہ جائے۔ انھوں نے اس کو بھی قبول کیا ہے کہ اس تفہیم میں کوئی خطا نہیں اور نہ اس میں کوئی شرعی خرابی ہے کیوں کہ سالک جب اس کیفیت سے لوٹے گا تو وہ پھر سے رب تعالیٰ کی دوسری جہت کا بھی اقرار کرے گا اور وہ یہ تسلیم کرے گا کہ رب تعالیٰ بلاشبہہ واجب الوجود اور موجود بالذات ہے اس کے علاوہ کوئی موجود حقیقی نہیں لیکن اس کے ارادے کے ظہور کے طور پر کائنات بھی موجود ہے۔(دیکھیے: مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ، کتاب التصوف مدارج السالکین)

اس تشریح سے نہ اتحاد لازم آتا ہے نہ حلول کیونکہ یہ خالص سر توحید کی بات ہے جو آیت: **قل ھو اللہ احد** میں مضمر ہے۔ یہاں دوئی کے تصور کی یکسر نفی ہے وہ ذات یکتا اپنے تمام صفات و کمالات میں شرک کے شائبہ سے بھی منزہ ومبرا ہے یہ عقیدہ اسلام وایمان کی جان ہے۔

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

ہر شان کی طرح شان وجود میں بھی یکتا ہے یہی وحدۃ الوجود کا عام فہم اور واضح مطلب ہے جو خود لفظ وحدت سے عیاں ہے۔ اسمیں مزید چہ میگوئیاں یا فنی بحث قلق واضطراب کا شکار کردیتی ہے۔ لہذا اس سے گریز ضروری ہے۔ اسی توجیہ کو مختلف صوفیہ نے اپنے اپنے احوال و مکاشفات کے اعتبار سے بیان فرمایا ہے۔

بطور تمثیل میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی چند عبارتیں ذکر کر رہا ہوں وہ فرماتے ہیں کہ:

صدق آں آنگاہ معلوم گردد کہ طالب از محنت روز وشبہا وممارست استغراق وترک خطرات ماسوا از خودی خود دور شود چوں از خیال خود گذشت گو یا از ہمہ گذشت ہیچ شئی درنظر او و خیال اونماند جز خدا ہیچ نہ بیند۔(رسالہ وحدۃ الوجود از امداد اللہ مہاجر مکی، مطبع اسرار کریمی پریس الہ آباد)

اس حالت کی حقیقت اس وقت معلوم ہوگی جب طالب روز وشب کی ریاضت واستغراق اور ماسوا کے خطرات وخیال کو ترک کر کے بلکہ خود اپنی ذات کے خیال سے دور ہو جائے جب وہ اپنی خودی کے احساس سے غائب ہو جائے تو گو یا سب سے بے خبر ہو گیا اس وقت اس کی نگاہ وخیال میں کوئی باقی نہیں رہتا اس وقت صرف اور صرف خدا ہوتا ہے۔آگے ایک شعر نقل کرتے ہیں۔

تو مباش اصلا کمال اینست وبس
تو درآں گم شو وصال اینست وبس

(تو بالکل نہ رہے یہی کمال ہے خود کو اس کی یاد میں محو کر دے یہی وصال ہے)۔

اس حالت کی تائید امام شعرانی کی وہ توجیہ وتمثیل کرتی ہے جہاں آپ نے وحدۃ الوجود کو ایک کیفیت وحالت سے تشبیہ دی ہے وہ فرماتے ہیں: لاموجود الا اللہ وہی کہتا ہے جو طالب مبتدی ہے اسکا قلب اللہ سے شدت محبت اور غیر اللہ کی محبت سے خالی ہونے کے سبب غیر کے شعور وخیال سے محجوب ہو جاتا ہے جیسا کہ کسی مصیبت زدہ کے ساتھ ہوا کرتا ہے اگر اس کا بیٹا مر گیا ہے یا اس کا مال تلف ہو گیا ہو تو وہ شدت غم سے ایسا ہو جاتا ہے کہ بار بار گھر میں داخل ہوتا ہے اور نکلتا ہے لیکن دروازے پر بیٹھے ہوئے اپنے ساتھی کو نہیں دیکھ پاتا اب اگر اس سے پوچھا جائے کہ فلاں کو دیکھا ہے؟ تو اس کا جواب نفی میں ہوگا اگر اس سے کہا جائے کہ وہ تو تمھارے سامنے ہی تھا تو کہے گا کہ خدا کی قسم شدت غم سے میں اسے دیکھ نہیں سکا۔مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اگر یوسف علیہ السلام کے پاس آنے والی عورتیں ایسی خود فراموشی کا شکار ہو سکتی ہیں کہ انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے اور انہیں اس تکلیف کا احساس بھی نہیں ہوا تو اس شخص کی بے خودی کا عالم کیا ہوگا جس کا قلب اپنے رب کی محبت میں غرق ہے اور جو اپنے رب کی عظیم نشانیوں کے مشاہدہ میں مشغول ہے۔(التصوف الاسلامی والامام الشعرانی، مکتبۃ النہضہ، قاہرہ، ص: ۹۴)

پردہ ضروری ہے

اس مسئلے کو روپوش رکھنے اور اسے عوام کے درمیان نہ لے جانے کا کیا فائدہ ہے اس پر گفتگو کرتے ہوئے حاجی امداد اللہ مہاجر مکی فرماتے ہیں:

سوائے آں دراستتار ایں مسئلہ فایدہ ہمیں کہ اسباب ثبوت ایں مسئلہ بسیار نازک و نہایت دقیق فہم عوام بلکہ فہم علمائے ظاہر کہ از اصطلاح عرفا عاری اند قوت درک آں نمی دارد چہ علماء بلکہ صوفیا نیکہ ہنوز سلوک خود تمام ناکردہ باشند واز مقام نفس گذشتہ بمرتبۂ قلب نارسیدہ از یں مسئلہ ضرر می یابند واز مکر نفس وتزلزل ولغزش پا در چاہ اباحت وقعر ضلالت سرنگوں می افتند بلکہ گروہا افتادہ اند کما شہدنا ہم نعوذ باللہ من ذلک۔

(رسالہ وحدۃ الوجود فارسی، مطبع اسرار کریمی پریس الہ آباد)

اس مسئلے کو روپوش رکھنے میں یہی فائدہ ہے کہ اس مسئلے کے اثبات پر جو دلائل ہیں وہ بہت ہی نازک اور دقیق الفہم ہیں وہ عام فہم نہیں بلکہ ان علمائے ظاہر کی بھی فہم سے بالاتر ہیں جو اہل عرفان کی اصطلاح سے ناواقف ہیں علماء کیا بلکہ ان صوفیوں کے لئے بھی ناقابل فہم ہیں جن کا سلوک ابھی ناتمام ہے جو ابھی مقام نفس کو عبور کر کے مقام قلب تک نہیں پہنچا ہو ان کے حق میں یہ مسئلہ ضرر سے خالی نہیں کیونکہ اس کا امکان ہے کہ وہ مکر نفس کے فریب میں آ کر لغزش کھا کر چاہ اباحت اور قعر ضلالت میں گر نہ جائے جیسا کہ میں نے دیکھا کہ کئی جماعتیں اس سے پہلے اس کا شکار ہو چکی ہیں۔نعوذ باللہ من ذلک۔

وحدۃ الوجود بمقابلہ وحدۃ الشہود

اختلاف کی دوسری جہت: صوفیہ کے مابین ایک یہ بھی مسئلہ گرم رہا کہ وحدۃ الوجود کمال ہے یا وحدۃ الشہود؟ اس سلسلے میں ابن عربی کے پیش کردہ وحدۃ الوجود کے مقابلے میں شیخ الاسلام عبداللہ انصاری کے بعد جنہوں نے وحدۃ الشہود کی اصطلاح قائم کی وہ مجدد الف ثانی قدس سرہ کی ذات ہے۔ان دونوں نظریات میں کون بہتر ہے یا کون شرع سے زیادہ قریب ہے، اس کی پوری تفصیل مولانا ابوالحسن زید فاروقی نقش بندی کے رسالہ،،وحدۃ الوجود،، میں موجود ہے انہوں نے فریقین کے موقف اور اس کے دلائل کا بھرپور احاطہ کیا ہے جو ایک علمی وتحقیقی شاہکار ہے۔
بطور مثال ان کا ایک تجزیہ ملاحظہ ہو:

شیخ اکبر کے نزدیک ولایت کا اعلیٰ مقام بحر وحدت میں غوطہ لگانا اور دُرِّ توحید وجودی کا حاصل کرنا ہے۔سالک اس بحر ناپیدا کنار میں شناوری کرتا رہے۔سوا وحدت کے اس کو کچھ نظر نہ آئے اور اس کے تن کا ذرہ ذرّہ ''ہمہ اوست'' کی تکرار کرے۔

حضرت مجدد فرماتے ہیں۔توحید وجودی مقام یک بینی ہے جو سکر ومدہوشی کا مقام ہے اور یہ ولایت کا ادنیٰ مقام ہے اور اس سے بالاتر دائرۂ ظلال ہے۔جب سالک اس مقام میں داخل ہوتا ہے، وہ اسماء وصفات کے ظلال میں سیر کرتا ہے اور اس سے بالاتر مقام

عبدیت ہے۔ یہ حضرات ابنیاء علیہم السلام کا مقام ہے۔اس میں صحو وآ گاہی ہے۔
سالک کی زبان پر توحید وجودی کے مقام میں لامحالہ ''**انا الحق**'' جاری ہوگا اور دائرۂ ظلال میں ''**سبحانی ما اعظم شانی**'' کی صدا بلند ہوگی اور مقام عبدیت میں ''**لااحصی ثناءً علیک**'' کے مبارک الفاظ آئیں گے۔ یہ مقام فرق ہے۔اس مقام میں ''**العبد عبد و الرب رب**'' کے اسرار کھلتے ہیں۔حضرت مجدد نے ان تینوں مقامات کا ذکر دفتر اول کے مکتوب ۱۶ میں کیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان تینوں مقامات کی سیر کرائی ہے۔ چنانچہ از روئے کشف وبصیرت فرماتے ہیں کہ ''ہمہ اوست'' وہ شخص کہہ سکتا ہے جو مقام توحید وجودی میں ہے اور جو شخص اس مقام میں نہیں ہے وہ ''ہمہ از وست'' کہے گا۔آپ نے لکھا ہے کہ مکتوبات ورسائل میں اس درویش سے بلکہ ہر سالک سے علوم اور معارف کے بیان میں جو تفاوت ظاہر ہوا ہے، وہ ان ہی مقامات متفاوتہ کے حصول کی وجہ سے ہے۔ ہر مقام کے علوم اور معارف جدا ہیں اور ہر سالک کا نیا قال ہے۔

خدا ئیست آں کہ ذاتِ بے مثالش
نہ گردد ہرگز از حالے بہ حالے

(وحدۃ الوجود،ص: ۸۳، ۸۴، شاہ ابوالخیر اکاڈمی،شاہ ابوالخیر مارگ، دہلی،)

حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں

وحدۃ الوجود کی صحیح تعبیر کے مطابق اس میں کوئی تناقض وتخالف نہیں ملتا حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں علیحدہ دو مستقل کیفیتیں ہیں دونوں کا موقع ومحل اور اس کی نزاکت ولطافت مخصوص ہے اس میں حقیقی اختلاف کی گنجائش نہیں ذیل میں چند تطبیقات کے ذریعہ مابہ الامتیاز پہلوؤں کو درج کیا جارہا ہے اس امید کے ساتھ کہ مدت سے سرگرم اس فکری اختلاف کا تصفیہ ہوجائے۔

وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے درمیان تطبیق

تطبیق کی ایک ممکن صورت یہ ہے کہ سالک کے اوپر جب ،،لاموجود الا اللہ،، کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو اس کے قلب ونگاہ میں صرف اللہ کی ذات کا تصور ہی غالب ہوتا ہے، ماسوا سے بالکل غافل ہوتا ہے تو اس وقت وحدۃ الوجود کا قول کرتا ہے،اس وقت اس کی نظر صرف متجلی پر ہوتی ہے اور جب اس کی نظر کائنات میں پھیلی ہوئی اللہ کی آیات وتجلیات اور صفات پر ہوتی ہے تو لامشہود الا اللہ کہتا ہے جو وحدۃ الشہود ہے یہاں نظر تجلیات پر ہوتی جس میں اسی ذات کو متجلی پاتا ہے بعض حضرات غلط فہمی سے اسے ہی وحدۃ الوجود سمجھ بیٹھتے ہیں حالانکہ یہ کیفیت وحدۃ الشہود کی ہوتی ہے۔
اس کو اگر لا الہٰ الا اللہ کے درجات کی اس تفصیل کی روشنی میں سمجھا جائے تو وحدۃ الوجود

اور وحدۃ الشھو د دونوں اچھی طرح واضح ہوجائے گا۔
سالک جب لا الہٰ الا اللہ کہتا ہے تو وہ سب سے پہلے غیر اللہ کے موجود حقیقی ہونے کی نفی پر ایمان لاچکا ہوتا ہے گویا لاموجود الا اللہ جو وحدۃ الوجود ہے یہاں سے سالک کے سفر کا آغاز ہوتا ہے۔اب لا الہ الا اللہ کہنے کے بعد جو منازل آتے ہیں وہ کچھ اس ترتیب سے ہوتے ہیں۔

لا الہ الا اللہ کے درجات معانی

(۱) لا مالک الا اللہ (لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ۔ غافر: 16)
(۲) لا حاکم الا اللہ (إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ۔ الأنعام: 57)
(۳) لا مطاع/لا معبود الا اللہ (اعْبُدُوا رَبَّكُمُ۔ البقرۃ: 21/أَطِيعُوا اللّٰهَ۔ آل عمران: 32)

یہ لا الہ الا اللہ کے شریعت کے لحاظ سے تین درجات ہیں کہ سالک جو لا الہٰ الا اللہ کہتا ہے اور جو پہلے ہی لاموجود الا اللہ پر ایمان لاچکا ہوتا ہے وہ لا الہ کے معانی کو مذکورہ بالا تین معنی کے اعتقاد کے ساتھ سمجھتا ہے۔وہ پہلے مالک کے ایک ہونے پر ایمان لاتا ہے جو مالک ہوگا وہیں حاکم بھی ہوگا اور اس طرح وہ حاکم کے ایک ہونے پر ایمان لاتا ہے اور جو حاکم ہوگا اسی کی اطاعت کی جائے گی۔لہٰذا وہ معبود ومطاع کے ایک ہونے پر بھی ایمان لاتا ہے اور غیر اللہ کی مالکیت، حاکمیت اور معبودیت کا انکار کردیتا ہے۔اب جو مالک ہوگا، مالک، حاکم اور معبود ہوگا، وہی سالک کا مطلوب ہوگا اسی تک رسائی کی اس کو طلب ہوگی، وہی اس کا مقصود ہوگا، اسی کا وہ قصد وارادہ کرے گا اور جس کا وہ قصد وارادہ کرے گا وہی اس کا محبوب ہوگا۔
اس طرح وہ طریقت کی منزل میں قدم رکھتا ہے اور لا الہ الا اللہ پر اس معنی میں از سر نو ایمان لاتا ہے کہ

(۱) لا مطلوب الا اللہ۔ (اللہ الصمد۔ الاخاص:۲)
(۲) لا مقصود الا للہ۔ (فَفِرُّوا إِلَى اللّٰهِ۔ الذاریات: 50)
(۳) لا محبوب الا اللہ۔ (وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ۔ البقرۃ: 165)

اس اس طرح مطلوب، مقصود اور محبوب کے ایک ہونے کا اقرار کرتا ہے اور غیر اللہ کے مطلوب، مقصود اور محبوب حقیق ہونے کی نفی کرتا ہے۔ جب رب تعالیٰ مطلوب، مقصود اور محبوب ہوجاتا ہے تو اب وہ حقیقت کی منزل میں قدم رکھتا ہے اور لا الہ الا اللہ پر ان مفاہیم کی روشنی میں ایمان لاتا ہے کہ

(۱) لا فاعل الا اللہ۔ (يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ۔ آل عمران: 40)
(۲) لا مشہود الا اللہ۔ (إِنَّ اللّٰهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ۔ الحج: 17)
(۳) لا موجود الا اللہ (قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ۔ الاخلاص: 1)، (كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ۔ الرحمن: 26،27)

اس منزل میں اس پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے سب اس کے ارادے کا ظہور ہے۔ ہر جگہ اس کی کاریگری ہے اور وہی ہر جگہ فاعل حقیقی ہے اور اس طرح وہ فاعل حقیقی اللہ تعالیٰ کا اقرار کرتا ہے، اور دوسرے تمام فاعلین کا انکار کرتا ہے۔ جب سالک اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ لا فاعل الا اللہ کی حقیقت اس پر منکشف ہو جاتی ہے تب اللہ تعالیٰ اس بندے پر اپنا انعام فرماتا ہے۔ اور اس کی آنکھوں میں وہ نور عطا فرماتا ہے اس کو ہر چیز میں رب کائنات کا جلوہ نظر آتا ہے اور ہر شئی میں اس کے علاوہ کوئی مشہود نہیں رہ جاتا۔ یہی وحدۃ الشھود ہے اور یہ سالک پر انعام الٰہی ہے، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، مولائے کائنات حضرت علی کرم اللہ تعالی وجہہ فرماتے ہیں: ما رأيت شيئا الا و رأيت الله فيه يا ما رأيت شيئا الا و رأيت الله قبله۔ اس کے بعد سالک پھر اپنے اسی ایمان حقیقی کی طرف پلٹتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی موجود بالذات نہیں۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ جب اس نے ابتدا میں لا الٰہ الا اللہ کہنے سے پہلے لا موجود الا اللہ کا اقرار کیا تھا تو اس وقت وہ ایمان بالغیب تھا اور اب جب کہ وہ اپنا سلوک الی اللہ مکمل کر چکا ہے اس وقت اس کا ایمان شہودی ہو چکا ہے اور اب وہ اس حال سے گزر چکا ہے جب کہ اس کی نظر میں متجلی کے علاوہ سب فنا ہو چکا تھا اور اس کی نگاہ میں صرف موجود حقیقی تھا اور یہی وحدۃ الوجود ہے۔ حاصل یہ کہ نظر جب تجلی پر ہو تو وحدۃ الشہود، اور جب نظر متجلی پر ہو اور تجلی شہود سے فانی ہو تو وحدۃ الوجود یا یہ کہہ سکتے ہیں کہ وحدۃ الشہود سالک کے لیے سفر سلوک مکمل ہونے پر ملنے والا انعام الٰہی ہے جب کہ وحدۃ الوجود سالک کا ایمان حقیقی ہے جس پر لا الٰہ الا اللہ کہنے سے پہلے ہی ایمان لا یا تھا اور اس ایمان کا کمال سلوک کے تکملے کے بعد پھر سے لا موجود الا اللہ کی حقیقت کھلنے اور رب تعالیٰ کی صفت ازلی کے مشاہدے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔

خلاصۂ بحث

وحدۃ الوجود: کمال توحید، کمال ایمان، حقیقت توحید یا توحید محض یا سر توحید کا نام ہے جو اس ذات یکتا کی شان احدیت کو اجاگر کرتا ہے جسے قرآن نے قل ھو اللہ احد، اور لیس کمثلہ شئی سے بیان کیا ہے جسے علم کلام کے اعتبار سے کمال تنزیہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اور وحدۃ الشہود کمال عبدیت، کمال احسان، کمال عبادت، کمال سالک، کمال سلوک، یا حقیقت سلوک کا نام ہے جسے حدیث کے الفاظ ان تعبد الله كانك تراه سے عیاں کیا گیا کیونکہ كانك تراه کی حالت مشاہدہ کی ہے جو کمال بندگی اور انعام خداوندی ہے اس مقام پر سالک لا مشہود الا اللہ کی کیفیت میں غرق ہوتا ہے اس وقت اس پر اینما تولوا فثم وجه الله کی حقیقت عیاں ہوتی ہے۔ حاصل یہ کہ یہ دو کمال ہے جن کی الگ الگ جہتیں ہیں۔ یہی سادہ سا تصور اور فرق ہے جس میں کوئی خلجان یا حیرت کا دخل نہیں۔

○○○

إلى التصوف من جديد

مجلة الله آباد

مجلة فصلية تصدر من الجامعة العارفية ، الهند

تحت الإشراف العام

الداعية الإسلامي والعارف الرباني

الشيخ أبو سعيد شاه إحسان الله المحمدي الصفوي حفظه الله

برياسة التحرير

حسن سعيد صفوي

قد نشرت عددها الثاني [العدد الخاص على]

الرسالة المكية

للعلامة قطب الدين الدمشقي رحمه الله تعالى

تقديم

الأستاذ/ ضياء الرحمٰن العليمي

تحقيق وتخريج

الأستاذ/ غلام مصطفىٰ الأزهري

المراسلات: أكادمية الشاه صفي، الجامعة العارفية، سيدسراوان،

كوشامبي، الله آباد، أترابراديش (الهند)

البريد الإلكتراني: shahsafiacademy@gmail.com/ **الهاتف:** 7860604036

بحث ونظر

تصوف کے بنیادی مآخذ کیا ہیں؟

تصوف کی بنیاد حدیث جبریل میں لفظ احسان ہے

"اگر تصوف کی بعض باتیں دوسرے مذاہب کی بعض باتوں سے ملتی ہیں، توقابل غور ہے کہ عقیدۂ توحید کے آثار بھی اسلام سے پہلے عجمی افکار اور سامی مذاہب میں موجود رہے ہیں۔"

مفتی مطیع الرحمٰن رضوی

اسلام ہی اللہ کے نزدیک دین ہے۔ان الدین عنداللہ الاسلام۔(آل عمران: ۱۹) اس لیے اُس نے حضرت آدم سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وسلم تک جتنے پیغمبر مبعوث فرمائے، سب کو اسی دین پر مبعوث فرمایا، اور وہ اسی کی تبلیغ فرماتے رہے:

"شرع لکم من الدین ماوصی به نوحاوالذی اوحیناالیک وماوصینابه ابراهیم وموسیٰ وعیسیٰ ان اقیموا الدین ولاتتفرقوا فیه۔ تمہارے لیے دین کی وہ راہ ڈالی جس کا حکم اس نے نوح کو دیا۔اور جو ہم نے تمہاری طرف وحی کی اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا کہ دین ٹھیک رکھواور اس میں پھوٹ نہ ڈالو۔ (شوریٰ:۱۳)

اگرچہ معاملات کی راہیں جدا جدا اور عبادت کے طریقے الگ الگ رہے:

لکل جعلنامنکم شرعة ومنهاجا۔ ہم نے تم سب کے لیے ایک ایک شریعت اور راستہ رکھا۔(مائدہ:۴۸)

مگر دل کا خلوص اور حسن نیت سب میں قدر مشترک رہے۔

وماامروا الالیعبدالله مخلصین له الدین۔اور ان لوگوں کوتو یہی حکم ہوا کہ اسی عقیدہ پر اخلاص کے ساتھ اللہ کی بندگی کریں۔(بینۃ:۵)

ان الله لاینظرالی صورکم واموالکم بل ینظرالی قلوبکم واعمالکم۔ اللہ تمہاری صورتوں اور مالوں کونہیں دیکھے گا، بلکہ تمہارے دلوں اور اعمال کو دیکھے گا۔ (مسلم: ج:۱،ص:۳۱۷) انما الاعمال بالنیات۔ اعمال کا مدار نیتوں ہی پر ہے۔ (بخاری، ج:۱،ص:۲)

اسی دل کے خلوص اور حسن نیت کو حامل وحی حضرت جبرئیل اور محبط وحی خاتم النبیین صلی

اللہ علیہ وسلم کی پاک زبانوں نے احسان کا نام دیا۔

قال: ما الایمان؟ قال: الایمان ان تؤمن باللہ وملائکتہ ورسلہ وتؤمن بالبعث۔
قال: ما الاسلام؟ قال: الاسلام ان تعبداللہ ولاتشرک بہ وتقیم الصلوۃ وتودی الزکوۃ المفروضۃ وتصوم رمضان۔ قال: ما الاحسان؟ قال الاحسان ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک۔ جبرئیل نے عرض کی: ایمان کیا ہے؟ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایمان یہ ہے کہ اللہ، اس کے فرشتوں، اس کے رسولوں اور مرنے کے بعد اُٹھائے جانے پر ایمان لاؤ۔ جبرئیل نے عرض کی: اسلام کیا ہے؟ حضور نے ارشاد فرمایا: اسلام یہ ہے کہ اللہ کی عبادت کرو، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ، نماز قائم رکھو، فرض کی ہوئی زکوٰۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو۔ جبرئیل نے عرض کی: احسان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: **احسان** یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اگر تم نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ (بخاری: ۱/ص: ۱۲)

یہی دل کا خلوص، حسن نیت اور احسان، تصوف کی حقیقت ہے۔ یعنی ایمان (اعتقادات) اسلام (ظاہری اعمال) اور احسان (دل کا خلوص اور حسن نیت) تصوف کے اجزائے ترکیبی ہیں۔

حدیث پاک میں پہلے نمبر پر ایمان (اعتقادات) دوسرے نمبر پر اسلام (ظاہری اعمال) تیسرے نمبر پر احسان (دل کا خلوص اور حسن نیت) کے ذکر سے اس حقیقت کی نقاب کشائی ہوجاتی ہے کہ جس طرح دو کا وجود اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ایک کا وجود نہ ہوجائے، اور تین کا وجود اس وقت تک ممکن نہیں جب تک دو کا وجود نہ ہوجائے، اسی طرح جب تک ایمان نہ ہو شرعاً اعمال کا وجود ممکن نہیں، اور جب تک اعمال نہ ہوں احسان کا وجود بھی ممکن نہیں۔ پھر جس طرح تین سے دو کی قدر کم ہوتی ہے، اور دو سے ایک کی قدر کم، اسی طرح عمل کے بغیر ایمان کمزور ہے اور احسان کے بغیر اعمال ناقص ہیں۔

اور اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ کائنات میں سب سے پختہ ایمان انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام کا تھا، اعمال بھی سب سے زیادہ کامل واکمل ان ہی بندگان خاص کے تھے، اور وہی مقدس حضرات سب سے بڑھ کر حسن نیت، خلوص دل اور احسان کے حامل ومتصف تھے۔ تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ حقیقی معنوں میں انبیائے کرام سب کے سب صوفی تھے، اور تصوف کی ابتدا آدمیت کی ابتدا ہی سے ہے۔

کسی حقیقت کا اصطلاح کے جامہ میں ملبوس نہ ہونے سے اس حقیقت کے وجود کی نفی

نہیں ہوسکتی۔ علم نحو میں مذکور فعل، فاعل، مفعول اور مرفوع، منصوب، مجرور کی حقیقتیں اس وقت بھی تھیں، جب یہ اصطلاحیں وجود میں نہیں آئی تھیں۔ اسی طرح احادیث کی قسمیں مرفوع، مرسل، موقوف اور صحیح لذاتہ، صحیح لغیرہ، حسن لذاتہ، حسن لغیرہ، ضعیف، شاذ، منکر وغیرہ اس وقت بھی موجود تھیں، جب یہ اصطلاحیں وضع نہیں ہوئی تھیں۔

رہا یہ کہ تصوف کی اصطلاح قائم ہوجانے کے بعد بھی انبیائے کرام کو صوفی کے لقب سے ملقب کیوں نہیں کیا گیا؟ تو عرض ہے کہ جس طرح مڈل، میٹرک، آئی اے، بی اے، پھر ایم اے پاس کرلینے کے بعد کسی کے تعارف میں یہ نہیں کہا جاتا ہے کہ فلاں مڈل پاس یا میٹرک پاس یا آئی اے پاس یا بی اے پاس ہے؛ کیوں کہ یہ مدارج اس کے درجہ (ایم۔ اے) سے فروتر ہیں۔ اسی طرح نبوت کا رتبہ، وہ بلند رتبہ ہے کہ اس منصب کے حاملین کو صوفی کے لقب سے ملقب کرنا، ان عالی رتبہ حضرات کو ان کے رتبہ سے نیچا دکھانا تھا۔ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم **خیر الناس قرنی ثم الذین یلونھم** (بخاری، ج:۱/ص: ۳۶۲) کے مطابق انبیائے عظام کے بعد سب سے بلند رتبہ صحابۂ کرام کا، پھر تابعین، اس کے بعد تبع تابعین کا ہے۔ اس لیے عام طور پر وہ حضرات بھی اس لفظ سے ملقب نہیں کیے گئے، ورنہ بلاشبہ سارے صحابہ، عام تابعین اور کبار تبع تابعین، تصوف کے حامل رہے۔

صغار تابعین کے زمانہ میں عہد رسالت کی دوری سے عام مسلمانوں کی وہ حالت نہیں رہی جو پہلے تھی، اخلاص واحسان کی کمی آئی، خدا طلبی کی بجائے دنیا طلبی غالب آنے لگی، نام ونمود کی خواہش اور ہوائے نفس سے یونان کے مردہ فلسفہ کی درآمد ہوئی اور اعتقادات پر شب خون مارا جانے لگا، عیش کوش سلاطین نے حلال وحرام میں امتیاز کرنا چھوڑ دیا، جاہ پرست درباریوں نے حدیثین گڑھنا شروع کردیں تو حاملین احسان میں جن حضرات نے ع: ہر کسے را بہر کارے ساختند'' کے مطابق اعتقادات کے تزلزل سے مسلمانوں کو بچانے کی کوشش کی، وہ متکلم کہے جانے لگے اور علم کلام کی اصطلاح قائم ہوئی۔ جنہوں نے حدیثوں کی حفاظت کا ذمہ لیا، وہ محدث کہلائے اور علم حدیث کی تدوین ہوئی۔ جن حضرات نے حلال وحرام میں تمیز کا بیڑا اُٹھایا، وہ فقیہ ومجتہد کے لقب سے ملقب ہوئے اور علم فقہ کی ایجاد ہوئی۔ اسی طرح جن حضرات نے نیتوں کی تصحیح کا فریضہ انجام دیا اور دلوں کا رخ دنیا کی طرف سے موڑ کر دنیا پیدا کرنے والے کی طرف کیا، وہ صوفی سے مشہور ہوئے اور تصوف کی اصطلاح قائم ہوئی؛؛ اسی لیے امام مالک جیسے محدث ومجتہد نے فرمایا:

''**من تفقہ ولم یتصوف فقد تفسق، ومن تصوف ولم یتفقہ فقد تزندق، ومن جمع بینھما فقد تحقق۔** جو فقہ سیکھے اور تصوف سے اعراض کرے، فاسق ہوجائے گا۔

جوتصوف پر گامزن ہونا چاہےاور فقہ سے اعراض کرے زندیق ہوجائے گا۔ جو دونوں کو اپنائے وہی ثابت قدم رہے گا۔'' (مرقات، ج:۱:۲۵۶)

واضح رہے کہ میری یہ گفتگو اس حقیقی تصوف سے متعلق ہے جس کا تذکرہ میں نے سطور بالا میں کیا ہے ،جس کا مصدر و ماخذ سراسر قرآن وحدیث ہے ،اور جو اسلام کا عین مطلوب ومقصود ہے۔ وہ تصوف نہیں جو بعض جاہل متصوفین نے شریعت کے خلاف گڑھ لیے ہیں اور اباحیت اختیار کر لی ہے۔ یا۔ أرأیت من اتخذالهه هواه۔ (فرقان: ۴۳) (کیاتم نے اسے دیکھا جس نے اپنے جی کی خواہش کو اپنا خدا بنالیا۔) کے مصداق حلول واتحاد کو اپنا مسلک ٹھہرالیا ہے۔

ان جاہل متصوفوں کے افعال واقوال کی بنیاد پر حقیقی تصوف کا انکار کرنا اور اس کے حامل صوفیۂ کرام کو موردلعن وطعن قرار دینا صریح خیانت وبددیانتی اور ظلم ہے۔ اگر کوئی آج کے کچھ غلط کار مسلمانوں کے افعال واقوال کی بنیاد پر اسلام ہی کا انکار کردے اور قرآن وحدیث کے مطابق زندگی گذارنے والے مسلمانوں کو موردلعن وطعن گردانے تو اسے خیانت وبددیانتی اور ظلم وجفا کے علاوہ کچھ کہا جائے گا؟

''وحدۃ الوجود'' کے مسئلہ کو پیش کر کے تصوف کو غیر اسلامی فکر اور حضرت محی الدین ابن عربی کو مشرک قرار دینے والے دانستہ فریب دے رہے ہیں۔ یا۔ بے چارے ان الفاظ کے معنی مراد سے ناواقف ہیں۔ ان حضرات کو پتہ نہیں کہ یہ الفاظ اس خدارسیدہ شخص کے ہیں جس نے پوری زندگی خالق کی عبادت میں گذاری ہے اور اپنی بیشتر کتابوں میں لکھا ہے کہ: مخلوق، مخلوق ہے اور خالق، خالق۔ نہ مخلوق کبھی خالق ہوسکتا ہے ,نہ خالق کبھی مخلوق.'' یہ الفاظ کسی ایسے شخص کے نہیں ہیں جو فن کی کتابوں کا اردو۔ یا۔ انگریزی میں ترجمہ پڑھ کر سمجھا ہو اور ترجمہ بھی ایسا جسے مترجم نے'' لغت'' سامنے رکھ کر کیا ہو۔ اور اگر ترجمہ پڑھ کر نہیں تو خود ہی ''لغت'' سامنے رکھ کر سمجھنے کی خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا ہے۔

ہر زبان کے کچھ محاورے اور ہر فن کی کچھ اصطلاحیں ہوتی ہیں، جن کو اس زبان کی واقفیت رکھنے والے اور فن کے جانکار حضرات ہی سمجھ سکتے ہیں، لغت دیکھ کر سمجھے نہیں جا سکتے۔ کوئی عرب کانت حرۃُ تحت عاتقٍ بولے اور یہ حضرات ''لغت'' دیکھ کر اس کا مطلب ''کوئی آزاد عورت کسی آزاد کردہ غلام کے نیچے تھی''۔ یا۔ کوئی انگریز .Zaid is under ground بولے اور یہ حضرات ''لغت'' دیکھ کر اس کا مطلب ''زید زمین کے نیچے ہے'' بتائے، تو میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ عرب اور انگریز سر پیٹے گا یا متنبی کا یہ شعر گنگنا کر خاموش ہو جائے گا!

وکم من عائب قولا صحیحا
وآفته من الفهم السقیم

کتنے ہی لوگ ہیں جو صحیح بات میں بھی عیب نکالتے ہیں، حالانکہ ساری آفت بُری سمجھ کی پیداوار ہوتی ہے۔

کئی سال ہوئے کسی کتاب یا ڈائجسٹ میں یہ لطیفہ پڑھا تھا کہ: ایک سیٹھ جسے انگریزی کی صحیح جانکاری نہیں تھی، لندن پہونچا۔ بھوک لگی تو ساتھ میں ''ڈکشنری'' لے کر ہوٹل گیا۔ سامنے ایک صاحب بیٹھے زبان کا گوشت کھا رہے تھے۔ ان کے بھی جی میں آیا کہ وہی کھائیں۔ جھٹ سے ''ڈکشنری'' کھولی اور ''زبان'' کا ترجمہ دیکھا Language۔ حالانکہ یہ اُس ''زبان'' کا ترجمہ ہے جو لکھی، پڑھی اور بولی جاتی ہے، جسے ہندی میں بھاشا کہتے ہیں۔ اُس ''زبان'' کا ترجمہ نہیں جس کا گوشت کھایا جاتا ہے۔ اُس کو تو انگریزی میں T o n g u e کہتے ہیں۔ بہر کیف! بیرے کو بلایا اور کہا: A plate of language۔ بے چارہ بیرا حیران وپریشان کہ Language کی ڈِش تو دنیا میں کہیں تیار نہیں ہوتی ہے، پھر یہ کیا مانگ رہا ہے؟ جو صاحب سامنے بیٹھے تھے، اتفاق سے سیٹھ کے ہم وطن تھے، وہ سمجھ گئے کہ اسے ڈھنگ کی انگریزی آتی نہیں، مجھے زبان کا گوشت کھاتے دیکھ کر مُنھ میں پانی بھر آیا ہے اور وہی طلب کر رہا ہے۔ اس نے بیرے کو بلا کر سمجھا دیا، اور بیرا لے آیا۔ اب تو سیٹھ کی خوش فہمی کا ٹھکانا نہ رہا کہ میں بھی انگریزی سمجھنے اور بولنے میں کسی انگریز سے کم نہیں ہوں۔ پیسے ادا کر کے باہر نکلا تو پھل کی دکان سامنے تھی۔ اس میں پکے ہوئے خوب صورت آلو بخارے لٹک رہے تھے۔ شوق چرایا اور دکان میں داخل ہو کر ''لغت'' کھولی تو ''آلو'' کے معنی Potato اور ''بخار'' کے معنیٰ Fever دیکھے۔ دکان دار سے پوچھا: ?What is the cost of this potato fever دکان دار نے کہا: جا! پہلے کچھ دنوں انگریزی سیکھ، پھر یہاں قدم رکھنا ـــــــ جو لوگ ''تصوف'' کو لغت دیکھ کر سمجھنے کی خوش فہمی میں مبتلا ہیں، آج ایسے ہی لوگوں سے تصوف کو واسطہ پڑ گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے ''خوش فہموں'' سے تصوف کی حفاظت فرمائے۔ آمین!

وحدت کے معنی ہیں ''ایک۔ اکیلا'' اور وجود کے معنی ہیں ''خود بخود موجود ہونا۔ کسی کے وجود بخشنے سے موجود نہ ہونا''۔ تو وحدۃ الوجود کے معنی ہوئے ''وہ ذات جو خود بخود ہے اکیلا موجود ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی خود بخود موجود نہیں'' یہ بلا شبہ حق اور کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ کا مفاد ہے۔ یہ معنی نہیں ہیں کہ جو ذات خود بخود ہے وہ، اور جو ذات کسی کے وجود بخشنے سے موجود ہوئی ہے''، دونوں ایک ہی ہے۔ اسے ارباب تصوف بھی اسلام کے منافی اور شرک قرار دیتے ہیں۔

رہا یہ کہ تصوف کی بعض باتیں دوسرے مذاہب کی بعض باتوں سے میل کھاتی ہیں، اس لیے یہ عجم سے برآمد کردہ ہیں۔ تو کیا اسلامی وحدانیت کا عقیدہ، یہودیت کے عقیدہ توحید سے میل

نہیں کھاتا؟ اگر میل نہیں کھاتا ہے تو: قل یااھل الکتٰب تعالوا الیٰ کلمة سواء بینناو بینکم اَلَّا نعبدالا اللّٰہ کا کیا مطلب ہے؟ کیا محض میل کھانے کی وجہ سے عقیدۂ توحید کو بھی عجم ہی سے برآمد کردہ کہا جائے گا؟ کیا کسی اچھی اور واقعی بات میں توارد و توافق نہیں ہوسکتا؟ کیا قرآن کریم میں بعض الفاظ ایسے نہیں ہیں جو نزول قرآن سے پہلے بھی عجمی زبانوں میں بولے جاتے تھے؟ تو کیا اس توافق کی بنا پر قرآن کو خدائی کتاب کی بجائے عجم سے برآمد کردہ مان لیا جائے؟ جبکہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ قرأنا عربیا (یوسف: ۲) ہے۔

خلاصہ یہ کہ تصوف کی ابتدا آدمیت کی ابتدا ہی سے ہے، حضرت آدم سے محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہم وسلم تک تمام انبیا اس کے حامل رہے ہیں۔ زبان جبرئیل نے اسی کو احسان کا نام دیا ہے۔ لسان رسالت نے بھی اسے ہی احسان سے تعبیر فرمایا ہے۔ صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور أئمہ ہُدیٰ نے اسی سے روگردانی کو فسق قرار دیا ہے۔

OOO

تصوف کے اصل منبع و مخرج قرآن و سنت ہیں

”مشائخ نے مخصوص علاقوں کے رہنے والوں کے طبعی خصائص کا لحاظ رکھتے ہوئے جوگیوں تک کے بعض اشغال قبول کیے ہیں، مگر وہ مقصود بالذات نہیں ہیں ان کا مقصد صرف خطرات کو دور کرنا ہے۔“

شمیم طارق

تصوف کے منبع و مخرج کے بارے میں کوئی بات اسی وقت کہی جاسکتی ہے جب ذہن میں یہ حقیقت واضح ہو کہ تصوف کیا ہے؟ لیکن چونکہ بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ مختلف زبانوں، زمینوں اور مذہبوں میں ایسی کیفیتوں کا اظہار ہوتا رہا ہے جن پر تصوف کا گمان ہوتا ہے اور پھر مستشرقین نے مغالطہ دینے کی بھی کوشش کی ہے اس لیے سب سے پہلے تصوف کی ابتداء اور ارتقاء پر ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں راقم نے اپنی کتاب ”تصوف اور بھکتی۔ تقابلی اور تنقیدی مطالعہ“ میں تین اہم نکات کی نشاندہی کی ہے:

”☆ ورائے شعور Supra Concious انسانی جبلت میں شامل ہے اور چونکہ مذاہب انسانی جبلت سے بے نیاز نہیں ہوسکتے اس لیے ”ورائے شعور“ جس کو دوسرے لفظوں میں عرفان الٰہی، روحانیت یا انسانی فطرت کی باطنی اصلاح و تربیت کا رجحان و نظام بھی کہہ سکتے ہیں، ہر زمانے میں مذاہب کی اساس اور مذہب پسندوں کے ایک خاص طبقے کی طبیعت کا میلان تو رہا ہی ہے ایسے لوگوں کے قلوب کی خوابیدہ قوت بھی رہا ہے جو بظاہر مذہب و روحانیت میں یقین نہیں رکھتے۔ اس لیے مذاہب کے ماننے والوں کی طرح مذاہب کے نہ ماننے والے بھی ایسے خیالات کا اظہار کرتے رہے ہیں جن کا تعلق ماورائیت سے ہے۔

سرّیت (Mysticism)“ ”بھکتی“، ”نروان“، ”تیان“، ”ال تنگری“ جیسے الفاظ الگ الگ قومی اور مذہبی پس منظر میں خالق کل یعنی وراء الوریٰ ہستی اور اس کے مختلف مظاہر سے ہم رشتگی کے احساس، ذات و کائنات کے عرفان اور جسمانی و مادی وجود کے ماورائی تسلسل کے ادراک کی ترجمانی کرتے ہیں۔ Mysticism کے تصور میں تنوع بھی ہے، تضاد بھی، کہ تاریخی اور اقتصادی پس منظر میں اس لفظ سے یونان، شام، عراق، الجزیرہ اور ایران

کے ان گوشہ نشینوں کی بھی ترجمانی ہوتی ہے جنہوں نے اپنی قلبی واردات یا نفسیاتی کیفیات
کو مکمل روحانی نظام کا درجہ دے دیا تھا اور مذہب کے مخالفین کی بھی جو وحی والہام کے تو منکر
تھے مگر ماورائیت سے ہم رشتگی کے احساس سے عاری نہیں تھے۔ بھکتی، ''تیان''، ''ال
تنگری'' ہندوستانیوں، چینیوں اور منگولوں و ترکوں کے قدیم طرزِ زندگی میں روحانی و ماورائی
احساس و نظام کا مستقل حوالہ ہیں۔ بظاہر تصوف بھی اسی سلسلۂ فکر کی ایک کڑی معلوم ہوتا
ہے۔ قرآن وسنت میں یہ لفظ موجود نہیں ہے اور مسلمانوں میں تصوف سے متعلق رجحانات
اور فکر و فلسفہ کی نشوونما مذہبی فکر کے ارتقاء اور داخلی روحانی تجربے اور قیاس آرائی کی صورت
میں ہوئی ہے۔ دوسرے مذاہب کی کئی باتیں بھی اس میں شامل ہوتی رہی ہیں۔ سعید نفیسی
کے مطابق ایرانی صوفیہ نماز روزہ کے قائل نہیں ہیں۔ صوفیہ میں ایسے لوگ بھی ہر زمانے اور
ہر ملک میں پیدا ہوتے رہے ہیں جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود قرآن وسنت
کی تعلیمات پر اپنی قلبی واردات کو فوقیت دیتے یا قرآنی آیات کی من مانی تشریح کر کے
اس کو باطنی تشریح و تفسیر ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن بعض استثنائی صورتوں اور
زمانی و مکانی تغیرات کے باوجود مسلمان تو مسلمان، غیر مسلم اور مستشرقین بھی تصوف سے جو
حقیقت مراد لیتے ہیں وہ وہی ہے جس کو قرآن حکیم میں ''تزکیہ'' حدیث رسول میں ''احسان
'' اور شریعت وسنت نبوی ﷺ پر جان دینے والے علماء کی تحریروں میں ''سلوک
راہِ نبوت'' کہا گیا ہے۔ کسی دوسرے مذہب سے تعلق رکھنے والے کسی شخص کے نام کے
ساتھ لفظ ''صوفی'' استعمال کیا بھی گیا ہے تو اس کے کسی مسلم صوفی کا شاگرد یا صحبت یافتہ
ہونے کے سبب، اور اگر کسی شخص نے صوفی کہلانے کے باوجود اسلام سے دوری اختیار کی
ہے یا اس سے برأت کا اظہار کیا ہے تو وہ عوام وخواص میں بے اعتبار ہو گیا ہے۔ اس لیے یہ
تسلیم کرنے کے باجود کہ لفظ تصوف قرآن وحدیث میں موجود نہیں ہے اور اس کے
سہارے بہت سی ایسی باتیں مسلمانوں میں راہ پا گئی ہیں، جو عقیدہ کے خلاف ہیں یہ
حقیقت تسلیم کرنا ضروری ہے کہ جس تصوف کو مسلمانوں میں اعتبار حاصل ہے اس کا مفہوم و
مقصود نبی رحمت ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اللہ کی بے ریا عبادت اور
مذہب، برادری، قومیت، علاقائیت اور مالی وسماجی حیثیت کی تفریق کو خاطر میں نہ لاتے
ہوئے اللہ کے بندوں کی بے غرض خدمت کرنا ہے۔ علماء اور صوفیہ میں عقیدہ وعمل کا نہیں
طرزِ زندگی کا فرق ہے۔ علماء کو معاشرے میں اگر ''محتسب'' کی حیثیت حاصل ہے تو
''صوفیہ'' کو معالج کی۔ علماء کا کام فساد کی مختلف صورتوں اور فساد پیدا کرنے والے لوگوں کی

نشاندہی اور گرفت کرنا ہے جبکہ صوفیہ کا کام ان کیفیتوں اور وسوسوں کو دور کرنا ہے جو قلب و
نظر اور ذہن واحساس میں فساد پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں۔

صوفیہ کے بارے میں جو غلط فہمیاں پھیلی ہیں وہ ان کی سادہ زندگی اور ان کے کچھ خاص
اوراد واشغال کی پابندی کرنے کے سبب نہیں پھیلی ہیں بلکہ کسی خاص کیفیت میں کیے
گئے ان کے کسی کام کی اندھی تقلید یا کہے گئے کسی جملے کی ان تشریحات کے سبب پھیلی
ہیں جو دوسروں نے کی ہیں اور ان تشریحات کو مابعد الطبیعاتی فلسفہ کا درجہ دے دیا گیا
ہے حالانکہ مسلمانوں کے لیے تصوف، کوئی مابعد الطبیعاتی فلسفہ نہیں، روحِ عبادت اور
مشائخ کا خاص اخلاق ہے اور یہ خاص اخلاق یا مشائخ کی طرزِ زندگی بھی اتباعِ سنت و
شریعت کے ساتھ مشروط ہے۔ کشف والہام بھی اسی صورت میں قابلِ قبول ہیں جب وہ
قرآن وسنت سے مطابقت رکھتے ہوں۔

☆ قرآن حکیم اور احادیث نبویؐ میں بار بار اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ حضور
خاتم النبیین ﷺ کوئی نیا دین لے کر دنیا میں تشریف نہیں لائے بلکہ آپ نے اسی
سلسلۂ نبوت کی تکمیل فرمائی جس کی پہلی کڑی نبی برحق اور ابوالبشر حضرت آدم تھے۔ اس
لیے آپ ﷺ کی شریعت میں پچھلی شریعتوں کی بعض ایسی سچائیوں کا پایا جانا جو
تحریف سے بچ گئی تھیں خلاف عقل ہے نہ خلاف عقیدہ۔ شرف الدین یحییٰ منیری قدس
سرہ نے اپنے ایک مکتوب میں ایسی ہی ایک حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے جو ابوالبشر
سے افضل البشر خاتم الانبیاء ﷺ کی ذات گرامی تک بغیر انقطاع موجود رہی ہے۔

''اگر تصوف کی ابتداء پر غور کرو گے تو اس کو حضرت آدم کے وقت سے ہی پاؤ گے، اس
عالم میں پہلے صوفی حضرت آدم ہیں۔ ان کو حق تعالیٰ نے خاک سے پیدا کیا، پھر اجتباء
اور اصطفاء کے مقام پر پہنچایا۔ خلافت عطا فرمائی، پھر صوفی بنایا ...... مرید کو آغاز
ارادت میں چلہ کرنا پڑتا ہے۔ اوّل اوّل طائف و مکہ کے درمیان میں چلّہ کیا......
میں نے اپنے ہاتھ سے آدم کی مٹی کو چالیس دنوں میں خمیر کیا۔ جب تجرید کا چلہ ختم ہو چکا
تو حق سبحانہٗ تعالیٰ نے اس میں روح عنایت فرمائی اور عقل و دانش کا چراغ اس کے دل
میں روشن کر دیا۔ پھر کیا، دل سے زبان تک وہ باتیں آنے لگیں کہ منہ سے انوار واسرار
کے پھول جھڑنے لگے۔ جب آپ نے اپنا یہ رنگ دیکھا تو مستی میں جھوم گئے۔......
اس خاکدان دنیا میں تشریف لائے مگر تین سو برس تک روتے رہے۔ پھر دریائے رحمت
خداوندی جوش میں آیا اور درجۂ اصطفیٰ عطا ہو گیا۔ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰیٓ اٰدَمَ۔ اب کیا تھا،

تصفیہ کامل ہوگیا۔صوفی صافی بن گئے۔ وہ مرقع جو دریوزہ گری کے بعد پہنایا گیا تھا، آپ اس کونہایت عزیز رکھتے تھے۔آخرعمر میں وہ مرقع حضرت شیث علیہ السلام کوآپ نے پہنا دیا اور خلافت بھی سپرد کی چنانچہ نسلاً بعد نسلٍ اسی طریقہ پر عمل ہوتا رہا اور تصوف کی دولت ایک نبی سے دوسرے نبی کو یکے بعد دیگرے منتقل ہوتی رہی ... پھر جب دور مبارک حضرت سیدنا ونبینا سلطان الاولیاء وانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آپہنچا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی طرح مکمل اختیار کیا ...

اصحاب میں وہ گروہ جو سالکان راہ طریقت بہ عنوان خاص تھے، ان سے وہیں راز کی باتیں ہوا کرتیں۔ ان میں بعض پیر تھے اور بعض جوان جیسے حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت سلمان، حضرت معاذ و بلال و ابوذر و عمار رضی اللہ عنہم ......حضرت مہتر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی معمول تھا کہ جب کسی صحابی کی عزت و تکریم فرماتے تو ان کو ردائے مبارک یا اپنا پیراہن شریف عنایت فرماتے۔ پھر صحابہ میں وہ شخص صوفی سمجھا جاتا تھا۔ اب تم جان سکتے ہو کہ تصوف اور طریقت کی اوّل ابتداء حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی اور اس کا تتمہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا'' [۱]

اس عرفانی نقطۂ نظر کی روشنی میں چاہے لغوی طور پر لفظ ''صفا'' کو صوفی کا مادۂ اشتقاق نہ تسلیم کریں کیونکہ صفا سے جو لفظ بنے گا وہ عربی قاعدہ کے مطابق صفوی ہوگا نہ کہ صوفی، تاہم صوفیہ کی ظاہری باطنی کیفیات اور ان کے میلان طبیعت میں رچی بسی روحانیت کو جس لفظ کے سہارے سب سے بہتر طور پر پیش کیا جا سکتا ہے وہ لفظ 'صفا' ہی ہے اور چونکہ اس صفا کا جس شخص میں سب سے پہلے ظہور ہوا وہ انسان ہونے کی حیثیت سے ''ورائے شعور'' کے بھی مالک تھے اور نبی برحق ہونے کی حیثیت سے ''صاحبِ شریعت'' بھی۔ اس لیے بعد کے ادوار میں اگرچہ تصوف کو مذہب وشریعت سے الگ ایک مستقل روحانی نظام کے طور پر پیش کرنے کی بھی کوششیں کی جاتی رہی ہیں مگر تمام تر کوششوں کے باوجود اس حقیقت کو نہیں جھٹلایا جاسکا ہے کہ تصوف اپنی ابتداء اور نبی برحق سے نسبت کے سبب ''صفائی باطن مع شرع'' کا نام ہے اور ترکوں اور منگولوں کا نظریۂ ''ال تنگری'' چینیوں کا تصور ''تیان'' اور صوفیۂ اسلام کا نظریۂ ''حق'' اگر اساسی طور پر ایک نظر آتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ترکوں، منگولوں اور چینیوں میں یہ نظریے کسی ایسے نبی کے ذریعہ پہنچے ہوں گے جو حضرت آدم اور حضرت محمد مصطفیٰ کو جوڑنے والے سلسلۂ نبوت کے درمیان کی کوئی کڑی رہے ہوں گے۔

☆ قرآن حکیم نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منصب نبوت ورسالت اور دنیا میں

تشریف لانے کے جو تین مقاصد بیان کیے ہیں وہ تلاوت آیات، تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ اخلاق ہیں جنہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہ تمام و کمال پورا کیا ہے لیکن چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آنے والی نسلوں کو بھی ان کی ضرورت ہے، کتاب اللہ ابد تک کے لیے ہے اور **و کوٗنوا مع الصادقین** کی تلقین وہدایت بھی ہر زمانے کے لیے ہے اس لیے قرآن وحکمت کی تعلیمات وہدایات کو سمجھنے اور ان پر خلوص سے عمل کرنے کے لیے، اللہ والوں کی معیت وتربیت ضروری ہے۔ مولانا مفتی محمد شفیع کے لفظوں میں:

''تیسرا فرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرائض منصبی میں تزکیہ ہے جس کے معنی ہیں 'ظاہری و باطنی نجاسات سے پاک کرنا' ظاہری نجاسات سے تو عام مسلمان واقف ہیں، باطنی نجاسات کفر اور شرک، غیر اللہ پر اعتماد کلی اور اعتقاد فاسد نیز تکبر وحسد، بغض، حب دنیا وغیرہ ہیں۔ اگرچہ علمی طور پر قرآن وسنت کی تعلیم میں ان سب چیزوں کا بیان آگیا ہے لیکن تزکیہ کو آپ کا جداگانہ فرض قرار دے کر اس کی طرف اشارہ کردیا گیا کہ جس طرح محض الفاظ کے سمجھنے سے کوئی فن حاصل نہیں ہوتا، اسی طرح نظری وعلمی طور پر فن حاصل ہوجانے سے اس کا استعمال اور کمال حاصل نہیں ہوتا۔ جب تک کسی مربی کے زیر نظر اس کی مشق کرکے عادت نہ ڈالے۔ سلوک وتصوف میں کسی شیخ کامل کی تربیت کا یہی مقام ہے کہ قرآن و سنت میں جن احکام کو علمی طور پر بتلایا گیا ہے ان کی عملی طور پر عادت ڈالی جائے۔'' [۲]

اسلامی تاریخ کی روشنی میں مندرجہ بالا تینوں نکات کی عملی صورتوں کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ قرآن پاک نے پیغمبر اعظم وآخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جو اوصاف بیان کیے ہیں ان میں تزکیہ بھی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ساری زندگی فقر کا اعلیٰ ترین نمونہ تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انفاق والعفو کے حکم پر پوری طرح عمل کیا اور کبھی صاحبِ نصاب ہوئے نہ میراث چھوڑی۔ محبوبِ خدا تھے اس کے باوجود شکر گزاری کے جذبہ سے قائم اللیل اور صائم النہار ہوکر مشقتیں اٹھاتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رہن سہن، کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے میں بھی ہمیشہ سادگی غالب رہی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع میں حضرات صحابہ کرام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خصوصاً خلفائے راشدین اور اصحاب صفہ رضی اللہ عنہم بھی دنیا میں رہتے ہوئے دنیا سے بے رغبتی کی زندگی گزارتے رہے لیکن دوسری صدی ہجری میں جب سلاطین میں اکثر نے کتاب وحکمت وتزکیہ کی تعلیم سے منہ موڑ لیا اور مسلم معاشرہ میں دین ودنیا کی تفریق بڑھی تو ان نفوس مطہرہ کی حیثیت نمایاں ہونے لگی جو گوشۂ عافیت کے متلاشی، معرفت حق کے جویا اور دنیاوی اقتدار سے گریزاں تھے مگر ان کے مخالف نہیں تھے جو انصاف واخلاق کے ساتھ سلطنت یا دنیا کے کاموں کو انجام دے رہے تھے۔ قرآن حکیم میں جہاں جہاں **صادقین، صادقات، مخلصین،**

محسنین، خائفین، عابدین، صابرین، اولیاء، ابرار، مقربین جیسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان سے ''صاحب کتاب اللمع'' نے وہی لوگ مراد لیے ہیں جو مزاج وطبیعت، ذوق وشوق اور عبادت ودعوت میں انہماک واستغراق کے لیے مشہور ہوگئے تھے اور جنہیں بعد میں اہل تصوف کہا گیا ہے۔[۳] اس لیے تزکیہ وتصوف کی حقیقت یا تحریک کو اموی حکمرانوں کی بیخ کنی کی تحریک یا ردعمل کے طور پر پیش کرنے والے اہل قلم سے اتفاق کرنا ممکن نہیں ہے۔ان لوگوں سے بنیادی غلطی یہ ہوئی ہے کہ انہوں نے اپنے مطالعے کا آغاز اسلامی تاریخ کے اس نازک موڑ سے کیا ہے جب مسلمانان عالم کے مرکز عقیدت، مدینۃ الرسول اور اموی حکمرانوں کے مرکز حکومت دمشق سے بہت دور کوفہ اور بصرہ میں کچھ لوگوں کو ''صوفی'' کہا جانے لگا تھا اور صوفی کے لقب سے مشہور ہونے والوں میں حسن بصری جیسے عالم وعابد بھی تھے اور ربیع بن خیثام، ابواسرائیل اور جابر بن حیان جیسے لوگ بھی جو مرکز اقتدار ہی کے نہیں، اگر مگر کے ذریعہ کتاب وسنت میں بیان کیے ہوئے اس صاف وصریح عقیدے کے بھی مخالف تھے جس پر اصحاب رسول تابعین اور تبع تابعین کی پاکیزہ جماعت عامل بھی تھی اور شاہد بھی۔اس غلطی کا ازالہ ہوسکتا تھا اگر وہ یہ دیکھتے کہ تزکیہ وتصوف کے نام سے اس دور میں جس حقیقت کو منضبط یا منظم کرنے کی کوشش کی گئی اس کی تمام تر بنیاد قرآن وسنت اور آثار صحابہ پر تھی اور اس کی ابتدائی کڑی خلفاء رسول ﷺ تھے۔اس لیے سلاسل کی تنظیم کے پہلے ہی مرحلے میں وہ لوگ سلسلہ سے باہر کردیے گئے تھے جو کتاب وسنت کے عقیدہ سے منحرف تھے یا اپنے اعتقادات کی پردہ داری کرتے تھے۔مثال کے طور پر پہلی صدی ہجری کے ربیع بن خیثام (۶۷ ہجری/ ۶۸۶ ء) دوسری صدی ہجری کے ابواسرائیل (۱۴۰ ہجری/ ۷۵۷ء) اور جابر بن حیان (۱۶۰ ہجری کے آس پاس) جیسے لوگوں کو اصحاب سلسلہ کا اعتبار حاصل نہیں ہے۔اس کا مطلب ہے کہ صوفیہ کی شہرت ومقبولیت سے فائدہ اٹھانے کے لیے باطنیوں، نوفلاطونی فلسفیوں اور اسلام وعرب دشمن تحریکوں کے داعیوں نے صوفیوں کی وضع قطع اور نام اختیار کرکے ان کی صفوں یا سلسلوں میں دراندازی کرنے کی جو کوششیں کی تھیں انہیں اسی مرحلے یعنی دوسری صدی ہجری میں مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔سفیان ثوری (۱۶۱ ہجری/ ۷۷۷ء) نے چار کتابیں تصنیف کی تھیں جن میں سے ایک کتاب ''کتاب التفسیر'' کا ایک نادر نسخہ آج بھی رام پور کی رضا لائبریری میں محفوظ ہے۔شیخ عبداللہ بن مبارک (۱۸۱ ہجری/ ۷۹۷ء) کی 'کتاب الزہد' کو بھی بڑی شہرت حاصل ہے یعنی عقیدہ اور تنظیم دونوں سطح پر صوفیۂ کرام ابتداء ہی سے ان لوگوں کے نفوذ واثرات کو زائل کرنے کا کام کرتے رہے ہیں جو کتاب وسنت اور آثار صحابہ کے معیار پر پورے نہیں اترتے تھے۔''

مندرجہ بالا سطور سے جہاں یہ واضح ہوتا ہے کہ تصوف کیا ہے یا مسلمانوں میں کس

تصوف کو اعتبار حاصل ہے وہیں یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ تصوف کے اصل مآخذ قرآن وسنت ہیں۔تصوف کی ان کتابوں میں بھی جو صوفیہ کے حلقوں میں مقبول ہیں اور سند کا درجہ رکھتی ہیں مثلاً قوت القلوب، رسالہ قشیریہ، کشف المحجوب، عوارف المعارف، تذکرۃ الاولیاء، فوائد الفواد، خیر المجالس، مکتوبات صدی، دوصدی، سبع سنابل اور مطالب رشیدی وغیرہ میں کتاب وسنت کی اتباع پر اصرار کیا گیا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ بدلتے وقت کے ساتھ تصوف میں زمین، زبان اور الگ الگ مذاہب کے اثرات شامل ہوتے رہے ہیں مگر اکابر صوفیہ ان کو رد کرتے رہے ہیں۔مشائخ نے مخصوص علاقوں کے رہنے والوں کے طبعی خصائص کا لحاظ رکھتے ہوئے جوگیوں تک کے بعض اشغال قبول کیے ہیں مگر وہ مقصود بالذات نہیں ہیں ان کا مقصد صرف خطرات کو دور کرنا ہے۔دفع خطرات کے لیے ان کی حیثیت محض تدبیر کی ہے، مطلوب ومقصود کی نہیں۔

صوفیہ جیسی وضع قطع اختیار کرکے بھی کچھ لوگوں نے ہر دور میں تصوف کی روح کو مسخ کرنے اور صوفیہ کے حلقوں میں بگاڑ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے مگر وہ بھی ملعون قرار دیے جاتے رہے ہیں۔شاہ کلیم اللہ دہلوی نے ایک خط میں لکھا ہے:

''اے برادر، اگر تم آج فقراء کے مراتب کا پتہ لگانا چاہو تو ان کے اتباع شریعت پر نظر کرو کہ شریعت معیار ہے۔اسی کسوٹی پر فقیر کی حقیقت روشن ہوجاتی ہے۔''[۴]

مختصر یہ کہ تصوف میں وقت کے ساتھ اگرچہ کئی نئی باتیں شامل ہوئی ہیں مثلاً سید محمد غوث شطاری نے ''بحر الحیات'' اور داراشکوہ نے ''مجمع البحرین'' میں اسلامی تصوف اور ہندو فکر وفلسفہ کو ملانے کی کوشش کی ہے، ''حبس دم'' جیسے اشغال جوگیوں سے لیے گئے ہیں مگر ایسی تمام کوششیں یا تو رد کردی گئی ہیں یا انھیں دفع خطرات کے لیے اپنے نظام تربیت میں ضم کرلیا گیا ہے اور قرآن وسنت ہی کی قولاً فعلاً حالاً اتباع کو صوفیہ کا مقصد زندگی قرار دیا گیا ہے اس لیے یہ کہنا درست ہے کہ تصوف کا اصل منبع ومخرج قرآن وسنت ہے۔

حوالے

۱۔شیخ شرف الحق والدین احمد یحییٰ منیری، مکتوبات، بہار شریف، ص ۲۴۴ (مترجم شاہ نجم الدین احمد فردوسی)

۲۔مولانا مفتی محمد شفیع، معارف القرآن، ج اوّل، نئی دہلی ۱۹۹۳ء ص ۷۔۳۳۶

۳۔بحوالہ پروفیسر خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، ج اوّل دہلی ۱۹۸۰ء، ص ۵۴

۴۔حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی، مکتوبات کلیمی، دہلی ۱۳۰۱ ھج، مکتوب ۹۵

شناسائی

شاہ شرف الدین نیر قادری سے گفتگو

حضرت شاہ شرف الدین نیر قادری مدظلہ العالی ہندوستان کی قدیم قادری آستانہ، خانقاہ محمدیہ اجھر شریف کے ۱۴رویں صاحب سجادہ ہیں۔مشہور عالم دین مولانا اصغر امام مصباحی آپ کے سگے چچا ہیں۔آپ کی ابتدائی تعلیم خانقاہ محمدیہ ہی میں ہوئی۔متوسطات کی تعلیم اورنگ آباد بہار کے مدرسہ سراج العلوم سے حاصل کی اور پھر اعلیٰ تعلیم کے حصول کی غرض سے لکھنؤ کا رخ کیا،مگر ایک حادثے کے شکار ہوئے اور ناچار آبائی وطن واپس ہونا پڑا۔طویل علالت کے بعد ایک بار پھر حصول تعلیم کا ارادہ کیا اور مدرسہ عزیزیہ ضلع بہار شریف میں داخل ہوئے اور بعد میں مولانا مظہر الحق عربی فارسی یونی ورسٹی سے ایم۔اے کیا۔ ۱۰رمحرم الحرام ۱۴۲۱ھ/ ۱۵راپریل ۲۰۰۰ءکو آپ کے والد اور خانقاہ قادریہ اجھر شریف کے ۱۳رویں صاحب سجادہ حضرت شاہ جلال الدین ابدال قادری علیہ الرحمہ کا وصال ہوا اور اسی سال ۳۰رصفر ۱۴۲۱ھ/ ۴رجون ۲۰۰۰ءکو عرس کے موقع پر سلسلے کے ارباب حل وعقد نے خانقاہ محمدیہ کی سجادگی کے لیے آپ کو منتخب کیا۔آپ اپنے طور پر اس قدیم خانقاہ کی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں۔موصوف نہایت خلیق اور متواضع شخصیت کے مالک ہیں۔خردنوازی اور غربا پروری کا جذبہ رکھتے ہیں۔مہمان نوازی کو اپنا دینی فریضہ خیال کرتے ہیں۔ ۱۸رستمبر ۲۰۱۲ء/ یکم ذی قعدہ ۱۴۳۳ھ کو راقم اپنے رفیق سفر مولانا مجیب الرحمن علیمی کے ہم راہ خانقاہ محمدیہ اجھر شریف میں حاضر ہوا اور حضرت صاحب سجادہ سے ملاقات کی ،الاحسان کے لیے موصوف کا انٹرویو کیا جو قارئین الاحسان کے حوالے ہے۔ حسن سعید صفوی

سوال:۔خانقاہ اور بانی خانقاہ سیدنا کے حالات پر روشنی ڈالیں؟

جواب:۔خانقاہ قادریہ محمدیہ کے بانی امیر الہند حضور سیدنا محمد القادری رضی اللہ تعالیٰ عنہ، آپ کی ولادت باسعادت ۲۵؍رمضان المبارک ۸۱۰ھ بروز پنج شنبہ بمقام بغداد شریف (عراق) میں ہوئی، اور وصال شریف ۹۴۰ھ میں ایک سوتیس سال عمر شریف گزار کر بمقام اجھر شریف ضلع اورنگ آباد، صوبہ بہار ہندوستان میں ہوا۔

آپ کے اجداد کرام کا وطن مالوف اصل جیلان (ایران) ہے، آپ کے والد محترم ابو محمد سید شمس الدین درویش قادری بغدادی تھے، جو حضرت پیران پیر دستگیر سیدنا غوث الاعظم محی الدین عبدالقادر جیلانی کی اولاد پاک سے تھے، اور آپ بغداد شریف میں اپنے آبائی خانقاہ قادریہ کے سجادہ بھی تھے، آپ کا شمار، اپنے زمانہ کے اکابر علماء ومشائخ میں تھا، آپ کی والدہ ماجدہ کا نام بی بی فاطمہ تھا، جو سید عبدالعلی حسنی کی صاحبزادی تھیں، اور موصوف حضرت سید عبداللہ صوفی جیلانی کے اولاد میں سے تھے، انہیں برگزیدہ ہستیوں اور بابرکت خانوادے میں حضور سید الہند رضی اللہ عنہ کی ولادت باسعادت ہوئی آپ کا نام 'محمد' رکھا گیا۔

آپ کے چھوٹے بھائی بھی تھے، جن کا نام سید احمد، قدس سرہ تھا، وہ بغداد شریف میں ہی رشد وہدایت کے کام میں مشغول رہے اور وہیں آسودہ خاک ہوئے۔

۸۴۶ھ میں بغداد مقدس سے چالیس خلفاء ومریدین کے نورانی قافلہ کے ساتھ منزل بہ منزل قندھار آئے، آپ کے پہنچنے کی خبر جب والی قندھار کو ہوئی تو آپ کی زیارت کے لئے اصحاب حکومت کے ساتھ خدمت میں حاضر ہوئے حضرت سیدنا، حضرت علامہ نصر الدین تبریزی کے گھر قیام فرماتے تھے۔حضرت تبریزی دو مرتبہ حضرت کی زیارت سے مشرف ہو چکے تھے۔ایک مرتبہ مکہ معظّمہ میں اور دوسری بار روم میں ملاقات ہو چکی تھی، وہ سیدنا پاک علیہ الرحمہ کے جاہ وجلال اوران کے مرتبے سے آگاہ تھے، اس لیے انھوں نے بادشاہ قندھار کو سیدنا پاک کے تمام حالات و کرامات اوران کے مقام سے آشنا کر دیا تھا، حضرت تبریزی نے فرمایا کہ آپ جیسا عالم باعمل، صاحب کشف وکرامت، محقق اور عارف باللہ اب تک میری نظروں سے دوسرا نہیں گزرا ہے۔وہ یکتائے زمانہ ہیں۔

ایک روز قندھار میں علما وفضلا اور صوفیۂ کرام کی مجلس گرم تھی، ایک شخص نے حضرت سیدنا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سوال کیا، جس عورت کے سر کے بالوں کی چوٹی گوندھی ہوئی ہو، اسے غسل کے وقت کھولنا اور بھگونا ضروری ہے یا نہیں؟

حضرت سیدنا نے جواب اس طرح مرحمت فرمایا: **قال النبی ﷺ لام سلمة**

یکفیک اذابل اصول شعرک۔ترجمہ: نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے ام سلمہ! جب چوٹی گوندھی ہوئی ہو تو بالوں کی جڑوں کا بھیگ جانا کافی ہے، اس مجلس میں شیخ منصور بھی موجود تھے، اس حدیث شریف کے سنتے ہی ان کے دل میں خیال آیا، شاید حضور ﷺ نے ازواج مطہرات کے آرام وسہولت کے خاطر ایسا فرمایا ہوگا۔

حضرت سیدنا رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ان کے دل کے خطرات پوشیدہ نہ رہے؛ کیوں کہ اللہ تبارک تعالیٰ نے آپ کے سینے مبارک کو اس قدر مجلی ومصفی اور روشن ومنور فرمایا تھا کہ لوگوں کے دلوں کے خطرات اور دور دراز مقامات کے کوائف اور حالات آپ کے پیش نظر رہا کرتے تھے، اسی طرح منصور کی وہ بات جو اس کے دل میں گزری تھی، آپ پر ظاہر ہو گئی، حضرت سیدنا نے اس سے فرمایا: اے منصور! کفر کی حد تک پہنچا دینے والا ہے، حضرت سیدنا نے اس سے فرمایا بلاشبہ پیغمبر کی ہر بات وحی الٰہی ہوتی ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے ذریعے دین کو کامل فرماتا ہے، اگر اللہ کے رسول پر نفسانیت اور خاطر داری سے مسئلہ بیان کرنے کا گمان کیا جائے تو نور ایمان کب باقی رہے گا؟ جب شیخ نے آپ کے اس ارشاد کو سنا تو بجائے شرمندہ ہونے کے سرے سے ہی اپنے خیال باطل کے بارے میں آپ کے کشف کا انکار کر دیا۔اور حضرت سیدنا پر کذب بیانی کا الزام لگاتے ہوئے کہا کہ شاید آپ اس طریقے سے خود صاحب کشف وکرامت ہونے کا یقین دلانا چاہتے ہیں، حضرت سیدنا نے فرمایا: کیا تو مجھے جھٹلاتا ہے، تیرا دل خود ہی اس بات کی گواہی دے گا'' حضرت سیدنا رضی اللہ عنہ کی زبان مقدس سے اس جملہ کا نکلنا تھا کہ یکا یک شیخ منصور کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور بہ زبان فصیح اس کے دل نے حضرت سیدنا کے کلام کی تصدیق کر دی۔

منصور کے دل کی آواز کو حاضرین مجلس نے بھی سنا، جس کی وجہ سے اہل مجلس پر ایک کیفیت طاری ہو گئی اور شیخ منصور کے چہرہ کا رنگ فق پڑ گیا، لب پر سکوت طاری ہو گیا۔ہوش وحواس بجا نہ رہے، حاضرین علما نے کہا کہ ہم نے قرآن میں پڑھا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد: **الْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلَى أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَيْدِيهِمْ وَتَشْهَدُ أَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ** ۔ترجمہ: آج یعنی قیامت کے دن ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے کلام کریں گے اور ان کے پاؤں اس بات کی گواہی دیں گے جو وہ سب دنیا میں کمائے تھے۔

والی قندھار نے جب شیخ منصور کے اس گستاخانہ رویہ کا حال سنا تو قتل کرا دینا چاہا لیکن حضرت سیدنا نے حاکم وقت کو اس سے منع فرما دیا، شیخ منصور سے توبہ کرائی گئی جب وہ تائب ہو گئے تو آپ سے بیعت کا خواہش مند ہوئے، آپ نے بیعت لینے سے انکار کر دیا اور فرمایا، ''پہلے ممکن تھا مگر اب مناسب نہیں'' جب قندھا میں آپ کے قیام کو تین دین ہو چکے، قندھار سے روانہ ہو کر حضرت

سیدنا رضی اللہ عنہ ملتان تشریف لائے،شہر پناہ پر کئی بزرگوں نے آپ کا خیر مقدم کیا،آپ ملتان سے روانہ ہوکر یو پی کے ضلع فیض آباد،قصبہ سر ہر پور،متصل کچھوچھہ رونق افروز ہوئے جو ملک الشرق خواجہ سرور متوفی ۸۰۴ھ کا بسایا ہوا تھا،اسی وجہ سے اس کا نام سرور پور تھا جو کثرت استعمال سے سر ہر پور ہوگیا،آپ نے اسی قصبہ میں نکاح کیا،آپ کے عقد نکاح کا واقعہ روح پرور ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ سادات سر ہر پور میں ایک بزرگ حسن بن سید تاج الدین بن سید ابو صالح احمد تھے،انھوں نے خواب میں سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کی،آقائے کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا،سید محمد قادری تمہارے قصبہ میں تشریف لا رہے ہیں انہیں بہ عزت تمام اپنے مکان پر لانا اور اپنی خواہر کو ان کے نکاح میں دے دینا۔

ہندوستان میں آنے کے بعد رسم مناکحت کا ادا ہونا آپ کے والد بزرگوار کے نصیحت کی تکمیل تھی،چوں کہ رخصت کے وقت آپ کے والد بزرگوار نے نصیحت فرمائی تھی کہ جب ہندوستان پہنچ جانا تو وہاں سادات گھرانہ تلاش کر کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ادا کر لینا۔

حضرت شیر علی شیرازی فرماتے ہیں کہ حضرت سیدنا رضی اللہ تعالیٰ عنہ سر ہر پور سے روانہ ہوکر صوبہ بہار کے گھنے جنگلی علاقے جہاں وحشی درندے اور حشرات الارض بکثرت رہا کرتے تھے، پہنچے، یہ وہی جگہ ہے جس کے لیے آپ نے اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ بلاخوف وخطر گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار ہوکر پہاڑوں، وادیوں،صحراؤں اور میدانوں کی دشوار گزار گھاٹیوں کو عبور کرتے ہوئے بغداد سے بہار تک سات ماہ گیارہ دنوں میں اپنا یہ سفر مکمل کیا۔

دوران سفر تبلیغ دین متین اور اشاعت اسلام کے فریضہ کو نہایت حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیتے ہوئے منزل مقصود پر قیام پزیر ہوئے،آپ اسی جگہ مقیم ہوئے جوندی کے کنارے ایک وسیع جنگل میں واقع ہے،جہاں نہایت متعصب اور متشدد ہندو قوم آباد تھی،یہ قوم مسلمانوں سے حد درجہ بغاوت رکھتی تھی، بلکہ ان کی صورتوں کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتی،اگر کوئی مسلمان انہیں مل جاتا تو سخت تکلیفیں پہنچاتے اور مار پیٹ کر اپنی سرحد سے باہر نکال دیتے،صبح کے وقت اگر کسی مسلمان پر ان کی نظر پڑ جاتی تو فال بد خیال کرتے۔

اسی آبادی میں ایک مضبوط قلعہ تھا،جس پر ایک سخت دل اور بے رحم ،ظالم وجابر راجہ قابض تھا،جس کا نام ''جیون کولہ'' تھا،حضرت شیخ علی ہندی کے رشتہ داروں اور احباب کو بے دردی اور بے رحمی کے ساتھ قتل کروادیا تھا،حضرت شیخ علی نے حضرت سیدنا سے اس مقام پر اپنے واقعات بیان فرمائے،حضرت سیدنا نے پہلے مناسب سمجھا کہ راجہ کے پاس جا کر پہلے اتمام حجت کر لیں،لہٰذا آپ حضرت شیخ علی ہندی کو اپنے ساتھ لے کر قلعہ کے اندر راجہ جیون کول کے پاس

تشریف لے گئے جب راجہ سے سامنا ہوا تو آپ نے اس کو چند نصیحتیں کیں اور فرمایا:تم مسلمانوں کو کیوں ناحق قتل کرتے ہو،تم کو اللہ کے قہر وغضب سے ڈرنا چاہیے، جو ظالموں سے سخت بدلہ لینے والا ہے،اس لیے میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم اسلام قبول کر لو اور لوگوں کو ناحق قتل کرنے سے باز آجاؤ تا کہ تلافی ہوجائے ،تمہاری بھلائی اور سلامتی اسی میں ہے،اگر تم اپنے ظلم سے باز نہ آئے اور اسلام قبول نہ کیا تو یاد رکھو تم پر اب حجت قائم ہوگئی ہے اور اللہ کی یہی سنت ہے کہ جو لوگ اپنی خوشحالی میں سرکشی کرتے ہیں پہلے ان کی طرف ہدایت کرنے والا بھیجتا ہے،اگر ہدایت کو قبول کر لیا تو چین کی زندگی عطا کرتا ہے اور اگر ہدایت کو ٹھکرا دیا، پھر اسے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے، کیوں کہ اب اس پر حجت قائم ہو چکی ہے، لہٰذا تم بھی اپنے نفع ونقصان کو سمجھو، دنیا کی زیب و زینت میں پڑ کر آخرت کو برباد نہ کرو، ہمارا پیدا کرنے والا سارے افعال کا حساب لینے والا ہے، لہٰذا تم اس کے سزا سے ڈرو۔

آپ کی نصیحت آمیز تقریر سن کر نصیحت پذیر ہونے کے بجائے اور زیادہ برہم ہوگیا،اس نے آپ کو بے مددگار اور معمولی انسان سمجھ کر حقارت کی نگاہ سے دیکھا اور ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے بولا! تم کو اس سے کیا کام، جب آپ نے دیکھا کہ اس نے آپ کی نصیحت قبول نہ کی اور سرکشی کی تو آپ نے اس سے فرمایا:اب تم کو اپنے اعمال کی سزا ضرور ملے گی اور تمہارا بھی حشر قوم نوح اور فرعون جیسا ہوگا۔

آپ کے اس پر جلال آواز سے وہ مرعوب ہوکر رہ گیا پھر دوبارہ اس کو بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی،آپ وہاں سے جنگل میں واپس تشریف لائے اللہ رب العزۃ کی بارگاہ میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے، دعا کے الفاظ یہ تھے:

یاقادر اھلکھم کھلکت قوم نوح فی الطوفان۔ترجمہ:اے قادر مطلق ان لوگوں کو اس طرح ہلاک کر دے جیسے قوم نوح کو طوفان میں ہلاک کر دیا۔

اجابت استقبال کے لیے کھڑی تھی صرف دعا کے الفاظ زبان سے نکلنے میں دیر تھی دعا کے کلمات ابھی مکمل بھی نہ ہوئے تھے، ہر چہار جانب پہاڑ کے چٹانوں کی طرح بادل گھر گئے،اور یک بیک موسلا دھار بارش ہونے لگی، دیکھتے دیکھتے ظالم راجہ جیون کولہ کا قلعہ پانی کے سیلاب میں گر کر بہہ گیا،اور وہ بد باطن تمام اہل وعیال اور جملہ اہل کار کے ساتھ اسی قلعہ کی دیوار میں دب کر ہمیشہ کے لیے، نابود ہوگیا۔

جب جیون کولہ کی تباہی اور ہلاکت کی خبر قرب وجوار میں پھیلی تو اس کا بھائی کرمون کولہ جو اسی علاقہ میں رہتا تھا،حضرت سیدنا کے درپے آزار ہوا،لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت سیدنا اور آپ

کے تمام ساتھیوں کواس کے دست ظلم سے بھی محفوظ رکھا۔

نرہنا میں چند ماہ قیام کرنے کے بعد آپ وہاں سے روانہ ہوکر ایک ایسی جگہ پہنچے جوایک جزیرہ نما جنگلی علاقہ تھااور امجا کے نام سے مشہور تھا یہ مقام آپ کو پسند آیا، یہاں تشریف لائے ہوئے ابھی چند دن ہی ہوئے تھے کہ ایک روز نماز ظہر کے وقت حضرت سیدنا رضی اللہ عنہ نے اپنے مریدوں سے ایک شخص کواذان دینے کاحکم دیا، ابھی اذان ہو ہی رہی تھی کہ اس طرف سے راجہ جیون کولہ کا بھائی کرمون کولہ کا گزرہوا، وہ اس وقت اپنے عملہ اور سپاہیوں کے ساتھ گزررہا تھا، اس نے اذان کی آواز سنی، تو اپنے ہمراہیوں سے دریافت کیا، یہ کیسی آواز ہے، اس نے جواب دیا۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کی بددعاؤں سے تیرے بھائی راجہ جیون کولہ اوراس کے اہل وعیال، اہل کاراور قلعہ اور گاؤں کی تباہی وبربادی ہوئی، تجھے ان کی تلاش تھی، جب والی بہار بھی ان کے حلقہ ارادت میں داخل ہوکر ان کا مطیع وفرمانبردار ہوچکا، تو نے اس کے خوف سے ان کا پیچھا کرنا چھوڑ دیا، اب یہ اس جنگل میں آگئے ہیں نہ معلوم کیا چاہتے ہیں، شاید تجھے بھی ہلاک کرنا چاہتے ہیں، کرمون کولہ نے اپنے تمام ساتھیوں کوحکم دیا کہ ابھی فوراًان تمام لوگوں کو ہلاک کرڈالو ایسا نہ ہو کہ کہیں اس فتنہ کا دبانا مشکل ہوجائے، اس کے ہمراہی جن کوحکم ملا تھا، ابھی تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ اچانک بادل گھر گئے ان پر بجلی گری اور وہ سب وہیں ڈھیر ہوگئے۔

حضرت علی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کرمون کولہ کی ہلاکت کے بعد حضرت سیدنا رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ میں ہرچند چاہتا ہوں کہ ہجوم خلائق سے الگ ہوکر گوشہ نشینی اختیار کرلوں اور تنہائی کی زندگی اختیار کرلوں مگر یہ اللہ تعالیٰ ہی کومنظور نہیں تو کیا ہوسکتا ہے، اور جو عصا آپ کے دست مبارک میں تھا اسے مستقل قیام کے ارادے سے اس ندی کے کنارے جہاں پر آپ آکر ٹھہرے تھے، زمین میں نصب فرمایا، اور فرمایا اب میں اس جگہ سکونت پذیر ہوتا ہوں وہ عصا جلد ہی سرسبز وشاداب ہوگیا شیرازی فرماتے ہیں ہم نے از راہ تعجب دریافت کیا کہ کیا یہ درخت تا قیام قیامت باقی رہے گا؟ آپ نے فرمایا: جب رسول مقبول ﷺ کے لگائے ہوئے درخت باقی نہ رہے تو یہ کیوں کررہ سکتا ہے۔

آج بھی مزار پرانوار کے قریب وہ درخت ڈھلہ کے درخت جیسا موجود ہے، اسے اس عصا شریف کے آثار میں بتایا جاتا ہے، اس کا نام اجناس ہے، یہ درخت دوسری جگہ نظر نہیں آتا زائرین اس کی چھڑی کاٹ کر تبرکاً اپنے ساتھ لے جاتے ہیں، اس کی پتیوں کو سیاہ مرچ کے ساتھ پیس کر مریضوں کو پلاتے ہیں جس کی وجہ سے شفا نصیب ہوتی ہے۔

مورخین بیان کرتے ہیں کہ حضرت سیدنا رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس عصا شریف کو جو

بغداد سے چلتے وقت والد بزرگوار نے آپ کو عطا فرمایا تھا، اور یہ ارشاد فرمایا تھا، کہ اس عصا کو جہاں مستقل قیام کاارادہ ہونصب کردینا، اس کا سرسبز وشاداب ہونا اسی مقام پر مستقل قیام کرلینے کاحکم سمجھا جائے گا، اسے آپ نے اسی مقام پرندی کے کنارے نصب فرمایا، جہاں آپ اور آپ کے متعلقین کے مزارات ہیں اور وہ بستی امجھر شریف کے نام سے موسوم ہے۔

سوال: اتنی بڑی خانقاہ جس کے تحت مختلف روحانی مراکز آتے ہیں آپ اس کو کس طرح سنبھالتے ہیں اور کیا اس کے تحت چلنے والی تمام خانقاہیں ایک ہی صاحب سجادہ کے تحت چل رہی ہیں؟

جواب: رب قدیر بہتر کارساز ہے خانقاہ قادریہ محمدیہ کے جتنے مراکز ہیں ہر ایک کا علیحدہ ذمہ دار بنایا جاتا ہے اولا خانقاہ کے اصول وفرامین سے آگاہ کیا جاتا ہے، ہر ذمہ دار مرکزی خانقاہ کے اصول وضوابط پر عمل کرتے ہوئے اپنی پوری ذمہ داری کو بحسن وخوبی انجام دیتے ہیں، اس وقت مرکزی خانقاہ کی ذمہ داری اس ناتواں کاندھوں پر ہے، فقیر قادری سیدنا پاک اور بزرگان دین کے نگاہ کرم سے اپنی تمام ذمہ داریوں کوانجام تک پہونچانے میں مصروف ہے۔

سوال: خانقاہ قادریہ امجھر یہ کا میدان دعوت وتبلیغ میں کیا کردار رہا ہے؟

جواب: خانقاہ کی جانب سے تحریری وقلمی دعوت وتبلیغ بہت کم ہو پایا، ہمارے والد بزرگوار بتایا کرتے تھے، یہاں غیر مسلموں کی کثیر آبادی تھی یہاں مسلمان انگلی میں گنے جاتے تھے اس وقت خانوادہ کے مشائخ نے دعوت توحید ورسالت کا کام شروع کیا، پیغمبر اسلام ﷺ کی تعلیمات کوقوم کے سامنے پیش کیا تو لوگوں کے دلوں میں اسلام کی حقانیت اوراس کی عظمت قائم ہونے لگی اور لوگ جوق درجوق اسلام میں داخل ہونے لگے، حتی کہ ایک بڑی آبادی مسلمانوں کی ہوگئی اس طرح دعوت وتبلیغ کا کام ہوا، فقیر قادری نے بھی اپنے آقا کی سنت کوادا کرتے ہوئے دین متین کی دعوت وتبلیغ کا کام جاری رکھا اور مختلف شہروں میں پہونچ کر اسلام کی عالمگیر آفاقی تعلیمات کوقوم کے سامنے پیش کیا۔ بہت سارے لوگ اس حقیر کے ہاتھوں مشرف باسلام ہوئے جیسے بلال کلکتہ، شمشیر مع اہل وعیال اڑیسہ، اسمعیل رانچی اوراس کی والدہ اور بہت سارے ایسے ہیں جنھوں نے اسلام کوقبول تو کرلیا لیکن اعلان نہ کیا۔ رب قدیر سے دعا ہے کہ ہم اسی طرح خدمت اسلام کرتے رہیں۔

سوال: خانقاہ قادریہ امجھر یہ کے علمی کارناموں کے بارے میں بتائیں؟

جواب: علمی دنیا میں بزرگوں نے جو کچھ بھی کام کیا وہ منظر عام پر نہ آیا اس کی دو وجہ ہے اول یہ کہ وہ تصنیفات نااہلوں کی ہاتھ لگی جس کو نہ انھوں نے خود شائع کیا اور نہ کسی ذمہ دار شخص کے حوالے کیا، اور دوسری وجہ یہ کہ ۱۹۸۰ء کے زلزلے میں مکانات گرگئے چوں کہ مکانات مٹی کے

تھے، آخر کار کتابیں کہاں دب گئیں واللہ اعلم، فقیر قادری نے امیر الہند کے نام سے ایک رسالہ بھی نکالا، جس کو بعض وجوہات کی بنیاد پر بند کر دیا گیا، اب نوجوان علما وفضلا کی ٹیم تیار کر رہا ہوں جو دعوت فکر وعمل پر کئی جہتوں سے کام کریں گے۔ رب قدیر سے دعا ہے کہ اپنے حبیب کے صدقے ہمارے اس نیک منصوبے کو تکمیل تک پہنچائے۔

سوال: اس قدیم خانقاہ کے معمولات، رسومات اور امتیازات کیا رہے ہیں؟

جواب: خانقاہ قادریہ محمدیہ کے جتنے سجادہ نشیں ہوئے، توکل وقناعت ان کا خاص وصف رہا، شہرت وناموری سے گریز کرتے رہے، گوشہ نشینی کو زیادہ پسند فرمایا جیسا کہ حضرت علی شیرازی فرماتے ہیں، کرمون کولہ کی ہلاکت کے بعد حضرت سیدنا رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا، میں ہر چند چاہتا ہوں کہ ہجوم خلائق سے الگ رہ کر گوشہ نشینی اختیار کرلوں اور تنہائی کی زندگی گزاروں مگر یہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کو منظور نہیں تو کیا ہوسکتا ہے، اگر آپ گوشہ نشینی اختیار کر لیتے تو ظالم و جابر، کافر ومشرک کو عدل وانصاف اور ایمان وتوحید کی دعوت کون دیتا اور دین اسلام کی آبیاری کون کرتا، رب قدیر کو اپنے اس محبوب بندہ سے دین اسلام کی نشر واشاعت مقصود تھا، ہاں! بات چل رہی تھی بزرگان دین کے خاص وصف کی، یہاں کے اکثر مشائخ نے لوگوں کی ہدایت کے لیے دور دراز کا سفر طے کیا اور فقر وقناعت کے ساتھ دعوت وتبلیغ میں لگے رہے۔

چاند کی تاریخ کے حساب سے ۳۰ / صفر المظفر اور ایک ربیع الاول کو عرس سیدنا پاک منایا جاتا ہے، ۳۰ / صفر المظفر کو تقریبا رات دس بجے مزار مقدسہ کے غسل کے لیے پیتل کے گھڑا میں پانی لیے سر پر رکھ کر جلوس کی شکل میں ہزاروں عقیدت مند مختلف مقامات کا گشت کرتے ہوئے رات ۱۲ / بجے تک جلوس مزار پر انوار تک پہونچتا ہے پھر مزار مقدسہ کو غسل دیا جاتا ہے بعد غسل خانقاہ کی جانب سے ایک سفید چادر پھر ایک رنگین چادر، صاحب سجادہ پیش کرتا ہے بعدۂ مزار پر انوار کے قریب حلقہ ذکر تقریبا آدھ گھنٹہ تک ہوتا ہے اس وقت عقیدت مندوں میں ایک وجدانی کیفیت محسوس ہوتی ہے، اس کے بعد زائرین حضرات اپنے اپنے طور پر پھول وعنبر پیش کر کے عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔

یکم ربیع الاول شریف کو بعد نماز فجر جامع مسجد سیدنا پاک میں قرآن خوانی ہوتی ہے، جس میں حضور رضی اللہ عنہ عبادت وریاضت کیا کرتے تھے، ۹ / بجے صبح قل شریف ہوتا ہے اس کے بعد لنگر عام جاری کیا جاتا ہے۔

یکم ربیع الاول شریف بعد نماز ظہر تبرکات شریف کی زیارت کرائی جاتی ہے، موئے مبارک سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، کمر بند حضرت علی شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ، سوزنی بیٹھنے واوڑھنے کی

سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہما، گلو بند حضرت امام حسن وامام حسین رضی اللہ عنہما کا تاج مبارک، جائے نماز، خرقہ، کفن فقرائی، سوزنی بیٹھنے واوڑھنے کی سرکا غوث اعظم رضی اللہ عنہ، قرآن پاک سرکار غوث پاک رضی اللہ عنہ کے دست مبارک سے تحریر کیا ہوا، جو ایک ورق میں ایک پارہ اور تیس ورق میں تیس پارہ موجود ہے، جس کو بآسانی پڑھا جا سکتا ہے، جن تبرکات شریفہ کی زیارت سے لاکھوں زائرین فیضیاب ہو چکے ہیں اور سلسلہ جاری ہے۔

سوال: خانقاہ قادریہ امجھر یہ کے دوسری خانقاہوں اور علمی مراکز سے علمی وروحانی روابط کیسے رہے ہیں؟

جواب: ہندوستان کے تمام دوسری خانقاہوں سے اچھے روابط رہے ہیں۔

سوال: ہندو بیرون ہند کے ان مشائخ اور محققین کے بارے میں کچھ بتائیں جو اس قدیم خانقاہ سے روابط رکھتے تھے؟

جواب: خانقاہ قادریہ محمدیہ چوں کہ ۵۸۷ سال قدیم خانقاہ ہے ہند اور بیرون ہند کے کثیر علما ومحققین اس خانقاہ سے روابط رکھتے تھے، اور رکھتے ہیں اگر بیان کیا جائے تو ایک لمبی فہرست تیار کرنی ہوگی اور بعض محبین کی ناراضگی کا سبب بھی بن سکتا ہے اگر ان بعض کا ذکر نہ کیا جائے۔

سوال: یہ قدیم خانقاہ مخطوطات ومکتوبات کے حوالے سے بھی جانی جاتی ہے، یہاں کے اہم مخطوطات ومکتوبات اور علمی ذخائر کے بارے میں بتائیں؟

جواب: میں نے آپ کو اولاً بتایا جو بھی علمی ذخائر، مکتوبات ومخطوطات کی شکل میں تھی مکانات گرنے کی وجہ سے کہاں دب گئیں اس کا کوئی پتہ نہیں، فی الحال کچھ موجود نہیں۔

سوال: تصوف جس کا قرآنی اور حدیثی نام الاحسان ہے، کیا وہ صرف کتب تصوف کے مطالعے سے حاصل ہوسکتا ہے؟

جواب: علم تصوف کا حصول امہات الکتب کے مطالعے سے حاصل تو ہوسکتا ہے لیکن یہ کافی نہیں ہے، کیوں کہ تصوف ایک فن ہے جس کا حصول بغیر شیخ یا معلم تصوف کے ممکن نہیں، ایسے میں معلم تصوف کا ہونا میری ناقص رائے میں ضروری ولازمی ہے۔

سوال: آج کے اس دور میں تصوف اور صوفیہ کا انسانی معاشرے پر کتنا اثر ہے؟

جواب: تصوف اور صوفیہ کا معاشرہ پر اثر جو کچھ ہے وہ کافی نہیں۔

سوال: کیا تصوف اور صوفیہ انسانوں کو بے عملی، تجرد اور جمود کا سبق دیتے ہیں؟

جواب: نہیں بلکہ صوفیہ اپنے اصول اور عمل سے خوف خدا، عشق مصطفی اور تصور آخرت کا درس دیتے ہیں جو انسان کی حقیقی کامیابی ہے۔

سوال: کیا آج اصلاح تصوف کے لیے مشن کے طور پر کام کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں؟ اگر ہاں! تو اس کے طریقے کیا ہونے چاہیے؟

جواب: دیکھئے ہر زمانہ میں ایسی جامع الکمالات اور داعی اسلام کی ضرورت محسوس کی جاتی رہی، جو مسلمانوں میں تلاوت آیات، تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ نفوس کا کام کریں، نیابت رسالت کا فریضہ انجام دیں اور امت مسلمہ کا رشتہ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جوڑ سکیں، اپنے معاملات میں خدا اور رسول ﷺ کی عدالت سے فیصلہ کرانے اور اللہ کی راہ میں مجاہدہ اور اس عہد کی تجدید اپنا شعار بنائیں جو انھوں نے رسول اللہ سے کیا تھا، اس لیے کہ خلافت راشدہ کے بعد خلفا وسلاطین اسلام نے اس کام کو فراموش کر کے صرف فتوحات ٹیکس اور جزیہ کی وصولیابی اور اپنے اور اپنی اولاد کے لیے بیعت وخلافت کے انعقاد سے دلچسپی باقی رکھی، علما بھی اصلاح سے عاجز تھے وہ وعظ ونصیحت، درس وتدریس تصنیف وتالیف میں ایسے منہمک تھے کہ کسی اور چیز کی فرصت نہ تھی، اس کے علاوہ اگر یہ اس کا ارادہ بھی کرتے تو بھی یہ بات ان کے بس کی نہ تھی، اس لیے کہ ان کی زندگی عوام کے سامنے تھی اور وہ جانتے تھے کہ ان میں زہد واخلاص اور خلافت نبوت کے علامات اور اثرات نہیں ہیں، غرض کہ اس طرح عام اور خاص ہر طبقہ میں دینی شعور اور دینی فکر کمزور اور مضمحل ہوتی رہی اور رفتہ رفتہ وہ یہ بھولنے لگے کہ اسلام درحقیقت بندہ اور اس کے رب کے درمیان عہد ومیثاق اور بیع وشرا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے تصرفات میں بالکل آزاد ہو گئے اور خواہش نفس کو بالکل چھوٹ دے دی، ان کی حالت بھیڑوں کے اس گلے سی ہو گئی جس کا نہ کوئی چرواہا نہ مقصد، عبادت کا شوق، درجہ احسان اور حلاوت ایمان کے حصول کا جذبہ سرد پڑنے لگا، ہمتیں پست ہو گئیں، عزائم خوابیدہ ہو گئے اور عام طور پر لوگ بے حد بے تابی اور جنون کے ساتھ لذات اور خواہشات پر ٹوٹ پڑے۔

آخر کار اسلامی خلافت میں روح خلافت اور امانت نبویہ کا خاتمہ سا ہو گیا، ان مایوس کن حالات میں دعوت اسلامی کے ایسے علمبردار اور تربیت اسلامی کے بعض امام فن پیدا ہوئے جنھوں نے روح اسلامی اور شعور ایمانی کی بقا وحفاظت اور دعوت وتبلیغ کے میدان میں اہم خدمات انجام دیں، جو صوفیہ، محدثین اور فقہا کی جماعت تھی، اگر وہ نہ ہوتے تو مادیت پوری امت مسلمہ پر اپنا تسلط جما لیتی اور اصل زندگی ومحبت کی چنگاری بالکل سرد پڑ جاتی۔

آج بھی جب کہ حالات ناگفتہ بہ ہیں تو جہاں علما عاملین، اخلاقی وتربیتی کیمپ کا انعقاد کر کے قوم مسلم کے قلوب واذہان کو تصوف کی طرف مرکوز کر سکتے ہیں وہیں دینی رسائل وجرائد کے ذریعہ جمود فکر میں روحانی انقلاب پیدا کر سکتے ہیں۔

سوال: آج صوفیہ کو سلفی اور سلفیہ کو صوفی بننے کی ضرورت ہے اس خیال پر آپ کیا تبصرہ کرنا چاہیں گے؟

جواب: مجھے اس سے بحث نہیں، صوفیہ کو سلفی اور سلفیہ کو صوفی بننے کی ضرورت ہے یا نہیں لیکن اتنی بات ضرور کہنا ہے کہ صوفی حقیقت میں وہ ہے جو شریعت مطہرہ کا پابند ہو، شریعت سے الگ ہو کر جس نے تصوف میں اپنی فکری توانائی صرف کی وہ ہلاکت میں گیا، کنز العمال شریف میں ہے، **المتعبد بغیر فقه کاالحمار فی الطاحون**، بغیر علم شریعت کے عبادت کرنے والا ایسا ہے جیسا کہ چکی کا گدھا، تاریخ شاہد ہے آج تک کوئی شریعت سے الگ رہ کر صوفی نہ بنا اور نہ بن سکتا ہے۔

سوال: کیا تصوف عصر حاضر میں اتحاد اہل سنت اور اتحاد امت کا عنوان بن سکتا ہے؟ اگر ہاں! تو اس کی شکل کیا ہو؟

جواب: ہاں! تصوف اتحاد اہل سنت واتحاد امت کا عنوان بن سکتا ہے جب کہ شریعت کو لازم اور طریقت کو ملزوم جانے جائیں، کیوں کہ بغیر علم شریعت کے طریقت کے حصول کا طلب گار ایسا ہی ہے جیسے ایک اعمی اپنی منزل کے لیے سرگرداں ہو، اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس کی منزل کہاں ہوگی، دوسری جہت سے یوں سمجھا جائے کہ شرع کو اصول اور طریقت کو اس کے وصول تسلیم کیے جائیں تو تصوف کو اتحاد اہل سنت کا عنوان بنایا جا سکتا ہے۔

سوال: قارئین الاحسان اور مرتبین کے لیے آپ کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

مجھے حد درجہ فرحت ہو رہی ہے، الاحسان ایک علمی، تحقیقی مجلہ ہے جو اہل سنت وجماعت کے لیے باعث فخر ہے، اور وقت کی اہم ضرورت بھی یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جب دین غبار آلود ہوتا ہے تو رب قدیر دین کو نکھارنے والا، ایک ایمانی، روحانی اور انقلابی شخص کو پیدا فرما دیتا ہے، پھر اس شخص کے ذریعے جب وہ انقلاب بپا ہوتا ہے تو دعوت وتبلیغ کے طریقے پر الاحسان کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ قابل مبارکباد ہیں الاحسان کے مرتبین ومنتظمین کہ انھوں نے جمود فکروں میں ایک انقلابی تحریک پیدا کر دی، خدا کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ مولیٰ اس مجلّے کو حاسدوں کی حسد سے محفوظ رکھے۔ (آمین)

○○○

مطالعۂ تصوف

تصوف اور بھکتی: تنقیدی اور تقابلی مطالعہ

تصوف اور بھکتی میں کچھ ظاہری مشابہتیں ہیں مگر آخر کار یہ مغایرت میں بدل جاتی ہیں

صادق رضا مصباحی

جو فرق خانقاہیت اور درگاہیت میں ہے بالکل وہی فرق تصوف اور تصوف کے نام پر در آنے والی کیفیتوں کے درمیان ہے۔ اس کو الٹ کر یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ خانقاہیت تصوف ہے اور درگاہیت، تصوف کے نام پر دبے پاؤں نقب لگانے والے واردات واحوال۔ خانقاہیت، روحانیت اور تصوف کا دوسرا نام ہے اور درگاہیت، روحانیت اور خانقاہیت کی مسخ کی ہوئی تصویر۔ درگاہیت کے چہرے پر روحانیت کا نقاب تو ضرور پڑا ہوتا ہے مگر اس کے پیچھے تقرب الی اللہ کی تڑپ اور دینی فرائض کی ادائیگی کا جذبہ نہیں بلکہ محض ''مخصوص جذبات'' کی تسکین کا سامان ہوتا ہے۔ ہماری کم نصیبی کہ ہم اسی کو تصوف سمجھ لیتے ہیں اور اسی کو خانقاہیت۔ ہم میں سے زیادہ تر لوگ جتنے ذوق اور انہماک سے درگاہیت کی طرف دوڑتے ہیں اتنی دل چسپی اور شوق سے خانقاہیت کو اپنی نشان منزل متعین نہیں کرتے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا مذہب ہو جو اپنے پیروکاروں کو غیر اخلاقی اور غیر فطری احکامات دیتا ہو۔ ہمارا دین اسلام چوں کہ الہامی طور پر دین فطرت ہے، اس لیے اس کی تعلیمات میں خالق ومخلوق کی کڑی مضبوط سے مضبوط تر کرنے کی بے پناہ حکمتیں پنہاں ہیں جب کہ دوسرے مذاہب کی تعلیمات اگرچہ فطری ہیں مگر وہ یا تو اسلام کا چربہ معلوم ہوتی ہیں یا شعوری اور ارادی طور پر انہیں فطرت انسانی سے ہم آہنگ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی فطری ضرورت کا اقتضا ہے کہ اللہ عزوجل سے قریب ہونے اور روحانی سکون و اطمینان کے لیے جو تجربات کیے اور کرائے جاتے ہیں انہیں اسلام میں تصوف سے تعبیر کیا جاتا ہے اور غیر مسلموں کے یہاں اسی روحانی کیفیت کو کبھی سرّیت اور کبھی بھکتی کے نام سے جانا جاتا

ہے۔ یہاں یہ بات بھی سمجھنا ضروری ہے کہ جس طرح اسلام کے نام پر کچھ لوگوں نے خانقاہیت اور تصوف کا مفہوم بدلنے کی کوشش کی ہے اسی طرح دوسرے مذاہب میں بھی تن پروروں نے اپنے مذاہب میں ایسی ایسی آمیزشیں کر دی ہیں جو ان کے مذہب کے اساسی پہلوؤں کی غلط تصویر پیش کرتی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب ''تصوف اور بھکتی: تنقیدی اور تقابلی مطالعہ'' تصوف اور بھکتی کے درمیان فرق کی حدیں متعین کرتی ہے۔ کتاب کے مصنف اردو کے معروف اسکالر، صحافی اور کالم نگار شمیم طارق نے مختلف کتابوں کے حوالے سے تصوف اور بھکتی پر ایک تفصیلی بحث کی ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے مصنف کی زبان ہی میں بھکتی کی تعریف ذہن نشیں کرتے چلیں:

''لغوی اعتبار سے ''بھکتی'' کا مطلب طاعت و بندگی اور انتہائے عقیدت و محبت ہے لیکن ہندو مذہب کی کتابوں میں جن میں ''بھگوت گیتا'' اور ''شریمد بھاگوت'' بہت اہم ہیں، بھکتی کی جو تعریف کی گئی ہے وہ محبوب سے وصال کے اس والہانہ اور لافانی جذبے سے عبارت ہے جس کی آخری منزل خود سپردگی اور فنا ہے۔ جس طرح گنگا کی فطرت ہی یہی ہے کہ وہ سمندر کی طرف بہی چلی جائے اسی طرح بھکتی کے جذبات انسان کے رگ وپے میں سما کر اس کو اس کی اصل یعنی پرماتما (پرم+آتما) یا مالک ومحبوب کی طرف بہا لیے جاتے ہیں۔'' (ص:۱۰۷)

تصوف کے بالمقابل ایک باطنی رجحان غیر مسلموں کے یہاں ''سرّیت'' کے نام سے بھی شائع وذائع ہے۔ شمیم طارق نے اس کے معانی و مفاہیم یوں بیان کیے ہیں:

''سریت، قدرت کے اسرار سے ہم آہنگ ہونے، قدیم یونانی فکر وفلسفہ یا شخصی تجربے سے خدا کو جاننے ماننے، نوفلاطونیت اور یہودیوں اور عیسائیوں کے بعض قدیم فرقوں کے اعتقادات واعمال کی رازدارانہ ہم نوائی سے عبارت ہے۔۔۔۔ سریت الگ الگ ملکوں اور زمانوں میں الگ الگ انداز سے، کبھی کسی مذہب کے پس منظر میں اور کبھی مذہب سے بے نیاز ہو کر صرف حیات وکائنات کے اسرار سے راز و نیاز اور باطنی ترنگ کے حوالے سے عرفان عملی یا عملی معرفت Gnosis کے ہم معنی مختلف ناموں سے اپنی شناخت قائم کرتی رہی ہے۔ وسیع تر مفہوم میں لفظ ''سریت''، باطنی رجحان، ایک خاص وجدانی حالت یا ذہنی قلبی کیفیت کے اظہار کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جس میں انسان شخصی روحانی تجربے کے ذریعے اللہ کی محبت ومعرفت اور کشفی یا وہبی علوم کی بازیافت کے احساس سے سرشار ہوتا رہتا ہے اور ان عقائد واسرار کے لیے بھی جو اس کے لاشعور کا حصہ ہوتے ہیں ۔۔۔۔ یہ کہنا درست ہے کہ سریت قدیم موروثی عقائد و نظام فکر کی پاس داری تو ہے ہی ذاتی احساسات اور ماورائی تجربات کی ہم نوائی بھی ہے۔'' (ص ۱۹۱)

مسلمانوں کی دینی تعلیمات سے دوری کا یہ عالم ہے کہ ان میں زیادہ تر لوگوں کے کردار و اعمال تصوف کے عملی مظاہر واثرات سے کوسوں دور ہیں اور اس سے بھی بڑی کم نصیبی یہ ہے کہ خام صوفیہ اور صوفیوں جیسی وضع قطع اختیار کرنے والوں کو دیکھ کر یہ حضرات انہیں ایک حقیقی صوفی، اسلام کا نمائندہ اور علم بردار سمجھ لیتے ہیں۔ بعض لوگ وہ بھی ہیں جو محض اسی وجہ سے تصوف کو اسلام سے کوئی متوازی مسلک یا مذہب تصور کرتے ہیں اور پھر اسی کی تشہیر میں لگ جاتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس طرح ان غلط کار صوفیوں اور درگاہ نشینوں کے مذموم رویوں کی بدولت تصوف کا سرے سے انکار کر دینا یا اسے اسلام کا دوسرا ایڈیشن کہنا قرینِ انصاف نہیں ہے اسی طرح انہیں حقیقی تصوف کے سر منڈھنا بھی تصوف کی توہین کرنا ہے۔ تصوف کے متعلق غلط فہمیوں کو پروان چڑھانے میں ان غیر مسلم جوگیوں اور برہمچاریوں کے وہ باطنی اور روحانی تجربات بھی شمار کرائے جاتے ہیں جسے بھکتی کے نام سے جانا جاتا ہے، یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ تصوف اور بھکتی کا پس منظر الگ ہے۔ دونوں میں بظاہر ہمیں مماثلت نظر آتی ہے لیکن یہ مماثلت زیادہ دیر تک باقی نہیں رہ پاتی اور مغائرت کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے۔ یہ کتاب ''تصوف اور بھکتی: تنقیدی اور تقابلی مطالعہ'' تصوف اور بھکتی کے درمیان مغائرت کو اجاگر کرتی ہے۔ تصوف اور بھکتی کی مماثلت اور مغائرت کے تعلق سے مصنفِ کتاب کا مطمحِ نظر بالکل واضح ہے:

''صوفیوں اور بھکتوں میں کچھ ظاہری مشابہتیں سامنے آ جاتی ہیں مگر آخری مرحلے پر پہنچتے پہنچتے یہ مشابہتیں مغایرت میں تبدیل ہو جاتی ہیں'' (ص:۲۲)

تصوف اور بھکتی میں کیا حد فاصل ہے اسے انگریزی زبان کے مایۂ ناز اسکالر پروفیسر سید امین اشرف اشرفی الجیلانی کی زبانی سنیے، پروفیسر موصوف کتاب میں ''حرف اول'' کے تحت لکھتے ہیں:

''تصوف اور بھکتی کا مذہبی پس منظر اور مفہوم الگ الگ ہے۔ Mysticism بھی مالک وخالق سے براہِ راست ہم رشتگی کا ہم معنی ہے۔ بھکتی اور Mysticism شریعت محمدی اور وسیع تر معنی میں انبیاے کرام کی دعوت سے الگ ایک خودمختار روحانی یا باطنی نظام اور تجربہ ہے۔ قربِ خداوندی حاصل کرنے اور پرم آتما میں مل جانے کو ایک نہیں کہا جا سکتا۔ مسلمانوں کا تصوف ''سلوک راہ نبوت'' ہے۔ صوفیہ کشفی علوم کے قائل ہیں مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ وحی الٰہی کی نفی نہ کرتا ہو۔ (ص:۷)

شمیم طارق نے کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب ''تصوف'' ہے، اس کے دو ذیلی عنوان ہیں: (۱) ابتدا، ارتقا اور رد وقبول (۲) تزکیہ واحسان، روحانی ارتقا اور عرفانِ ذات و کائنات۔ دوسرا باب ''بھکتی'' سے موسوم ہے، اس کے تحت بھی (۱) رجحان، فلسفہ، تحریک اور شاعرانہ اظہار، اور (۲) عقیدے میں آمیزش اور نئے فرقوں کا ظہور، کی سرخیوں سے دو ذیلی

عناوین ہیں۔تیسرے باب کا نام ''سریت'' ہے،اس کا ایک ہی ذیلی عنوان ہے: مفہوم اور مذہب وتصوف میں نفوذ واثرات۔اور چوتھا اور آخری باب تصوف اور بھکتی کے درمیان ''تنقیدی اور تقابلی مطالعہ'' ہے جو کتاب کا حاصل کہا جاسکتا ہے۔اس باب میں (۱) تصوف اور بھکتی (۲) عقیدۂ توحید اور ویدانتی وحدانیت (۳) وحدۃ الشھود اور وحدۃ الوجود کی ذیلی سرخیاں لگا کر گفتگو کی گئی ہے اور تصوف اور بھکتی کے مختلف پہلوؤں پر مصنف نے اپنا حاصلِ مطالعہ پیش کیا ہے۔ پروفیسر سید امین اشرف کچھوچھوی مرحوم، پروفیسر محسن عثمانی ندوی اور پروفیسر نثار احمد فاروقی نے بالترتیب حرفِ اول، مقدمہ اور پیشِ لفظ لکھ کر کتاب کو بھی سراہا ہے اور صاحبِ کتاب کو بھی۔

شمیم طارق نے اپنی اس کتاب میں ان لوگوں کا بھی رد کیا ہے جو بالکلیہ تصوف کے مخالف ہیں اور ان کا بھی جو تصوف کو بالکل بے آمیز اور بے غبار ماننے پر بضد ہیں۔انہوں نے کتابوں کے حوالوں سے بتایا ہے کہ جب جب اسلام میں تصوف کے نام پر غیر اسلامی چیزوں نے نقب زنی کر کے اسے داغدار بنانے کی کوشش کی تو سب سے پہلے صوفیہ کی جماعتوں نے ہی اپنے اپنے طور پر اس کا تعاقب کیا اور اسے باہر کا راستہ دکھایا اور آج بھی صوفیہ کی جماعتیں یہ فریضہ بحسن وخوبی انجام دے رہی ہیں۔کتاب کی بحث کا یہ حصہ دونوں طبقوں کے لوگوں سے اپنے اپنے نظریات پر نظر ثانی کرنے کی دعوت دیتا ہے ۔تصوف کو ''چنیا بیگم'' سے موسوم کرنے والے بانیِ جماعتِ اسلامی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جو عام طور پر تصوف کے مخالفین میں شمار ہوتے ہیں، کا ریمارک ان لوگوں کے لیے بہت اہم ہے جو بالکلیہ تصوف کو رد کرنے یا اسے کسی دوسرے مذہب کے متوازی سمجھنے کے درپے ہیں۔بقول مولانا مودودی:

> ''تصوف کسی ایک چیز کا نام نہیں ہے بلکہ بہت سی مختلف چیزیں اس نام سے موسوم ہوگئی ہیں۔جس تصوف کی ہم تصدیق کرتے ہیں وہ اور چیز ہے،جس کی ہم تردید کرتے ہیں وہ ایک دوسری چیز اور جس کی ہم اصلاح چاہتے ہیں وہ ایک تیسری چیز۔ایک تصوف وہ ہے جو اسلام کے ابتدائی دور کے صوفیہ میں تھا مثلاً فضیل بن عیاض، ابراہیم ادہم، معروف کرخی وغیرہم رحمہم اللہ۔اس کا کوئی الگ فلسفہ نہ تھا، اس کا کوئی الگ طریقہ نہ تھا۔وہ افکار اور وہی اشغال واعمال تھے جو کتاب وسنت سے ماخوذ تھے اور ان سب کا وہی مقصود تھا جو اسلام سے مقصود ہے۔یعنی اخلاص للہ اور توجہ الی اللہ۔۔۔اس تصوف کی ہم تصدیق کرتے ہیں اور صرف تصدیق ہی نہیں کرتے بلکہ اس کو زندہ اور شائع کرنا چاہتے ہیں۔''(ص ۶۳)

ناچیز تبصرہ نگار کے پاس اس وقت ''تصوف بھکتی: تنقیدی اور تقابلی مطالعہ'' کا پہلا ایڈیشن ہے۔یہ ۲۷۶ صفحات پر مشتمل ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا تھا۔اس کتاب پر ناچیز کا ایک تبصرہ اردو بک ریویو، نئی دہلی (شمارہ جنوری تا مارچ ۲۰۱۳ء) میں شائع ہو چکا ہے۔اس میں بعض وجوہ سے کچھ

چیزیں شامل نہیں ہو سکی تھیں تاہم اب کتاب کے بالاستیعاب مطالعے کے بعد وہ تمام محسوسات بغیر کسی کھٹک کے اس تبصرے میں شامل کیے جا رہے ہیں۔اس کتاب کو انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور کریمی لائبریری ممبئی نے شائع کیا ہے۔کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۲۰۱۳ء میں شائع ہو چکا ہے اور اس کے صفحات ۲۸۴ ہیں۔اس میں بہت سارے لوگوں کے تاثرات بھی شامل کیے گئے ہیں جو کتاب کے مندرجات کے مطالعے کے بعد مصنف کتاب کو موصول ہوئے تھے۔کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شمیم طارق صاحب نے اس موضوع پر بہت گہرا مطالعہ کیا ہے اور بڑی محنت سے اس کا نچوڑ قلم بند فرمایا ہے مگر ایک نہیں متعدد مقامات پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قاری الفاظ کے پیچوں میں الجھ کر رہ گیا ہے اور اسے مقصد ومفہوم کا گہر حاصل ہی نہیں ہوا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ تصوف کے بعض مقامات مصنف کے ذہنِ رسا پر اپنی گرہیں کھولنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ظاہر ہے جب مصنف ہی نہیں سمجھے گا تو وہ اپنے قاری کو کیا سمجھا سکے گا۔انہوں نے محی الدین ابن العربی کے افکار ونظریات کی روشنی میں وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشھود پر گفتگو بھی کی ہے مگر یہ بحث بھی ان کی اپنی سمجھی ہوئی نہیں معلوم ہوتی۔خود انہی کے لفظوں میں:

> ''مسئلہ وحدۃ الوجود کا مندرجہ بالا تعارف ایک صاحب دل اور صاحب نظر بزرگ کا رہین منت ہے جن کی نظر ابن العربی کی تصانیف کی باریکیوں کے ساتھ قرآن وسنت کی تعلیمات پر بھی تھی۔''(۲۵۵)

شمیم طارق صاحب اگر اس ''صاحب دل اور صاحب نظر بزرگ'' کا نام بھی بتا دیتے تو ان کی بات اور زیادہ پختہ ہو جاتی۔تبصرہ نگار کو حیرت ہے کہ اس طویل بحث میں انہوں نے وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشھود کی تعریف بھی وضاحت کے ساتھ نہیں کی ہے۔ظاہر ہے جب تک کسی چیز کا تعارف نہیں ہوگا، اسے اچھی طرح نہ سمجھا جا سکے گا اور نہ سمجھایا جا سکے گا۔صفحہ ۲۳۵ پر انہوں نے اللہ عزوجل کے اسماء الحسنیٰ کا تذکرہ کرتے ہوئے خیر الحاکمین اور خیر الفاتحین دونوں کا ترجمہ ''بہترین فیصلہ کرنے والا'' کیا ہے۔ہمارے خیال میں خیر الفاتحین کا ترجمہ ''بہترین آغاز فرمانے والا'' یا ''بہترین فتح سے ہم کنار کرنے والا'' ہونا چاہیے۔دوسرے باب میں ہندوؤں کے مذہبی رہنما سورداس اور شری کرشن کے اقوال واشعار کی روشنی میں شمیم طارق نے ان کے باطنی رجحانات اور داخلی کیفیات کا جائزہ بڑی تفصیل سے لیا ہے، بلفظ دیگر انہیں ''صوفی'' ثابت کیا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

پوری کتاب کا حاصل یہ ہے کہ کسی جوگی اور برہمچاری کے ترک وتجرد اور اس کے روحانی تجربات کا رشتہ تصوف سے کیسے جوڑا جا سکتا ہے جب کہ تصوف ایک خالص اسلامی اصطلاح

ہے۔صوفیۂ کرام کا تصوف الگ چیز ہے اور جوگیوں اور برہمچاریوں کی بھکتی تحریک الگ چیز۔
تصوف اور بھکتی کا مذہبی پس منظر الگ الگ ہے گو کہ ان کے یہاں بھی خداے تعالیٰ کی وحدانیت کا
تصور موجود ہے مگر ان کا شریعت اسلامیہ سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔اس لیے ان کے راہبانہ مدارج و
منازل کچھ اور تو ہو سکتے ہیں مگر ان پر تصوف کا لیبل نہیں لگایا جا سکتا؛ کیوں کہ تصوف اور بھکتی کی
واردات بظاہر ایک معلوم ہوتی ہیں مگر دونوں کے راستے جدا جدا ہیں۔تصوف کی روح دراصل
ہمارے وہ عقائد ہیں جو اسلام کی اساس ہیں جن سے بھکتی اور سرّیت کا دامن یک سر خالی ہے۔

۲۸۴ صفحات کی یہ کتاب اس موضوع پر ایک اچھی کتاب کہی جا سکتی ہے۔شمیم طارق
صاحب اس کتاب کے لیے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک اچھوتے موضوع پر
قلم اٹھا کر دونوں کے درمیان خط فاصل کھینچنے کی عمدہ سعی کی ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ امتیازی لکیر کا
تعین کرنے میں وضاحت اور CLEARITY نہیں پیدا ہو سکی ہے جس کی وجہ سے بسا اوقات
مطالعے کے دوران قاری کو بڑی الجھن کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ
آخر مصنف یہاں کہنا کیا چاہ رہے ہیں۔بعض جگہ انھوں نے غیر ضروری اطناب سے کام لیا ہے۔
جس مفہوم کو وہ ایک پیراگراف میں آسانی کے ساتھ قاری کے دل و دماغ میں اتار سکتے تھے وہاں
کئی کئی پیراگرافوں میں اپنی گفتگو کو پھیلا دیا ہے جس سے نہ صرف یہ کہ معانی و مفاہیم الفاظ کے
نیچے دب سے گئے ہیں بلکہ دوران مطالعہ بسا اوقات ذہن میں الجھن سی ہونے لگتی ہے اور بے
اختیار کتاب بند کر دینے کو جی چاہتا ہے۔میرا ذاتی تاثر یہ ہے کہ جس کتاب کو انھوں نے ۲۷۶ یا
۲۸۴ صفحات پر مرتب کیا ہے اس سے نصف صفحات پر وہ بڑی آسانی اور وضاحت کے ساتھ اپنا
مدعا قاری کے گوش گزار کر سکتے تھے۔اس کتاب کے مطالعے سے پہلے تک تبصرہ نگار کا نظریہ یہ تھا
کہ کوئی بھی صاحب قلم، باشعور اور صاحب ذوق شخص کسی بھی موضوع پر لکھنے کا اہل ہوتا ہے، لیکن
مطالعے کے بعد تبصرہ نگار کو اپنے اس نظریے سے رجوع کرنا پڑا اور اس نظریے کو گرہ باندھ لیا کہ
جس آدمی کا جو میدان ہو وہ اسی میں کام کرے تبھی وہ بہتر طریقے سے کامراں ہو سکتا ہے، بصورت
دیگر اہل علم بھی اسے پسند نہیں کرتے اور بنی بنائی ساکھ کے بھی متاثر ہونے کا خطرہ لگا رہتا ہے۔

بہر حال یہ کتاب قابل قدر ہے اس کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے۔کتاب کے بعض
حوالے بہت اہم ہیں، تصوف کے طالب علم اور محقق کے لیے جن کا جاننا بہت ضروری ہے۔

(دوسری اشاعت: اکتوبر ۲۰۱۳ء، صفحات: ۲۸۴) قیمت: ۲۰۰ روپے
ناشر: انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور کریمی لائبریری ممبئی)

○○○

تصوف اور کشمیری صوفیا

یہ کتاب اپنے موضوع پر مرجع کی حیثیت رکھنے کے ساتھ کافی مفید اور معلومات افزا ہے۔

افضل حسین مصباحی

موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے اس دور کو دینی تصادم کا دور کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔
زندگی کے تمام شعبوں میں روحانیت کے پاکیزہ اصول کو یک لخت مسترد کر کے مادیت کی حاکمیت
اعلی کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ مادیت اور روحانیت کے اس ٹکراؤ اور اسلامی اقدار کی پامالی کو دیکھتے
ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عالمی سطح پر روحانیت کی بقا و فروغ ناممکن امر ہے۔ایسا لگتا ہے کہ اس
کی شعاعیں اپنا اثر کھو چکی ہیں۔ایک وقت تھا جب ہمارے اسلاف نے تصوف اور تزکیۂ نفس
کے ذریعے ہزاروں لوگوں کو اسلام اور ایمان کی دولت سے آراستہ کیا اور اپنے قول و عمل کو اس
طرح پیش کیا کہ جسے دیکھ کر لوگ جوق در جوق دامن اسلام سے وابستہ ہونے لگے۔

کل تک جن خانقاہوں کو اسلام کی دعوت و تبلیغ کا مرکز سمجھا جا رہا تھا آج انھی
خانقاہوں میں اسلامی اقدار و روایات کی دھجیاں اڑائی جا رہی ہیں، اغیار جہاں تصوف کو مختلف
نامناسب نام دے کر بدنام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں وہیں اپنے بھی اپنے قول و عمل میں تضاد
پیدا کر کے تصوف کو بدنام کرنے میں برابر کے حصے دار ہیں۔

یہ بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ آج لوگ ذہنی سکون و چین کے لیے بھٹکتے پھرتے ہیں، اپنے
اعتبار سے مختلف عبادت گاہوں اور آشرموں میں جا کر روحانی چین و سکون تلاش کرتے ہیں، مگر
اس کے باوجود بھی چین و سکون میسر نہیں، اضطراب و بے چینی جو پہلے تھی وہ ہنوز باقی ہے۔اس کا
واحد سبب راستے کا غلط تعین ہے۔اگر ذہنی سکون و راحت کوئی دے سکتا ہے تو وہ روحانیت اسلام
یعنی تصوف ہے۔تصوف ہی پریشان انسانیت کو چین و سکون کی دولت سے ہم کنار کر سکتا ہے۔آج

کے اس بگڑے ہوئے ماحول اور سسکتے ہوئے حالات میں تصوف کی سخت ضرورت ہے۔تصوف اور صوفیۂ کرام کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب جب مسلمانوں کے اندر روحانیت کی جگہ مادیت نے لی تو صوفیۂ کرام نے تزکیۂ نفوس کر کے مسلمانوں کے اندر روح ایمانی پھونکنے میں نمایاں رول ادا کیا۔اگر عہد صحابہ وتابعین کی طرف رجوع کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن دین کے ایک اہم رکن کی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ دلاتا ہے اور اس کو تزکیہ سے تعبیر کرتا ہے:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ۔ (الجمعہ:۲)

اللہ کی ہی ذات ہے جس نے امیوں کے بیچ ایک رسول بھیجا، جو ان کے سامنے اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، اگرچہ وہ اس سے قبل کھلی گمراہی میں تھے۔

تزکیہ سے مراد انسانی نفوس کو اعلیٰ اخلاق سے آراستہ کرنا اور باطن کو رذائل سے پاک و صاف کرنا ہے، جو سرکار دو عالم ﷺ اور صحابہ کرام کی زندگی کے ہر گوشے میں نظر آتا ہے، بعد میں اسی تزکیہ کو تصوف کہا جانے لگا، اصطلاح کے بدلنے سے حقیقت نہیں بدلتی، حدیث جبرئیل میں بھی تصوف کی جانب واضح اشارہ موجود ہے اور اس کو دین کا ایک رکن قرار دیا گیا ہے۔

تصوف اور اہل تصوف اصحاب قلم کے درمیان آج بحث وتحقیق کا خاص موضوع بنے ہوئے ہیں اور اس کو نئے سرے سے عالمی سطح پر لانے کی جدوجہد جاری ہے۔خانقاہوں کے ذمہ داران اور صاحبان ارشاد وتبلیغ اس جانب خاص توجہ دے رہے ہیں، طرح طرح کے مضامین، رسالے، پمفلیٹ اور کتابیں شائع کیے جارہے ہیں۔

اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ''تصوف اور کشمیری صوفیا'' ہے جس کو جناب غوث سیوانی صاحب نے حسن نظم کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔موصوف کو تحریر وقلم سے خاص لگاؤ ہے۔ مذکورہ کتاب کے علاوہ موصوف کی یہ کتابیں بھی منظر عام پر آچکی ہیں: ''جدید دنیا کے مسائل اور تصوف''، ''انوار تصوف''، ''چراغ دیر''، ''برگد کی چھاؤں''، ''ہمارے رسول''۔اس کے علاوہ تقریباً پندرہ سو مضامین مختلف رسائل واخبارات کے لیے لکھ چکے ہیں۔موصوف کا تصوف اور صوفیہ کی تعلیمات کی جانب خاصا میلان ہے۔موصوف کی اکثر کتابیں ان کے اسی میلان طبع کا نتیجہ ہیں۔

''تصوف اور کشمیری صوفیا'' ۴۵۶ صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ہے۔اس کے شروع میں تصوف کی تاریخ کے حوالے سے پروفیسر غلام یحیٰ انجم صدر شعبۂ علوم اسلامیہ، جامعہ ہمدرد، نئی

دہلی کا نہایت مفید اور جامع مقدمہ ہے، اس کے بعد عرض مؤلف ''بنام جہان دار جاں آفریں'' ہے، جس میں موصوف نے بتایا ہے کہ تصوف ہی تمام قوتوں کا مرکز اور منزل مقصود تک پہنچانے کا اہم ذریعہ ہے۔عرفان خداوندی کا دوسرا نام تصوف ہے، موصوف لکھتے ہیں:

''عرفان حقیقت کا خواب انسان مختلف رنگوں میں دیکھتا رہا ہے، اس کی جھلک مذہب ہی نہیں شاعری، آرٹ فلسفہ وسائنس، ہر جگہ دیکھنے کو ملتی ہے، سب نے اپنی بساط کے مطابق اس حقیقت کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے، مگر تصوف اس معاملہ میں سب سے آگے ہے، فلسفہ جہاں دلیل وحجت، ثبوت و برہان کی بنیاد پر گفتگو کرتا ہے وہیں تصوف کو اس کے لیے کسی دلیل وحجت کی ضرورت نہیں بلکہ بغیر ثبوت و برہان کے یہاں حقیقت کو تسلیم کر لیا جاتا ہے، سبب یہ ہے کہ دلیل کی ضرورت وہاں ہوتی ہے جہاں حقیقت نظر سے پوشیدہ ہو مگر جب حقیقت کا مشاہدہ ہو جائے تو ثبوت کی کیا ضرورت؟ فلسفہ کے لیے دماغ کی حاجت ہے مگر تصوف کے لیے دل کی۔'' (ص:۳۳)

پوری کتاب عام فہم اور سادہ اسلوب میں محققانہ رنگ وآہنگ کے ساتھ ترتیب دی گئی ہے، حوالوں کا بھرپور التزام ہے، ہر موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، کسی بھی جگہ قاری کو تشنگی کا احساس ہونے نہیں دیا، اس کتاب میں تصوف اور صوفی کی حقیقت و ماہیت اور منازل سلوک مثلاً فقر، توکل، مجاہدہ، مراقبہ، یاد الٰہی اور بیعت وخلافت پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے، ہر عنوان کے تحت معتبر کتابوں کے حوالوں سے اپنی بات کو پیش کیا ہے، اقوال صوفیہ کو بھی پیش کیا گیا ہے کہ خود صوفیہ کا اس سلسلے میں کیا خیال ہے، کبھی قاری کو اصطلاحات تصوف سمجھنے کی ضرورت بھی ہوتی ہے، اس لیے اصطلاحات تصوف کا باب قائم کر کے سیر حاصل گفتگو کی ہے، اس کے بعد موصوف نے صفحہ ۲۰۰ سے جنت ارضی کشمیر کی خوبیاں اور اس کی خصوصیات کو بیان کیا ہے، وادی کشمیر کی خوبیوں کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کشمیر کو سرزمین گل ولالہ کہا جاتا ہے، اس لیے کہ یہاں ہر طرف پھول ہی پھول کھلے نظر آتے ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی خوبصورت دلہن نے اپنے چہرے کو پھولوں کے نقاب سے ڈھک رکھا ہے، پربتوں، وادیوں، ندیوں اور جھیلوں کا حسن اس بات پر شاہد ہے کہ قدرت نے حسن کے خزانے جی کھول کر کشمیر پر لٹائے ہیں، جنت کے نظاروں کی پیوندکاری، سرزمین کشمیر پر کر دی گئی ہے'' (ص:۲۰۸)

اس کے بعد کشمیری اقوام کی تاریخ پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ساتھ ہی کشمیر میں فروغ اسلام اور صوفیہ کے کارنامے اور ان کی جدوجہد کی روداد بیان کی گئی ہے، نیز یہ بھی بیان کیا ہے کہ

کشمیر میں صوفیہ کی آمد کب ہوئی ۔ زمانے کے لحاظ سے بترتیب صوفیہ کے کارناموں اور ان کی سوانح حیات کو بیان کیا ہے اور یہ بھی ثابت کیا ہے کہ صوفیۂ کرام نے کشمیر میں جہاں اسلام اور تصوف کو فروغ بخشا وہیں ان کی تہذیب ، معاشرت اور معیشت کو بھی متاثر کیا اور ان کی معاشی و اقتصادی زندگی میں اس طرح گہرے اثرات چھوڑے جو ان کی شناخت بن گئی ۔

مجموعی اعتبار سے یہ کتاب کافی مفید، معلومات افزا، کشمیری صوفیہ کے تعلق سے نہایت جامع اور اپنے موضوع پر مرجع کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہم اس شاندار کتاب پر ایک بار پھر جناب غوث سیوانی صاحب کو مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ اللہ انہیں صوفی ادب کی خدمت کی مزید توفیق بخشے ۔ (آمین)

(اشاعت : ۲۰۱۲ء، صفحات : ۴۵۶ ، قیمت : ۲۷۵ روپے

ناشر : عرشیہ پبلی کیشنز، A-170، گراؤنڈ فلور-3، سوریا اپارٹمینٹ، دل شاد کالونی، دہلی-95)

○○○

سہ ماہی ’’دیوان‘‘ پٹنہ کا تصوف نمبر

ہمیں امید ہے کہ رسالہ ’دیوان‘ آئندہ بھی اشاعت تصوف کی خدمات انجام دیتا رہے گا۔

حماد رضا مصباحی

خانقاہ حضرت دیوان شاہ ارزانی پٹنہ کے زیر انتظام نکلنے والا سہ ماہی رسالہ ’’دیوان‘‘ کا تازہ شمارہ (جلد : ۱۰ ، شمارہ : ۷) ’’تصوف نمبر‘‘ مشائخ وصوفیہ کی تعلیمات کے حوالے سے منظر عام پر آیا ہے، جو ایک نیک اور قابل تحسین پیش رفت ہے۔ رسالے کی سائز کتابی، ضخامت متوسط (۱۳۶ صفحات) اور ٹائٹل دیدہ زیب ہے، مضامین خوب سے خوب تر ہیں، لیکن اس میں پروف کی غلطیاں کچھ زیادہ ہی ہیں جو ذوق پر گراں گزرتی ہیں، مثلاً صفحہ نمبر ۸ پر ’’**یعلمهم**‘‘ کو ’’**معلمهم**‘‘، ’ہیں‘ کو ’ہی‘ اور ’’علما نے تصوف کی ایک وجہ تسمیہ یہی نسبت صفہ بتائی ہے‘‘ کو بتاتی ہے‘‘ لکھا گیا ہے ، صفحہ نمبر ۹ پر ’’منزلیں‘‘ کو ’’مزلین‘‘، صفحہ ۱۱ پر ’’مجموعے بھی شامل ہیں‘‘ کو ’’ہے‘‘ ۔ یہ چند مثالیں بہ طور نمونہ تھیں، امید کہ آئندہ اس کا خیال رکھا جائے گا۔

پروفیسر سید شاہ حسین الحق ، ڈاکٹر سید شاہ حسین احمد، ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی ، پروفیسر طلحہ رضوی برق ، ڈاکٹر سید سراج اجملی ، ڈاکٹر عاصم اعظمی ، ڈاکٹر زین رامش جیسے دانشوران اور صاحبان قلم کے مضامین اس شمارے کی زینت ہیں۔ اول الذکر دونوں حضرات نے دو دو مقالے لکھے ہیں اور دونوں قابل مطالعہ ہیں، پروفیسر طلحہ رضوی برق صاحب نے اپنے مضمون میں تصوف، کتب تصوف اور صوفیہ کا تعارف کرایا ہے لیکن شروع میں موصوف نے سخت اور پیچیدہ الفاظ کا استعمال کچھ زیادہ ہی کیا ہے، اخیر میں برق صاحب کا یہ جملہ ’’تصوف میں سارا معاملہ دل کا ہے‘‘ کتب تصوف اور تعلیمات صوفیہ کے مطابق ہے۔

ڈاکٹر سید شاہ حسین الحق کا پہلا مقالہ کافی لمبا اور تحقیقی ہے۔ اس میں انہوں نے تصوف

مخالف فکر کے حامل پروفیسر عبدالمغنی کے مضمون ''اردو ادب میں مشرق کی باز یافت'' کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور تصوف کے خلاف ان کے گیارہ اعتراضات کا جواب دیا ہے، عبدالمغنی صاحب نے وحدت الوجود کو ضلالت، غیر اسلامی عقیدہ اور اسے عقیدۂ توحید قرار دینے کو وحدت الٰہ کے ساتھ مذاق قرار دیا ہے، اس کے جواب میں ڈاکٹر حسین الحق صاحب نے وحدت الوجود کے اثبات کے لیے عالمانہ بحث کی ہے۔

بیان نمبر تین میں عبدالمغنی صاحب نے ''ایمان'' کے لیے عرفان کی شرط کو مطلقا باطل قرار دیا ہے۔ حسین الحق صاحب نے اس پر تفصیلی گفتگو کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ایمان کے لیے معرفت کی شرط کی مطلقا نفی کر دینا بھی باطل ہے اور بالعموم سب کے لیے اس شرط کو لازم کرنا بھی درست نہیں، بلکہ یہ شرط کچھ خاص لوگوں کے لیے ہے، پھر اس کو انہوں نے چند مثالوں سے ثابت کیا ہے۔

ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اسی مقام سے علمائے سوء اور علمائے حق کا فرق نمایاں ہونے لگتا ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی صاحب جیسے ناقدین بہت آسانی سے حضرت شیخ اکبر اور حضرت وہاج الدین کو گمراہی کے کنارے کھڑا قرار دیتے ہیں مگر علمائے حق (حضرت امام ابوحنیفہ، حضرت امام مالک، حضرت امام حنبل اور حضرت امام شافعی) اور صوفیائے کرام اختلاف رائے کو معیار ضلالت و گمراہی قرار نہیں دیتے'' (ص: ۳۲)

آخر کے چند سطور میں ڈاکٹر صاحب نے اپنا معتدل موقف ان جملوں میں بیان کیا ہے:

''آخری بات: میں یہ نہیں مانتا کہ پروفیسر عبدالمغنی مرحوم اور ان کے دوسرے ہم خیال حضرات نے کل سے آج تک جو کچھ کہا، سب غلط ہے اور شیخ محی الدین ابن عربی یا حسن عسکری صاحب نے جو کچھ کہا سب صحیح ہے۔ دونوں صفوں کے علما بعض معاملات میں صحیح ہو سکتے ہیں اور بعض میں دونوں کو تسامح ہو سکتا ہے لیکن افسوس اس بات پر ہوتا ہے کہ کچھ لوگ موجودہ صوفی نما حضرات کی غلطیوں کے سبب ''ادارۂ تصوف'' پر حملہ کر بیٹھتے ہیں''۔ (ص: ۳۳)

سید صاحب کے دوسرے مقالے کا عنوان ''اقبال اور تصوف'' ہے۔ اس میں انہوں نے اقبال کے تعلق سے کچھ بیان کرنے سے پہلے تصوف پر روشنی ڈالی ہے، رقم طراز ہیں:

''فقہ اسلام کا ظاہر ہے اور تصوف اسلام کا باطن، داخل اور روح۔ یہی بات بہ انداز دیگر یوں بھی کہی جاسکتی ہے کہ تصوف اس کائنات کو، اس کے تخلیقی مراحل کو اور کائنات کے خالق کو سمجھنے اور اس کا عرفان حاصل کرنے کا نام ہے''

تصوف کا تعارف کرانے کے بعد لکھتے ہیں:

''مگر جب اختلافات کو سیاسی مصلحتوں کے تحت ضروری سمجھا گیا تو اسلامی اور غیر اسلامی تصوف کا شوشہ چھوڑا گیا جو آگے چل کر 'فقہی تصوف' اور 'اصلی تصوف' کے جامے میں ملبوس نظر آیا۔'' (ص: ۳۷)

مذکورہ بالا نظریہ درست ہے یا نہیں، اس سے قطع نظر، اگر تصوف حقیقت میں اسی ''احسان'' کا نام ہے، جیسا کہ مشائخ کا اس پر اتفاق ہے، جس کی طرف حدیث جبرئیل میں اشارہ کیا گیا ہے تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ تصوف کا کسی غیر اسلامی چیز سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح سید صاحب کے قول: ''فقہ، اسلام کا ظاہر ہے اور تصوف اسلام کا باطن'' سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ 'فقہی تصوف' اور 'اصلی تصوف' کی طرف تصوف کی تقسیم محل نظر ہے، بلکہ جس کو اصلی تصوف کا نام دیا جاتا ہے وہی 'تصوف' ہے۔

سید صاحب نے اپنے اس مقالے میں بڑے اچھے انداز میں اقبال کی شاعری کے حوالے سے ان کے صوفیانہ نظریات اور فلسفیانہ انداز کو بیان کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''بلکہ سچ پوچھئے تو اقبال انتہائی طور پر فلسفیانہ رویے کے حامل ہیں، ان کی شاعری میں ایک طرف ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں کائنات اور خالق کائنات کے تئیں مخصوص اور خالص فلسفیانہ نقطۂ نظر جھلک رہا ہے تو دوسری طرف ایسے اشعار بھی بکثرت تلاش کیے جاسکتے ہیں جن میں پیش کردہ خیالات اگر نثر میں پیش کر دیے جائیں تو موجودہ فقہی غلبے والا سماج شاید آسانی سے اسے ہضم نہ کر سکے۔'' (ص: ۴۰)

پھر اس کے بعد انہوں نے علامہ اقبال کے اس طرح کے کچھ اشعار نقل کیے ہیں، اخیر میں نتیجے کے طور پر سید صاحب نے علامہ اقبال کے بارے میں اپنا یہ ریمارک لکھا:

''اقبال نہ صرف یہ کہ تصوف کے حمایتی ہیں، بلکہ تصوف جس روشن خیالی اور آزادی اظہار کا استعارہ ہے وہ روشن خیالی اور جرأت اظہار اقبال کی پہچان ہے ۔۔۔ تیسری بات یہ کہ اقبال 'دین حنیف' کی جانب اسلام کے موافقانہ اور ہمدردانہ رویے کو اپنی وسیع النظری کے لیے بطور مشعل راہ استعمال کرتے ہیں اور فقہی شدت کے برعکس صوفیانہ رأفت و رحمت اور وسعت کے پیش نظر فقہی دائرے میں محدود خیر کو ہی 'خیر کل' نہیں سمجھتے، بلکہ جہاں جو خیر نظر آتا ہے اسے حضور اکرم ﷺ کے ارشاد گرامی **"الحکمة ضالة المؤمن اذا وجدها اخذها"** کے مطابق اپنے لیے لائق کسب و اختیار سمجھتے ہیں، اس لیے کہ حضور کے آخری خطبے میں عرب و عجم یعنی علاقے کی بنیاد پر حجت اور برتری کے رویے کو رد کر دیا گیا ہے اور یہی وہ اصل صوفی نقطۂ نظر ہے جو تمام اقوام کے لیے امن و

سلامتی کی ضمانت ہے۔'' (ص: ۴۱، ۴۲)

''وحدت الوجود اور معترضین تصوف'' کے عنوان سے ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی کا مقالہ پڑھنے کو ملا، جب میں نے اس کو پڑھنا شروع کیا تو شروع کے دو تین صفحات میں ایسا محسوس ہوا جیسے میں عربی مجلہ ''الاحسان'' میں حضور داعی اسلام کا انٹرویو پڑھ رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ وحدت الوجود پر عالمانہ گفتگو کرنے کے بعد تصوف کی مخالفت میں لکھی جانے والی کتاب ''شعر اقبال اور تصوف'' میں مذکور کچھ اعتراضات کے جواب دیے ہیں۔

ڈاکٹر حسن رضا خاں صاحب نے صوفیۂ کرام کے مجاہدات و ریاضات کو مختلف آیات قرآنی اور احادیث نبوی سے کافی اچھے انداز میں ثابت کیا ہے لیکن اسی میں ایک جگہ ہے:

''حدیث میں مذکور ایسی عبادت کہ جس میں بندہ خدا کو دیکھ رہا ہے اور یہ خیال کہ خدا بندے کو دیکھ رہا ہے، یہ مراقبہ ہے اور یہ دونوں تصوف کی اصلاحات ہیں'' (ص: ۵۹)

شاید یہاں کمپوزر کی کرم فرمائی سے عبارت کچھ سے کچھ ہوگئی ہے، عبارت غالباً یوں ہوگی:

''حدیث میں مذکور ایسی عبادت کہ جس میں بندہ خدا کو دیکھ رہا ہے، یہ مشاہدہ ہے اور یہ خیال کہ خدا بندے کو دیکھ رہا ہے، یہ مراقبہ ہے اور یہ دونوں تصوف کی اصطلاحات ہیں۔''

''تصوف سے فرار: اسباب اور سد باب'' کے عنوان سے ڈاکٹر سید سراج اجملی کا فکر انگیز مقالہ بھی زینت شمارہ ہے۔ اکثر مقالہ نگاروں کی طرح موصوف نے بھی اصل موضوع پر خامہ فرسائی سے پہلے تصوف کی تعریف، اس کا تعارف اور صوفیہ کے کچھ حالات اور اقوال بیان کیے ہیں۔ حاصل یہی ہے کہ تصوف اور طریقت، شریعت سے کوئی الگ چیز نہیں، بلکہ طریقت عین شریعت ہے۔ ''جس طرح جسم روح کے بغیر اور روح جسم کے بغیر نا قابل عرفان رہتی ہے، اسی طرح طریقت، شریعت کے بغیر اور شریعت طریقت کے بغیر آدھی ادھوری ہے'' جسم کو روح سے جو نسبت ہے وہی نسبت شریعت کو طریقت سے ہے۔ مثنوی ''**نغمات الاسرار فی مقامات الابرار**'' میں شریعت، طریقت، معرفت اور حقیقت کو نہایت دل چسپ اور قابل فہم پیرائے میں سمجھایا گیا ہے:

اے عزیز من شریعت قال ہے ۔۔۔ اور طریقت فعل، حقیقت حال ہے
معرفت اس حال کا انجام ہے ۔۔۔ جو خدا کا فضل اور انعام ہے
فضل گر خواہی ازو غافل مشو ۔۔۔ وز علوم معرفت جاہل مشو
بے شریعت کے طریقت ہے حرام ۔۔۔ بے طریقت کے شریعت نا تمام

سید صاحب نے خانقاہوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک جگہ فرمایا:

''پہلے خانقاہوں کے زیر اثر مدارس ہوتے تھے، علما صوفیائے کرام کے دست حق پرست پر بیعت کر کے اپنے آپ کو علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطنی میں بھی طاق کرتے تھے بلکہ پہلے ماہر علوم ظاہری ہونے کے بعد شیخ کے زیر اثر ریاضت وسلوک کے مراحل سے گزر کر وہ مرتبہ حاصل کرتے تھے کہ جو انہیں ہمیشہ کے لیے مرکز عقیدت اور مرجع تقلید بنا دیتا تھا۔''

گزشتہ خانقاہوں کا یہ حال پڑھ کر نتیجے کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مشائخ نے خانقاہوں کی بنیاد ہی تعلق باللہ قائم کرنے اور مخلوق خدا کو علوم ظاہری و باطنی سے آراستہ کرنے کے لیے رکھی تھی، وہ قرآن میں مذکور نبی کی صفت ''ویزکیھم'' کے حامل اور اس پر عامل تھے، لوگوں کے دلوں کو کدورتوں اور نجاستوں سے پاک کر کے ان کو انوار الٰہیہ اور تجلیات قدسیہ سے معمور کرنا خانقاہوں کے قیام کا مقصد تھا، کاش آج بھی خانقاہوں کا حال پہلے کی خانقاہوں کی طرح ہوتا، طلبہ اور علما کے اندر وہ طلب اور تڑپ ہوتی جو طلب، متقدمین علما کو مشائخ کی بارگاہوں تک پہنچنے پر مجبور کرتی تھی اور پھر وہ مشائخ کی صحبت میں رہ کر تاج معرفت وحقیقت کے حامل ہوتے تھے، لیکن ہمیں یہ بھی یقین رکھنا چاہیے کہ اللہ کی رحمت کا دروازہ ابھی بند نہیں ہوا ہے، اس کی بنائی ہوئی دنیا بہت بڑی ہے، اللہ کی یہ زمین اس کے محبوب بندوں سے قیامت تک کبھی خالی نہیں رہے گی، ان شاء اللہ، ڈھونڈنے والوں کو خدا مل ہی جاتا ہے، بس صرف ہمارے اندر طلب کا فقدان ہے، ورنہ تو اس کریم کے کرم کا تو یہ حال ہے کہ:

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے رہ رو منزل ہی نہیں

باقی سد باب اور تدارک کی جن مجوزہ صورتوں کو سید صاحب نے پیش کیا ہے، وہ واقعی لائق بیان اور قابل عمل ہیں۔

رسالے کے اخیر میں ڈاکٹر سید شاہ حسین احمد صاحب کے دو مقالے ہیں؛ پہلا ''اصطلاحات صوفیہ'' اور دوسرا ''تصوف: دینی حقیقت اور سماجی ضرورت'' کے عنوان سے ہے، دونوں مقالے تحقیقی ہیں اور خصوصا علما کے لیے لائق مطالعہ ہیں، پہلے مقالے میں انہوں نے اصطلاحات صوفیہ کو اچھے انداز میں سمجھانے کی کوشش کی ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:

''کچھ لوگ صرف کتابی علم رکھ کر اصطلاحات صوفیہ کو سمجھنا چاہتے ہیں اور سمجھانا چاہتے ہیں۔ ان حضرات کے علم و دانش سے انکار ممکن نہیں لیکن علم و دانش کے ساتھ ساتھ واردات کا ہونا بھی ضروری ہے اور بیشتر حضرات اس سے محروم ہیں، اس لیے ان سے

مصطلحات صوفیہ کی نقاب کشائی ممکن نہیں'' (ص:۱۰۹)

دوسری جگہ یوں رقم طراز ہیں جس سے پہلی عبارتوں کی کھل کر تشریح ہوجاتی ہے:

''شہسواران میدان معرفت کے اندر بیان کی خصوصیت کو آشکار کرنے کے لیے یا اس کے صحیح معنی ومفہوم تک پہنچنے کے لیے فنا و بقا کی منزلوں سے گزرنا ہوگا'' (ص:۱۰۸)

صوفیہ کی اصطلاحات اوران کے اشارات کو سمجھنے میں الفاظ کے پیچ وخم کو ترک کردینا پڑتا ہے، یہاں صرف زبان والے نہیں بلکہ اصحاب دل بھی ہوا کرتے ہیں، قال کے ساتھ حال بھی ہوتا ہے، ان کے یہاں حقایق کی تعلیم صرف سماع ہی سے نہیں بلکہ مشاہدات کے ذریعے بھی ہوتی ہے، ان کی صحبتوں میں جہاں کچھ سمجھ میں نہ آئے وہاں خاموش رہنا چاہیے کہ **من سکت نجا** ایسے ہی جگہوں کے لیے ہے، ایسے مقامات پر ان کی پیروی واجب نہیں ہے لیکن انکار واعتراض سے بھی سخت گریز کرنا چاہیے، یہی آداب بارگاہ مرشدین ہے، اپنی سمجھ اور گمان کے مطابق ان کے اقوال وافعال اور احوال کا خود ساختہ مطلب نکال کر بدگمانی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے، بدگمانی کے تعلق سے تو سخت وعیدیں آئی ہیں، اس میں صوفیہ اور مشائخ کی کیا تخصیص، بلکہ کسی سے بھی بے تحقیق بدگمان ہوجانا گناہ ہے ''**نغمات الاسرار فی مقامات الابرار**'' میں مشائخ کی بارگاہوں کے آداب اس طرح بتائے گئے ہیں:

اعتبارات و جہات اس کے سمجھ — اصطلاحات و لغات اس کے سمجھ
بد گمانی اور تکبر بے گماں — قاطع راہ طریقت ہے میاں
گر سمجھ سے دور ہو یہ علم و فن — پوچھ مردان خدا سے جان من
پھر بھی رہ جائے اگر ژولیدگی — تو سمجھ خود فہم کی نابالغی
اعتراض و شک و انکار و کلام — شیخ کی صحبت میں ہے مطلق حرام
گو سمجھ میں آئے تیرے یا نہ آئے — تجھ پہ لازم ہے کہ تو ایمان لائے
اس کی جو بھی بات سن اے بے خبر — رد اور انکار میں جلدی نہ کر
اور نہ ہی تقلید میں جلدی دکھا — بلکہ ساکت رہ کہ **من سکت نجا**
تو نے جو سمجھا ہے تیرا ہے گماں — **ان بعض الظن اثم** را بخواں

ڈاکٹر صاحب کا دوسرا مقالہ بھی کافی معلومات افزا ہے۔ ان کے اس مقالہ کا حاصل خود انہیں کی زبانی اس طرح ہے:

''آج ہم اور آپ ایسے سماج میں جی رہے ہیں جہاں آدمی بڑھتا جارہا ہے اور انسانیت گھٹتی جارہی ہے۔۔۔ اگر اسے وسیع تر تناظر میں دیکھا جائے تو ایک ملک دوسرے

ملک کا دشمن ہے، ایک مذہب کے ماننے والے دوسرے مذہب کے ماننے والوں سے نفرت کرتے ہیں، ایک ذات کے لوگ دوسری ذات کے لوگ کو پسند نہیں کرتے، حد تو یہ ہوگئی ہے کہ ایک ہی مذہب کے ماننے والے مسلک وعقائد کے نام پر ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں اور معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ ایک ادارہ دوسرے ادارہ کی بیدکنی پر تلا ہوا ہے، ایک خانقاہ دوسری خانقاہ کی مخالف ہے، چاروں طرف انسانیت کراہ رہی ہے، ایسے وقت میں تعلیمات تصوف کی از حد ضرورت ہے؛ کیوں کہ تصوف کا پہلا سبق ہے احترام انسانیت اور توکل علی اللہ، لوگوں کو توکل کی تعلیم دی جائے اوران کے اندر انسانیت کا جذبہ ابھارا جائے'' (ص:۱۱۸،۱۱۹)

ڈاکٹر صاحب کی اس طویل عبارت کو پڑھ کر حضور سیدی داعی اسلام کی وہ صوفیانہ دعوت انقلاب یاد آگئی جسے انہوں نے پوری انسانیت کو ان الفاظ میں دی ہے:

''آؤ! ایک نئی دنیا آباد کریں
امن وسلامتی کی دنیا، روحانیت اور دین داری کی دنیا
اور ایک ایسا انقلاب برپا کریں جو صوفیہ صافیہ کے منہاج پر ہو
کیوں کہ؛ صوفیہ کا طریق عمل ہی سب سے بہتر اور ان کی سیرت ہی سب سے پاکیزہ ہے
وہ عین شریعت پر قائم، چشمۂ وحدت سے سیراب اور مشکات نبوت سے روشن ہیں
اس لیے؛ مجھے صرف وہی انقلاب پسند ہے جو صوفیہ کے نقش قدم پر ہو'' (الاحسان، شمارہ:۴)

ان کے علاوہ ''تصوف کی عصری معنویت''، ''تصوف اور توکل علی اللہ'' اور دیگر مقالے بھی قابل ذکر ہیں، مفتی محمد ابراہیم آسی صاحب نے اپنے مقالے کے پہلے چار صفحات میں تصوف کی اہمیت وافادیت اور اس کی تعریف وتعارف کو اجاگر کیا ہے اور صرف تقریبا تین صفحوں میں اصل موضوع ''تصوف اور توکل علی اللہ'' پر گفتگو کی ہے اور توکل اور بے نیازی کو بیان کیا ہے۔

سہ ماہی ''دیوان'' کے ذمہ داران بطور خاص سرپرست گرامی قدر جناب ڈاکٹر سید شاہ حسین احمد صاحب مدظلہ زیب سجادہ حضرت دیوان شاہ ارزانی، پٹنہ ہماری طرف سے اس نیک اقدام پر قابل مبارک باد ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ اس رسالے میں آئندہ بھی تصوف پر مضامین اور خصوصی شمارے شائع ہوتے رہیں گے، اس لیے کہ صرف تعلیمات تصوف اور صوفیہ کے ذریعے ہی اس زمانے کے مسائل کا حل ممکن ہے۔

○○○

سال نامہ ''الاحسان'' (عربی) الہ آباد، شمارہ (۱)

تصوف پر شائع ہونے والا یہ پہلا عربی مجلہ جاذب نظر ہونے کے ساتھ علمی اور معلوماتی بھی ہے۔

محمد ناظم اشرف مصباحی

داعی اسلام شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی حفظہ اللہ تعالی کی سرپرستی میں چلنے والا ادارہ 'شاہ صفی اکیڈمی' سید سراواں، الہ آباد، نے اب تک کئی علمی و تحقیقی کام سرانجام دیے ہیں، جن میں سال نامہ 'الاحسان' اردو اور عربی، عوامی دینی رسالہ ماہ نامہ 'خضر راہ' اور مثنوی 'نغمات الاسرار فی مقامات الابرار' سرفہرست ہیں۔ الاحسان اردو کے چاروں شماروں پر نظر ڈالنے اور دو سال سے 'خضر راہ' کی مسلسل اشاعت کو دیکھنے کے بعد یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس ادارے نے غزالی و شعرانی کے افکار و نظریات کو عام کرنے کی کوشش کے ساتھ تصوف کی نشاۃ ثانیہ کی بنا ڈال دی ہے۔ اگر تعلیمات تصوف کو علمی و فکری نہج سے مدلل و محقق کرنے میں ان دونوں شخصیتوں کا اہم کردار رہا ہے تو دور جدید میں اس کے صحیح خد و خال کو واضح کرنے میں الاحسان ٹیم اور اس کے سربراہ لائق ستائش ہیں۔ الاحسان اردو کے گزشتہ شماروں کے اداریوں اور ابتدائیوں میں اس تحریک کی ہمہ گیریت کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ اب 'الاحسان' عربی کی اشاعت نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ دعوی صرف رسمی اور ادعائے محض نہیں بلکہ اس کی جڑیں حقیقت کی تہوں میں پیوست ہیں۔ ورنہ ہماری جماعت کا یہ ایک المیہ ہے کہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے سالوں تک اہداف و مقاصد کی فہرست میں اس کا اعلان ہوتا ہے جس کی تکمیل کے انتظار میں جوان آنکھیں بوڑھی ہو جاتی ہیں اور اگر اس کی تکمیل ہوتی بھی ہے تو کما حقہ نہیں ہو پاتی۔ ایسی صورت میں اس رسم کو توڑتے ہوئے بغیر کسی سابقہ اعلان و اشتہار کے ''الاحسان عربی'' کی اشاعت خود ایک انقلابی قدم ہے۔

جب ہم نے اس مجلّے کے متعلق ''الاحسان اردو'' کے چوتھے شمارے میں پڑھا تو سوچا

کہ الاحسان اردو ہی کے مضامین کا عربی زبان میں ترجمہ کر دیا گیا ہوگا؛ لیکن جب اس کے مطالعے کا اتفاق ہوا تو ہمیں حیرت ہوئی کہ توقع کے برخلاف یہ مجلہ نئے سرے سے جدید علمی، تحقیقی اور فنی لوازمات کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔

الاحسان اردو کے چوتھے شمارے میں اس مجلّے کے مجلس شوریٰ کا تعارف پیش کر دیا گیا تھا جس میں مصر کے سات معتبر نام، جب کہ علما و مشائخ اور پروفیسر حضرات سمیت ہندوستان کے نو جلیل القدر حضرات شامل تھے، مصر کے ڈاکٹر مفتی علی جمعہ، سابق مفتی اعظم مصر، ڈاکٹر شیخ محمد مہنا، ڈاکٹر طٰہٰ حبیشی، شیخ محمد خالد ثابت وغیرہم اور ہندوستان کے شیخ ابو بکر احمد، پروفیسر اختر الواسع، ڈاکٹر علیم اشرف جائسی اور پروفیسر مسعود انور علوی قابل ذکر ہیں۔ اور اس کے ادارتی بورڈ میں ''رئاسۃ التحریر'' کے تحت حسن سعید صفوی، ''مسئولیۃ التحریر'' کے تحت ضیاء الرحمٰن علیمی اور ذیشان احمد مصباحی، ''مساعدۃ التحریر'' کے تحت مجیب الرحمن علیمی، اظہار احمد ثقافی، مظفر آفاق ازہری اور رکن الدین سعیدی اور ''مسئول المکتب'' کے تحت غلام مصطفی ازہری کے نام درج ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے آپ میں ایک مشن کی حیثیت رکھتے ہیں، کسی مجلّے کے مجلس ادارت میں ان سب کا جمع ہو جانا اس کی اہمیت سمجھنے کے لیے کافی ہے۔

یہ مجلہ ''افتتاحیہ'' اور ''کلمۃ العدد'' کے علاوہ مندرجہ ذیل کالموں میں منقسم ہے: (۱) حوار (۲) من تراث السلف (۳) ماھو التصوف؟ (۴) قضایا التصوف (۵) دراسات و ابحاث (۶) الربانیون (۷) اوضاع و افکار اور ''من مائدۃ العرفان'' اور جا بجا آیات قرآنی، احادیث اور سبق آموز اقتباسات کو چھوڑ کر ۲۹ رمضامین شامل اشاعت ہیں، جن میں دس سے زیادہ، علما مصر کے ہیں۔

افتتاحیہ میں ''کلمات عن الاحسان'' کے عنوان کے تحت مولانا حسن سعید صفوی نے اس مجلّے کی اشاعت کے تعلق سے اپنے دلی احساسات کو بیان کرنے کے ساتھ، اس کے مقصد پر بھی روشنی ڈالی ہے، کہ اس کی اشاعت کا مقصد احیائے تصوف کے مشن کے لیے ذہن سازی کرنا اور تصوف کے تعلق سے اپنے اور بے گانوں کے شبہات کا ازالہ کرنا ہے۔ نیز عرب و عجم کے مابین پیدا ہونے والی گہری خلیج کو پاٹنا، اس کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے۔

مولانا ذیشان احمد مصباحی نے ''الی التصوف من جدید'' کے عنوان سے تصوف کی حقیقت، موجودہ عہد میں تصوف کی ضرورت و معنویت کو واضح کرنے اور مخالفین و موافقین کے درمیان پیدا شدہ غلط فہمیوں کے ازالے کی کوشش کی ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ ظاہر شریعت پر عمل کرنے والے کچھ متشدد سلفی حضرات جو صوفیہ پر حدیث کے سلسلے میں تساہل برتنے، انبیا و اولیا کی

شان میں غلو کرنے کی تہمت لگاتے ہیں، یہ بالکل غلط ہے، بلکہ حقیقت میں صوفی تو وہ ہے جو ظاہر و باطن اور شریعت وطریقت دونوں پر عامل ہو، جیسا کہ حضرت داعی اسلام شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی دام ظلہ العالی کے پیغام کا ایک حصہ ہی یہی ہے:

''نرید ثورۃ اسلامیۃ علی مبدأ الصوفیۃ الصافیۃ''

''ہم صوفیۂ کرام کے نقش قدم پر ایک اسلامی انقلاب کے خواہاں ہیں''

بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جو صوفیت کا دعویٰ کرے اور اسلاف کے نقش قدم پر نہ چلے تو اس کا یہ دعوی، باطل محض ہے۔ مولانا مصباحی رقم طراز ہیں:

''من تصوف و لم یتسلف فقد تضلل و من تسلف و لم یتصوف فقد تمرد و من جمع بینھما فقد تحقق'' (ص:۱۱)

''جو صوفیت اختیار کرے اور اسلاف کے طریقے پر نہ چلے وہ گم راہ ہے، جو سلفیت اختیار کرے اور خود کو سرچشمۂ تصوف سے سیراب نہ کرے وہ مردود و خود سر ہے اور جو دونوں کا جامع ہو وہی جادۂ حق پر ہے۔''

آپ نے اس تحریر میں ''عصر حاضر میں تصوف کے تقاضے کیا ہیں اور اس عہد میں احیاے تصوف کا طریقۂ کار کیا ہو؟ جیسے سوالات کو اٹھایا ہے اور ان کا تشفی بخش جواب بھی دیا ہے۔

کالم ''**حوار**'' کے تحت داعی اسلام شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی دام ظلہ العالی کا انٹرویو شائع کیا گیا ہے، جس میں علماے ربانی کون ہیں؟ اور علماے سو کی پہچان کیا ہے؟ تصوف اور باطنیت کے درمیان کیا فرق ہے؟ وحدۃ الوجود کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ اہل ہند، خصوصاً کفار و مشرکین تک دعوت دین کیسے پہنچائیں؟ اور تصوف کا مستقبل کیا ہے؟ جیسے سوالات کیے گئے ہیں اور ان کے علمی اور فکر انگیز جوابات دیے گئے ہیں۔ ''**من تراث السلف**'' کے کالم میں علامہ قطب الدین دمشقی کی تصنیف رسالہ مکیہ کی ایک فصل کو رکھا گیا ہے۔ ''**ماھو التصوف**'' کے کالم میں سات مضامین شامل ہیں، جن میں ڈاکٹر مفتی علی جمعہ کی تحریر ''**الاحسان من ارکان الدین**'' کو اول جگہ دی گئی ہے۔ موصوف کی تحریر کا خلاصہ ان کی اس عبارت میں مل جاتا ہے:

و منہج اھل التصوف یستمد اصولہ و فروعہ من القرآن و السنۃ النبویۃ و خیر دلیل علی ذالک قول سید ھذہ الطائفۃ (الصوفیۃ) الامام الجنید: "علمنا ھذا مقید بالکتاب و السنۃ"۔ (ص:۲۲) ''اہل تصوف کے اصول و فروع قرآن و سنت سے ماخوذ ہیں اور اس کی سب سے بڑی دلیل سرخیل جماعت صوفیہ حضرت جنید بغدادی کا یہ ارشاد ہے: ہمارا علم کتاب و سنت سے مستحکم ہے''

اس کے علاوہ اسی کالم میں شیخ حسن نجار محمد کا مضمون ''**التصوف علم و عمل**'' اور ڈاکٹر عادل محمد سرور کا ''**التصوف اصلہ و حقیقتہ**'' بھی کافی معلومات لیے ہوئے ہے۔

قضایا التصوف کے کالم میں پانچ جبکہ **دراسات و ابحاث** کے کالم میں چار مقالات مندرج ہیں۔ پہلا مقالہ ''**قضیۃ الشیخ و المرید**'' کے عنوان سے ڈاکٹر محمد مہنا کا ہے، جب کہ شطحات مشائخ پر مولانا امام الدین سعیدی نے اور عصر حاضر میں بیعت و ارادت کی ضرورت و اہمیت پر مولانا غلام مصطفی ازہری نے اپنے قلم کی جولانیت دکھائی ہے۔ دراسات و ابحاث میں ڈاکٹر طہٰ حبیشی کی تحریر ''**ظاھرۃ التصوف فی منھج المفکرین**'' باعتبار زبان و ادب کے سخت ہونے کے باوجود معلومات افزا ہے۔ ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی کی تحریر ''**اھمیۃ تربیۃ الصوفیۃ و اثرھا علی المجتمع**'' اور مولانا ضیاء الرحمن علیمی کا مضمون ''**الشیخ علی المھائمی و آثارہ العلمیۃ**'' اس کالم کی جان ہیں۔ **الربانیون** کے کالم میں آٹھویں صدی ہجری کے بزرگ سید محمد حسینی بندہ نواز گیسو دراز، شیخ عبد الصمد مخدوم شاہ صفی (۹۴۰ھ)، شیخ عبد الوہاب شعرانی (۸۹۸ھ)، قاضی ارتضا علی خان گوپاموی (۱۲۷۰ھ) اور سید محمد زکی ابراہیم قدس اللہ سرھم کے حالات و کوائف پر روشنی ڈالی گئی ہے جو بالترتیب پروفیسر مصطفی شریف، مولانا مقصود عالم ثقافی، شیخ خالد ثابت، مولانا مجیب الرحمن علیمی اور امین العشیرۃ المحمدیۃ (قاہرہ) کے قلم کا نتیجہ ہیں۔ اخیر میں اوضاع و افکار کے تحت مولانا جہانگیر حسن مصباحی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کی عصری اہمیت پر اور ڈاکٹر جمال فاروق نے تصوف کی اہمیت پر اظہار خیال فرمایا ہے، جب کہ مولانا اظہار احمد ثقافی نے داعی اسلام مدظلہ العالی کے معتدل افکار و نظریات اور منہج دعوت کو پیش کیا ہے۔

اس مجلّے کی طباعت میں خوب صورتی کا کافی خیال رکھا گیا ہے، ٹائٹل پیج اور مواد کی پیش کش میں عصری تقاضوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے اور پروف ریڈنگ کی غلطیوں سے حتی الامکان محفوظ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، البتہ اس کی موجودہ سائز مناسب نہیں معلوم ہوتی، میگزین سائز کے ۱۴۰ صفحات پر مشتمل اس مجلّے کی قیمت ۱۰۰/روپے رکھی گئی ہے۔ مجموعی طور پر یہ مجلہ دلکش اور جاذب نظر ہونے کے ساتھ علمی، فکری، تحقیقی اور معلومات افزا ہے۔

(اشاعت: فروری ۲۰۱۳ء، صفحات: ۱۵۰، قیمت: ۱۰۰روپے
ناشر: شاہ صفی اکیڈمی، جامعہ عارفیہ، سید سراواں، کوشامبی، یوپی)

○○○

صوفی ادب

پروفیسر اختر الواسع

ہندوستان میں صوفی ادب

تصوف کی روایت کے اثرات ہندوستان کے چپے چپے پر ثبت ہیں۔ یہاں سروں پر چاہے جس کی حکمرانی رہی ہو، دلوں پر ہمیشہ اولیاء اللہ کی حکمرانی رہی اور ان کے ملک وکشور کی سرحدیں مذہب، نسل، رنگ اور علاقوں کی سرحدوں کو پار کر گئی۔

صوفیہ کرام کی نورانی شخصیات نے تمام تعصّبات سے بالاتر ہوکر عہد الست کا نغمۂ جاں بخش اس سرزمین کو دیا اور یہاں باہمی الفت و یگانگت کی بے مثال فضا قائم کی۔ صوفیۂ کرام کا پیغام، ان کے عمل، ان کی شخصیت اور ان کی نورانی زندگی کے جلو میں اس سرزمین کے باسیوں کو ملا اور انہوں نے اپنی اپنی صلاحیت کے اعتبار سے اس کو اپنے عقیدے اور عقیدت کا محور بنایا۔ عقیدے اور عقیدت کی کارفرمائی روحانیت کی کلید اور عمل کی ضمانت ہوتی ہے لیکن بسا اوقات عقیدہ اور عقیدت حجاب بھی بن جاتے ہیں۔ عقیدت کے ساتھ عقل سلیم اور عقیدے کے ساتھ عمل صالح نہ ہو تو اصل پیغام کرامات وخرافات میں گم ہو جاتا ہے، مراکز رشد وہدایت آمدنی کے ذرائع میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور نگاہیں لوگوں کے اعمال کی اصلاح کے بجائے ان کی جیبوں پر مرتکز ہو جاتی ہیں۔ اور ہمارے ملک میں ایسا ہوا بھی۔

صوفیۂ کرام کو اس کا احساس تھا کہ ایک وقت میں عقیدت محض نسبت بن کر رہ جائے گی اصل پیغام گم ہو جائے گا، اس لیے انہوں نے اول دن سے اس کا بھی التزام کیا کہ ان کے پیغام کو یک گونہ قلم وقرطاس کی مدد سے سفینوں میں محفوظ کر دیا جائے۔ بعض صوفیہ نے اپنے مرشدوں کے ملفوظات کو قلم بند کیا اور تصوف کے بعض اہم دانشوروں نے پوری روایت تصوف کو تاریخ یا تذکرہ کی شکل میں کتابوں میں محفوظ کر دیا۔ ایسے بھی صوفیۂ کرام تھے جنھوں نے اپنے واردات اور اپنے مطالعہ وغور وفکر کے حاصل کو خود کتابی شکل میں مدون کر دیا۔

تصوف میں ایک خاص اصطلاح اخوان کی ہے یعنی ہم خیال صوفیہ، حضرت جنید بغدادی

سے لے کر آج تک صوفیہ میں اس کی خاص اہمیت رہی ہے کہ ایک فکر کے اور ایک خیال کے صوفیۂ کرام آپس میں تبادلۂ خیال کر کے اپنے فکر و عمل کو مزید جلا بخشیں۔ سماع کے جواز کے مسئلے میں صوفیہ نے جو بنیادی شرائط رکھی ہیں ان میں ایک اخوان بھی ہے یعنی سماع صرف ہم مشرب صوفیہ کی موجودگی میں ہی جائز ہے۔ ہم مشرب صوفیہ بسا اوقات اک ہی شہر یا ایک ہی مقام پر موجود نہیں ہوتے بلکہ الگ الگ شہروں میں ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہم نشینی کا لطف اٹھانے کے لیے صوفیۂ کرام نے خطوط نویسی کا سلسلہ شروع کیا۔ اس سلسلہ کو سب سے زیادہ ترقی حضرت جنید بغدادی نے دی۔ صرف عمرو بن عثمان مکی کے نام ان کے ایک ہزار خطوط کا تذکرہ ملتا ہے۔ دیگر صوفیہ کے ساتھ بھی ان کی مراسلت تھی۔ ان مکاتیب میں صوفیۂ کرام اپنے ان مخصوص واردات اور مشاہدات کا تذکرہ کرتے تھے جن کا تذکرہ عام محفل میں مناسب نہیں ہوتا تھا یا جن کو کتابوں کے صفحات میں لکھنا مناسب نہیں تھا۔ ان معارف و حقائق کو بالعموم صوفیۂ کرام مکاتیب کی شکل میں ایک دوسرے کو بیان کرتے اور ان پر تبادلۂ خیال کرتے۔ بعد میں متعدد صوفیہ نے مکاتیب کو عوام کی اصلاح اور مریدوں کی تربیت کے لیے بھی استعمال کیا اور ان کے مریدین و متوسلین نے ان خطوط و مکاتیب کو یکجا کر کے مجموعوں کی شکل میں مرتب کیا۔

تصوف کے پورے ذخیرے پر نظر ڈالیں تو ابتدا سے تمام شکلوں کی تصنیفات تصوف کے دائرے میں نظر آتی ہیں۔ ابو سعید الخراز اور حکیم ترمذی نے چوتھی صدی میں صوفیانہ افکار و اعمال اور واردات پر متعدد کتابیں لکھیں۔ صوفیہ کے تذکرے پر ابو عبدالرحمن سلمی اور ابو نعیم اصفہانی نے بالترتیب طبقات الصوفیہ اور حلیۃ الاولیاء اور فارسی میں شیخ الاسلام عبداللہ انصاری نے طبقات الصوفیہ لکھی۔ خاص فن تصوف پر ابونصر سراج نے اللمع فی التصوف، ابوبکر کلاباذی نے التعرف لمذہب اہل التصوف، امام ابوالقاسم القشیری نے الرسالۃ القشیریۃ وغیرہ لکھی۔ ملفوظات میں سہلجی نے النور من کلمات ابی طیفور اور شیخ محمد بن منور نے اسرار التوحید فی مقامات ابی سعید لکھی اور بعد میں لگاتار ان تصنیفات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ بعد کے صوفیہ نے عربی کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی ان موضوعات پر کتابیں لکھیں۔

تصوف کا سلسلہ بغداد اور مشرق وسطی سے نکل کر ایک طرف افریقہ کے ممالک میں پھیلا۔ دوسری طرف یہ سلسلہ ہندوستان میں داخل ہوا۔ ہندوستان میں بہت سے صوفیہ ابتدا میں ہی آ گئے تھے۔ لیکن تاریخی طور پر ہندوستان میں تصوف کی پہلی بڑی شخصیت حضرت داتا گنج بخش علیہ الرحمہ کی ہے۔ وہ نہ صرف تصوف کی عملی روایت کے بڑے امین ہیں بلکہ تصوف کی علمی روایت کے بھی پاس دار ہیں۔ کشف المحجوب لکھ کر انہوں نے تصوف کو ہندوستان اور دنیائے عجم میں متعارف کرایا۔ حضرت داتا صاحب کے بعد ہندوستان میں تصوف کی علمی و عملی روایت کا آغاز ہوا۔ بے شمار صوفیہ

نے اپنے مرشدوں کے ملفوظات مرتب کیے۔ متعدد صوفیہ نے تذکرے اور تصوف کی کتابیں لکھیں۔

ہندوستان میں صوفی لٹریچر بنیادی طور پر فارسی میں لکھا گیا۔ گزشتہ صدی سے اردو میں بھی اس علم کی اہم کتابوں کی تصنیف کا آغاز ہوا۔ مجموعی طور پر ہندوستان میں تصوف پر ہر طرح کی کتابیں لکھی گئیں۔ تذکرے بھی لکھے گئے، ملفوظات جمع کیے گئے، فنی کتابیں لکھی گئیں، تصوف کے علوم و معارف پر کتابیں لکھی گئیں۔ تصوف کی ان کتابوں میں سب سے اہم تو تصوف کی فنی کتابیں ہیں۔ فنی اعتبار سے ہندوستان میں سب سے اہم کتاب حضرت داتا گنج بخش کی معرکہ آراء تصنیف ''کشف المحجوب'' ہے۔ یہ کتاب نہ صرف ہندوستان میں تصوف کی پہلی کتاب ہے بلکہ مجموعی طور پر فارسی ادب کی پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب نے تصوف کو عرب کے باہر عجم کے علاقوں میں متعارف کرایا۔ کشف المحجوب اپنے درجۂ استناد کے اعتبار سے رسالہ قشیریہ اور اللمع فی التصوف سے کم نہیں ہے۔ تصوف کو مخصوص منہاج اور اسلوب عطا کرنے میں اس کتاب کا اہم کردار ہے۔ خاص طور پر تصوف میں صحو کی روایت کو فروغ دینے میں اس کتاب کی بڑی اہمیت ہے۔

صوفی حمید الدین ناگوری، شیخ فخر الدین عراقی اور سید محمد امیر حسینی نے بعض کتابیں تصنیف کیں۔ خاص طور پر مؤخر الذکر نے وحدۃ الوجودی تصوف پر کئی کتابیں لکھیں۔ شیخ محمود سبشتری کی گلشن راز جو وحدۃ الوجود کی اہم کتاب مانی جاتی ہے۔ اس سے متعلق کچھ سوالات بھی قائم کیے۔ ان کی بیشتر کتابیں ابھی مخطوطات کی شکل میں ہیں اس لئے ان کا صحیح مقام و مرتبہ بھی ہنوز طے ہونا باقی ہے۔ تصوف کی علمی روایت میں داتا صاحب کے بعد سب سے بڑا نام شیخ شرف الدین یحیٰ منیری کا ہے۔ وہ بڑے کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ ان کی تصنیفات میں مکتوبات بھی ہیں، ملفوظات بھی ہیں اور کتابیں بھی ہیں۔ ان کی کتابیں جیسے ارشاد الطالبین، شرح آداب المریدین، فوائد المریدین وغیرہ بہت اہم ہیں۔

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز بھی تصنیف و تالیف کے میدان میں بڑی شخصیت ہیں۔ ان کی کم و بیش ۱۳۱/ کتابوں کے نام ملتے ہیں، جن میں نصف سے زیادہ زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ حضرت خواجہ بندہ نواز کا ایک اہم ترین پہلو ان کی علمیت ہے۔ انہوں نے تصوف کے مختلف پہلوؤں پر لکھا اور جو لکھا اعلی درجے کا لکھا۔ انہوں نے قدیم صوفیہ کی حکمت کو اپنی زبان اور اپنے ماحول کے مطابق پیش کیا۔ تصوف کی بیشتر مستند کتابوں کی شرح بھی لکھی۔ مثلاً عوارف المعارف، التعرف لمذہب اہل التصوف، آداب المریدین، فصوص الحکم، رسالہ قشیریہ اور تمہیدات عین القضاۃ کی شروحات لکھ کر اور قوت القلوب پر حواشی تحریر فرما کر تصوف کی قدیم روایت کو برصغیر کی فضا میں زندۂ جاوید کیا۔

حضرت گیسو دراز کا ایک اور بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے قرآن پاک کی صوفیانہ تفسیر

بھی لکھی۔ کئی بڑے صوفیہ ان سے قبل بھی صوفیانہ تفسیر لکھ چکے تھے لیکن ہندوستان میں سب سے پہلے خواجہ گیسو دراز نے ہی تفسیر لکھی۔ پندرہ جلدوں پر مشتمل یہ تفسیر عربی زبان میں ہے اور ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے۔ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے تعلق سے ایک بات اور بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ آپ نے معراج العاشقین کے نام سے اردو زبان کی پہلی نثری کتاب تصنیف کی۔

ہندوستان میں خواجہ بندہ نواز تصوف کے سب سے بڑے مصنف ہیں۔ ان کی تصنیفات سارے ذخیرہ تصوف کا عطر ہیں اور ان کی کتابوں میں ایک اہم پہلو یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے احوال وظروف کے مطابق مریدین کی اصلاح کا طریقہ تجویز کیا اور اپنی تصنیفات میں ان کو جا بجا بیان کیا بلکہ ''خاتمہ'' کے نام سے ایک مستقل کتاب بھی تصنیف فرمائی جس میں ہندوستان کے مخصوص سماجی حالات کی رعایت کے ساتھ راہ سلوک پر گامزن ہونے کی ہدایات ہیں۔ یہ کتاب حیدرآباد سے شائع ہو گئی ہے۔

حضرت خواجہ کے بعد تصوف کی تاریخ میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی کا نام بڑی اہمیت سے لیا جاتا ہے۔ آپ کی متعدد تصنیفات موجود ہیں ان میں انوار العیون سب سے زیادہ مشہور ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بڑے جامع کمالات تھے۔ انہوں نے تفسیر، حدیث، فقہ، حکمت شریعت، کلام، تصوف سبھی موضوعات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ تصوف کے حوالے سے آپ کی تین کتابیں بہت اہم ہیں۔ ایک ''الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ'' دوسری القول الجمیل اور تیسری ہمعات۔ آخری کتاب تصوف کی تاریخ اور صوفیہ کے اذکار پر ہے۔ اگرچہ یہ ایک مختصر کتاب ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ بہت سے کتاب خانوں پر بھاری ہے۔ اس مختصر سی کتاب میں انہوں نے تصوف کی تاریخ کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے اور پوری تاریخ کو چار ادوار میں تقسیم کر کے ان کے امتیازات بیان کیے ہیں۔

شاہ ولی اللہ کی دوسری کتابوں میں بھی تصوف کے مباحث بڑی تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ آپ کی کتاب انفاس العارفین صوفیہ کا تذکرہ ہے۔ فیوض الحرمین میں اپنے واردات اور خوابوں کو بیان کیا ہے۔ سطعات اور الخیر الکثیر میں اور بعض جگہ حجۃ اللہ البالغہ میں اور التفہیمات الالہیہ میں بھی تصوف کے مباحث کا بیان ہے۔

شاہ ولی اللہ نے تاریخ میں پہلی مرتبہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے درمیان تطبیق دینے کی کوشش بھی کی ہے، ان کا ایک مستقل رسالہ اس موضوع پر ہے۔

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی صوفیہ کی اس سنہری زنجیر میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے تصوف کی تفہیم اور راہ سلوک کے غامض مضامین کو اردو میں ڈھالنے کا کام کیا۔ حاجی صاحب

وحدۃ الوجودی صوفی تھے۔ اس لیے ان کی تصنیفات میں وحدۃ الوجود کا رنگ غالب ہے اور بیشتر تصنیفات نظم کی صورت میں ہیں۔ ان کی تصنیفات میں ضیاء القلوب، ارشاد مرشد، مثنوی تحفۂ عشاق، بیان وحدۃ الوجود اور مثنوی گلزار معرفت کافی مشہور ہیں۔

صوفی لٹریچر کا دوسرا اہم حصہ ملفوظات کا ہے، جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے اجلہ صوفیہ اپنے مرشدوں کے زبانی ارشادات اور ملفوظات کو کتابی صورت میں مدون کر لیا کرتے تھے۔ ہندوستان میں بھی صوفیۂ کرام نے اس روایت کو باقی رکھا۔ غالباً سب سے پہلے حضرت خواجہ غریب نواز علیہ الرحمہ نے اپنے مرشد خواجہ عثمان ہارونی کے ملفوظات انیس الارواح کے نام سے مرتب کیے۔ حضرت خواجہ اجمیری کے ملفوظات ان کے مرید خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے دلیل العارفین کے نام سے مرتب کیے۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے ملفوظات ان کے مرید بابا فرید الدین گنج شکر نے ارشاد السالکین کے نام سے مرتب کیے۔ بابا فرید کے ملفوظات ان کے مرید حضرت نظام الدین اولیاء نے راحت القلوب کے نام سے مرتب کیے اور ان کے دوسرے ملفوظات ان کے دوسرے مرید خواجہ بدر اسحق نے اسرار الاولیاء کے نام سے مرتب کیے۔

ہندوستان میں ملفوظات کی تاریخ میں سب سے معیاری اور مستند کام حضرت نظام الدین اولیاء کے وہ ملفوظات ہیں جو ان کے خاص مرید حضرت خواجہ حسن سنجری نے فوائد الفواد کے نام سے ترتیب دیے۔ ان کے دوسرے مرید حضرت امیر خسرو نے افضل الفواد کے نام سے ایک مجموعہ اور مرتب کیا تھا۔ حضرت نظام الدین کے خلیفہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے ملفوظات ان کے خلیفہ حمید قلندر نے خیر المجالس کے نام سے مرتب کیے۔ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے خلیفہ حضرت سید محمد حسینی المعروف خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے ملفوظات ان کے صاحب زادوں نے مرتب کیے جن میں جوامع الکلم کو خاص طور پر شہرت حاصل ہوئی۔

ملفوظات کی تاریخ میں لطائف اشرفی کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ یہ سید اشرف جہانگیر سمنانی کے ملفوظات ہیں جو تین جلدوں میں ان کے تلامذہ نے مرتب کیے یہ ملفوظات تصوف کے اسرار و رموز اور اپنے عہد کے سماجی حالات دونوں کے لیے بہترین مرجع کی حیثیت رکھتے ہیں۔

متاخر صوفیہ میں شاہ غلام علی دہلوی کے ملفوظات در المعارف اور ہدایۃ الطالبین بہت اہم ہیں۔ شاہ فخر الدین کے ملفوظات فخر الطالبین کی تاریخی اہمیت بھی قابل ذکر ہے۔

حضرت شرف الدین یحییٰ منیری کے ملفوظات تعداد کے لحاظ سے سب سے زیادہ ہیں۔ ان کے مریدین اور تلامذہ نے مختلف ناموں سے ان کے ملفوظات کے نو مجموعے مرتب کیے۔ ان میں معدن المعانی، مخ المعانی، مونس المریدین وغیرہ بڑے اہم مجموعے ہیں۔

بعض اجلہ صوفیہ جیسے سید جلال الدین بخاری، شیخ برہان الدین غریب، مولانا ضیاء الدین نخشبی، شیخ ابوالفتح رکن الدین کے ملفوظات بھی بہت اہم ہیں۔ ان ملفوظات کی تاریخی اور دینی اہمیت کا اعتراف بالعموم تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔

ملفوظات عام طور پر فارسی زبان میں مرتب کیے گئے چوں کہ عہد وسطی میں فارسی علمی زبان تھی جب اردو کا چلن عام ہوا تو اردو میں بھی صوفیہ کے ملفوظات لکھے جانے لگے۔ اردو کے ملفوظات میں غوث علی شاہ پانی پتی کے مجموعۂ ملفوظات ''تذکرہ غوثیہ' کی بڑی اہمیت ہے۔ انیسویں صدی کے وسط میں ان کے ملفوظات ان کے مرید گل حسن شاہ نام کے ایک افغانی صوفی نے مرتب کیے۔ یہ ملفوظات گوناں گوں خوبیوں کا مجموعہ ہیں۔ ان میں تاریخی معلومات کا بھی خزانہ ہے اور انیسویں صدی کے زوال پذیر ہندوستانی مسلم معاشرے کی قلمی تصویر بھی نظر آتی ہے۔ موسم، ماحول، طریق تدریس، طریقۂ سلوک اور ہندوستان سے باہر حجاز کے حالات کے لیے بھی یہ ایک اہم دستاویز ہے۔ اس کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ برصغیر کے گاؤں گاؤں اور شہر شہر جو صوفیۂ کرام اس وقت تھے، ان کا ایک مستند مرجع بھی یہ کتاب ہے۔

بعد کے صوفیہ کے یہاں ملفوظات نویسی کو بڑا فروغ ملا۔ اور تقریباً ہر قابل ذکر صوفی کے ملفوظات ان کے تلامذہ اور متوسلین نے جمع کئے۔ ملفوظات فارسی اور اردو کے علاوہ ہندوستان کی مقامی زبانوں میں بھی ترتیب دیے گئے۔ کشمیری، سندھی، بلوچی، بنگلہ وغیرہ زبانوں میں بہت سے ملفوظات کے مجموعے موجود ہیں۔

ہندوستان میں صوفیہ کے ملفوظات کو بڑی ترقی ملی۔ بلکہ ملفوظاتی ادب کے اعتبار سے ہندوستان کا نام سرفہرست ہے۔ چوں کہ عہد وسطی میں بکثرت ملفوظات لکھے گئے اور اس صنف کو بڑا قبول حاصل ہوا۔ اس لیے بہت سے ملفوظات کے بارے میں یہ تاثر بھی پیدا ہو گیا کہ یہ حقیقی نہیں بلکہ جعلی ہیں۔ یعنی یہ ملفوظات اس صوفی کی محفل میں نہیں لکھے گئے تھے۔ مصنف نے اپنی یادداشت سے لکھے اور ان کو منسوب کر دیا۔ اس پر پروفیسر محمد حبیب کا ایک طویل مقالہ شائع ہو چکا ہے اور سید صباح الدین عبدالرحمن نے اس کا علمی محاکمہ بھی کیا ہے جو پہلے معارف میں چھپا بعد میں بزم صوفیہ کے ضمیمہ کے طور پر شائع ہوا۔ پروفیسر اسلم فرخی اور پروفیسر نثار احمد فاروقی نے ملفوظاتی ادب کا مجموعی طور پر جائزہ لیا ہے۔ صوفیہ کے یہ ملفوظات ایک طرف تو علم وحکمت کا گنجینہ ہیں۔ راہ سلوک کی مشکلات کی کشود ہیں۔ دوسری طرف ان کی تاریخی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے۔ عہد وسطی کے تاریخ نویسوں نے بادشاہوں کی تاریخ لکھی ہے۔ صوفیۂ کرام کے یہ ملفوظات سماجی تاریخ ہیں۔ عہد وسطی کے معاشرہ کی جھلک ان ملفوظات میں نظر آتی ہے۔ گویا ملفوظات کی اہمیت تصوف

کے حوالے سے تو مسلم ہے۔ تاریخ کے حوالے سے بھی ملفوظات بہت اہمیت کے حامل ہیں۔

صوفی لٹریچر میں تذکرہ نگاری کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ جہاں تک ہندوستان میں صوفیہ کے تذکروں کا تعلق ہے تو ہندوستان میں صوفیہ کی تذکرہ نگاری دہلی سلطنت کے قائم ہو جانے کے بعد شروع ہوئی۔ صوفیہ کا پہلا باضابطہ تذکرہ، شیخ جمالی کی سیر العارفین ہے۔ یہ مختصر سی کتاب ہے اور اس میں زیادہ تذکرہ ہندوستان سے باہر کے صوفیہ کا ہے لیکن ہندوستان کے صوفیہ کے حوالے سے بھی اس کی بڑی اہمیت ہے۔

سیر العارفین کے بعد امیر خورد کرمانی نے سیر الاولیاء کے نام سے ایک جامع تذکرہ لکھا جس میں ہندوستان کے اکثر صوفیہ کے حالات بھی درج ہیں۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا جامع تذکرہ اخبارالاخیار ہندوستان کے صوفیہ کے لیے بنیادی مرجع کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے بعد جتنے تذکرے لکھے گئے عام طور پر اس کتاب کی روشنی میں لکھے گئے۔ اخبارالاخیار کے بعد صوفیہ کے تذکروں کی تعداد میں بہت تیزی سے اضافہ ہوا۔ عہد شاہجہانی میں ذکر جمیع اولیاء دہلی لکھا گیا۔ سیر الاقطاب، قصر عارفاں، مرأۃ الاسرار، خزینۃ الاصفیاء، مونس الارواح، تذکرۂ اولیاء ہند جیسے تذکرے لکھے گئے۔ اور پھر علاقائی سطح پر بھی تذکرے لکھے گئے جیسے تذکرہ اولیاء دکن، تذکرۂ اولیاء پنجاب، تاریخ صوفیۂ میوات وغیرہ اور ایک ایک صوفی کے حالات وکوائف پر مشتمل کتابیں بھی لکھی گئیں جیسے حضرت خواجہ اجمیری پر متعدد لوگوں نے کتابیں لکھیں۔ حضرت بابا فرید الدین گنج شکر، شیخ عبدالقدوس گنگوہی، حضرت نظام الدین اولیاء، شیخ احمد کھٹو، شیخ محمد غوث گوالیاری اور اس طرح کی بے شمار کتابیں لکھی گئیں۔

صوفی ادب کی ایک اہم ترین قسم مکتوباتی ادب ہے۔ ہندوستان میں اس پر کام کم ہوا لیکن صرف مقدار کے اعتبار سے کم کام ہوا ہے، اہمیت کے اعتبار سے ہندوستان کا مکتوباتی ذخیرہ پورے عالم اسلام کے ذخیرے پر بھاری ہے۔ مکتوبات امام ربانی، مجدد الف ثانی تین جلدوں میں ہیں اور ان کے غیر معمولی اثرات ہندوستان سے باہر بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس طرح شیخ شرف الدین یحیٰ منیری کے مکتوبات، مکتوبات صدی، اور مکتوبات دوصدی کے نام سے مرتب ہوئے اور تصوف کے حلقوں میں ان کی بڑی پذیرائی ہے۔

سطور بالا میں ہندوستان کے اندر صوفی لٹریچر کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد احاطہ کرنا نہیں تھا بلکہ تعارف کرانا تھا۔ ورنہ ایک ایک صنف باضابطہ تحقیق کا تقاضا کرتی ہے اور بعض اصناف پر تحقیقات ہو بھی چکی ہیں۔

○○○

مرزا مظہر جان جاناں۔شاعری اور اصلاح زبان

ہندوستان کی تاریخ میں اٹھارہویں صدی عیسوی کافی اتھل پتھل اور اتار چڑھاؤ کا عہد مانا جاتا ہے۔یہ عہد نہ صرف عوام الناس کے لیے سخت نقصان دہ اور سوہان روح ثابت ہوا بلکہ مغلیہ سلطنت کے زوال کا بھی باعث رہا ہے۔حالات اس قدر ابتر تھے کہ اس وقت کا مغل فرماں روا شاہ عالم ثانی اپنی علمی استعداد اور سنجیدگی کے باوجود مشکلات پر قابو نہ پا سکا۔نتیجہ یہ نکلا کہ اس عہد کا ہر شخص اقتصادی، مذہبی، روحانی، اخلاقی اور سماجی پستی کا شکار ہوتا چلا گیا۔

ایسے پر آشوب عہد میں جب انسانیت کی صلاح وفلاح کی شدید ضرورت تھی، مختلف شخصیات نمودار ہوتی ہیں اور اپنا واضح نشان چھوڑ جاتی ہیں لیکن ان میں چار شخصیات ایسی ہیں جو عقائد، نظریات اور افکار کی بنیاد پر ایک دوسرے سے کافی قریب ہیں، وہ شخصیات ہیں:

۱۔شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (ولادت: ۱۱۱۴ھ/ ۱۷۰۱ء، وفات: ۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۲ء)

۲۔خواجہ میر درد دہلوی (ولادت: ۱۱۳۵ھ/ ۱۷۲۱ء، وفات: ۱۱۹۹ھ/ ۱۷۸۵ء)

۳۔مولانا فخر الدین دہلوی (ولادت: ۱۱۲۶ھ/ ۱۷۸۸ء)

۴۔مرزا مظہر جان جاناں

ان میں اول الذکر یعنی شاہ ولی اللہ باوقار عالم دین اور مصلح امت ہونے کے ساتھ اعلیٰ محدثانہ مقام رکھتے ہیں اور شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی شاعری میں کافی وشافی سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ثانی الذکر یعنی خواجہ میر درد نہ صرف شاعر کی حیثیت سے مسلّم ہیں بلکہ اپنی صوفیانہ شاعری کے سبب معاصرین میں یک گونہ فوقیت بھی رکھتے ہیں اور ثالث الذکر یعنی مولانا فخر الدین مایہ ناز عالم دین ہونے کے ساتھ شاہراہ طریقت کے امام بھی ہیں۔ان کا شمار بھی ان مصلحین میں ہوتا ہے جنھوں نے عوام کو خود ساختہ تصوف کی بے راہ روی سے نجات دلائی، جب کہ آخر الذکر یعنی مرزا مظہر جان جاناں مبلغ بھی ہیں، صوفی بھی ہیں، شاعر بھی ہیں اور زبان وبیان کے اعتبار سے دیکھیں تو مصلح اعظم بھی ہیں۔

ولادت باسعادت

مرزا مظہر جان جاناں کی پیدائش ۱۱/رمضان بروز جمعہ ۱۱۱۱ھ مطابق ۱۷۰۰ء کالا باغ میں ہوئی جو حدود مالوہ میں واقع ہے۔سنہ پیدائش کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔بعض نے ۱۱۱۰ھ، بعض نے ۱۱۱۱ھ، بعض نے ۱۱۱۲ھ، جب کہ کچھ نے ۱۱۱۳ہجری لکھا ہے۔البتہ! ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی تحقیق میں ۱۱۱۰ہجری کو قوی بتایا ہے۔لیکن قرین قیاس ۱۱۱۱ھ ہے، کیونکہ اسی کو عام تذکرہ نگاروں اور معاصر محققین نے راجح اور قوی قرار دیا ہے اور یہی مرزا مظہر جان جاناں کے اجل خلیفہ مولوی سید نعیم اللہ بہرائچی کے نزدیک بھی معتبر ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ’’حضرت (مرزا مظہر) نے خود اپنے عالیشان دیوان کے عنوان کے اندر اپنی پیدائش کے بارے میں ایک روایت نقل کی ہے جو کہ سالگرہ کے حساب وکتاب اور شمار کے اعتبار سے ۱۱۱۱ہجری کے مطابق وموافق ہے۔فرمایا کہ آج ایک ہزار ایک سوستّر ہجری ہے اور میری عمر ساٹھ سال ہے اور یہی صحیح ودرست بات ہے۔‘‘ (معمولات مظہریہ، ص:۱۰)

نام ونسب

مرزا مظہر جان جاناں کا اصل نام ’جان جاناں‘ لقب ’شمس الدین حبیب اللہ‘ اور ’مظہر‘ تخلص ہے۔بقول مولوی نعیم الدین بہرائچی: اظہر من الشمس اور نور علی نور کے نام سے بھی پکارے جاتے تھے۔ان کا سلسلۂ نسب انیس (مقامات مظہری کے مطابق اٹھائیس) واسطوں سے محمد بن حنفیہ کے ذریعے حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم تک پہنچتا ہے۔ (معمولات مظہریہ، ص:۲۰)

والدین کریمین

والدہ ماجدہ کے سلسلے میں کچھ زیادہ وضاحت نہیں ملتی۔لیکن اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیجاپور کی شیخ زادی اور امیر خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور بڑی نیک وپارسا، عابدہ، زاہدہ اور جود وسخا میں بے مثال تھیں۔جب کہ والد بزرگوار کا نام ’’مرزا جان‘‘ تھا جو اپنے فضل وکمال میں ممتاز اور علم وفن میں ماہر تھے، ساتھ ہی اچھے شاعر تھے اور اپنا تخلص جانؔی رکھتے تھے۔اورنگ زیب کے عہد میں کچھ دنوں تک شاہی ملازم رہے لیکن کسی وجہ سے ملازمت ترک کردی۔فقر وتوکل اور قناعت وصبر کی راہ اختیار کی۔سلسلہ قادریہ کے عظیم الشان بزرگ شاہ عبدالرحمن قادری سے بیعت ہوئے اور ان کی صحبت بافیض میں رہ کر تصوف میں کمالات حاصل کیے۔

مرزا جان (وفات: ۱۱۲۷ھ) اپنے شیخ سے کافی عقیدت ومحبت رکھتے تھے۔ایک بار شیخ قادری قدس سرہٗ آم کھا رہے تھے۔آم کھٹا تھا اس لیے اس کا رس زمین پر تھوک دیتے تھے۔یہ موقع غنیمت جان کر مرزا جان نے گرد وغبار میں پڑے اس رس کو چاٹ لیا جس کا اثر یہ ہوا کہ ان کے

دل کی دنیا خوب سے خوب تر ہوتی چلی گئی۔(مقاماتِ مظہری،ص:۴۸)

تعلیم وتربیت

چوں کہ مرزا مظہر جان جاناں کا خاندان آگرہ میں سکونت پذیر تھا،اس لیے ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت بھی وہیں ہوئی،مرزا جان نے اپنے بیٹے کی تعلیم کے لیے ہر ممکن راستے اختیار کیے۔ خود مرزا مظہر جان جاناں قدس سرہٗ اپنی تعلیم کے تعلق سے لکھتے ہیں:

"علوم متعارف درعہد پدرخوانده بودو کتب حدیث درخدمت حاجی محمد افضل سیالکوٹی تلمیذ شیخ المحدثین شیخ عبداللہ ابن سالم مکی گزرانیده وقرآن مجید را از حافظ عبدالرسول دہلوی تلمیذ شیخ القراء شیخ عبدالخالق شوقی سند کرد۔"

ترجمہ: والد بزرگوار کے عہد میں ہی مختلف علوم سے متعارف ہوگئے تھے، حدیث کی کتابیں شیخ المحدثین حضرت عبداللہ ابن سالم مکی کے شاگرد حاجی محمد افضل سیالکوٹی سے پڑھیں اور قرآن مجید کی تعلیم شیخ القراء عبدالخالق شوقی کے شاگرد حافظ عبدالرسول دہلوی سے حاصل کی۔

مرزا مظہر کے والد مرزا جان قناعت اور صبر وشکر کے پیکر تھے اور اپنے بیٹے کو بھی ان ہی خوبیوں سے متصف دیکھنا چاہتے تھے، وہ ہمیشہ مرزا مظہر جان جاناں سے کہا کرتے تھے کہ اگر تم امیر ہوگئے تو ارباب ہنر کی قدر وشناخت کروگے،مگر میری خواہش ہے کہ فقیری وترک دنیا اختیار کروتا کہ تم کو اہل پیشہ اور ہنرمندوں کی حاجت نہ رہے۔اسی کے مدنظر وفات کے وقت انھوں نے مرزا مظہر جاناں قدس سرہٗ کو یہ وصیت بھی کی تھی:"کسب مال میں اپنا وقت صرف کرنا۔غیر ضروری اشغال میں اپنی زندگی خراب نہ کرنا۔"(مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط،ص:۷۳)

چنانچہ اپنے والد ماجد کی خواہش کے مطابق مرزا مظہر جان جاناں قدس سرہٗ نے مختلف پیشہ اور فن کو نہ صرف سیکھا بلکہ اس میں مہارت بھی حاصل کی، یوں مرزا مظہر دینی اور دنیاوی دونوں علوم کے متدین عالم اور ماہر ہونے کے ساتھ فن سواری،فن سپہ گری اور حرفت میں بھی کمال پیدا کیا اور کبھی کبھی اس کا اظہار بھی کرتے تھے۔

شاہ غلام علی نے مرزا مظہر جان جاناں قدس سرہٗ کا مختلف پیشہ اور ان کی فنی مہارت کا ذکر کیا ہے جیسے وہ بہترین کپڑا کاٹتے تھے۔خاص کر شلوار کو پچاس طریقے پر کاٹنا جانتے تھے۔ علم موسیقی کے ماہر تھے اور اس فن کے ماہرین آپ کے پاس اصلاح کے لیے آیا کرتے تھے۔

شخصیت

مرزا مظہر جان جاناں نہایت حسین وجمیل،ظریف، بلند قامت اور نازک مزاج انسان تھے

۔بچپن ہی سے طبیعت میں قلندری تھی اور بزرگان دین سے خاصہ لگاؤ رکھتے تھے۔تعلق باللہ اور تعلق بالمخلوق دونوں خوبیوں سے متصف تھے۔مذہباً حنفی تھے اور مشرباً نقشبندی۔سنت کے مطابق عمامہ باندھتے اور قمیص سامنے سے چاک شدہ پہنتے تھے۔تقویٰ اور پرہیزگاری کا یہ عالم تھا کہ مشکوک کھانا کبھی نہ تناول فرماتے ، ہمیشہ زرق حلال کا حد درجہ اہتمام فرمایا کرتے تھے اور امیروں کی جانب سے آئے ہوئے کھانے کو تو کبھی ہاتھ بھی نہ لگاتے تھے،فرماتے ہیں: **شر الطعام طعام الاغنیاء**۔یعنی بدترین کھانا امیروں کا کھانا ہے۔

عظمت وشان کا یہ عالم تھا کہ معاصرین میں کوئی ان کا ہم پلّہ نہ تھا،شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہٗ جیسے عظیم اسلامی اسکالر بھی مرزا مظہر جان جاناں قدس سرہٗ کی انفرادیت اور ہمہ جہت شخصیت کے قائل تھے، وہ لکھتے ہیں:

ہم لوگ ان کو جانتے ہیں وہ کیا چیز ہیں۔ہندوستان کے لوگوں کے احوال ہم پر پوشیدہ نہیں۔ عرب کے شہروں میں بھی ہم گئے ہیں اور ان لوگوں سے آپ کی ولایت کے پختہ وٹھوس احوال سنے ہیں۔کتاب وسنت اور شریعت وطریقت پر احسن طریقے سے مستقیم واستوار ہیں اور طالبین کے درمیان عالیشان عظمت کے مالک ہیں،عمدہ شخصیت ہیں۔ اس زمانے میں ان جیسا انسان ہمارے شہروں میں کوئی نہیں بلکہ ہر زمانے میں ایسے لوگوں کا وجود بہت کم ہوتا ہے۔ (معمولاتِ مظہری،ص:۲۱۹-۲۱۸)

خودداری اور توکل علی اللہ کا حال یہ تھا کہ بادشاہوں سے کبھی کوئی ہدیہ یا تحفہ قبول نہیں کیا۔ دنیا اور اہل دنیا سے بالکل مستغنی رہے۔ایک بار کسی امیر نے خانقاہ کے لیے ایک حویلی بنوائی،قبول نہ کیا اور فرمایا: چونکہ ایک نہ ایک دن مکان چھوڑنا ہی ہے تو مکان چاہے اپنا ہو یا پرایا برابر ہے اور روزی جو مقرر ہے وہ مل کر رہے گی اس لیے فقرا کے لیے صبر وشکر اور قناعت کا خزانہ کافی ہے۔

اکثر کہا کرتے تھے: **قل متاع الدنیا قلیل**۔یعنی دنیا کی دولت بہت ہی معمولی اور حقیر ہے۔اعلیٰ ظرفی ، اخلاقی بلندی اور اخلاص وللّٰہیت کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوسکتی ہے کہ مرزا مظہر جان جاناں نے اپنے قاتل سے بھی قصاص نہیں لیا۔ جب بادشاہ نے استفسار کروایا تو کہلا بھیجا کہ میں نہیں بتاؤں گا اور اگر خدانخواستہ ملزمان کا پتہ چل بھی گیا تو بھی انھیں سزا نہ دی جائے کیونکہ: **بندہ کشتۂ راہ خدا است، و کشتہ را کشتن داخل جرم نیست**۔

یعنی بندہ تو اللہ کی راہ میں مرا ہوا ہے اور مرے ہوئے کو مارنا جرم نہیں۔

اور یوں: **عاش حَمِیْدًا مَاتَ شَہِیْدًا**۔(زندہ رہے تو اچھائی کے ساتھ اور موت پائی تو شہید کی) کے تحت ۱۱۹۵ھ مطابق ۱۷۸۱ء میں اس دنیا کو خیر باد کہا۔(**اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ**)

مرشدین وشیوخ

مرزامظہر جس خاندان اور جس ماحول میں پیدا ہوئے وہ فطرتاً تصوف اور صوفیہ سے قریب کرنے والا تھا۔جس کا نمایاں اثر بھی ہوا کہ والد ماجد کی وفات کے بعد جب کہ ان کی عمر سولہ سال تھی دو سال کسب دنیا میں مشغول رہے۔(بعض نے چار سال لکھا ہے جو درست نہیں ہے)اس کے بعد خواب میں دیکھا کہ خواجہ قطب الدین بختیار کا کی قدس اللہ سرہٗ نے ان کے سر پر اپنی ٹوپی رکھ دی،اسی وقت سے مرزامظہر جاناں قدس سرہٗ کے دل سے دنیا طلبی جاتی رہی اور مختلف بزرگوں کی صحبت میں آنے جانے لگے،جیسے خواجہ کلیم اللہ چشتی جہان آبادی،شاہ مظفر قادری،شاہ غلام محمد موحد،میر ہاشم جالیسری قدس اللہ اسرارہم وغیرہ سے اکتساب فیض کیا۔

● **سیدالسادات سیدنور محمد قدس سرہٗ:** پھرایک دن مرزامظہر جان جاناں قدس سرہٗ اپنے دوستوں کے درمیان محوگفتگو تھے کہ نقشبندی سلسلے کے مشہور بزرگ سیدالسادات سیدنور محمد بدایونی قدس سرہٗ (متوفی ۱۱۳۵ھ) کا ذکر آیا۔ یہ شیخ محمد سیف الدین بن خواجہ محمد معصوم سرہندی قدس اللہ سرہٗ سے بیعت وارادت رکھتے تھے اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہٗ کی اولا دامجاد میں عظیم شخصیت شیخ محمد محسن قدس سرہٗ کی تربیت وصحبت فیوض وکمالات کا وافرحصہ بھی پایا تھا اور آداب واخلاق نبوی کے سچے پیروکار تھے۔ان کی پاکیزہ طینت،تقوی شعاری، پرہیزگاری، شریعت کی پابندی اوراکل حلال میں احتیاط کی کیفیت سن کر مرزامظہر جان جاناں کے دل میں ان سے ملنے کا ایک اشتیاق پیدا ہوا۔چنانچہ انھوں نے ان کی خدمت میں حاضری دی اور بیعت کی خواہش ظاہر کی جسے قبول کرلیا گیا۔حالانکہ شیخ نورمحمد بدایونی قدس سرہٗ استخارہ کے بغیر کسی کو بیعت نہیں کرتے تھے۔

اس تعلق سے خود لکھتے ہیں:

میری عمر اٹھارہ سال کی تھی کہ کسی شخص نے میرے سامنے شیخ نورمحمد بدایونی قدس سرہٗ کے حسنات وکمالات کا ذکر کیا۔ان کے اوصاف سنتے ہی دل میں قدم بوسی کی طلب پیدا ہوئی اوران کے دیدار سے مشرف ہوئے۔انھیں پابند شریعت،سنت کا پیروکار اور تخلقوا باخلاق اللّٰہ کا پیکر پایا۔شیخ نے پوچھا:کس لیے آئے ہو؟میں نے عرض کی:استفادہ کے لیے۔اگرچہ شیخ استخارہ کے بغیر کسی کو کوئی تلقین نہیں کرتے تھے لیکن اللہ کے فضل وکرم سے استخارہ کے بغیر ہی مجھ پر توجہ فرمائی۔آپ کی توجہ سے باطن میں ایک ایسا رنگ آیا کہ آئینہ میں اپنی صورت میں ہو بہو شیخ کو پایا۔یہ دیکھ کر میری محبت اور بڑھ گئی اور عقیدت راسخ ہوگئی۔ (مقامات مظہری،ص:۶۶)

مرزامظہر جان جاناں قدس سرہٗ مکمل چار سال تک شیخ کی خدمت میں رہے اور ہر پل تزکیہ و تطہیر میں شدت ہوتی رہی،ساتھ ہی راہ سلوک کی منزلیں بھی طے کرتے رہے اور بالآخر ۱۱۳۵ھ مطابق ۱۷۲۲ء میں شیخ بدایونی قدس سرہٗ نے خرقہ اورخلافت سے نواز دیا۔مرزامظہر قدس سرہٗ اپنے شیخ قدس سرہٗ کی وفات کے بعد بھی چھ سال تک مزار اقدس پر مجاوری کی اور جب خواب میں شیخ قدس سرہٗ کی جانب سے بار بار یہ اشارہ ملا کہ:ربانی کمالات کی کوئی انتہا نہیں ہے۔اپنی اس قلیل عمر کو حق سبحانہ وتعالیٰ کی طلب میں صرف کرنا چاہیے اورزندوں کے پاس جا کر اللہ کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔چنانچہ مرزامظہر قدس سرہٗ اسے شیخ کا حکم سمجھ کر زندہ شیوخ کی تلاش میں نکل پڑے۔

● **شاہ گلشن قدس سرہٗ:** مرزامظہر جان جاناں شیخ بدایونی قدس سرہٗ کے حکم کے بعد سب سے پہلے شیخ عبدالاحد وحدت قدس سرہٗ کے خلیفہ شاہ گلشن قدس سرہٗ کی خدمت میں پہنچے۔یہ اپنے وقت کے خدارسیدہ بزرگ اورمشہور نقشبندی صوفیوں میں سے ایک تھے۔جب مرزامظہران کے پاس گئے تو انھوں نے فرمایا کہ:تمھیں شیخ وقت ہونا ہے اور میں آداب طریقت کا مقید نہیں،کیونکہ میں کبھی سماع بھی سن لیتا ہوں اور نماز بھی تنہا ادا کرتا ہوں۔اس لیے تم کسی دوسرے شیخ کی بارگاہ میں جاؤ۔پھر شیخ حجۃ اللہ نقشبندی قدس سرہٗ کے خلیفہ شیخ محمدزبیر قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضری دی،وہ بڑی شفقت سے پیش آئے اورکہا:وہ نسبت جو تم نے شیخ سیدنورمحمد بدایونی قدس سرہٗ سے حاصل کی ہے مضبوط تر ہے،اگر تم اس کی حفاظت صحیح ڈھنگ سے کرلو تو کافی ہے۔

● **حاجی محمد افضل قدس سرہٗ:** بعدہٗ حاجی محمد افضل قدس سرہٗ کی بارگاہ میں توجہ کے لیے عرضی پیش کی۔انھوں نے جواب دیا:تمھیں مقامات کا کشف حاصل ہے اور ہمیں نہیں،اس لیے استفادہ کماحقہٗ نہیں ہوسکے گا۔اس کے باوجود مرزامظہر نے ان سے کافی فیض پایا وہ خود فرماتے ہیں کہ:بظاہر استفادہ نہیں کیا لیکن درس حدیث کے دوران باطنی فیض سے اس قدر مستفیض ہوا کہ نسبت کے اظہار میں اورزور پیدا ہوگیا،کیونکہ درس حدیث کے دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت میں حضور حاصل ہوتا تھا اور کثرت سے انوار وبرکات ظاہر ہوتے تھے۔گویا معنوی طور پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت حاصل ہوتی تھی۔

● **حافظ سعداللہ قدس سرہٗ:** پھران کی اجازت سے شیخ حافظ سعداللہ قدس سرہٗ (متوفی ۱۱۵۲ھ مطابق ۱۷۳۹-۴۰ء) کی خدمت میں پہنچے۔جو شیخ محمد صدیق قدس سرہٗ (وفات:۱۱۵۲ھ) خلیفہ شیخ محمد معصوم قدس سرہٗ کے خلیفہ تھے اوران کی بارگاہ میں فیض کے حصول کا عریضہ پیش کیا جو استخارے کے بعد قبول کرلیا گیا۔مرزامظہر جان جاناں قدس سرہٗ فرماتے ہیں:

میں نے ان کی صحبت کو اپنے اوپر لازم کرلیا اوران کی خدمت کو اپنا وظیفہ بنالیا جس کی

برکت سے روزانہ باطنی انوار میں ترقی محسوس کرتا اور نسبت وتعلق میں اور وسعت پیدا ہوتی گئی۔
اس طرح میں نے بارہ سال تک ان کی صحبت میں رہ کر راہ سلوک کی مختلف منزلیں طے کیں۔
یہاں تک کہ مجھ سے اپنے اصحاب کے باطنی احوال پوچھتے۔ جو کچھ میں بتاتا اس کی تصدیق فرماتے،
پھر مجھے حکم دیتے کہ ان کی تربیت اور انھیں مسائل شرعیہ کی تلقین کرو۔ (مقامات مظہری، ص: ۲۷۳)

● **شیخ الشیوخ محمد عابد سنامی قدس سرہٗ:** مزید تربیت وتسلیک کی نیت سے شیخ محمد عابد سنامی قدس سرہٗ (متوفی ۱۱۶۰ھ مطابق ۱۷۴۷ء) خلیفہ شیخ عبدالاحد سرہندی قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے اس قدر فیضیاب ہوئے کہ نسبت عبودیت کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔
خود ہی فرماتے ہیں کہ:

شیخ کی خاص توجہ نے میری باطنی نسبت میں اتنی وسعت پیدا کردی کہ نظر کشفی اس کے ادراک سے عاجز وبے بس تھی اور طریقت میں طرق تسلیک مقامات کی ایسی قوت حاصل ہوگئی جس کا اظہار خودستائی اور فخر کی بات ہے۔ (مقامات مظہری، ص: ۲۷۹)

مزید فرماتے ہیں:

ایک روز مجھے اپنے فیوض میں شامل کرکے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے گزشتہ شب ہم پر جن کمالات جدیدہ اور برکات ثمینہ کا احسان کیا ہے، وہ سابقہ تمام کمالات پر بھاری ہیں۔ میں نے عرض کیا: ابھی رات باقی تھی اور وہ تمام کمالات الٰہیہ جو آپ پر وارد ہوئے اس بندہ کو بھی آپ کے توسل سے اپنے باطن میں محسوس ہوا۔ انھوں نے فرمایا: تم سچ کہتے ہو، تمھیں میرا ضمنی بنایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جو بھی عطیات مجھے ملی ہیں اس میں ایک بڑا حصہ تمھیں بھی حاصل ہے۔ (مقامات مظہری، ص: ۲۷۹)

مرزا مظہر جان جاناں قدس سرہٗ کو ان سے طریقت قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ میں اجازت وخلافت بھی حاصل ہے۔ اس سلسلے میں وہ فرماتے ہیں:

جب میں نے قادری سلسلے کی اجازت طلب کی تو انھوں نے فرمایا ہم تمھیں اس سلسلے کی اجازت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دلواتے ہیں اور بارگاہ نبوی کی جانب متوجہ ہوگئے۔ میں بھی حکم کے مطابق مراقب ہوا تو دیکھا کہ رسول کائنات صلی اللہ علیہ وسلم، اصحاب عظام رضی اللہ عنہم اجمعین کے ساتھ تشریف فرما ہیں اور محبوب سبحانی شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھڑے ہیں۔ شیخ نے بارگاہ نبوی میں عرضی پیش کی کہ مرزا جان جاناں قادری سلسلے کی اجازت چاہتا ہے، فرمایا: سید عبدالقادر سے رجوع کرو۔ چنانچہ محبوب سبحانی قدس سرہٗ نے التماس قبول کرکے تبرکاً

خرقہ عطا کیا اور اجازت سے مشرف فرمایا۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ میں نے اس نسبت قادریہ کے برکات کا احساس اپنے باطن میں کیا اور میرا سینہ اس کے انوار سے منور ہوگیا۔ (مقامات مظہری، ص: ۲۸۰)

اس طرح شیخ محمد عابد سنامی قدس سرہٗ سے قادریہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ کی نسبت حاصل ہوئی اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہٗ سے چشتیہ کی نسبت اور ان چاروں سلسلوں کے رنگ نے مل کر مرزا مظہر جان جاناں کو ۱۱۵۵ھ میں مسند ارشاد پر متمکن کرادیا۔

خلفا و مریدین

مرزا مظہر جان جاناں کے مریدین کی ایک بڑی تعداد ہے جو ہندوستان کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن ان میں زیادہ تر مریدین ومتوسلین علاقۂ روہیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی طرح مرزا مظہر جان جاناں قدس سرہٗ کے خلفا بھی بہت ہیں۔ مقامات مظہریہ کے مطابق ان کی تعداد تقریباً چون (۵۴) تک پہنچتی ہے۔ ان کے اسما ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ میر سلمان قدس، ۲۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی، ۳۔ مولوی فضل اللہ، ۴۔ مولوی احمد اللہ ۵۔ شیخ محمد مراد، ۶۔ شیخ عبدالرحمن، ۷۔ میر علیم اللہ گنگوہی، ۸۔ شیخ مراد اللہ عرف غلام کاکی، ۹۔ شیخ محمد احسان ۱۰۔ شیخ غلام حسن، ۱۱۔ شیخ محمد منیر، ۱۲۔ مولوی قلندر بخش، ۱۳۔ میر نعیم اللہ ۱۴۔ مولوی ثناء اللہ سنبھلی، ۱۵۔ میر عبدالباقی، ۱۶۔ خلیفہ محمد جمیل، ۱۷۔ شاہ بھیک سرہندی، ۱۸۔ مولوی عبدالحق ۱۹۔ شاہ محمد عالم، ۲۰۔ شاہ رحمت اللہ، ۲۱۔ محمد شاہ، ۲۲۔ میر مبین خاں، ۲۳۔ میر محمد معین خان، ۲۴۔ میر علی اصغر عرف میر مکھو، ۲۵۔ محمد حسن عرب، ۲۶۔ محمد قائم کشمیری، ۲۷۔ حافظ محمد، ۲۸۔ مولوی قطب الدین، ۲۹۔ مولوی غلام یحیٰ بہاری، ۳۰۔ مولوی غلام محی الدین، ۳۱۔ مولوی نعیم اللہ نقش بندی، ۳۲۔ مولوی کلیم اللہ بنگالی، ۳۳۔ میر روح الامین، ۳۴۔ شاہ محمد شفیع، ۳۵۔ محمد واصل، ۳۶۔ محمد حسین، ۳۷۔ شیخ غلام حسین تھانیسری، ۳۸۔ مولوی عبدالکریم، ۳۹۔ مولوی عبدالحکیم، ۴۰۔ نواب ارشاد خان، ۴۱۔ نواب غلام مصطفی خان، ۴۲۔ اخون نور محمد قندھاری، ۴۳۔ ملا نسیم، ۴۴۔ ملا عبدالرزاق، ۴۵۔ ملا جلیل ۴۶۔ ملا عبداللہ، ۴۷۔ ملا تیمور۔

تعلیمات وارشادات

مرزا مظہر جان جاناں قدس سرہٗ کا مقصد محض پیری مریدی نہیں تھا بلکہ انسانی سماج ومعاشرے کی اصلاح اور اس کا تزکیہ وتطہیر کرکے اللہ کی طرف متوجہ کرنا بھی مقصود تھا۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے اپنے اس عمل وسعی کو خانقاہ کی چہاردیواری میں قید رکھنے کے بجائے پوری انسانیت کے لیے صلاح وفلاح کا کام کیا اور زندگی کے ہر موڑ پر ان کے لیے ہدایت وکامیابی کے

نسخے تجویز کیے، جنھیں اپنا کر تا قیام قیامت دنیا کی خرافات وبدعات سے محفوظ رہا جا سکتا ہے، مثلاً:
مرزا مظہر جان جاناں قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں:

● تقوی اور پرہیز گاری اختیار کرو اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کو دل وجان سے لازم پکڑو۔

● دل کو دونوں جہان کی اغراض سے یکسر پاک رکھو اور دنیاوی اسباب کو کم سے کم اختیار کرو، کیونکہ قیامت کے دن حساب دینا ہوگا۔

● مشائخ کی محبت میں اپنے عقیدے کو راسخ کرو، کیونکہ اولیا کی دوستی اللہ کی رضا سے قریب کرتی ہے اور اپنے شیخ کے سوا غیر کا خیال نہ لاؤ۔

● اپنے آپ کو سب سے کم تر اور قاصر شمار کرو اور طلب مولیٰ کی راہ میں کبر ونخوت اور غرور کو دل ودماغ سے نکال دو۔

● نفس کی مخالفت کرو جس قدر ہو سکے، بہتر ہے۔ لیکن اتنا بھی نہیں کہ وہ تنگ آ جائے، جس سے اطاعت کی خوشی اور شوق جاتا رہے۔ کبھی اس کے ساتھ نرمی بھی کرو، کیوں کہ مومن کے نفس کی رضامندی ثواب کا موجب ہے۔

● اولیائے کرام کے مزارات کی زیارت کو فیض کا ذریعہ بناؤ۔ مشائخ عظام کی ارواح طیبہ کو فاتحہ اور درود سے ایصال ثواب کرو اور انھیں اپنا وسیلہ بناؤ کیوں کہ ان کی وجہ سے ظاہری اور باطنی سعادت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ تصفیۂ قلب کے بغیر اولیا سے فیض کا حاصل ہونا مشکل ہے۔

اصلاح زبان وشاعری

● **اصلاح زبان:** مرزا مظہر جان جاناں چونکہ زبان وادب کے ارتقائی عہد سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ان کا کلام تاریخ ارتقا میں ایک اہم مقام رکھتا ہے، کیوں کہ انھوں نے نہ صرف اردو زبان کو صاف وستھرا کیا بلکہ اس میں فارسی کی کچھ نئی ترکیبیں اور نازک خیالات پیدا کیے اور قدیم ایہام گوئی کو خیرباد کہا، یہی سبب ہے کہ کم غزلیں کہنے کے باوجود مرزا مظہر جان جاناں کا شاعرانہ قد نہایت بلند ہے۔ پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

''مرزا مظہر جان جاناں... نے اردو میں بہت کم غزلیں لکھی ہیں مگر ایک بہت بڑے صوفی اور عالم ہونے کے باعث انھیں بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے اردو میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا کچھ حصہ تذکروں میں مل جاتا ہے۔ انھوں نے زبان درست کرنے اور شاعری کو ان صنائع سے بچانے کی سعی کی جو شاعری کو محض الفاظ کا ایک گورکھ دھندا بنا دیتے تھے۔ اس طرح انھوں نے ایہام گوئی کی مخالفت کی، فارسی کے عالم ہونے کی

وجہ سے ان کی زبان میں فارسی تراکیب کا استعمال بہت ملتا ہے۔''

(تاریخ اردو ادب کی تنقید، ص: ۵۴)

مشہور شاعر مصحفی مرزا مظہر جان جاناں کو زبان ریختہ کا نقاش اول قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اول کس کہ شعر ریختہ بہ تتبع فارسی گفتہ اوست، فی الحقیقت نقاش اول زبان ریختہ بایں وطیرہ فقیر مرزا است۔ بعدہٗ تتبعش بدیگراں رسیدہ۔'' (تذکرۂ ہندی، ص: ۲۰۳)

ترجمہ: سب سے پہلے جس شخص نے زبان فارسی کی تقلید میں ریختہ گوئی کی وہ مرزا مظہر جان جاناں ہے، اسی وجہ سے حقیقتاً زبان ریختہ کا نقاش اول مرزا مظہر ہے۔ اس کے بعد ان کی اتباع میں ریختہ گوئی دوسروں تک پہنچی۔

ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں:

''اردو شاعری میں مرزا صاحب کو ''نقاش اول ریختہ'' اس لیے نہیں کہا گیا کہ انھوں نے شمالی ہند میں پہلی بار اردو میں شعر کہنا شروع کیا، بلکہ یہ اعزاز اس لیے ملا ہے کہ انھوں نے ایہام جیسے ''ستم'' اور غیر فطری چیز کے خلاف پہلی بار آواز بلند کی اور اپنی اس مخالف آواز کو باقاعدہ تحریک کی صورت دی۔ انھوں نے اردو شاعری کی ان تاریک راہوں کو روشن کیا اور منور کیا جن پر گامزن ہو کر دردؔ، میرؔ، سوداؔ، آتش اور غالبؔ جیسے عظیم شاعروں نے نئی راہیں اور نئے راستے نکالے۔

اسی طرح مرزا صاحب نے فارسی مکتوب نگاری میں بھی سادگی کی بنیاد رکھی اور اس کی اصلاح کی۔ غالب نے اردو مکتوب نگاری میں جو اصلاحیں کی تھیں اور جس سادگی اور بے تکلفی کی طرح ڈالی تھی اس کی ابتدا ستر اسی سال قبل مرزا صاحب ہی نے کی تھی۔''

(مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط، ص: ۸۱ تا ۸۲)

مرزا مظہر جان جاناں کا اصلاح زبان کی جانب متوجہ ہونے میں ان کی نازک مزاجی اور لطافت طبع کا بہت بڑا دخل ہے، اس لیے کہ جو انسان آبخورے کے ٹیڑھے رکھنے کے سبب نواب کی نوابیت پر ہی سوال کھڑا کر دے اور ٹیڑھی تراش کی ٹوپی پہننے سے سر میں درد محسوس کرنے لگے بھلا وہ زبان کی ناہمواری اور کھردرے پن کو کیسے برداشت کر سکتا تھا، چنانچہ مرزا صاحب لطافت طبع سے مجبور ہو کر اصلاح زبان کی طرف مائل ہوئے۔ مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

''لطافت مزاج اور نزاکت طبع کا نتیجہ ہے کہ زبان کی طرف توجہ کی اور اسے تراشا کہ جو شعرا پہلے گزرے تھے، انھیں پیچھے ہی چھوڑ کر اپنے عہد کا طبقہ الگ کر دیا اور زبان کو نیا نمونہ تراش کر دیا، جس سے پرانہ رستہ ایہام گوئی کا زمینِ شعر سے مٹ گیا۔'' (آب حیات، ص: ۱۷۳)

سطور بالا سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مرزا مظہر جان جاناں نے شاعری کے ذریعے محض اپنے جذبات وخیالات کا اظہار نہیں کیا بلکہ طرز شاعری میں ایک انقلاب برپا کیا جس کے باعث آگے چل کر زبان وادب کی ترقی کے راستے ہموار ہوئے۔ جو اصلاحات مرزا مظہر جان جاناں کے ذریعے ہوئیں وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ایہام گوئی ترک کرکے سادہ الفاظ کے ذریعے رنگ تغزل پیدا کیا گیا۔

۲۔سوقیانہ اور مبتذل خیالات کا دروازہ بند کر دیا گیا۔

۳۔عمدہ اور غنائی بحروں کا چلن عام ہوا جن کا استعمال اس سے پہلے نہ تھا۔

۴۔برج بھاشا اور دکن کے بہت سے الفاظ متروک ہوگئے اور ان کی جگہ اردو۔فارسی کے الفاظ اور محاورات استعمال ہونے لگے، جیسے: نین کے مقام پر چشم، ساجن کے بدلے معشوق، درشن کے عوض زیارت، وغیرہ

۵۔عربی ۔فارسی کے وہ الفاظ جو اردو میں صوتی اعتبار سے لکھے جاتے تھے متروک ہوگئے، جیسے: تسبی سے تسبیح، صحی سے صحیح وغیرہ

۵۔مشکل وثقیل اور بوجھل الفاظ کا استعمال بند ہوگیا، جیسے: آئیاں، جائیاں، سوں، کوں وغیرہ

٦۔نئی نئی تشبیہیں، استعارے اور صنعتوں کو فروغ دیا گیا۔

غرض کہ مرزا مظہر جان جاناں نے عمدہ اور فصیح وبلیغ شاعری کے ساتھ زبان اردو کی اصلاح میں نمایاں کردار ادا کیا اور نت نئے ادبی ولسانی اختراعات کرکے اردو زبان میں بیش بہا اضافہ بھی کیا جس کے ذکر کے بغیر اردو زبان کی تاریخ ادھوری اور نامکمل رہے گی۔

شاعری

مرزا مظہر جان جاناں زندہ دل، صوفی مزاج، عاشقانہ طبیعت کے مالک اور شعری خمیر سے مرکب تھے، جس نے ان کو شعر گوئی کی طرف مائل کیا، سید تبارک علی لکھتے ہیں:

''مزاج عاشقانہ لے کر پیدا ہوئے تھے، شیر خوارگی کے زمانے سے حسن ظاہر میں حسن حقیقی کا نظارہ فرمانے لگے تھے۔... حضرت مرزا صاحب کے الفاظ میں کہ شاعری اور پریشان نظری فقیر کی طینت میں سے ہیں جو پارہ کی طرح عاشقانہ دل لے کر پیدا ہوا ہے۔ جس کو نظارۂ حسن کے بغیر قرار نہ آتا ہو، جس کی خمیر طینت شاعری و پریشان نظری ہو اُس کی شاعری میں شعور نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا۔'' (مرزا مظہر جان جاناں، ان کا عہد اور اردو شاعری، ص: ٦۴)

اس کے باوجود شعر کہنا مرزا مظہر جان جاناں کا شوق یا مشغلہ نہیں تھا اور نہ ہی انھوں نے کسی مظاہرے یا نام ونمود کے لیے شاعری کی، بلکہ جب کبھی حقیقی محبت کی چاشنی سے مغلوب

ہوتے، ان کا مافی الضمیر شعری قالب میں ڈھلتا چلا جاتا۔ وہ لکھتے ہیں:

گاہ گاہ از کشش طبع رسا اسرار مافی الضمیر را در قالب نظم فارسی وریختہ ظاہر می کند۔

ترجمہ: کبھی کبھی طبع رسا جذبے سے مغلوب ہوتا ہوں تو قلبی واردات ریختہ اور فارسی زبان میں نظم ہوتے چلے جاتے ہیں۔

اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مرزا مظہر جان جاناں نے فارسی اور اردو ہر دو زبان میں شاعری کی اور خوب کی۔ کم وبیش فارسی اور اردو شاعری میں خیالات و جذبات ایک جیسے ہیں۔ مرزا مظہر جان جاناں چونکہ اپنے آپ کو کشتۂ راہ خدا کہتے تھے اس لیے ان کی شاعری میں بھی عشق حقیقی کی تڑپ، وارفتگی شوق کی کثرت اور واردات قلبیہ کی بہتات اور تصوف جیسے پاکیزہ خیالات کی فراوانی پائی جاتی ہے۔

مرزا مظہر جان جاناں کی شاعری ہر خاص وعام میں مقبول اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی گئی اور وہ ہر طرح کے قارئین کو اپنا گرویدہ بنائے رکھی۔ جب بھی کوئی مرزا کے اشعار کو سنتا ہے وہ اپنے دل پر ایک چوٹ سی محسوس کرتا اور کچھ نہ کچھ فیض ضرور پاتا ہے۔ شیخ حاجی محمد افضل سیالکوٹی کے بقول: اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ مرزا مظہر جان جاناں مردان خدا، اہل دل اور اہل درد ہیں، اس لیے ان کا کلام سننے والوں کو اس کیفیت کا احساس ہوتا ہے، چند اشعار ملاحظہ کریں:

چلی اب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا
یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا
ہم نے کی توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے بس چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار
ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن سے لیک
جی نکل جاتا ہے، جب سنتے ہیں آتی ہے بہار
لالہ وگل نے ہماری خاک پر ڈالا ہے شور
کیا قیامت ہے مُوؤں کو بھی ستاتی ہے بہار

دراصل مرزا مظہر فانی فی اللہ اور باقی باللہ کے مقام پر فائز تھے اور جس کا حال اللہ والوں کا سا ہوجائے تو یقیناً اس کی ہر بات اثر کن ہوگی چاہے نظم ہو یا نثر۔ کیوں کہ ایسا مرد حق آگاہ ہر تصنع اور ہر تکلف سے پاک ہوجاتا ہے، جو کچھ کہتا ہے حق کہتا ہے اور حقانیت اپنا اثر ضرور دکھاتی

ہے، چنانچہ مرزا مظہر جان جاناں کا کلام سن کر دل میں شعلہ سا بھڑکنا تو لازمی امر ہے۔

اُن کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں سنجیدگی، لطافت، سادگی اور عام فہم الفاظ ہوتے ہیں اور اس طرح کا انداز و اسلوب، عشق و محبت میں ڈوبے ہوئے کلام کو اور بھی پرتاثیر بنا دیتا ہے، اسی پر بس نہیں بلکہ فصاحت و بلاغت اور سلاست و روانی کے اعتبار سے بھی مرزا مظہر جان جاناں کی شاعری مثالی نظر آتی ہے، جیسے یہ اشعار:

خدا در انتظار حمد ما نیست
محمد چشم بر راہ ثنا نیست
خدا مدح آفرینِ مصطفٰی بس
محمد حامدِ حمدِ خدا بس
محمد از تو می خواہم خدا را
الٰہی از تو حبِّ مصطفٰی را

جھکی ہے فوج گل اور عندلیباں کی پکار آئی
ارے ہنستا ہے کیا وہ دیکھ دیوانے بہار آئی
تجلی گر تری پست و بلند ان کو نہ دکھلاتی
فلک یوں چرخ کیوں کھاتا زمیں کیوں فرش ہو جاتی
بلبل فدا ہوئی ہے ترے رخ پہ اے صنم
سنبل ہے پیچ پیچ تری زلف و بال دیکھ

مرزا مظہر جان جاناں کے کلام میں جو کچھ مضامین باندھے گئے ہیں وہ خیالی نہیں بلکہ اصلی اور حقیقی ہیں، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ کلام میں عاشقانہ مزاج دیکھ کر عوام الناس تڑپ اٹھتے ہیں اور دل میں میٹھا میٹھا سا درد محسوس کیے بنا نہیں رہ پاتے۔ محمد حسین آزاد اپنی کتاب ''آب حیات'' میں لکھتے ہیں:

''ان کے کلام میں مضامین عاشقانہ عجب تڑپ دکھاتے ہیں اور یہ مقام تعجب نہیں کیونکہ وہ قدرتی عاشق مزاج تھے، اوروں کے کلام میں یہ مضامین خیالی ہیں، ان کے اصل حال۔'' (ص:۱۷۳)

اب ملاوٹی کلام اور دکھاوٹی خیالات کے درمیان جب خالص جذبات اور لطیف کلام مل جائے تو سننے والا کیوں نہ اثر لے۔ چنانچہ اس وجہ سے بھی مرزا مظہر جان جاناں کے کلام کی چاشنی اور اثر انگیزی لوگوں کو اپنی طرف مائل کر لیتی ہے، جیسے یہ کلام:

رسوا اگر نہ کرنا تھا عالم میں یوں مجھے
ایسی نگاہ ناز سے دیکھا تھا کیوں مجھے

چلے کیا زور چشموں کا کہو دریائے شورا کا
نہ دی نالوں نے مجھ آنکھوں کو فرصت کھل کے رونے کی
گر یہ سرد مہری تجھ کو آسائش نہ سکھلاتی
تو کیوں کر آفتاب حسن کی گرمی میں نیند آتی
آتش کہو، شرارہ کہو، کوئلہ کہو
مت اس ستارہ سوختہ کو دل کہا کرو

مرزا مظہر جان جاناں کے کلام کی زبان و بیان سے متعلق محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

''زبان ان (مرزا مظہر) کی نہایت صاف و شستہ و شفاف ہے۔'' (آب حیات، ص:۱۷۳)

دوسری جگہ لکھتے ہیں: ''جو سودا اور میر کی زبان ہے وہی ان کی (مرزا مظہر) زبان ہے۔''

(آب حیات، ص:۱۷۵)

محمد حسین آزاد کے اس بیان کی رو سے دیکھیں تو مرزا مظہر جان جاناں کی زبان و بیان میرؔ اور سوداؔ دونوں کے مقابلے کہیں زیادہ ارفع و اعلیٰ ہے۔ وہ یوں کہ مرزا محمد رفیع سوداؔ اپنے کلام میں شوکت الفاظ پر زور دیتے تھے اور میر تقی میرؔ سادگی و سلاست پر زیادہ توجہ دیتے تھے، اس لیے سوداؔ کے کلام میں شوکت الفاظ ہے تو میرؔ کی سی سادگی نہیں اور میرؔ کے کلام میں سادگی ہے تو سوداؔ کی سی شوکت الفاظ نہیں۔ جب کہ مرزا مظہر جان جاناں کے کلام میں شوکت الفاظ کا برمحل استعمال بھی ہے اور سادگی و سلاست کی مٹھاس بھی۔

تصوف کی بازگشت

اگر مختصر لفظوں میں کہا جائے تو اسلام، ایمان اور احسان کے مجموعے کا نام تصوف ہے، لیکن صوفیۂ کرام نے احسان پر زیادہ زور دیا ہے۔ اب اس کسوٹی پر مرزا مظہر جان جاناں کی شاعری میں تصوف کی بازیافت کی جائے تو پوری تشفی حاصل ہوتی ہے اور اس کی واحد وجہ ہے مرزا کا تصوف سے مربوط ہونا، چونکہ وہ نقشبندیہ سلسلے سے منسلک تھے اس لیے ان پر تصوف کا رنگ و روغن چڑھنا فطری امر ہے، بلکہ وہ نقشبندی سلسلے سے مربوط نہ بھی ہوتے تو بھی مزاج ایسا پایا تھا کہ وہ تصوف کی جانب مائل ہوئے بغیر نہ رہتے اور جس کا رشتہ تصوف سے اس قدر مضبوط اور گہرا ہو اور وہ شاعر بھی ہو تو اس کے کلام میں تصوف کا آنا لازمی ہے، وہ چاہ کر بھی اس سے بچ نہیں سکتا ہے، یہی کچھ مرزا مظہر جاناں کے ساتھ بھی ہوا کہ ان کے کلام میں تصوف کی واضح بازگشت سنائی دیتی ہے، جس نے مرزا کی غزل گوئی کو لازوال بنا دیا اور ایسا کیوں نہ ہو کہ ان کی غزل گوئی کی بنیاد ہی عشق و محبت ہے جو قلبی واردات سے تعلق رکھتی ہے۔

عام غزل میں بھی عشق و عاشقی کا وجود ہوتا ہے اور صوفیانہ غزل میں بھی ،لیکن دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ صوفی شاعر حقیقی عشق کے نور سے شرابور ہوتا ہے جب کہ عام غزل گو عشق مجازی کی آگ میں جلتا ہے۔ بہر حال !اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ غزل گوئی کی ترقی میں صوفیانہ شاعری کا اہم کردار ہے ۔آج ہم جو رعنائی اور توانائی غزل میں محسوس کر رہے ہیں وہ تصوف کی مرہون منت ہے ۔مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''اس کشش یعنی عشق کا مبدا حسن ہے۔یعنی حسن جہاں پایا جائے گا یہ کشش بھی ہوگی اور جس قدر حسن کامل تر ہوگا اسی قدر کشش بھی زیادہ قوی اور سخت ہوگی اور چونکہ حسن کامل صرف شاہد حقیقی میں پایا جاتا ہے، اس لیے عشق بھی وہی کامل جو شاہد حقیقی سے تعلق رکھتا ہو۔یہی وجہ ہے کہ حضرات صوفیہ کی شاعری میں جو جذبہ اور اثر ہے اوروں کے کلام میں اس کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔حضرات صوفیہ کا مطلوب عموماً شاہد حقیقی ہے اس لیے ان کا عشق ہوا وہوس سے پاک اور نہایت قوی اور مستقل ہوتا ہے۔مجازی حسن ناکامل اور سریع الزوال ہے۔اس لیے عشق مجازی میں وہ زور، وہ جذبہ، وہ استقلال نہیں ہوسکتا جو عشق حقیقی کا خاصہ ہے۔...

عشق میں سیکڑوں قسم کی وارداتیں پیش آتی ہیں۔محویت،شوق،جانبازی،شکایت،انتظار، وصل،ہجر، یہ تمام واردات اور جذبات عام شاعری کے موضوع ہیں۔لیکن یہی جذبات جب تصوف کی زبان سے ادا ہوتے ہیں تو ان میں نہایت زور اور جوش پیدا ہوجاتا ہے۔...اس موقع پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ عشق مجازی میں جو وارداتیں پیش آتی ہیں عشق حقیقی میں ان کا کیا موقع ہے۔شاہد حقیقی (یعنی ذات باری) زمان،مکان،صورت،شکل، سمت اور جہت سے مطلق بری ہے۔دیدار،وصال،فراق،انتظار،شوق،محویت،جذبات، کا کیا محل ہے۔لیکن واقعہ یہ ہے کہ عارف پر ذاتی اور صفاتی تجلیات اور مشاہدات میں جو کیفیات گزرتی ہیں وہ عشق مجازی کی واردات سے بالکل ملتی جلتی ہیں۔اس لیے اسی قسم کے لیکن زیادہ لطیف زیادہ پرجوش اور زیادہ پاک جذبات پیدا ہوتے ہیں اور صوفی شعرا انھیں کو عام الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔'' (شعر العجم،جلد:۵،ص:۸۴ تا ۸۷)

اور مرزا مظہر جان جاناں کے کلام کی خوبی بھی یہی ہے کہ وہ سیدھے سادے اور عام الفاظ میں کہے گئے ہیں اور اس پر صوفیانہ رنگ اور عشق حقیقی کی آمیزش ،ان کے کلام میں اور بھی لطف،شیرینی،تازگی،رعنائی اور بالیدگی پیدا کردیتی ہے۔

لیکن اہم بات یہ ہے کہ مرزا مظہر کے کلام میں صوفیانہ مضامین کی کثرت کے باوجود رنگ

تغزل کہیں کم نہیں ہوا اور نہ ہی کہیں کوئی خشکی یا بدمزگی کا احساس ہوتا ہے،عبدالرزاق قریشی لکھتے ہیں:

''مرزا صاحب صوفی تھے۔ان کی ساری عمر سلوک اور ارشاد و ہدایت میں گزری۔اس لیے صوفیانہ مضامین کا ان کے یہاں ہونا ناگزیر تھا۔انھوں نے 'سر دلبری' کو بڑی دل کشی وندرت کے ساتھ ''فاش'' کیا ہے اور لطف یہ ہے کہ ان اشعار میں زہد کی خشکی نہیں بلکہ تغزل کی رنگینی و رعنائی ہے۔'' (مرزا مظہر جان جاناں اور ان کا کلام،ص:۱۶۲)

یہ تمام باتیں ان اشعار میں محسوس کی جاسکتی ہیں:

الٰہی درد و غم کی سرزمیں کا حال کیا ہوتا
محبت گر ہماری چشم تر سے مینہ نہ برساتی

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے
کہاں اس کو دماغ و دل رہا ہے

سجن کس کس مزہ سے آج دیکھا مجھ طرف یارو
اشارہ کرکے دیکھا، ہنس کے دیکھا،مسکرا دیکھا

اگر ملئے تو خفت ہے و گر دوری قیامت ہے
غرض نازک دماغوں کو محبت سخت آفت ہے

مرا جلتا ہے دل اس بلبلِ بے کس کی غربت پر
کہ گل کے آسرے پر جن نے چھوڑا آشیاں اپنا

رقیباں کی نہ کچھ تقصیر ثابت ہے نہ خوباں کی
مجھے ناحق ستاتا ہے یہ عشقِ بد گماں اپنا

اسی معجز بیانی کو دیکھ کر سید انشاء اللہ خاں جیسے زبان داں،مرزا مظہر کے کلام کی چاشنی کو لا یزال کہنے پر مجبور ہوئے،انشا کے اس نظریے کو''دریائے لطافت'' سے مع فارسی عبارت مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی کتاب''آب حیات'' میں نقل کیا ہے،جس کا خلاصہ یہ ہے:

''ایک بار جب یہ بندۂ گنہ گار والد مغفور کے ساتھ دار الخلافہ میں تھا تو فیض مآب مرزا جان جاناں مظہر علیہ الرحمہ کی فصاحت و بلاغت کا چرچا سنا۔میرے دل اور آنکھ میں کشمکش ہونے لگی کہ مرزا صاحب کے دیدار سے میں کیوں محروم رہا اور ان بزرگ کے کلام معجز نظام میں جو لا یزال روحانی اور جاودانی لذت و سرور ہے اس سے خود کو کیوں باز رکھا۔چار و ناچار ان سے ملاقات کے لیے گئے۔وہ جامع مسجد سے متصل ایک مقام پر تھے اور شریفانہ و بزرگانہ لباس میں ملبوس تھے۔میں نے ان کی بارگاہ میں ادب کے ساتھ سلام پیش کیا۔اس فرط

عنایت اور مکارم اخلاق کے ساتھ میرے سلام کا جواب دیا اور اپنے قریب میں بٹھایا جو اللہ کے نیک بندوں کا شیوہ رہا ہے۔'' (ص:۱۷۴)

نیاز فتح پوری جیسا مستند اور باشعور نقاد نے ہندوستان کے جن پانچ شاعروں کو ایرانی مسلم الثبوت کے مقابلے پیش کیا ہے ان میں ایک نام مرزا مظہر جان جاناں کا بھی ہے، مرزا کی غزل گوئی کے تعلق سے وہ لکھتے ہیں:

''ان کی غزل گوئی میں سعدی و مابعد سعدی دونوں زمانوں کا رنگ سمویا ہوا ہے۔''

(انتقادیات، جلد:۲، ص:۲۰۹)

بالفاظ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مرزا مظہر جان جاناں کے کلام میں سعدی کی سی سادگی و صفائی، لطافت و چاشنی، سوز و گداز، شستگی و شگفتگی، موسیقیت و غنائیت، دلکشی و رعنائی اور کیفیات عشق کے سوسو اظہار تو ملتے ہیں لیکن ان تمام خصوصیات پر تصوف کا رنگ زیادہ غالب وحاوی ہے: ؎

سحر اس حسن کے خورشید کو جا کر جگا دیکھا
ظہور حق کو دیکھا خوب دیکھا باضیا دیکھا
جو اٹھ کر نیند سے تری طرف دیکھا او سارا دن
طماچہ قہر کا دیکھا، غضب دیکھا، بلا دیکھا

معاون کتابیں

۱۔معمولات مظہریہ، محمد نعیم الدین بہرائچی، مترجم: محمد الطاف نیروی، کرمانوالہ بک شاپ، لاہور ۲۰۰۹ء
۲۔مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط، مرتب: ڈاکٹر خلیق انجم، مکتبہ برہان، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔۱۹۸۹ء۔
۳۔مقامات مظہری، تالیف: شاہ غلام علی دہلوی، مترجم: محمد اقبال مجددی، لاہور۔۲۰۰۱ء۔
۴۔مرزا مظہر جان جاناں اور ان کا کلام، مرتب: عبدالرزاق قریشی، دارالمصنفین، اعظم گڈھ ۲۰۰۴ء
۵۔آب حیات، تالیف: محمد حسین آزاد، احسان بکڈپو، لکھنو، مطبوعہ شاہی پریس لکھنو۔سنہ ندارد۔
۶۔تذکرۂ ہندی، غلام ہمدانی مصحفی، انجمن ترقی اردو ہند۔۱۹۳۴ء۔
۷۔تذکرہ مشائخ نقشبندیہ، علامہ محمد نور بخش توکلی، مشتاق بک کارنر، اردو بازار، لاہور۔
۸۔شعرالعجم، جلد:۵، مولانا شبلی نعمانی، معارف پریس، یوپی۔۱۹۴۰ء۔
۹۔انتقادیات، نیاز فتح پوری، جلد:۲، ناشر: عبدالحق اکیڈمی، حیدرآباد، سنہ ندارد۔
۱۰۔مرزا مظہر جان جاناں، ان کا عہد اور اردو شاعری، سید تبارک علی، ناشر: مصنف، ۱۹۸۸ء

○○○

ڈاکٹر ظفر انصاری ظفر

آسی غازی پوری کی شاعری کی فکری جہات

حضرت آسی غازی پوری رحمۃ اللہ علیہ کے کلام سے میں اس وقت واقف ہوا جب میری عمر یہی تقریباً بیس بائیس برس کی رہی ہوگی۔ میں نے ایک جلسے میں ان کا ایک مشہور کلام جس کا مطلع ہے:

نہ میرے دل نہ جگر پر نہ دیدۂ تر پر
کرم کرے وہ نشان قدم تو پتھر پر

سنا تھا۔ کلام بھی نہایت عمدہ اور جنھوں نے اس کو پڑھا تھا ان کی آواز بھی نہایت ہی اثر انگیز تھی، دونوں نے مل کر کلام دوآتشہ کی کیفیت پیدا کردی تھی۔ کلام سن کر کم سنی کے عالم میں بھی میرے اوپر وجد کا عالم طاری ہوگیا تھا۔ آج جب میں حضرت آسی کے کلام پر کچھ باتیں تحریر کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں تو وہ سماں مجھے بڑی شدت سے یاد آرہا ہے۔ آسی کے کلام کی سب سے بڑی خوبی اس کی جاذبیت اور اثر انگیزی ہے اور یہ وصف ان کے کلام میں ان کے اخلاص اور جذبے کی صداقت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ ان کا کلام محض شعری روایت کی پیروی یا قافیہ پیمائی سے عبارت نہیں، بلکہ ان کی سوزش پنہاں اور جذبِ دروں کا اظہار نامہ ہے۔ اسی کے ساتھ ان کی شاعری میں زبان و بیان کا وہ کلاسیکی رچاؤ اور تغزل انداز بھی ہے جو کسی بھی شاعر کو معتبر بنانے کے لیے کافی ہوتا ہے، اس کے باوجود حضرت آسی پر اس انداز سے توجہ نہیں دی گئی جس کے وہ مستحق تھے۔ اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں:

''آج مجھے کوئی قابل قدر تاریخ شعر اردو ایسی یاد نہیں آتی جس میں آسی کی شاعری کا اعتراف کیا گیا ہو۔ مولانا عبدالسلام ندوی جیسا بالغ النظر اور ہمہ گیر مورخ دو جلدیں شعر الہند کی لکھ ڈالتا ہے اور مشکل سے کسی ایک جگہ آسی کا نام لے کر چپ ہو جاتا ہے اور پھر نہ ان کی شاعری پر کوئی رائے دیتا ہے اور نہ ان کا ایک شعر درج کرتا ہے۔ کیا آسی کے سارے کلام میں ایک شعر بھی ایسا نہ نکل سکا جس کو تغزل یا تصوف یا کسی اور عنوان کے

مثالاً پیش کیا جاسکتا تھا۔اور شاعری ان کے لیے باعث فخر نہ تھی ۔ وہ خانقاہِ رشیدیہ کے سجادہ نشین تھے اور ایک صاحبِ باطن مرشد اور یہی ان کی اصل بزرگی اور برگزیدگی ہے جس کے سامنے ان کی ساری شاعری شرما کر منہ چھپالیتی ہے ۔ یہ آسی خود کہتے تو ہم خاموش ہو جاتے یا پھر اگر کوئی ایسا مرید کہتا جو شاعری کا مبصر نہ ہوتا یا کم از کم شاعری پر تنقید کرنے نہ بیٹھا ہوتا تو بھی اس کو معاف کیا جاسکتا تھا،لیکن ایک نقاد ادب کو ایسا تجاہل زیبا نہیں ۔اردو شاعری میں آسی کی شاعری کو شامل نہ کرنا صریح ظلم ہے۔'' (۱)

محولہ بالا اقتباس اس حقیقت کا برملا اظہار ہے کہ حضرت آسی غازی پوری کی شعری خصوصیات کا جس انداز میں تنقیدی محاکمہ کیا جانا چاہیے اور ان کے شاعرانہ امتیازات کی جس خوش اسلوبی کے ساتھ نشان دہی کی جانی چاہیے تھی، اس سے وہ محروم رہے جس کی وجہ سے ادبی دنیا میں ان کا شناخت نامہ کما حقہ تشکیل نہ پاسکا اور اس کے لیے اردو ناقدین و محققین کا تجاہل پسند رویہ پورے طور سے ذمہ دار ہے ۔ علاوہ ازیں اس کے پس پشت اس رویّے کی بھی کارفرمائی ہے جو نہایت ہی سہل پسند ہے اور معروف شاعروں پر ہی کچھ لکھ دینا اپنی ادبی فتوحات تصور کرتا ہے اور وہ ان شاعروں، ادیبوں اور فن کاروں تک پہنچنا نہیں چاہتا جو ہر طرح کے ادبی محاسن و خصوصیات کے باوجود عدم توجہی کے شکار رہے۔

حضرت آسی غازی پوری کا اصل نام عبدالعلیم ،تاریخی نام ظہور الحق اور تخلص آسی تھا۔ ابتدا میں وہ 'عاصی' تخلص فرمایا کرتے تھے جس کے معنی گنہ گار کے ہیں،لیکن اپنے پیرومرشد قطب الہند حضرت شاہ معین الدین شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے حکم کے مطابق عاصی کو آسی سے بدل دیا۔آپ کے والد ماجد جناب شیخ قنبر حسین تھے جو خود بھی صوفی منش انسان تھے۔ان کے خاندانی پس منظر سے متعلق عبیدالرحمن صدیقی اپنی کتاب ''تذکرۂ مشائخ غازی پور'' میں لکھتے ہیں:

''آپ کے والد ماجد کا نام حضرت شیخ قنبر حسین تھا،نسباً سلسلۂ جدی سے انصاری تھے۔ جد مادری آپ کے اجداد کے، بندگی شیخ مبارک تھے، جو حضرت مولانا مظفر بلخی کی اولاد میں سے تھے اور ملک عدن سے سکندر پور تشریف لائے تھے۔'' (۲)

حضرت آسی غازی پوری کی پیدائش ۱۹؍شعبان ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۲ء کو سکندر پور ضلع بلیا میں اور وفات ۲؍جمادی الاول ۱۳۳۵ھ مطابق ۲؍فروری ۱۹۱۷ء کو ہوئی۔آپ اصلاً سکندر پور بلیا کے رہنے والے تھے اور ان کی زندگی میں جو بھی کلام شائع ہوئے بمطابق ڈاکٹر ڈی۔ این۔ چترویدی زاہد ''وہ آسی سکندر پوری کے نام سے شائع ہوئے۔'' (۳) لیکن وہ آسی غازی پوری کے نام سے مشہور ہوئے۔اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ جس زمانے میں حضرت آسی پیدا ہوئے،

اس زمانے میں سکندر پور بلیا تحصیل کا ایک قصبہ تھا اور یہ تحصیل غازی پور ہی میں موجود تھی ۔اس کی دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ان کا مزار بھی محلہ نورالدین پورہ ضلع غازی پور میں موجود ہے۔

آسی کا تعلق ناسخ اسکول سے تھا جیسا کہ ڈاکٹر غلام یحیٰ مصباحی نے لکھا ہے:

''مولانا عبدالعلیم آسی اردو ادب کی دنیا میں ایک صوفی شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ شاعری کے میدان میں انھوں نے اپنا الگ اور منفرد مقام بنایا۔بچپن ہی سے شعر گوئی کا شوق تھا۔یعنی آسی ایک فطری شاعر تھے۔۔۔۔ان کی ابتدائی شاعری بھی لائق ستائش اور قابل داد ہے۔آسی کے وقت کے مشہور شاعر شاہ غلام اعظم افضل الہ آبادی (سجادہ نشین دائرہ شاہ اجمل الہ آباد) جو ناسخ کے قریبی شاگردوں میں تھے، ایک بار آسی نے بھی اپنا کلام جون پور کے قیام میں ہی افضل الہ آبادی کو دکھلایا، افضل صاحب نے ان کی غزلوں کو بہت ہی غور وفکر سے دیکھا اور ان کی ذہانت کی داد دی اور مفید مشوروں سے نوازا۔ اس کے بعد آسی کو اصلاح کی ضرورت نہیں پڑی تھی مگر ادباً وہ غزلیں افضل صاحب کے پاس بھیجتے رہے۔اس طرح سے دیکھا جائے کہ آسی صاحب افضل کے شاگرد ہیں اور افضل صاحب ناسخ کے شاگرد ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آسی کا سلسلۂ تلمذ مشہور زمانہ شاعر ناسخ سے جاملتا ہے۔'' (۴)

اگرچہ آسی غازی پوری کا سلسلۂ تلمذ ناسخ سے ملتا ہے،ان کے کلام کا ایک بڑا حصہ ناسخ کے شعری رجحان سے متاثر ہے یعنی اس حصے میں فقط زبان دانی کے کمال کا مظاہرہ کیا گیا ہے،لیکن حضرت آسی کی شناخت جس قسم کی شاعری کی بدولت قائم ہوئی، اس شاعری میں ناسخیت کے بجائے میریت پائی جاتی ہے،جس کا اعتراف خود آسی کے ایک شعر سے بھی ہوتا ہے۔وہ ملاحظہ ہو:

اس طرح درد سے لبریز جو تقریر نہ ہو
سخن آسی شیدا غزل میر نہ ہو

دیوان آسی کے سرسری مطالعے سے ہی اس بات کی تصدیق ہوجاتی ہے جس کا اظہار سطور بالا میں کیا گیا ہے۔ان کے عموماً وہی اشعار اور وہی غزلیں دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی ہیں جن میں واردات قلبی اور کیفیات روحانی کا برملا اظہار ہوا ہے۔ پہلے چند وہ اشعار ملاحظہ ہوں جن میں رنگِ ناسخ کا غلبہ موجود ہے:

سینۂ صد چاک کے بنتے ہیں سب روزن چراغ
دل میں ہے اس کے تصور کا جو عکس افگن چراغ

ایسی آواز دل سے یہ کوسوں تک اڑ جاتا ہے
آج معلوم ہوا ہے پرِ پرواز جرس

جز اس کے کہ آنکھیں ہوں کبھی لختِ جگر ریز
دیکھا ہی نہیں نخلِ محبت کو ثمر ریز
شیرینیِ لعل لبِ جاناں سے ہے ظاہر
طوطی خط سبز حسیناں ہے شکر ریز

گریۂ وقتِ دعا بے تابیِ حسن قبول
جیسے پانی دیکھ کر کرتا ہے پیاسا اضطراب

کہا یہ دیکھ کر خالِ بت بے پیر کا دانا
الٰہی اس کو تو کرنا مری تقدیر کا دانا
مرے آنسو جو پوچھے یار نے دھانی دوپٹے سے
ہوا سر سبز آخر اشک بے تاثیر کا دانا

محولہ بالا اشعار کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وہ اشعار ملاحظہ فرمائیے جن میں میرؔ کا سوز وگداز اور دردمندی وجگر کاوی موجود ہے:

ثابت جو ہو رہی تھی گلشن کی بے ثباتی
جوں جوں ہنسے گل تر، میں زار زار رویا
غبار ہو کے بھی آسی پھرو گے آوارہ
جنونِ عشق سے ممکن نہیں ہے چھٹکارا

رشکِ خورشید جہاں تاب دیا دل مجھ کو
کوئی دل بر بھی اسی دل کے مقابل دینا

حسن کی کم نہ ہوئی گرمیِ بازار ہنوز
نقدِ جاں تک لیے پھرتے ہیں خریدار ہنوز

طائر جاں قفس تن سے تو چھوٹا لیکن
دام گیسو میں کسی کے ہے گرفتار ہنوز
ساتھ چھوڑا سفر ملک عدم میں سب نے
لپٹی جاتی ہے مگر حسرتِ دیدار ہنوز
اپنی عیسیٰ نفسی کی بھی تو کچھ شرم کرو
چشم بیمار کے بیمار ہیں بیمار ہنوز

محولہ بالا اشعار میں سوز وگداز اور دل برشتگی کی جو کیفیت ہے وہ اس امر کی شہادت پیش کرتی ہے کہ حضرت آسی رنگ میرؔ کے شاعر ہیں۔ مجنوں گورکھپوری نے ان کے کلام کی انھیں خصوصیات کی بنا پر ان سے متعلق یہ کہا ہے کہ ''مجھے یہ کہنے میں مطلق تامل نہیں ہے کہ آسی دبستان ناسخ کے میرؔ ہیں۔''(۵)

حضرت آسی کے تغزل میں نعتیہ آہنگ کی کارفرمائی بھی بطور خاص نظر آتی ہے۔ ان کی غزلوں کے بعض اشعار سے محبت رسول کا شدید جذبہ بھی منعکس ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ محبت رسول کا یہ جذبہ ان کی غزلوں میں طہارت اور پاکیزگی کا نور بھر دیتا ہے جس سے ان کی شاعری الہام والقا کے درجے کو پہنچ جاتی ہے۔ آسی طبعاً، مزاجاً اور فطرتاً ایک صوفی شاعر تھے اور تصوف میں عشق رسول کو کلیدی مقام حاصل ہے۔ لہٰذا انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے اس امر کا بخوبی اظہار کیا ہے کہ انھیں باعث ایجادِ کل ختم الرسل حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم سے بے انتہا محبت ہے۔ اس ضمن میں ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جو تاثیر کے اعتبار سے اپنے منتہا کو پہنچے ہوئے ہیں:

اب تو پھولے نہ سمائیں گے کفن میں آسی
ہے شب گور بھی اس گل سے ملاقات کی رات

وہاں پہنچ کے یہ کہنا صبا سلام کے بعد
کہ تیرے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

وہ جسم تھا یا کوئی گل تر، شمیم جس کی وہ روح پرور
جدھر سے گزرے بسا وہ رستہ، بہا پسینہ گلاب ہو کر

باندھ کر اکثر تصور اس رخ پرنور کا
خانۂ دل میں کیا کرتے ہیں ہم روشن چراغ

یہ بات مسلمہ حقیقت ہے اور کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ قیامت کے دن محبوب خدا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گنہ گار امتیوں پر کرم فرمائیں گے۔ عرصۂ محشر میں ان کا دیدار عام ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت آسی کے یہاں قیامت سے متعلق ایسے اشعار کی فراوانی ہے جن میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کریمی کی دہائی دی گئی ہے، ان سے چشم التفات کی امید اور رحمت کی تمنا کا اظہار کیا گیا ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے کے مصداق چند اشعار ملاحظہ ہوں:

رو کر آسی پوچھتا تھا کب قیامت آئے گی
کس طرح کہیے کہ وہ تیرا تمنائی نہ تھا

وہ کاش اتنا قیامت میں پوچھیں
کہاں ہے آسیِ بے دل ہمارا

خیر آجاتی قیامت تو قیامت ہی سہی
دیکھ لینا تو کسی طرح میسر ہوتا

حضرت آسی کو کامل یقین ہے کہ قیامت میں نبی رحمت کے جمال دل افروز کا نظارہ حاصل ہوگا، لیکن ان کی بے تابی کا یہ عالم ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے جلوے سے اس دنیاوی زندگی میں مشرف ہونے کا موقع مل جائے جس کے باعث وہ رسول کی بارگاہ میں اس آرزو کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ وہ انھیں اس دار فانی کی زندگی میں اپنا دیدار کرائیں تا کہ ان کے دل کو قرار حاصل ہو:

پلادے آج کہ مرتے ہیں رند اے ساقی
ضرور کیا کہ یہ جلسہ ہو حوض کوثر پر

ہم نہیں جانتے قیامت کیا
آج اگر تم ملو قباحت کیا

حضرت آسی تصوف کی روایت کے مطابق مجاز کو حقیقت کا اولین زینہ تصور کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں دونوں کا برملا اظہار ملتا ہے۔ دراصل مجاز اور حقیقت ان کی روحانی کیفیات کی دو منزلیں ہیں اور ایک کے عرفان کے بغیر دوسرے کا ادراک ان کی شاعری میں مشکل ہے۔ مظاہر عالم جنھیں مجاز سے تعبیر کیا جاتا ہے، ان کی دل کشی و رعنائی، ذات حقیقی کا ہی پرتو ہے، اس لئے شاعر حسن مجاز پر نگاہ ڈالتا ہے تو اسے حسن حقیقی کے جلوے کا ہی ادراک ہوتا ہے اور اس کے توسل سے وہ حسن حقیقی تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے اندر جو سیمابی کیفیت ہے اس کا راز یہی

ہے کہ وہ حسن حقیقی کے جلوؤں میں گم ہو جانا چاہتا ہے۔ اس تناظر میں ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

لالہ و گل کا یہ دیوانہ تماشائی نہ تھا
باغ میں ہر پھول تیرے حسن کا آئینہ تھا
اسی کے جلوے تھے لیکن وصال یار نہ تھا
میں اس کے واسطے کس وقت بے قرار نہ تھا
خرام جلوہ کے نقش قدم تھے لالہ و گل
کچھ اور اس کے سوا موسمِ بہار نہ تھا
محیط رنگ نیرنگ فنا ہیں
جمال دوست ہے ساحل ہمارا

وحدت الوجود اور وحدت الشہود کو بعض لوگ دو نظریہ تصور کرتے ہیں، لیکن میرے نزدیک دونوں دو نظریات نہیں بلکہ یہ دونوں دو روحانی مرحلے ہیں۔ دو روحانی کیفیات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض دفعہ ایک ہی سالک کے یہاں دونوں طرح کی کیفیات پائی جاتی ہیں۔ حضرت آسی غازی پوری کی شاعری کا اس تناظر میں مطالعہ کرنے کے بعد اس امر کا بخوبی انکشاف ہوتا ہے کہ وہ دونوں طرح کی کیفیات سے دوچار ہوئے تھے، ورنہ ان کے یہاں اس طرح کے اشعار نہیں پائے جاتے۔

کوئی تیرے سوا کہیں ہے بھی
بدگمانی کی مجھ سے علت کیا
کچھ تصور ہے تمھارا یا تمھیں ہر شے میں ہو
دیکھئے جو چیز آپ اس میں نظر آتے ہیں کیوں
وہ کیا ہے ترا جس میں جلوہ نہیں ہے
نہ دیکھے تجھے کوئی اندھا نہیں ہے
ان آنکھوں کو جب سے بصارت ملی ہے
سوا تیرے کچھ میں نے دیکھا نہیں ہے
وحدت جسے کہتے ہیں وہی کثرت ہے
کثرت جسے سمجھے ہو وہی وحدت ہے

کثرت میں وحدت اور وحدت میں کثرت کا نظارا وہی کر سکتا ہے جس کی آنکھ میں سرمۂ بصیرت موجود ہو اور یہ چیز ایک عمر کی ریاضت کے بعد ہاتھ آتی ہے۔ آسی غازی پوری ایک صاحب بصیرت بزرگ شاعر تھے۔ اس لیے انھیں اس بات کا عرفان ہو گیا تھا کہ وحدت کیا ہے

اور کثرت کیا ہے۔ وحدت میں کثرت کا تماشا کیسے دیکھا جا سکتا ہے اور کثرت میں وحدت کا نظارہ کرنے کے کیا طریقے ہیں۔

حضرت آسی غازی پوری کے یہاں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں جن میں معاملہ بندی اور حسن و عشق کے درمیان چھیڑ چھاڑ کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ایسے اشعار غزل کے حسن میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔ بعض دفعہ اس طرح کے اشعار میں ابتذال کا سقم بھی پیدا ہو جاتا ہے، لیکن آسی کے کلام میں ابتذال کا دور دور تک کوئی نشان نہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

حوصلہ تیغ جفا کا رہ نہ جائے		آیئے خون تمنا کیجیے
چال وہ چل کہ نہ ہو محشر خیز		یہ روش چرخِ جفا کار کی ہے
عشق و ہوس میں حسن کو تمیز چاہیے		مانو نہ مانو آگے تمھیں اختیار ہے
کہتے ہو کہ اور کو نہ چاہو		معلوم ہوا کہ تم خدا ہو

جان دو دن کی ہے مہمان ستاتے کیوں ہو
آپ روتے ہوئے آئے ہیں رلاتے کیوں ہو

حضرت آسی کے یہاں تصوف ہی نہیں بلکہ تغزل کے بھی بہترین اشعار موجود ہیں، ملاحظہ ہو:

اور کیا چاہتی ہے آرزوئے دل ان سے
کچھ نہیں حسن کی سرکار میں حسرت کے سوا

راستہ چھوڑ دیا اس نے ادھر کا آسی
کیوں بنی رہ گزر یار میں تربت دل کی

دم نزع آنے کا وعدہ تو دیکھو
کہ اب مرنا بھی ہو مشکل ہمارا

ڈھونڈتے پھرتے ہیں کھوئے ہوئے دل کو اپنے
ہم نے جس دن سنا ہے گھر ہے تمھارا دل میں

عداوت ہے سیہ چشموں کو ہم سے بعد مردن بھی
لحد پر جو اگا سبزہ ہرن آ آکے چرتے ہیں

بال زلفوں کے ہیں، عشاق سیہ بخت نہیں
جب نہ تب سامنے سے ان کو ہٹاتے کیوں ہو

تیرے تلووَں کی چھڑائی ہوئی مہندی کی طرح
خاک میں تیری جدائی نے ملایا ہم کو

حضرت آسی غازی پوری ایک قابل قدر شاعر ہیں۔ معنوی اور صوری ہر دو اعتبار سے ان کی شاعری قابل مطالعہ ہے۔ ان کے کلام میں تغزل کی دھنک رنگی بھی ہے اور تصوف کا نور بھی۔ عشق کی مستی اور روح کی سرشاری بھی ہے اور فلسفے کی ژرف بینی بھی۔ یعنی ان کی غزل گوئی یک رخہ پن کی شکار نہیں اور اس میں معنی کی ایک سرسبز و شاداب دنیا آباد ہے۔ اپنی جملہ خصوصیات کی بنا پر ان کی شاعری زندہ رہنے والی شاعری ہے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ شعر و ادب کی دنیا میں انھیں وہ مقام حاصل ہو کے رہے گا جس کے وہ مستحق ہیں۔

حوالہ جات

(۱) ''دیوان آسی المعروف بہ عین المعارف'' مولف طیب شاہ شاہد علی رشیدی، ناشر انجمن فیضان رشیدی کمر ہٹی، کلکتہ، سنہ اشاعت ندارد، ص۔ ۷۔

(۲) ''تذکرۂ مشائخ غازی پور'' از اعبید الرحمن صدیقی، صمد منزل، مچھر ہٹا، غازی پور ص۔ ۴۵۱۔

(۳) ''تجلیات آسی'' ڈاکٹر ڈی۔ این۔ چترویدی زاہدؔ، انجمن فروغ ادب، بشلی پور، بلیا ۱۹۹۰ء، ص۔ ۲۲

(۴) ''مولانا احمد رضا اور ان کے معاصر علمائے اہل سنت کی علمی و ادبی خدمات''، ڈاکٹر غلام یحییٰ مصباحی، ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا پاکستان، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص۔ ۵۶۔

(۵) ''دیوان آسی المعروف بہ عین المعارف'' مولف طیب شاہ شاہد علی رشیدی، ناشر انجمن فیضان رشیدی کمر ہٹی، کلکتہ، سنہ اشاعت ندارد، ص۔ ۱۲۔

○○○

زاویہ

امام عبدالوہاب شعرانی کی شخصیت اور ان کی علمی و اصلاحی خدمات پر خصوصی گوشہ

ادارہ

آئینۂ حیات شعرانی

نام: عبدالوہاب بن احمد بن علی شعرانی

عرف: امام شعرانی

لقب: عارف ربانی، عارف باللہ، ابوالمواہب

ولادت: ۲۷ رمضان ۸۹۸ھ/ ۱۱ جولائی ۱۴۹۳ء

اساتذہ ومشائخ: شیخ ابراہیم المتبولی، شیخ علی الخواص، شیخ صالح افضل الدین احمدی، شیخ الاسلام زکریا انصاری خزرجی، شیخ علی نورالدین لمرصفی، شیخ محمد شناوی، شیخ احمد السطحیۃ، شیخ عبد القادر الاشطوطی، شیخ ابوالعباس الحریثی، شیخ نورالدین اشونی، شیخ ناصرالدین النحاس رضی اللہ تعالیٰ عنہم

کمالات: مجدد، صوفی، واعظ، مصنف، فقیہ، محدث

مسلک: شافعی، اشعری

شیخ ارادت: شیخ علی الخواص قدس سرہ جو ایک امی بزرگ تھے۔

سند تلقین ذکر: شیخ محمد شناوی قدس سرہ سے

تجدیدی اور اصلاحی کارنامے: عقائد صوفیہ کا بیان اور ان کے مسلک و منہاج کا دفاع۔ مذاہب فقہا کی تحقیق اور سب کے درست و صواب ہونے کی تحقیق۔ علماے سو اور جاہل صوفیہ کی اصلاح۔ شریعت و سنت کا احیا۔ سالکین و طالبین کے لیے اصول و فروع کی تالیف و تدوین

تصنیفات: البحر المورود فی المواثیق والعهود، کشف الغمة عن جمیع الامة، مشارق الانوار القدسیة فی بیان العهود المحمدیة، منهاج الجواهر فی بیان عقائد الاکابر، طبقات کبریٰ، الکبریت الاحمر فی بیان علوم الکشف الاکبر وغیرہ

وفات: جمادی الاولی ۹۷۳ھ/ دسمبر ۱۵۶۵ء

تلخیص وترتیب: رفعت رضا نوری

حیات شعرانی بزبان شعرانی

لطائف المنن والاخلاق سے اقتباس

نام ونسب

عبدالوہاب بن احمد بن علی بن محمد بن زوفا بن الشیخ موسیٰ (جنہیں بہنسا کے شہروں میں ابوعمران کی کنیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ میرے چھٹے دادا ہیں۔) بن سلطان احمد ابن سلطان سعید ابن قاشین ابن سلطان محیا بن سلطان زوفا ابن سلطان ریان بن سلطان محمد بن موسیٰ ابن السید محمد الحنفیہ ابن الامام علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔ مجھ پر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے احسان فرمایا کہ مجھے شرافت نسبی حاصل ہے۔

اگرچہ غالب طور پر تقویٰ کے بغیر نسبی شرافت نفع نہیں دیتی لیکن کبھی کچھ فائدہ حاصل ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا اشارہ اپنے اس ارشاد میں فرمایا ہے: **وکان ابوھما صالحا** (جن دو یتیم بچوں کی دیوار حضرت خضر اور موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام نے کھڑی کی تھی) ان دونوں کا باپ نیک تھا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ ان کا باپ صالح تھا تو وہ اس انعام میں داخل نہ ہوتے اور اس کی صفت صلاح کی تصریح فرمانے کا چنداں فائدہ نہ ہوتا۔ (باب اول، ص:٦٦)

بچپن کے ایام

ریف کے علاقے میں ۸ سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کیا۔ بچپن سے ہی پابندی وقت کے ساتھ پانچ وقت کی نماز ادا کرتا اور مجھے یاد نہیں کہ میں نے آج تک نماز کا وقت ضائع کیا ہو، سوائے ایک دفعہ کے کہ سفر حجاز کے دوران راستے میں نماز ظہر پڑھنا بھول گیا اور تاخیر کی نیت کے بغیر عصر کا وقت داخل ہو گیا۔ کئی دفعہ میں ایک ہی رکعت میں پورا قرآن کریم ختم کر لیتا حالاں کہ ابھی بالغ نہیں تھا۔ (ص ٦٦-٦٧)

مصر کا سفر

اللہ تعالیٰ نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے مجھ پر انعام فرمایا کہ میں ریف کا صحرائی علاقہ چھوڑ کر مصر آ گیا اور یوں اللہ تعالیٰ نے مجھے جفا و جہالت کی سرزمین سے لطف اور علم کے شہر کی طرف منتقل فرمایا اور اس کی طرف سیدنا یوسف علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اشارہ فرمایا کہ آپ فرماتے ہیں: وَقَدْ أَحْسَنَ بِي إِذْ أَخْرَجَنِي مِنَ السِّجْنِ وَجَاءَ بِكُمْ مِنَ الْبَدْوِ مِنْ بَعْدِ أَنْ نَزَغَ الشَّيْطَانُ بَيْنِي وَبَيْنَ إِخْوَتِي۔ (یوسف: 100) یعنی اس نے مجھ پر بڑا کرم فرمایا جب اس نے مجھے قید خانہ سے نکالا اور تمہیں صحرا سے لے آیا، اس حالت کے بعد کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان ناچاقی پیدا کر دی تھی۔ چنانچہ آپ نے اپنے بھائیوں کے صحرا سے آنے کو اپنے اوپر اور بالتبع بھائیوں پر اللہ تعالیٰ کے احسان کے طور پر ذکر فرمایا۔ جس طرح کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے ساتھ اور اپنے ساتھ ظاہر کی گئی حکمت عملی پر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی اور حدیث شریف میں مرفوعاً بیان کیا گیا ہے کہ جس نے صحرا میں سکونت اختیار کی اس نے جفا کیا، جو شکار کے پیچھے چلا، غافل ہوا اور جو ارباب اقتدار کے دروازوں پر آیا، فتنہ میں مبتلا ہوا۔ (ص:٦٦)

جب میں ۱۲ سال کی عمر میں مصر آیا تو سیدی ابوالعباس الغمری کی جامع میں اقامت پذیر ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے شیخ الجامع اور ان کی اولاد کو مجھ پر بغایت مہربان کر دیا۔ چنانچہ میں ان کے درمیان ایسے تھا جیسے کہ انہی میں سے ایک ہوں۔ میں وہی کھاتا جو وہ کھاتے اور وہی پہنتا جو وہ خود پہنتے۔ انہیں میری طرف سے اللہ تعالیٰ ہی جزائے خیر عطا فرمائے گا۔ ان کے پاس وہاں رہتے ہوئے میں نے کتب شرعیہ کے متون اور ان کی اصطلاحات یاد کیں اور انہیں شیوخ پر پیش کر کے عقدہ کشائی کا شرف حاصل کیا۔ میرے ظاہر کو اللہ تعالیٰ نے گناہوں میں ملوث ہونے سے محفوظ رکھا۔ عقیدت کی بنا پر لوگ مجھے بہت کچھ سونا چاندی اور کپڑے پیش کرتے اور ظاہر کے ساتھ ساتھ باطنی آلودگیوں سے بھی محفوظ ہونے کی بنا پر میں کبھی تو سب کچھ لٹا دیتا اور کبھی صحن جامع میں ڈال دیتا تاکہ مجاور اسے اٹھا لیں۔ لوگوں سے سوال کرنے سے بچتے ہوئے اور ان کی نگاہوں میں رسوا ہونے کے خوف سے کئی کئی دن بھوکا رہتا حالاں کہ میں نابالغ تھا۔ (ص:٦٦)

بچپن کے چند واقعات

دریائے نیل کناروں تک بہہ رہا تھا۔ میں اس میں تیرتے ہوئے بہت تھک گیا۔ قریب تھا وسط دریا میں ڈوب جاؤں کہ اللہ تعالیٰ نے میرے لیے مگر مچھ بھیج دیا جو کہ میرے پاؤں کے نیچے آ ٹھہرا حتیٰ کہ مجھے راحت ملی۔ میں سمجھا کہ کوئی چٹان ہے۔ دیکھتا ہوں کہ وہ پانی کی سطح پر آ کر تیرنے لگا۔ پھر میرے ارد گرد تیرتے ہوئے مجھے سہارا دیتا رہا، یہاں تک کہ میں ساحل تک پہنچ

گیا۔ پھر وہ غوطہ لگا کر نکل گیا، یہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کا احسان ہے، جب کہ اس وقت میں چھوٹا تھا اور مجھے اس کے حضور حسن معاملہ کے طریقے کی پہچان نہ تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے لطف و کرم سے مجھے ہلاکت سے بچانے کے لیے ہلاک کرنے والے کے ذریعے میری حمایت فرمائی اور اس وحشی جانور کو میرے پاؤں کے نیچے رام کر دیا حتیٰ کہ مجھے اس پریشانی سے نجات ملی۔ (حوالہ سابق، ص:٦٦)

اس طرح ایک فاسق و فاجر نے میرے ساتھ فحش کلامی کی۔ اسے اللہ تعالیٰ نے سات دن کے بعد جذام میں مبتلا کر دیا، یہاں تک کہ لوگ اس سے نفرت کرنے لگے اور وہ اسی ذلت میں مر گیا۔ اس طرح ایک شخص مجھ سے بدسلوکی سے پیش آیا۔ اس نے روم کی طرف سفر کیا جہاں فرنگیوں نے اسے قید کر لیا اور وہاں عیسائی ہو گیا۔ میرے ساتھ پیش آنے والے اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں باوجودیکہ میں والدین کی طرف سے یتیم تھا لیکن اللہ تعالیٰ ہی میرا مددگار تھا اور اللہ تعالیٰ ہی کافی ہے دوستی اور امداد کے لیے۔ (ص:٦٦)

وسعت مطالعہ

مجھ پر اللہ تعالیٰ کے انعامات میں سے ایک انعام یہ ہے کہ میں نے کتب شریعت اور اس کے معاون علوم کا خود کثرت سے مطالعہ کیا۔ پھر میں نے ان سے استفادے میں اپنے فہم پر ہی اعتماد نہیں بلکہ مشکل مقامات کے حل کے لیے علمائے کرام کی طرف رجوع کیا کیوں کہ میرے فہم میں خطا کا احتمال تھا۔ جن کتابوں کا میں نے مطالعہ کیا ان میں کتب تفسیر، کتب شروح الاحادیث بالخصوص شروح صحیح بخاری فتح الباری ایک مرتبہ، شرح کرمانی دو مرتبہ شرح برماوی، پانچ مرتبہ، عینی دو مرتبہ اور شرح قسطلانی ایک سے کچھ زائد مرتبہ۔ قاضی عیاض کی شرح مسلم ایک مرتبہ، نووی کی شرح مسلم پندرہ مرتبہ، شیخ محی الدین ابن عربی کی مختصر جو کہ تیس ضخیم جلدوں میں ہے ایک مرتبہ، ماوردی کی کتاب الحاوی جو کہ تیس جلدوں میں ہے ایک مرتبہ، امام شافعی کی کتاب الام تین مرتبہ، شیخ ابومحمد الجوینی کی کتاب محیط جس میں آپ نے کسی ایک مسلک کی پابندی نہیں کی، انہیں کی کتاب الفروق، امام غزالی کی کتاب الوسیط، امام واحدی کی تفسیر البسیط والوجیز ایک مرتبہ۔ علاوہ ازیں بے شمار مطولات۔ (ص:٨٢)

کتب تفسیر

نیز تفسیر قرآن کی مشہور کتب کا مطالعہ کیا، تفسیر بغوی ایک مرتبہ، تفسیر خازن تین مرتبہ، تفسیر ابن عادل سات مرتبہ، تفسیر کوشی دس مرتبہ، تفسیر ابن زہرہ ایک مرتبہ، تفسیر قرطبی دو مرتبہ، تفسیر ابن کثیر ایک مرتبہ، تفسیر بیضاوی پانچ مرتبہ، تفسیر ابن النقیب المقدسی ایک مرتبہ جو کہ سو ضخیم جلدوں میں ہے اور اس سے زیادہ وسیع تفسیر کا میں نے مطالعہ نہیں کیا، امام واحدی کی تفسیر البسیط والوجیز، شیخ عبدالعزیز الدیرینی کی کبیر و صغیر تین مرتبہ، تفسیر جلالین تیس مرتبہ امام جلال الدین السیوطی کی

بڑی تفسیر یعنی الدر المنثور تین مرتبہ وغیرہ۔ (ص:٨٣ تا ٨٦)

کتب حدیث

میں نے حدیث شریف اور دلائل مذاہب کی اتنی کتابوں کا مطالعہ کیا کہ ان کا شمار نہیں ہو سکتا۔ بعض یہ ہیں۔ صحاح ستہ، صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن حبان، مسند امام احمد، مؤطا امام مالک، طبرانی کی تینوں معاجم، ابن امیر کی جامع الاصول، امام سیوطی کی جامع کبیر، جامع صغیر، زیادات اور یہ دس ہزار احادیث کا مجموعہ ہے اور حدیث پاک کی ان کتابوں میں سے شریعت پاک کا کوئی نادر مسئلہ ہی باہر ہوگا اور سنن بیہقی کے بعد ادلۂ مذاہب میں یہ سب سے جامع کتاب ہے۔ اس طرح میں نے بیہقی کی سنن کبریٰ کا مطالعہ کیا، پھر میں نے اسے سند اور تکرار خذف کر کے مختصر کیا، البتہ احکام باقی رکھے۔ اسی طرح میں نے شیخ مجد الدین کی کتاب المنتقی من الاحکام کا مطالعہ کیا اور یہ میری کتاب کشف الغمۃ عن جمیع الامۃ کے مسودے کی اصل ہے۔ اسی طرح میں نے ابن قیم کی کتاب الہدی النبوی کا مطالعہ کیا، پھر اسے مختصر کیا۔ بیہقی کی دلائل النبوۃ اور امام سیوطی کی کتاب المعجزات والخصائص کا مطالعہ کیا، پھر اسے مختصر کیا۔ علاوہ ازیں میں نے اتنے اجزاء اور مسانید کا مطالعہ کیا کہ شمار نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے شیخ شمس الدین المظفری کو میرے تابع فرمان کر دیا جو کہ خزائن مصر سے ہر وہ کتاب لے آتے تھے جو میں طلب کرتا۔ (ص:٨٦ تا ٨٧)

کتب لغت

میں نے لغت میں جوہری کی صحاح، قاموس، ابن اثیر کی نہایہ، نووی کی تہذیب الاسماء و اللغات کا مطالعہ کیا۔ مؤخر الذکر کا پندرہ مرتبہ مطالعہ کیا۔ (ص:٨٧)

کتب اصول و کلام

کتب اصول و کلام میں سے بعض یہ ہیں: شرح العضد، شرح منہاج البیضاوی، غزالی کی کتاب المسصفی، امام الحرمین کی کتاب الامالی، شرح المقاصد، کتاب شرح الطوالع والمطالع، قزوینی کی سراج العقول، تفتازانی کی شرح عقائد اور حاشیہ ابن ابی شریف وغیرہ۔ (ص:٨٧)

کتب فتاویٰ

درپیش حالات و واقعات کے بارے میں علمائے متقدمین اور متاخرین کے فتاویٰ کی بے شمار کتابوں کا مطالعہ کیا ہے جیسے فتاویٰ ابن ابی زید المروزی، فتاویٰ القفال، فتاویٰ القاضی الحسین، فتاویٰ الماوردی، امام غزالی اور ان کے امام کے فتاویٰ، فتاویٰ ابن ابی صباغ، فتاویٰ ابن الصلاح، فتاویٰ ابن السلام، فتاویٰ النووی، فتاویٰ السبکی، فتاویٰ البلقینی، فتاویٰ الشیخ زکریا، فتاویٰ الشیخ شہاب الدین الرملی وغیرہ۔ (ص:٨٧ تا ٨٨)

کتب قواعد

قواعد کی کتابوں میں سے ان کتب کا مطالعہ کیا۔قواعد الشیخ عزالدین الکبریٰ والصغریٰ، قواعد العلائی، قواعد السبکی، قواعد الزرکشی۔(ص:۸۸)

کتب سیرت

سیرت کی کتابوں میں سے سیرۃ ابن ہشام، سیرۃ ابن اسحاق، سیرت الکلبی، سیرۃ ابی الحسن البکری، سیرۃ الطبری، سیرۃ الکلاعی، سیرۃ ابن سید الناس اور سیرۃ الشیخ محمد الشامی جسے آپ نے سیرت کی ایک ہزار کتب سے جمع فرمایا۔ میرے نزدیک یہ سیرت میں سب سے جامع کتاب ہے۔(ص:۸۸)

کتب تصوف

میں نے تصوف اور لطائف کی اتنی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے کہ شمار نہیں ہوسکتا، ان میں سے ابو طالب مکی کی کتاب القوت، حارث محاسبی کی کتاب الرعایۃ، ابونعیم کی کتاب الحلیہ، رسالہ قیصریہ، سہروردی کی کتاب عوارف المعارف، غزالی کی کتاب الاحیاء، یافعی کی سب کتابیں، شیخ اکبر کی کتاب الفتوحات، پھر میں نے اس میں سے وہ مقامات حذف کر کے جو شیخ کے نام پر اس میں غلط طور پر درج کیے گئے تھے، اسے مختصر کر دیا۔ علاوہ ازیں میں نے شیخ احمد زاہد کا رسالہ نور پڑھا جس کی دو جلدیں ہیں اور آپ کے مرید شیخ محمد الغمری کی کتاب منح المنۃ کا مطالعہ کیا جس کی چھ جلدیں ہیں۔ ہروی کی منازل السائرین، قاشانی کی شرح الفصوص اور قصری کی شعب الایمان وغیرہ کا مطالعہ کیا۔

یہ ان چند کتابوں کا ذکر ہے جس کا مطالعہ کرنا مجھے یاد ہے اور الحمدللہ! میرے خیال میں اس زمانے میں شاید کوئی ہو جسے ان کا علم ہو۔(ص:۸۸۔۸۹)

میزان اعتدال

میں اپنے مذہب کی کتابوں کی بہ نسبت باقی تین مذاہب کے ائمہ یعنی امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد بن حنبل رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی کتابوں کا مطالعہ زیادہ کرتا ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب میں امام شافعی رضی اللہ عنہ کے مذہب میں تبحر حاصل کر لیا تو مجھے ایسے مسائل کی معرفت کی ضرورت محسوس ہوئی جن پر چاروں ائمہ کرام کا اجماع ہوا، یا پھر تین ائمہ جن پر متفق ہوں تاکہ میں ان کے ممنوعات پر عمل سے پرہیز کر سکوں اور جس کا انہوں نے حکم دیا ہے اس پر عمل کر سکوں۔

کتب مدونہ کا مطالعہ میں نے رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اشارہ پر کیا۔ اس

طرح امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ کے مذہب کی کتابوں کا بھی مطالعہ کیا اور میں نے اقوال ائمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں مطابقت کے لیے ایک میزان مقرر کیا اور اسے میزان کبریٰ کے نام سے جانا جاتا ہے اور اس کی وجہ سے پتہ چلتا ہے کہ ائمہ مجتہدین کے مذاہب اور ان کے مقلدین کے اقوال شریعت مطہرہ ہی کی طرف لوٹتے ہیں۔(ص:۸۹ تا۹۱)

مجھ پر اللہ تعالیٰ کا ایک انعام یہ بھی ہے کہ جب میں نے ائمہ مجتہدین کے مذاہب کے علوم میں تبحر حاصل کر لیا تو اب میں ان کے مذاہب کی توجیہات کثرت سے بیان کرتا ہوں اور جب کسی بھی امام مجتہد کا مذہب بیان کرتا ہوں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ میں انہی میں سے ایک ہوں۔ اسی دوران جو شخص میرے پاس آتا ہے وہ گمان کرتا ہے کہ میں حنفی یا حنبلی یا مالکی ہوں حالانکہ میں امام شافعی رضی اللہ عنہ کا مقلد ہوں اور یہ اس لیے ہے کہ میں نے اقوال ائمہ کے مصادر کا احاطہ کیا ہے اور مجھے اس کی دلائل پر آگاہی ہے۔

بعض بے جا جرأت کرنے والے کبھی میری مذمت اور تنقیص کے لیے یہاں تک کہہ گزرتے ہیں کہ یہ کسی مذہب فقہ کا پابند نہیں، حالانکہ میں اپنی آگہی کی وسعت کی بنا پر مذاہب ائمہ بیان کرتا ہوں، دین میں بے جا جرأت یا رخصتوں کے تتبع کے لیے نہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ جب میں نے مذاہب کے دلائل کی کتابیں تصنیف کیں تو مجھے پتہ چلا کہ مجتہدین میں سے کوئی کسی چیز میں قرآن پاک کے صریح لفظوں سے دلیل لیتا ہے تو کوئی ان کے مفہوم سے استدلال کرتا ہے۔ بعض اس سے سند لیتے ہیں جس سے مفہوم اخذ کیا گیا تو بعض اصل صحیح کے مطابق قیاس صحیح سے نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ اس طرح سب کے مذاہب شریعت مطہرہ سے ہی تیار کیے گئے ہیں۔ ان کا تانا بانا شریعت پاک ہی ہے۔(ص:۹۱)

مشائخ امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ

میں نے اس کتاب لطائف المنن میں مذکور انعامات و اخلاق کی تائید میں ان تین مشائخ؛ حضرت شیخ علی الخواص، شیخ علی الخواص کے پیر و مرشد الشیخ ابراہیم المتبولی اور اپنے پیر بھائی الشیخ الصالح افضل الدین احمدی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اخلاق ہی بیان کئے ہیں کیوں کہ مجھے ان کے مریدین سے یہ بات تواتر کے ساتھ پہنچی ہے کہ انہوں نے کہا ہے کہ ہمارے مشائخ نے جماعت صوفیہ کے نزدیک معروف شرطوں کے مطابق حضور نبی پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے عالم بیداری میں مشافہۃً اپنے طریق کا فیض حاصل کیا ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ ابراہیم المتبولی کے طریق پر میرے اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان دو حضرات کا واسطہ ہے جب کہ آپ کے علاوہ دوسروں کے طریق میں صرف ایک شخصیت کا واسطہ ہے۔(ص:۱۴)

(میں نے جن دیگر علما و مشائخ سے رابطہ کیا ان میں چند اہم نام یہ ہیں:)

شیخ الاسلام زکریا انصاری خزرجی رحمۃ اللہ علیہ جن کی صحبت بیس سال تک رہی۔

شیخ علی نور الدین مرصفی رحمۃ اللہ علیہ

عارف باللہ شیخ محمد شناوی رحمۃ اللہ علیہ

شیخ احمد السطحیۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ، ۲۰ سال تک ان کی خدمت میں رہا۔

شیخ عبدالقادر اشطوطی رحمۃ اللہ علیہ جن کی صحبت میں بیس سال رہا۔

شیخ عارف باللہ ابوالعباس حریثی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تیس سال صحبت رہی۔

شیخ نور الدین اشونی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

شیخ ناصر الدین النحاس رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ۱۵ سال تک ان سے مصاحبت رہی۔ (۷۰ تا ۷۵)

علاوہ ازیں بے شمار اہل اللہ سے استفادہ کیا۔ کئی ایک مجاذیب سے رابطہ رکھا اور ان سے فیوض و برکات حاصل کیے۔

تصنیفات

اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ انعام فرمایا کہ میں نے شریعت میں بے شمار کتابیں تالیف کیں۔ اکثر اپنے موضوع کے اعتبار سے نئی ہیں۔ مجھ سے پہلے کسی کی ایسی کاوش نہیں ملتی۔ چنانچہ چند ایک کے نام یہ ہیں۔

البحر المورود فی المواثیق والعهود۔ کشف الغمة عن جمیع الامة ۔ المنهاج المبین فی بیان ادلة المجتهدین ۔ البدر المنیر فی غریب احادیث البشیر والنذیر ۔ مشارق الانوار القدسیة فی بیان العهود المحمدیة ۔ لواقح الانوار القدسیة فی مختصر الفتوحات المکیة ۔ قواعد الصوفیة ۔ مختصر قواعد الزرکشی ۔ منهاج الجواهر فی بیان عقائد الاکابر ۔ الجوهر المصون فی علوم کتاب الله المکنون ۔ طبقات الصوفیة یعنی طبقات کبریٰ ۔ مفحم الاکباد فی بیان موارد الاجتهاد ۔ موائح الخذلان علی کل من لم یعمل بالقرآن ۔ حد الحسام علیٰ من اوجب العمل بالالهام ۔ التتبع والفحص علی حکم الالهام اذا خلف النص ۔ البروق الخواطف لبصر من عمل بالهواتف ۔ رسالة الانوار فی آداب العبودیة ۔ کشف الحجاب والران عن وجه اسئلة الجان ۔ فرائد القلائد فی علم العقائد ۔ الجواهر والدار ۔ الکبریت الاحمر فی بیان علوم الکشف الاکبر ۔ الاقتباس فی علم القیاس ۔ تنبیه المغترین فی القرن العاشر علیٰ ما خالفو فیه سلفهم الطاهر (ص: ۹۲ تا ۹۳)

اتباعِ شریعت

اللہ تعالیٰ کا مجھ پر احسان ہے کہ بچپنے سے ہی قول، فعل اور اعتقاد کے حوالے سے مجھے سنت محمدیہ علی صاحبہا الصلوات والتسلیمات کی پیروی کے لیے انشراح صدر حاصل ہے یعنی سنت پاک پر عمل کے لیے سینے میں فراخی محسوس کرتا ہوں جب کہ خلاف سنت سے مجھے تنگی کا احساس ہوتا ہے۔ کئی دفعہ اس فعل کو اپناتے ہوئے رک جاتا ہوں جسے بعض علمائے کرام نے اچھا سمجھا حتیٰ کہ میرے لیے اس فعل کے کتاب وسنت یا قیاس یا عرف کے موافق ہونے کی وجہ ظاہر ہو جائے۔ (ص: ۹۹ باب اول)

ضرورتِ شیخ

مجھے اہل طریقت کی خدمت میں حاضر ہونے اور ان کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا ذوق دل میں ڈالا گیا۔ چنانچہ بحمدہ تعالیٰ میں نے بے شمار اہل طریقت کی خدمت میں حاضری دی۔ بالخصوص ان تین مشائخ سے خصوصی فیض پایا سیدی علی المرصفی، سیدی محمد شناوی اور سیدی علی خواص رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ مجھے ان تینوں کے حضور باریابی پر ہی ضرورت شیخ کی تحقیق ہوئی۔

(ص: ۱۰۳۔ ۱۰۴)

اہل طریقت کی فضیلت کے لیے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا حضرت خضر علیہ الصلوٰۃ السلام سے یہ کہنا ہی کافی ہے: **هل اتبعک علی ان تعلمنی مما علمت رشدا۔** (الکہف، آیت: ۶۶) کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں بشرطیکہ آپ مجھے رشد و ہدایت کا وہ خصوصی علم سکھائیں جو آپ کو سکھایا گیا۔ نیز حضرت امام احمد بن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ابوحمزہ البغدادی کی فضیلت کا اعتراف کرنا، امام احمد بن سریج رحمۃ اللہ علیہ کا ابوالقاسم الجنید کی عظمت کا اعتراف کرنا، حجۃ الاسلام ہونے کے باوجود امام غزالی کا اپنے لیے کوئی شیخ طلب کرنا جو کہ آپ کو طریقت کی رہنمائی کرے، اسی طرح شیخ عزالدین بن عبدالسلام کا اپنے لیے شیخ طلب کرنا حالاں کہ آپ کو سلطان العلما کا لقب دیا گیا۔ چنانچہ امام غزالی کے شیخ حضرت شیخ محمد الباذغانی اور شیخ عزالدین کے شیخ حضرت شیخ ابوالحسن شاذلی ہیں۔ (ص: ۱۰۴)

چنانچہ امام غزالی جب اپنے شیخ مذکور کی خدمت میں حاضر ہوتے تو کہا کرتے کہ ہم نے اپنی عمر بے مقصد ضائع کی۔ آپ یہ بات اس ذوق کی نسبت سے فرماتے جو کہ آپ نے اہل طریقت کے احوال سے حاصل کیا اور شیخ عزالدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے کہ مجھے کامل اسلام کا عرفان شیخ ابوالحسن شاذلی کی خدمت میں حاضری کے بعد ہی حاصل ہوا۔ (ص: ۱۰۴)

○○○

ذیشان احمد مصباحی

فقہی روایات واقوال میں عارفانہ تطبیق

المیزان الکبری الشعرانیۃ کی روشنی میں

عارف باللہ امام عبدالوہاب شعرانی (۸۹۸ھ۔ ۹۷۳ھ) نے اپنی مشہور زمانہ تصنیف المیزان الکبریٰ الشعرانیۃ میں بظاہر مختلف احادیث واقوال میں تطبیق کی ایک نئی راہ نکالی ہے، جو تمام مجتہدین ومقلدین کے تعلق سے احترام وتوقیر، اولیاے کاملین کی عظمت بلند کے اعتراف اور اجتہاد وتقلید کے حوالے سے ایک معتدل نقطۂ نظر پر مبنی ہے۔ اس حوالے سے امام شعرانی نے المیزان الکبریٰ کے ابتدائی صفحات میں جو اصولی باتیں کی ہیں ان کا خلاصہ راقم کے ہی قلم سے مجلہ الاحسان کے گزشتہ شمارے میں ''مسئلۂ اجتہاد وتقلید امام شعرانی کی نظر میں'' کے زیر عنوان آچکا ہے۔ اپنے منفرد اصول تطبیق کی روشنی میں امام شعرانی نے بظاہر مختلف احادیث واقوال میں جو بے شمار تطبیقات فرمائی ہیں ان میں سے بعض مثالیں نذر قارئین کی جارہی ہیں ہیں۔

امام شعرانی کا اصول تطبیق جو بقول ان کے خود ان کی دریافت ہے، ان سے پہلے کسی دوسرے عالم کی عروس فکر اس تک نہیں پہنچ سکی تھی، وہ یہ ہے:

''برادرم! شریعت؛ امر ونہی ہر دو جہت سے دو مرتبے تخفیف وتشدید پر وارد ہے۔ شریعت میں صرف ایک پہلو ہی نہیں ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر زمانے میں تمام مکلفین ایمانی اور جسمانی اعتبار سے دو ہی طرح کے ہو سکتے ہیں؛ قوی یا ضعیف۔ ان میں جو قوی ہے وہ تشدید سے مخاطب ہے اور اسے عزیمت پر عمل کرنے کا حکم ہے اور جو ضعیف ہے وہ تخفیف سے مخاطب ہے اور اسے رخصت پر عمل کرنے کا حکم ہے۔ ایسے میں ان دونوں میں سے ہر ایک اپنے رب کی طرف سے شریعت اور برہان پر قائم ہیں، لہٰذا قوی کو رخصت کے لیے نیچے آنے کا حکم نہیں دیا جاسکتا اور نہ ضعیف کو

عزیمت کے لیے اوپر جانے کا مکلف کیا جاسکتا ہے۔''

(المیزان الکبریٰ الشعرانیۃ، ص:۶، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۹۹۸ء)

تاریخ اسلام کے اس پہلے اور منفرد اصول تطبیق کی روشنی میں یہ حقائق منکشف ہوتے ہیں کہ ائمہ میں جو اختلافات ہیں، ان اختلافات کی وجہ سے ان میں کوئی صحیح ودرست اور کوئی خاطی وگمراہ نہیں ہے، بلکہ تمام ائمۂ ہدیٰ برحق ہیں اور ان میں سے ہر ایک صحیح ومصیب ہے۔ نیز صرف وہ ائمہ ہی برحق نہیں ہیں جن کے مسالک بعد میں جاری رہے، بلکہ ان کے علاوہ وہ ائمۂ مجتہدین بھی برحق اور مصیب تھے، جن کے مسالک بعد کے ادوار میں کسی بھی وجہ سے جاری نہ رہ سکے، مثلاً حضرت داؤد ظاہری، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، محمد بن جریر، عمر بن عبدالعزیز، اعمش، شعبی اور اسحاق وغیرہ۔ رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین۔ اسی طرح امام شعرانی نے اپنے اصول تطبیق سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا ہے کہ ایسا شخص جو صرف اپنے امام کو مصیب اور دوسرے ائمہ کو خاطی سمجھتا ہے، ابھی اس کا فہم ناقص اور اس کا سلوک ناتمام ہے، بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام احادیث اور ائمہ کے تمام اقوال حق ودرست ہیں، ان میں سے کوئی حدیث یا اجتہاد قابل رد نہیں ہے، بلکہ عالم کے لیے جو سچ مچ کتاب وسنت اور اقوال ائمہ کا عالم ہو، تمام مسالک فقہ ایک مسلک کی طرح سے ہیں، ایسا عالم حسب ضرورت وصورت مسالک اربعہ پر فتویٰ دے سکتا ہے، البتہ بے ضرورت ایک مسلک فقہ کو چھوڑ کر دوسرے پر فتویٰ دینا یا عمل کرنا درست نہیں، کہ اس میں اتباع ہویٰ کا پہلو ہے۔

اب ہم امام شعرانی کی تطبیقات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ان تطبیقات میں امام شعرانی کا اسلوب سادہ، یکساں اور عام فہم ہے، وہ پہلے کسی بھی مسئلے سے متعلق ایک دو یا اس سے زائد ایسی احادیث پیش کرتے ہیں جن میں تشدید ہوتی ہے پھر ان کے بالمقابل دوسری احادیث پیش کرتے ہیں جن میں تخفیف ہوتی ہے، پھر امام شعرانی فرماتے ہیں کہ ان میں پہلی قسم کی احادیث میں شدت ہے لہٰذا وہ اکابر اور خواص کے لیے ہیں اور دوسری قسم کی احادیث میں تخفیف ہے، وہ عوام اور ضعفا کے لیے ہیں۔ یہ ترتیب کبھی اس کے برعکس بھی ہوتی ہے۔

(۱) کھڑے ہوکر پیشاب کرنے کا مسئلہ

امام شعرانی نے اس حوالے سے سب سے پہلے بخاری سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہوکر پیشاب فرمایا۔

(صحیح البخاری، کتاب الوضو، باب البول قائما وقاعدا/صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، باب المسح علی الخفین)

پھر اس کے بالمقابل وہ حدیث نقل کی ہے جس میں ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹھ کر پیشاب فرمایا۔

(ترمذی، ابواب الطہارۃ، باب النہی عن البول قائما/ ابن ماجہ، کتاب الطہارۃ، باب فی البول قاعدا)

اور اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر سے یہ فرمایا کہ کھڑے ہو کر پیشاب مت کرو، جس کے بعد تادم آخر حضرت عمر نے کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کیا۔

(ترمذی، ابواب الطہارۃ، باب النہی عن البول قائما/ ابن ماجہ، کتاب الطہارۃ، باب فی البول قاعدا)

ان احادیث میں مختلف علما نے مختلف انداز سے تطبیقات دی ہیں اور کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کی مختلف توجیہیں کی ہیں، مثلاً قاضی عیاض مالکی فرماتے ہیں:

''کھڑے ہو کر پیشاب فرمانے کی مختلف توضیحات کی گئی ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر اس لیے پیشاب فرمایا کہ کھڑے ہو کر پیشاب کرنے میں خروج حدث کا خطرہ بہت کم رہتا ہے۔ ایک قول یہ ہے کی اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف تھی۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ غالباً اس کوڑے میں جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر پیشاب فرمایا تھا، ترنجاستیں تھیں اور وہ جگہ نرم تھی، وہاں کھڑے ہو کر پیشاب کرنے میں پیشاب کے چھینٹے پڑنے کا خطرہ نہیں تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا خدشہ تھا کہ اگر پیشاب کے لیے آپ بیٹھیں گے تو آپ کا لباس مبارک نجاست آلود ہو جائے گا۔ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر پیشاب فرمایا۔ (اکمال المعلم شرح صحیح مسلم، 2/46)

امام شعرانی نے ان احادیث میں جو تطبیق دی ہے، وہ گزشتہ تطبیقات سے یکسر مختلف ہے۔ آپ اپنے منفرد اصول تطبیق کی روشنی میں فرماتے ہیں:

''پہلی حدیث میں تخفیف ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان جواز کے لیے ایسا فرمایا، جب کہ آخر کی دونوں حدیثوں میں تشدید ہے، گویا ادب و حیا میں کاملین اور غیر کاملین دونوں کے احوال کی رعایت کر لی گئی ہے۔'' (ص:۹۷)

(۲) بیٹھے بیٹھے سونے سے وضو ٹوٹنے کا مسئلہ

اس حوالے سے سب سے پہلے یہ حدیث نقل کی ہے:

العینان وکاء السہ، فمن نام فلیتوضا۔

دونوں آنکھیں بندھن ہیں۔ لہٰذا جو سو جائے وہ وضو کرے۔

(سنن ابن ماجہ، کتاب الطہارۃ، باب الوضوء من النوم/ مسند احمد ابن حنبل، مسند علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ)

اس کے بعد اس کے بالمقابل یہ حدیث نقل کی:

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ وہ بیٹھے بیٹھے سو کر جھپکیاں لینے لگے

تھے کہ اتنے میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور ان کے پیچھے سے انہیں پکڑ لیا۔ حضرت حذیفہ نے عرض کی: حضور! کیا میرا وضو ٹوٹ گیا۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں! اس وقت تک وضو نہیں ٹوٹے گا جب تک کہ تمہارے پہلوز مین سے نہ لگ جائیں۔ (سنن بیہقی، کتاب الطہارۃ، باب ترک الوضوء من النوم قاعدا)

امام شعرانی اپنے منفرد اصول تطبیق کی روشنی میں مذکورہ دونوں احادیث میں تطبیق دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''پہلی حدیث سونے کی وجہ سے وضو کے ٹوٹنے کے سلسلے میں عام ہے، اگرچہ سونے والا جم کر بیٹھا ہوا ہو، اور دوسری حدیث میں یہ ہے کہ جو بیٹھ کر سوئے اس کا وضو نہیں ٹوٹتا۔ اور ان دونوں کو دیکھتے ہوئے دونوں میں تطبیق اس طرح ہوگی کہ پہلی حدیث کو متدین اور متقی اکابر کے حال پر محمول کیا جائے اور دوسری حدیث کو ان کے علاوہ دوسروں کے حال پر محمول کیا جائے، اس طرح معاملہ میزان کے دونوں پہلو؛ تشدید اور تخفیف کی طرف راجع ہو گیا۔'' (ص:۹۷)

واضح رہے کہ اس باب کی احادیث میں تطبیق دیتے ہوئے علما نے مختلف قول کیے ہیں۔

امام ابوزکریا یحییٰ بن شرف نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''علما کے اس میں مختلف مذاہب ہیں۔ (۱) نیند کسی بھی حال میں ناقض وضو نہیں۔ یہ حضرت ابوموسیٰ اشعری، سعید ابن مسیب، ابومجلز، حمید الاعرج اور شعبہ کی طرف منسوب ہے۔ (۲) نیند ہر حال میں ناقض وضو ہے۔ یہ حضرت حسن بصری، مزنی، ابوعبید القاسم بن سلام اور اسحاق بن راہویہ کا قول ہے۔ امام شافعی کا ایک غریب قول بھی یہی ہے۔ ابن منذر نے کہا کہ میرا موقف بھی یہی ہے۔ فرماتے ہیں کہ یہی معنی حضرت ابن عباس، حضرت انس اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے۔ (۳) زیادہ سونا ہر حال میں ناقض ہے اور سونے کی معمولی مقدار کسی بھی حال میں ناقض نہیں۔ یہ امام زہری، ربیعہ، اوزاعی، مالک اور ایک روایت کے مطابق امام احمد کا مذہب ہے۔ (۴) نمازی کی نماز میں جو حالتیں ہوتی ہیں، اگر ان میں سے کسی حالت میں سویا، مثلاً رکوع، سجدے، قیام اور قعود کی حالت میں سویا تو وضو نہیں ٹوٹے گا، خواہ حالت نماز میں ہو یا نہ ہو، اور اگر پہلو کے بل سویا، یا چت سویا تو وضو ٹوٹ جائے گا۔ یہ امام ابوحنیفہ اور امام داؤد کا مذہب ہے اور امام شافعی کا ایک غریب قول بھی یہی ہے۔ (۵) صرف حالت رکوع اور حالت سجود والی نیند ناقض ہے۔ یہ امام احمد بن حنبل سے مروی ہے۔ (۶)

صرف حالت سجدہ کی نیند ناقض ہے۔ یہ بھی حضرت امام احمد ابن حنبل سے ہی مروی ہے۔(۷) حالت نماز کی نیند بہرحال ناقض نہیں جب کہ خارج نماز والی نیند ناقض وضو ہے۔ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ضعیف ہے۔(۸) اگر کوئی بیٹھ کر اس طرح سوتا ہے کہ اس کی سرین زمین سے مضبوطی سے لگی ہوئی ہے تو اس کا وضو نہیں ٹوٹے گا بصورت دیگر اس کا وضو ٹوٹ جائے گا، عام ازیں کہ اس کی نیند تھوڑی ہو کہ زیادہ، نماز میں ہو کہ خارج نماز میں، یہ امام شافعی کا مذہب ہے۔''

(شرح النووی علی صحیح مسلم، کتاب الحیض، باب الدلیل علی ان نوم الجالس لاینقض الوضوء)

(۳) لمس اور بوسہ سے وضو ٹوٹنے کا مسئلہ

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَى أَوْ عَلَى سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا (نساء: ۴۳)

اس آیت کریمہ میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ مریض، مسافر، قضاے حاجت سے فارغ ہونے والے اور عورتوں سے ملامست کرنے والے پر لازم ہے کہ پانی نہ ملنے کی صورت میں پاک مٹی سے تیمم کرے۔ اس کا مفاد یہ ہے کہ عورتوں سے ملامست کرنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ مفسرین کی ایک جماعت ادھر گئی ہے کہ اس آیت میں ملامست (لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ) کے معنی مباشرت اور جماع کے ہیں جب کہ ایک طبقے کا کہنا ہے کہ یہاں ملامست کے معنی مطلقاً چھونے اور لمس کرنے کے ہیں۔ اس صورت میں عورتوں کو چھونے اور بوسہ لینے سے بھی وضو ٹوٹ جانا چاہیے۔ امام شعرانی فرماتے ہیں کہ اس معنی کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ جب حضرت ماعز نے اعتراف زنا کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا غالباً تم نے ملامست کی ہوگی یا بوسہ لیا ہوگا؟ (مسند احمد ابن حنبل، مسند عبد اللہ بن العباس/ مستدرک، کتاب معرفۃ الصحابہ، کتاب الحدود) کیوں کہ اس حدیث میں ملامست مباشرت کے لیے نہیں، بلکہ اس کے بالمقابل یعنی چھونے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ بہرکیف! اس معنی کے اعتبار سے مطلقاً عورت کو چھونے یا بوسہ لینے سے بھی وضو ٹوٹ جانا چاہیے۔ چنانچہ علما کے ایک طبقے کا یہی مذہب ہے۔

اس کے برخلاف حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ اللہ کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بعض امہات المومنین کو بوسہ لیتے اور پھر بغیر وضو کیے نماز پڑھ لیتے۔ (سنن الدارقطنی، کتاب الطہارۃ، باب صفۃ ماینقض الوضوء وماروی فی الملامسۃ والقبلۃ/ المعجم الاوسط، من اسمہ عبدالرحمن، حدیث: 4686) جس سے پتہ چلتا ہے کہ عورت کو بوسہ لینے یا چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اس طرح کی احادیث میں مختلف علما نے اپنے اپنے طور پر تطبیق وترجیح کا عمل فرمایا ہے، لیکن اس مقام پر امام شعرانی کی تطبیق سب سے الگ ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

''پہلی حدیث اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ چھونے اور بوسہ لینے سے وضو ٹوٹ جائے گا جب کہ دوسری حدیث وضو نہ ٹوٹنے کے سلسلے میں صریح ہے۔ لہٰذا نقض وضو کی بات اس شخص کے حال پر محمول ہوگی جسے اپنی شہوت پر کنٹرول نہ ہو اور عدم نقض کو اس شخص کے حال پر محمول کیا جائے گا جسے اپنی شہوت پر مکمل کنٹرول ہو۔'' (ص: ۹۸)

(۴) بلی کے جوٹھے کا حکم

بلی کے جوٹھے سے متعلق بھی دو قسم کی روایات وارد ہیں۔ بعض روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جوٹھا پاک ہے جب کہ بعض سے اس کے ناپاک ہونے کا اشارہ ملتا ہے۔

(۱) الف۔ إنها ليست بنجس۔ بلی ناپاک نہیں ہے۔

(الموطا، روایۃ یحیی اللیثی، کتاب الطہارۃ، باب الطہور للوضوء/ سنن ترمذی، ابواب الطہارۃ، باب ماجاء فی سؤر الہرۃ)

ب۔ عن عائشة رضی اللہ عنها رایت رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یتوضا بفضلها۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، وہ کہتی ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بلی کے پینے کے بعد بچے ہوئے پانی سے وضو فرماتے ہوئے دیکھا ہے۔

(السنن الکبریٰ، کتاب الطہارۃ، باب سور الہرۃ/ سنن ابی داؤد، الطہارۃ، باب سؤر الہرۃ)

(۲) **الف۔ عن ابی هریرة یغسل الاناء من الهر کما یغسل من الکلب۔** حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ بلی کے جوٹھے برتن کو اسی طرح دھویا جائے جس طرح کتے کے جوٹھے برتن کو دھویا جاتا ہے۔ (السنن للدارقطنی، کتاب الطہارۃ، باب سور الہرۃ/ معرفۃ السنن والآثار للبیہقی، باب سؤر مالایؤکل لحمہ سوی الکلب، والخنزیر)

ب۔ عن ابی هریرة اذا ولغ الهر فی الاناء غسل مرة او مرتین بعد ان یهراق حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ اگر بلی برتن میں منہ ڈال دے تو اس کا پانی بہانے کے بعد اسے ایک یا دو بار دھو دیا جائے۔

(سنن الدارقطنی، کتاب الطہارۃ، باب سؤر الہرۃ، میں ہے: إذا ولغ الهر في الإناء فاهرقه واغسله مرة)

امام شعرانی فرماتے ہیں کہ پہلی قسم کی احادیث میں تخفیف ہے اور ان کے بالمقابل جو حضرت ابو ہریرہ کے اقوال ہیں اگر وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد پر مبنی ہیں تو یہی سمجھا جائے کہ اس میں تشدید ہے۔ لہٰذا یہاں بھی میزان کے دونوں پلے تشدید و تخفیف صادق آئے۔ (ص: ۹۹، ۱۰۰)

واضح رہے کہ امام اعظم ابوحنیفہ بلی کے جوٹھے کو مکروہ کہتے ہیں جب کہ آپ کے علاوہ دیگر ائمہ کا اس کی طہارت پر اتفاق ہے۔ (اختلاف الائمۃ العلماء، کتاب الطہارۃ، باب الاوانی)

(۵) عظمت نماز اور اہمیت طہارت

۶ ہجری میں مدینے میں خبر آئی کہ قبیلۂ بنی مصطلق کے لوگ مدینے پر حملے کی تیاری میں ہیں۔ یہ سن کر پیش بندی کے طور پر پیغمبر اسلام علیہ الصلاۃ والسلام اپنے صحابہ کو لے کر نکلے۔ اس سفر میں امہات المومنین میں قرعۂ فال حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے نام نکلا۔ مقام مریسیع پر جنگ ہوئی اور مسلمانوں کو فتح عظیم حاصل ہوئی۔ واپسی میں ایک مقام پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہار گم ہو گیا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے بعض صحابہ کو ہار کی تلاش میں بھیجا۔ اسی اثنا میں نماز کا وقت آ گیا، ان حضرات نے بغیر وضو کے نماز پڑھ لی۔ جب وہ بارگاہ رسالت میں آئے تو اس کا ذکر کیا لیکن بقول امام شعرانی سرکار علیہ السلام نے ان سے کوئی مواخذہ نہیں فرمایا۔ اس پر آیت تیمم نازل ہوئی جس میں یہ حکم ہوا کہ پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمم کر کے نماز پڑھ لی جائے۔

ایک طرف بخاری و مسلم کی یہ روایت ہے اور دوسری طرف اللہ کے رسول ﷺ کا یہ فرمان کہ اللہ طہارت کے بغیر نماز قبول نہیں فرماتا۔ **لا یقبل اللہ صلاۃ الا بطھور** (سنن ابن ماجہ، کتاب الطہارۃ وسننہا، باب لا یقبل اللہ صلاۃ بغیر طہور/السنن الکبری، کتاب الزکاۃ، جماع ابواب صدقۃ التطوع)

امام شعرانی علیہ الرحمہ نے دونوں کے بیچ یہ تطبیق فرمائی کہ پہلی حدیث میں طہارت کے معاملے میں نرمی اور اہتمام نماز کے معاملے میں سختی ہے، جب کہ دوسری حدیث میں طہارت کے معاملے میں سختی ہے، گویا یہاں بھی حکم شریعت تشدید و تخفیف کی طرف راجع ہے۔ (ص:۹۹)

واضح رہے کہ جب پانی اور مٹی دونوں مفقود ہو تو ایسی صورت میں امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک جب تک پانی یا مٹی نہ مل جائے نماز نہیں پڑھی جائے گی، امام مالک کے یہاں اس سلسلے میں تین اقوال ملتے ہیں، ایک تو یہی، دوسرا یہ ہے کہ جیسے ممکن ہو نماز پڑھ لے پھر جب پانی ملے تو نماز دوہرا لے، امام احمد ابن حنبل کی ایک روایت اور امام شافعی کا قول جدید بھی یہی ہے، اور امام شافعی کا قول قدیم امام اعظم کے موافق ہے، جب کہ امام احمد ابن حنبل کی دوسری روایت کے مطابق وہ نماز پڑھ لے گا اور اعادے کی حاجت نہ ہوگی، اور امام مالک کا قول ثالث بھی اسی کے موافق ہے۔ (اختلاف الائمۃ العلماء، کتاب الطہارۃ، باب التیمم)

اس مسئلے میں شیخ ابن حزم ظاہری کا موقف امام احمد ابن حنبل کی دوسری روایت کے مطابق ہے، موصوف رقم طراز ہیں:

ومن کان محبوسا في حضر أو سفر بحیث لا یجد ترابا ولا ماء أو کان مصلوبا وجاءت الصلاۃ فلیصل کما ھو، وصلاتہ تامۃ ولا یعیدھا، سواء وجد الماء في الوقت أو لم یجدہ الا بعد الوقت، برھان ذلك قول اللہ تعالی: (فاتقوا اللہ ما

استطعتم) وقولہ تعالی: (لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا) وقول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: (إذا أمرتکم بأمر فأتوا منہ ما استطعتم)

جو مقام اقامت میں قید ہو یا سفر میں ہو اور ایسی جگہ پر ہو جہاں پر نہ پانی ہو اور نہ ہی مٹی ہو، یا اسے صلیب پر لٹکا دیا گیا ہو اور اسی اثنا میں نماز کا وقت ہو جائے تو وہ اسی حالت میں نماز پڑھ لے اور اس نماز کے اعادے کی ضرورت نہیں، خواہ اسے اس کے بعد وقت کے اندر پانی مل جائے یا وقت کے بعد ملے، اس کی دلیل اللہ تعالی کا یہ ارشاد ہے: **فاتقوا اللہ ما استطعتم** جہاں تک ممکن ہو اللہ سے ڈرو۔ نیز یہ ارشاد: **لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا** اللہ کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ گراں بار نہیں کرتا۔ اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ کا یہ ارشاد: **إذا أمرتکم بأمر فأتوا منہ ما استطعتم** جب میں تمہیں کسی بات کا حکم دوں تو جہاں تک ممکن ہو اسے بجالاؤ۔ (المحلی: 2/138)

(۶) مسح علی الخفین کی مدت

اس حوالے سے امام شعرانی نے پہلے صحیح مسلم کی وہ حدیث نقل کی ہے جس میں ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مسافر کے لیے مدت مسح تین دن اور تین رات مقرر فرمائی جب کہ مقیم کے لیے ایک دن اور ایک رات۔

جعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلاثۃ أیام ولیالیھن للمسافر، ویوما ولیلۃ للمقیم۔ (صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، باب التوقیت فی المسح علی الخفین)

اس کے بعد سنن بیہقی سے درج ذیل احادیث نقل کی ہیں:

(ا) عن خزیمۃ بن ثابت قال: جعل لنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلاثا ولو استزدتہ لزادنا یعني المسح علی الخفین للمسافر (السنن الکبری للبیہقی، کتاب الطہارۃ، باب ماورد فی ترک التوقیت)

حضرت خزیمہ بن ثابت سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مسافر کے لیے مسح علی الخفین کی مدت تین دن مقرر فرمائی، لیکن اگر ہم اور زیادہ چاہتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں اور اضافہ فرما دیتے۔

(ب) عن خزیمۃ بن ثابت قال: أمرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أن نمسح علی الخفین یوما ولیلۃ إذا أقمنا وثلاثا إذا سافرنا وأیم اللہ لو مضی السائل في مسئلتہ لجعلھا خمسا (السنن الکبری للبیہقی، کتاب الطہارۃ، باب ماورد فی ترک التوقیت)

حضرت خزیمہ بن ثابت سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم

دیا کہ ہم حالت اقامت میں اپنے موزوں پر ایک دن اور ایک رات مسح کریں اور حالت سفر میں تین دن اور تین رات۔ اور قسم خدا کی اگر سائل مدت مسح میں مزید توسیع چاہتا تو اللہ کے رسول اسے پانچ دن فرما دیتے۔

(ج) عن أبي عمارة: أن رسول الله صلى الله عليه و سلم صلى في بيته قال: فقلت: يا رسول الله أمسح على الخفين قال فقال نعم قلت يوما قال ويومين قلت ويومين قال وثلاثة قلت وثلاثة يا رسول الله قال نعم ما بدا لك۔

(السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب الطہارۃ، باب ماورد فی ترک التوقیت)

حضرت ابوعمارہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک باران کے گھر میں نماز پڑھی۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کی: حضور! کیا میں موزوں پر مسح کرسکتا ہوں؟ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: ہاں! میں نے عرض کی: ایک دن؟ آپ نے فرمایا: دودن۔ میں نے کہا: دودن؟ فرمایا: تین دن۔ میں نے کہا حضور! تین دن؟ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں! جب تک تم چاہو۔

امام شرف نووی صحیح مسلم والی حدیث کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''اس میں مذہب جمہور کی تائید پر واضح دلیل اور قاطع برہان ہے۔ جمہور کا مذہب یہ ہے کہ مسح علی الخفین کی مدت مقرر ہے۔ یہ سفر میں تین دن اور تین رات ہے جب کہ حضر میں ایک دن اور ایک رات۔ یہی امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد ابن حنبل اور جمہور صحابہ و تابعین کا مذہب ہے جب کہ امام مالک کے مذہب مشہور اور امام شافعی کے قول قدیم کے مطابق مسح کی کوئی مدت مقرر نہیں ہے۔'' (شرح النووی علی صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، باب التوقیت فی المسح علی الخفین)

ائمہ و علما کے اس اختلاف و تشریح کے برخلاف امام شعرانی اپنے منفرد اصول تطبیق کی روشنی میں فرماتے ہیں:

''صحیح مسلم وغیرہ کی حدیث میں تشدید ہے جب کہ بیہقی کی جملہ حدیثوں میں تخفیف ہے۔ ایسے میں اول کو اکابر کے حال پر اور دوم کو اصاغر کے حال پر محمول کیا جانا چاہیے۔ اور کبھی طاعت و معصیت کے حوالے سے جسمانی قوت و ضعف کا لحاظ کرتے ہوئے اس کے برعکس بھی ہوسکتا ہے۔'' (ص:۱۰۰)

(۷) عشا کا وقت

(۱) حضرت جبریل علیہ السلام نے نماز عشا میں آپ ﷺ کی پہلی بار اس وقت امامت فرمائی جب شفق غائب ہوچکا تھا اور دوسری بار اس وقت جب رات کا پہلا تہائی حصہ گزر

چکا تھا، اور اس کے بعد بتایا کہ عشا کا وقت ان دونوں کے بیچ ہے۔ یعنی شفق کے ڈوبنے سے لے کر رات کے پہلے تہائی حصہ تک۔ (المستدرک، کتاب الصلاۃ، باب: فی مواقیت الصلاۃ / السنن الکبریٰ، کتاب الصلاۃ، جماع ابواب المواقیت، باب آخر وقت الظہر واول وقت العصر)

اس کے برخلاف حضرت عبداللہ ابن عباس کا فرمان ہے کہ عشا کا وقت فجر تک ہے۔

(السنن الکبریٰ، کتاب الصلاۃ، جماع ابواب المواقیت، باب آخر وقت الجواز لصلاۃ العشاء)

ان دونوں باتوں کو نقل کرنے کے بعد امام شعرانی فرماتے ہیں کہ پہلی حدیث میں شدت ہے، اس لیے کہ اس میں رات کے پہلے تہائی حصہ گزرنے کے ساتھ عشا کے وقت ختم ہونے کا اندیشہ ہے جب کہ دوسری روایت میں تخفیف ہے کہ اس میں طلوع فجر تک وقت میں وسعت ہے۔ لہٰذا یہاں بھی وہی تخفیف و تشدید کی صورت پیدا ہوگئی ہے۔ (ص:۱۰۱)

(۸) امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کی تلاوت

فقہاے امت کے درمیان مختلف فیہ فقہی مسائل میں ایک اہم مسئلہ قراءت خلف الامام کا بھی ہے۔ شوافع کے یہاں قراءت، امام کے ساتھ مقتدی پر بھی پر واجب ہے، مالکی علما کے نزدیک سری نمازوں میں مقتدی کا قراءت کرنا مستحب ہے اور جہری میں مکروہ ہے اور حنبلی علما کے یہاں سری اور جہری دونوں نمازوں میں مقتدی کا قراءت کرنا مستحب ہے، البتہ جہری نمازوں میں امام کی قراءت کے دوران مکروہ ہے، اس لیے کہ تلاوت قرآن کے دوران خاموش رہنے اور غور سے سننے کا حکم ہے (الاعراف: ۲۰۴)، اس لیے جہری نمازوں میں مقتدی کو امام کے سکتے اور خاموشی کے دوران قراءت کرنی چاہیے، جب کہ عام ائمۂ احناف کے یہاں قراءت خلف الامام بہرصورت مکروہ ہے۔ البتہ صاحب ہدایہ علامہ ابوالحسن مرغینانی حنفی نے ائمۂ احناف میں امام محمد کا ایک قول نقل کیا ہے جس کے مطابق قراءت خلف الامام احتیاطاً مستحسن ہے۔ (ہدایہ، کتاب الصلاۃ، فصل فی القراءۃ) اس پر امام ابن ہمام نے فتح القدیر میں تفصیلی گفتگو کرنے کے بعد آخر میں لکھا ہے کہ امام کے پیچھے قراءت نہ کرنے میں ہی احتیاط ہے؛ کیوں کہ احتیاط، قوی تر دلیل پر عمل کرنے میں ہوتا ہے اور اس مقام پر قوی تر دلیل قراءت کے حق میں نہیں، عدم قراءت کے حق میں ہے۔

فقہا کے یہ اختلافات اس مسئلے میں دو طرح کی احادیث مروی ہونے کی وجہ سے ہیں، مثلاً:

(۱) الف۔ لا صلاۃ الا بفاتحۃ الکتاب سورۂ فاتحہ کے بغیر کوئی نماز نہیں۔

(القراءۃ خلف الامام للبخاری، باب وجوب القراءۃ للامام والماموم / السنن الصغریٰ للبیہقی، کتاب الصلاۃ، باب فرض الصلاۃ وسننہا)

ب۔ انی اراکم تقرؤون وراء امامکم، قالوا: اجل یا رسول اللہ! قال: لا تفعلوا

الا بفاتحة الکتاب، فانه لا قراءة لمن لم یقرا بھا۔

میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ اپنے امام کے پیچھے قراءت کرتے ہو، صحابہ نے عرض کی: جی سرکار ہم قراءت کرتے ہیں۔ اس پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا سورۂ فاتحہ کے علاوہ میں ایسا نہ کرو، کیوں کہ سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ (مسند احمد، تتمۃ مسند الانصار، حدیث عبادۃ بن صامت / سنن ابوداؤد، الصلاۃ، باب من ترک القراءۃ فی صلاتہ بفاتحۃ الکتاب، الفاظ میں معمولی تبدیلی کے ساتھ)

(۲) الف۔ من صلی خلف امام فان قراءۃ الامام لہ قراءۃ۔

جو امام کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کی قراءت اس کے لیے قراءت ہے۔

(کتاب الآثار، باب القراءۃ خلف الامام وتلقینہ / المعجم الاوسط، باب من اسمہ محمود)

ب۔ من کان لہ امام فقراءۃ الامام لہ قراءۃ

جس کی نماز کا کوئی امام ہو تو امام کی قراءت اس کی قراءت ہے۔

(القراءۃ خلف الامام للبخاری، باب وجوب القراءۃ للامام والماموم / سنن ابن ماجہ، کتاب اقامۃ الصلاۃ والسنۃ فیہا، باب إذا قرا الامام فانصتوا)

ان احادیث میں تطبیق دیتے وقت شوافع نے دوسری قسم کی احادیث کو مرجوح قرار دیا اور صرف پہلی قسم کی احادیث کو پیش نظر رکھتے ہوئے سورۂ فاتحہ کی قراءت کو امام و مقتدی دونوں پر فرض قرار دیا۔ شوافع کے علاوہ دیگر علما نے دونوں طرح کی احادیث پر عمل کی صورت نکالی ہے، بہ ایں طور کہ مالکی علما نے کہا کہ پہلی قسم کی احادیث کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر نماز میں سورۂ فاتحہ کی تلاوت تو ضروری ہے البتہ جماعت والی نماز اگر سری ہو تو پہلی قسم کی احادیث کے پیش نظر اگر امام کے ساتھ ہر مقتدی پڑھے تو یہ مستحب ہے، واجب نہیں ہے، کیوں کہ دوسری قسم کی احادیث کی وجہ سے مقتدی کے لیے امام کی قراءت کافی ہے اور اگر جہری نمازوں میں بھی وہ پڑھتا ہے تو دوسری قسم کی احادیث کو دیکھتے ہوئے اور یہ دیکھتے ہوئے کہ قرآن میں تلاوت قرآن کے دوران غور سے سننے اور خاموش رہنے کا حکم ہے (الاعراف: ۲۰۴)، اس کا یہ عمل مکروہ ٹھہرے گا۔

حنابلہ نے اس میں اور تفصیل کی اور کہا کہ امام کے ساتھ اگر مقتدی بھی قراءت کرتے ہیں تو پہلی احادیث کی طرف نظر کرتے ہوئے یہ عمل بلا شبہ مستحب ہوگا، البتہ واجب اس لیے نہیں ہوگا کہ دوسری قسم کی احادیث کی وجہ سے مقتدی کے لیے امام کی قراءت کافی ہے، البتہ امام جب بلند آواز سے قراءت کر رہا ہو تو اس کی قراءت کے دوران ہی مقتدی نہ پڑھیں، یہ مکروہ ہے، کیوں کہ قرآنی حکم ہے کہ جب قرآن پڑھا جا رہا ہو تو غور سے سنو اور خاموش رہو۔ (الاعراف: ۲۰۴)

احناف نے کہا کہ پہلی حدیث پر اس طرح عمل ہوگا کہ ہر نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھی جائے گی،

انفرادی نمازوں میں ہر شخص پڑھے گا اور جماعتی نمازوں میں امام پڑھے گا اور مقتدی سنیں گے، امام کے پڑھنے سے پہلی قسم کی احادیث پہ عمل ہو گیا اور مقتدی کے سننے سے قرآنی حکم 'جب قرآن پڑھا جائے تو غور سے سنو اور خاموش رہو' پر، دوسری قسم کی احادیث پر اور اکابر صحابہ کی سنت پر عمل ہو گیا۔

صاحب ہدایہ نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ امام کے پیچھے قراءت نہ کرنے پر صحابہ کا اجماع ہے۔ (ہدایہ، کتاب الصلاۃ، فصل فی القراءۃ) اس پر شرح کرتے ہوئے علامہ شمس الدین بابرتی نے لکھا ہے کہ یہ بات قابل غور ہے، اس لیے کہ جیسا کہ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بعض صحابہ قراءت خلف الامام کے وجوب کے قائل تھے۔ پھر صاحب ہدایہ کی بات کی تاویل و توضیح کرتے ہوئے خود ہی لکھا ہے کہ ممکن ہے کہ صاحب ہدایہ کی اس سے مراد اکثر صحابہ کا اجماع یا اکابر اور مجتہدین صحابہ کا اجماع ہو، یا ممکن ہے کہ جو صحابہ اس موقف کے خلاف تھے وہ بعد میں اس کے حامی ہو گئے ہوں، یا یہ مراد ہے کہ جیسا کہ بعض روایتوں میں منقول ہے کہ دس اکابر صحابہ قراءت خلف الامام سے منع کرتے تھے اور جب ان کے منع پر کسی کا رد منقول نہیں ہوا تو گویا صحابہ کا اجماع سکوتی ہو گیا۔ (العنایہ، ہدایہ، کتاب الصلاۃ، فصل فی القراءۃ)

اس باب کی مذکورہ احادیث کو سامنے رکھتے ہوئے امام شعرانی اپنے منفرد اصول تطبیق کی روشنی میں فرماتے ہیں:

''دوسری قسم کی احادیث (جس میں امام کی قراءت کو مقتدی کی قراءت بتایا گیا ہے) اکابر کے حال پر محمول ہیں، جن کا دل قراءت امام کی سماعت کے ساتھ بارگاہ الٰہی میں حاضر رہتا ہے، اسی طرح جو امام کی قراءت کے ساتھ خود بھی قراءت کرتے ہیں، جس کی تفصیل آگے آرہی ہے، ان کا حال ان لوگوں کا ہے جن کا دل قراءت امام کے ساتھ بارگاہ الٰہی میں حاضر نہیں رہتا۔ حضرت عبداللہ ابن عباس، عبداللہ ابن مسعود، عبداللہ ابن عمر اور صحابہ و تابعین کی ایک جماعت نے پہلا والا موقف اختیار کیا۔۔۔۔۔ حضرت عطا کا بیان ہے کہ صحابہ سری نمازوں میں قراءت خلف الامام کے قائل تھے، جہری نمازوں میں اس کے قائل نہیں تھے۔ یہاں بھی معاملہ میزان کے دونوں پہلو، تخفیف اور تشدید کی طرف راجع ہوا۔'' (یعنی اصاغر کے لیے قراءت خلف الامام اور اکابر کے لیے عدم قراءت) (ص: ۱۰۴)

(۹) دیہات میں جمعے کی نماز

امام شعرانی فرماتے ہیں:

''امام شافعی کا ارشاد ہے: جمعہ صرف ایسی آبادی میں ہوگی جہاں گھر بنے ہوئے ہوں اور ان کے اندر ایسے لوگ رہتے ہوں جن پر جمعہ واجب ہوتا ہے، وہ آبادی خواہ شہر ہو یا گاؤں۔

اس کے بالمقابل بعض علما اس طرف گئے ہیں کہ جمعہ کی نماز ہر گاؤں میں نہیں ہوسکتی، صرف اسی گاؤں میں ہوسکتی ہے جس میں گھنی آبادی ہو، اس کے ساتھ اس میں ایک مسجد اور ایک بازار بھی ہو۔

جب کہ امام ابوحنیفہ کا ارشاد ہے کہ جمعہ کی نماز صرف اس شہر کی مسجد میں ہوگی، جہاں سلطان اسلام بھی ہو۔

پہلے قول میں تشدید ہے، اس اعتبار سے کہ اس میں عمارتوں کی شرط ہے۔ دوسرے قول میں اس سے زیادہ سختی ہے، اس اعتبار سے کہ اس میں آبادی کے گھنی ہونے اور ایک بازار ہونے کی شرط ہے اور تیسرا قول ان دونوں سے بھی سخت ہے۔

لہٰذا یہاں بھی معاملہ میزان کے دونوں پہلو تخفیف اور تشدید کی طرف راجع ہوا۔

پھر قول اول اور اسی طرح قول ثانی کی دلیل اتباع صحابہ ہے۔ اس لیے کہ ہمیں کوئی ایسی روایت نہیں ملتی کہ صحابہ نے شہر اور گاؤں سے باہر صحرا اور سفر میں جمعہ قائم کیا ہو۔

اسی طرح ہمارا یہ بھی اعتقاد ہے کہ امام مالک اور امام ابوحنیفہ نے اس کے لیے مسجد، بازار، آبادی اور سلطان کی جو شرط لگائی ہے وہ کسی دلیل کی بنیاد پر لگائی ہے، اس کے لیے ان کے پاس دلیل ہوگی۔ اہل علم کا کہنا ہے کہ واقعۂ ارتداد کے بعد (مسجد نبوی میں قیام جمعہ کے بعد، مضمون نگار کو کتب حدیث میں یہی ملا۔) بحرین کے جس گاؤں میں سب سے پہلے جمعہ قائم کیا گیا اس کا نام جؤاثی تھا، اس میں ایک مسجد بھی تھی اور ایک بازار بھی تھا۔

اور قول ثالث کی دلیل بھی واضح ہے کہ جہاں پر حاکم نہیں ہوگا، وہاں بدنظمی اور لاقانونیت ہوگی۔

ایک عارف کا قول ہے کہ ائمہ نے یہ شرائط صرف لوگوں کی آسانی کے لیے رکھی ہیں، ورنہ حقیقت میں یہ صحت کی شرط نہیں ہے، لہٰذا اگر مسلمانوں نے بغیر آبادی کے اور بغیر حاکم کے جمعہ کی نماز پڑھی تو بھی یہ ان کے لیے جائز ہوگا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر جمعہ فرض کیا ہے اور ائمہ نے جو شرطیں لگائی ہیں ان کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔'' (ص:۲۴۱)

(۱۰) لاپتہ شوہر کی بیوی کا نکاح ثانی

وہ عورت جس کا شوہر غائب ہو اور یہ پتہ نہ چل سکے کہ وہ زندہ ہے یا مردہ؟ اس سلسلے میں علما کے اختلافات ہیں۔ امام شعرانی نے مختلف آثار نقل کیے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے میں اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا موقف مختلف تھا۔ فرماتے ہیں:

''امام شافعی اور امام بیہقی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ لاپتہ شوہر کی بیوی دوسری شادی نہیں کرے گی، اگر اس نے دوسری شادی

کر لی اور اس کے بعد اس کا لاپتہ شوہر آ گیا تو وہ اسی کی بیوی رہے گی، اسے اختیار ہوگا، چاہے تو اسے رکھے چاہے تو طلاق دے دے۔

اس کے بالمقابل امام مالک، امام شافعی اور امام بیہقی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد گرامی نقل کیا ہے کہ جس عورت کا شوہر غائب ہو جائے اور اسے معلوم نہ ہو کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا، تو وہ چار سال تک انتظار کرے گی، پھر اس کے بعد چار مہینے دس دن گزار کر عدت سے باہر آ جائے گی۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے زمانے میں اسی پر فیصلہ کیا۔

لہٰذا پہلا حکم سخت ہے اور دوسرا نرم، اس طرح یہاں بھی معاملہ وہی تشدید و تخفیف کا ہے۔''

(ص:۱۲۱، ۱۲۲)

واضح رہے کہ امام مالک کے علاوہ ائمۂ ثلاثہ نے حضرت علی کا ہی مذہب اختیار کیا ہے جب کہ حضرت امام مالک نے سیدنا عمر ابن الخطاب کا موقف اختیار کیا ہے، البتہ ماضی قریب میں شہزادۂ اعلی حضرت علامہ مصطفی رضا خاں بریلوی، علامہ ظفر الدین بہاری اور علامہ ارشد القادری نے عام ائمہ اور علمائے احناف کے برخلاف امام مالک کے فتوی کو ہی مفتی بہ قرار دیا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے استاذ گرامی حضرت مفتی محمد نظام الدین رضوی صاحب کی کتاب: 'فقہ حنفی میں حالات زمانہ کی رعایت، فتاویٰ رضویہ کے حوالے سے' (ص:۵۹ تا ۶۱)

تلک عشرة کاملة

یہ دس مثالیں بطور مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ میزان الشریعة الکبریٰ اس قسم کی سیکڑوں بلکہ ہزاروں مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ حضرت امام شعرانی نے کتاب الطہارۃ سے لے کر کتاب الشہادات تک جمیع ابواب فقہ سے متعلق احادیث و آثار اور اقوال و روایات کے درمیان اسی طرح عارفانہ تطبیق فرمائی ہے اور یہ بتایا ہے کہ اہل حق کے جتنے فقہی اختلافات ہیں ان میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر مسئلے میں دو حکم ہے، ایک سخت اور دوسرا نرم، اس طرح جملہ اختلافات انہی دو پہلو میں راجع ہیں، جو حضرات تفصیل دیکھنا چاہیں اصل کتاب سے رجوع کریں بلکہ موجودہ شدت پسندی کے ماحول میں جب کہ ہر مفتی نہ صرف یہ کہ صرف اپنے ہی موقف کو درست سمجھنے پر مصر ہے بلکہ اپنی رائے کو غیر شعوری طور پر وحی کا درجہ دیے ہوئے ہے، اعتدال پسند علما پر لازم ہے کہ اپنے اکابر کی اس قسم کی کتابوں کا مطالعہ کریں جس سے نہ صرف معلومات میں اضافہ اور فکر میں وسعت پیدا ہوگی بلکہ یہ بھی واضح ہوگا کہ تمام ائمہ و علمائے مجتہدین کے اقوال برحق ہیں اور سب کی بنیاد کتاب و سنت ہے۔ اس کے ساتھ انہیں اختلاف کا سلیقہ بھی آئے گا اور انہیں یہ حقیقت بھی معلوم ہوگی کہ علمائے حق کے اختلافات زحمت نہیں رحمت ہیں۔

یہاں پہنچ کر بعض حضرات کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ اس طرح کے مضامین کی اشاعت کا کیا حاصل ہے جس سے ایک عام آدمی کو یہ لگنے لگے کہ حنفیت اور شافعیت کا اختلاف کوئی چیز نہیں اور ہمارے لیے یہ جائز ہے کہ جب چاہیں جس موقف پر عمل کریں؟

میں جواباً کہوں گا کہ یہ سوال مجھ سے نہیں، مجھ سے پہلے امام شعرانی سے ہونا چاہیے کہ انہوں نے تقلید ائمہ پر اتفاق علما کے زمانے میں آج سے تقریباً چار سو سال پہلے دسویں صدی ہجری میں اس قسم کی کتاب کیوں لکھی، پھر ایسی کتاب لکھنے پر ہمارے اکابر علماے اسلام، اہل تصوف اور فقہاے احناف نے ان پر نقد و جرح کرنے کے بجائے ان کی مدح وتوصیف میں زمین و آسمان کے قلابے کیوں ملائے؟

بات دراصل یہ ہے کہ امام شعرانی کے زمانے میں تقلید ائمہ ان کے معاصر علما کے مابین تحقیق واتباع سے آگے نکل کر عصبیت کی وادی میں داخل ہوگئی تھی۔ بعض علما اس قدر جری ہو گئے تھے کہ زبانی طور پر سارے ائمہ کو برحق کہنے کے باوجود، ان کے طرز عمل سے یہی ظاہر تھا کہ صرف انہی کا مسلک فقہ برحق ہے باقی دیگر مسالک ہفوات وخرافات کا پلندہ ہیں، ان کی جرات کا یہ عالم تھا کہ دوسرے مسلک فقہ کا ردو ابطال ہی ان کی زندگی کا شیوہ بن چکا تھا۔ میزان الشریعہ کے شروع میں ہی امام شعرانی نے اپنے شیخ حضرت علی الخواص رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ماوراء النہر کے بعض حنفی اور شافعی علما رمضان کے دنوں میں بھر پیٹ کھا کھا کر مناظرے کیا کرتے تھے اور اپنے مسلک فقہ کی حقانیت کو بیان کرنے کے لیے پریشان رہا کرتے تھے۔ انہی حالات میں امام شعرانی نے اپنی یہ کتاب لکھی، چنانچہ فرماتے ہیں:

> ”اس تصنیف کا مقصد یہ بھی ہے کہ مقلدین کا قول کہ تمام ائمہ برحق ہیں، ان کے دلی اعتقاد کے موافق ہوجائے، تاکہ وہ اپنے ائمہ کے حق ادب کا پاس رکھیں اور آخرت میں اس پر مرتب ہونے والے ثواب سے لطف اندوز ہوں اور جو شخص زبانی طور پر تو یہ کہتا ہے کہ مسلمانوں کے تمام ائمہ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور اپنے دل میں اس کا اعتقاد نہیں رکھتا، وہ نفاق اصغر سے محفوظ ہوجائے جس کی مذمت اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائی ہے۔“ (ص:۷)

ہمارے زمانے کے حالات اس سے بھی ابتر ہو چکے ہیں، موجودہ ہندوستانی فقہی معاشرے میں بعض علما حنفیت وشافعیت سے بھی نیچے اتر کر حنفیت اور حنفیت کے درمیان ہی برسر پیکار ہیں، بعض غلو پسند علما نے غیر اعلانیہ طور پر اپنے محبوب نظر فقہا کو مقام عصمت پر بٹھا رکھا ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی دوسرا فقیہ ان سے یا ان کے محبوب نظر فقہا سے علمی وفقہی اختلاف کرتا ہے یا فقہ حنفی کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے حالات زمانہ کی تبدیلی سے حکم شرعی میں تبدیلی کا

فتوی دیتا ہے تو یہ لوگ چراغ پا ہوجاتے ہیں، سب وشتم شروع کر دیتے ہیں اور اس سے بڑھ کر بد دعائیں دینا شروع کر دیتے ہیں اور رحمت حق کو اپنے محدود پیمانوں سے ناپتے ہوئے ایسے بے گناہ فقہا پر باب توبہ ومغفرت کو بھی بند کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس لیے ہمیں امام شعرانی کی عارفانہ تطبیقات کی ضرورت کل کے بہ نسبت آج زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ امام شعرانی کی یہ گفتگو عوام کے لیے نہیں خواص علما کے لیے ہے، اس لیے امام شعرانی کے ان عارفانہ نکات تک اگر بعض ذہن نہ پہنچ سکیں تو وہ عارف باللہ امام عبدالوہاب شعرانی پر یا ان کے افکار کو پیش کرنے والے اس سیہ کار پر انکار واعتراض کرنے کے بجائے موجودہ عہد کے معتبر اور متوسط علما سے رجوع کریں، وہ صحیح طور پر ان کی تفہیم کر سکیں گے۔

کیا اب تقلید کی ضرورت نہیں ہے؟

امام شعرانی کی ان تطبیقات اور نکات آفرینیوں کو پڑھنے کے بعد عامۃ الناس بلکہ بہت سے اوساط الناس کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ جب تمام مسالک برحق ہیں اور سارے آثار واقوال تشدید وتخفیف پر مبنی ہیں، پھر تو تقلید ائمہ کی ضرورت ہی نہ رہی، جس کے جی میں آئے جب جیسے اور جس موقف پر عمل کرے، کیوں کہ سب برحق ہیں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ امام شعرانی کی تطبیقات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہے؛ کیوں کہ خود امام شعرانی تقلید کے مخالف نہیں، موافق وموید ہیں، ان کا مقصد تقلید محضیت، اندھی تقلید اور متعصّبانہ تقلید کی مخالفت ہے جس کا اسیر ہوکر ایک مسلمان اکابر ائمہ وعلما کے خلاف ہرزہ سرائی شروع کر دیتا ہے یا اپنے ان معاصر علما کے خلاف آمادۂ پیکار ہوجاتا ہے جو اس کے نقطۂ نظر کے مخالف ہیں۔ امام شعرانی کا مقصود اہل علم تک اس پیغام کو پہنچانا ہے کہ وہ تمام ائمہ وعلما کو دل سے برحق جانیں اور سب کا احترام کریں، ایسا نہ ہو کہ ان کی زبان تو سب کو برحق کہے اور ان کا ضمیر اس کی نفی کرتا رہے اور اس طرح وہ نفاق خفی کے مرض میں مبتلا رہیں، اسی طرح ان کا مقصد مقلد علما کو یہ پیغام دینا ہے کہ وہ تقلید محضیت اور فقہی وعلمی جمود کا شکار نہ ہوں بلکہ تمام ائمۂ مجتہدین کو برحق سمجھتے ہوئے زمانی تقاضوں کے تحت اگر دوسرے مسلک فقہ پر فتوی دینے کی ضرورت محسوس کریں تو اس پر فتوی دیں اور بہر صورت کسی ایک امام سے چمٹے رہنے کی قسمیں توڑ دیں۔

اس مقام پر اس حقیقت کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اتباع شریعت کے حوالے سے مسلمانوں کو تین خانوں میں رکھا جا سکتا ہے:

۱۔ مجتہدین مطلق، ۲۔ مجتہدین مقید/ عام محققین، ۳۔ عامۃ المسلمین بشمول عام علما

مجتہدین مطلق تو آج کوہ قاف کے باشی بن چکے ہیں، موجودہ عہد میں ایسے علما نظر نہیں

آتے، جواجتہاد واستنباط میں مطلقاً آزاد ہوں، رہے عام محققین تو ایسے علما سے زمانہ کبھی خالی نہیں ہوگا، بقول علامہ علاؤالدین حصکفی زمانہ اہل تمیز سے کبھی خالی نہیں رہے گا اور جو صاحب تمیز نہ ہو وہ صاحب تمیز سے رجوع کرے، کہ اس کی فقط اتنی ہی ذمہ داری ہے۔

ولا یخلو الوجود عمن یمیز هذا حقیقة لا ظنا، وعلی من لم یمیز أن یرجع لمن یمیز لبراءة ذمته (الدرالمختار، 1/ 84)

اس تقسیم پر نظر کرتے ہوئے یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ تقلید سے مطلق آزادی موجودہ عہد میں عملاً ناممکن ہے، کیوں کہ یہ حصہ مجتہدین مطلق کا ہے جو آج موجود نہیں، رہے عام مسلمان تو ان کے مقلد ہونے میں کس کافر کو شک ہوگا، ہاں! عام محققین کا حال یہ ہے کہ وہ اصول و فروع میں کسی ایک مکتب فقہ سے وابستہ ہوتے ہیں لیکن اس کے ساتھ وہ ابن الوقت نہیں ابوالوقت ہوتے ہیں کہ تبدیلی زمانہ اور تغیر حالات کے تحت حسب ضرورت وحاجت تبدیلی فتوی کے لیے تیار رہتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر دوسرے امام کے قول پر فتوی دینے میں بھی دریغ نہیں کرتے۔

امام شعرانی کا مقصد اسی روح علمی کو بیدار کرنا ہے، نہ کہ تقلید کے خلاف آواز اٹھانا۔ وہ اہل علم کے ذہن و دماغ میں یہ بات بٹھانا چاہتے ہیں کہ تمام مسالک فقہ برحق اور مبنی بر کتاب و سنت ہیں تا کہ وہ ضرورت پڑنے پر تبدیلی فتوی کے لیے یا دوسرے مسلک فقہ پر فتوی دینے کے لیے تیار رہیں، ان کا مقصد عوام کو تقلید سے آزادی کی دعوت دینا نہیں ہے، وہ تو صرف اس کے قائل ہیں کہ سارے مکاتب فقہ برحق ہیں، اس کے قائل نہیں کہ جو جب چاہے جس مکتب فقہ پر عمل کرے، کون سا حکم کس صورت میں نافذ العمل ہوگا اس کا فیصلہ ہر ایرے غیرے کا نہیں، یہ اپنے زمانے کے ممتاز علما کا ہے جو صاحب تمیز کے مقام پر فائز ہوتے ہیں۔ عام مسلمان کو نہ یہ جائز ہے کہ جب چاہے جس موقف پر عمل کرے اور نہ یہ جائز ہے کہ اپنے عہد کے ان علما پر زبان طعن دراز کرے جو اسے پسند نہ ہوں، عام مسلمان بلکہ عام علما کو جو صاحب تمیز نہیں ہیں، ان کی ذمہ داری فقط یہ ہے کہ وہ اپنے طور پر جن علما کو قابل اعتماد سمجھتے ہیں اور جو ان کے نزدیک صاحب تمیز ہیں، ان سے رجوع کریں اور ان کے فتوے پر عمل کریں۔

امام شعرانی کے نزدیک عام مسلمانوں پر تقلید امام واجب ہے اور بلاضرورت دوسرے مکتب فقہ پر عمل کرنا جائز نہیں، اس کا ثبوت امام شعرانی کا یہ ارشاد ہے:

”کوئی شافعی المسلک ہے اور اس نے شرم گاہ کو چھولیا، اگر وہ دوبارہ وضو کرنے پر قادر ہے تو امام ابوحنیفہ کی تقلید کرتے ہوئے بے تجدید وضو نماز پڑھنا اس کے لیے روا نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شافعی المسلک فاتحہ کی تلاوت پر قادر ہے تو اسے جائز نہیں کے

بغیر تلاوت فاتحہ کے نماز پڑھ لے، یا تلاوت قرآن پر قدرت ہوتے ہوئے ذکر الٰہی کرتے ہوئے نماز پڑھے، یہ بھی اس کے لیے جائز نہیں۔“ (ص: ۲۳)

ہاں! اہل علم میں جو صاحبان تمیز ہیں، وہ اپنا کام جاری رکھیں۔ بقول امام موصوف کے:

”باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے حق میں فرمایا ہے کہ: ”ہم نے اس کتاب میں کسی چیز کو ترک نہیں کیا ہے۔: **مافرطنا فی الکتاب من شیء۔** (الانعام: ۳۸) اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اجمال کی تفصیل بیان فرمائی۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے طہارت، نماز اور حج وغیرہ کے طریقے بیان نہیں فرمائے ہوتے تو امت کا کوئی شخص ان امور کو قرآن سے نہیں نکال پاتا۔ نہ ہم فرائض ونوافل کی رکعتوں کی تعداد اور ان دوسرے امور سے واقف ہو پاتے جن کا ذکر آئندہ آئے گا۔ تو جس طرح شارع علیہ السلام نے اپنی سنتوں کے ذریعے قرآن کے مجمل احکام کو واضح فرمایا اسی طرح ائمۂ مجتہدین نے احادیث کریمہ میں موجود اجمال کی ہمارے لیے تفصیل فرمائی۔ اگر ائمہ مجتہدین نے ہمارے لیے اجمال شریعت کی تفصیل نہیں فرمائی ہوتی تو شریعت مجمل ہی رہ جاتی۔ یہی بات قیامت تک پچھلے دور کے بالمقابل ہر دور کے حق میں کہی جاسکتی ہے؛ کیوں کہ علمائے امت کے کلام میں قیامت تک اجمال کا سلسلہ جاری ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو نہ کتابوں کی شروحات لکھی جاتیں اور نہ ہی شروحات پر حواشی لکھے جاتے۔“ (ص: ۵۸)

چوتھا گروہ

واضح رہے کہ یہاں مسلمانوں کا ایک چوتھا طبقہ بھی ہے، جو نادر و کمیاب ہونے کے باجود صوفیہ کی تصریحات کے مطابق ہر زمانے میں موجود رہا ہے، جسے امام شعرانی عارفین باللہ کے لقب سے ملقب کرتے ہیں اور جن کے بارے میں امام موصوف کا دعوی ہے کہ یہ عین شریعت پر فائز ہوتے ہیں، ایسے نفوس قدسیہ بسا اوقات فنی اعتبار سے مقام اجتہاد مطلق پر نہ ہوتے ہوئے بھی، حقیقت کے لحاظ سے اس مقام پر فائز ہوتے ہیں، امام شعرانی کے لفظوں میں:

”اس کشف کا حامل یقین کے معاملے میں مجتہدین کے برابر ہوتا ہے اور بسا اوقات بعض پر فوقیت بھی رکھتا ہے؛ کیوں کہ وہ اپنا علم براہ راست عین شریعت سے اخذ کرتا ہے۔ ایسا شخص اجتہاد کے ان ذرائع کے حصول کا محتاج بھی نہیں ہوتا جنھیں علما نے مجتہد کے حق میں مشروط کیا ہے۔ اس کا معاملہ اس شخص جیسا ہے جو سمندر کی راہ سے ناواقف ہو، کسی واقف شخص کے ساتھ سمندر چلا جائے اور پھر اپنے برتن کو اس کے پانی سے بھر لے تو اب ان دونوں کے پانی میں کوئی فرق نہیں رہا۔“ (ص: ۱۶)

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

''جس کو بھی ولایت محمدی کا کوئی درجہ ملتا ہے وہ احکام شریعت کو وہاں سے لینا شروع کر دیتا ہے جہاں سے مجتہدین نے لیا ہے اور اس سے تقلید کی گرہ کھل جاتی ہے۔ وہ صرف اللہ کے رسول ﷺ کا مقلد رہ جاتا ہے اور بعض اولیا کے بارے میں جو یہ منقول ہے کہ وہ مثلاً شافعی یا حنفی تھے تو ایسا مقام کمال تک پہنچنے سے پہلے تھا۔'' (ص:۲۸،۲۹)

اور اہل تصوف کے یہاں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی ہوئی ہے کہ ایسے صاحبان کمال اولیا سے زمانہ کبھی خالی نہیں رہا، امام احمد رضا قادری بریلوی کے لفظوں میں ''بغیر غوث کے زمین و آسمان قائم نہیں رہ سکتے۔'' (الملفوظ، ج:۱، ص۱۲۰، قادری کتاب گھر، بریلی، ۱۹۹۵ء)

یہ اولیا تقلید کی زنجیر سے آزاد ہوتے ہیں مگر اس کے باوجود دعویٔ اجتہاد کرنے سے ادباً اور احتیاطاً گریز کرتے ہیں، کیوں کہ موجودہ زمانے میں عام مسلمان بلکہ عام محبین صوفیہ نے بھی یہ اعتقاد کر رکھا ہے کہ اب اولیاے کاملین اور مقام غوثیت پر فائز نفوس قدسیہ نہ رہے۔

کیا غیر مقلدین زمانہ عارفین باللہ کے مسلک پر ہیں؟

امام شعرانی نے میزان الشریعہ میں اس بات کو بار بار لکھا ہے کہ عارفین باللہ عین شریعت پر فائز ہیں، انہیں کسی امام مجتہد کی تقلید کی حاجت نہیں، وہ براہ راست سرچشمۂ نبوت سے سیرابی حاصل کرتے ہیں، انہیں سارے مسالک فقہ چشمۂ نبوت سے پھوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں اور وہ حسب حال خود کو جس پن گھٹ سے سیراب کرنا چاہتے ہیں سیراب کرتے رہتے ہیں۔

امام شعرانی کی اس بات سے ممکن ہے کہ بعض حضرات یہ نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کریں کہ غیر مقلدین زمانہ (یہ ایک اصطلاح ہے، ورنہ یہ حضرات بھی حقیقتاً اپنے چند مخصوص علما کے مقلد ہیں، غیر مقلد نہیں ہیں) بھی عارفین باللہ کے مسلک پر ہیں، کیوں کہ جس طرح عارفین باللہ امام معین کی تقلید کو اپنے لیے ضروری نہیں سمجھتے، غیر مقلدین بھی تقلید شخصی کو غیر ضروری قرار دیتے ہیں؟

اس شبہے کا جواب ایک جملے میں تو صرف یہ ہے:

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

اور بقول عارف ربانی حضرت شیخ ابوسعید صفوی دامت فیوضہم:

کہاں ناسوت کی دنیا کہاں ملکوت کی دنیا
کہاں آفتاب اور کہاں ایک ذرہ
کہاں دل کی دنیا کہاں گل کی دنیا

اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہ عارفین کے لیے جائز ہے کہ وہ جب چاہیں، جس پنگھٹ سے پانی

پییں، جاہلین کے لیے نہیں، جو اس سرچشمے سے ہی ناواقف ہیں، شمشیر زنی کی اجازت مجاہدین کو ہے نہ کہ بچوں کو، جو خود اپنی ہی ٹانگیں کاٹ لیں گے۔ جہلا کو یہ اجازت دے دی جائے تو شریعت اور اسرار دین سے یہ ناواقف اپنی خواہشات اور طبیعت کو ہی دین و شریعت بنا لیں گے اور أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ (الجاثیۃ:23) کے بمصداق اتباع شریعت کے بجاے خواہشات پرستی میں مبتلا ہو جائیں گے۔

غیر مقلدین زمانہ اور عارفین باللہ کے موقف میں ایک دوسرا نمایاں فرق بھی ہے اور وہ یہ کہ عرفا یہ دیکھتے ہیں کہ تمام مجتہدین امت کے اجتہادات و اقوال سرچشمۂ نبوت سے پھوٹ رہے ہیں، لہٰذا وہ سب کو برحق سمجھتے ہیں اور سب کا احترام کرتے ہیں، اس کے برخلاف غیر مقلدین زمانہ کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے فہم وادراک کو کتاب وسنت کا درجہ دے دیتے ہیں اور اپنے فہم کے مخالف تمام اجتہادات واقوال کو مخالف قرآن وسنت قرار دیتے ہوئے ائمۂ اعلام کو اربابا من دون اللہ بتاتے ہوئے انہیں سب وشتم کرنے کو اپنے لیے جائز بلکہ باعث ثواب سمجھتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر یوسف القرضاوی:

''ان غیر مقلدین کا معاملہ بھی بڑا عجیب وغریب ہے، دوسروں کو تقلید سے روکتے ہیں اور خود مقلد محض ہیں، قدیم ائمہ کی تقلید سے انکار کرتے ہیں اور بعض موجودہ علما کی تقلید کرتے ہیں، مسالک اربعہ کا انکار کرتے ہیں جب کہ خود ان کی آرا پر مبنی ایک پانچواں مسلک ایجاد کر رکھا ہے جس کے پیچھے آمادۂ جنگ نظر آتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ ان کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ یہ لوگ کسی اختلافی مسئلہ میں کسی حدیث پاک کو پا لیتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ اب انہوں نے اختلاف کو جڑ سے اکھاڑ دیا ہے اور اب اس مسئلہ میں ان کی رائے کا مخالف دراصل حدیث اور سنت کا معارض ہے۔'' (الصحوۃ الاسلامیۃ بین الاختلاف المشروع والتفرق المذموم، ص:۷۷۔۸۰، دار الشروق، قاہرہ)

اللہ تعالیٰ ہمیں اسرار شریعت کو سمجھنے اور ائمۂ مجتہدین کی عزت واحترام کرنے کی توفیق بخشے اور موجودہ مسائل میں علما کو امانت وتقوی کے ساتھ تحقیق وتدقیق کرنے اور علمی اختلاف میں علمی وفقہی آداب ملحوظ رکھنے، ایک دوسرے کا احترام کرنے اور اختلاف کے ساتھ زندہ رہنے کا سلیقہ بخشے اور عوام کے اندر اتباع شریعت کا جذبہ عطا فرمائے اور انہیں علما کے اختلافات میں پڑنے سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔

مصادر و مراجع

القرآن الکریم

اختلاف الائمۃ العلماء — وزیر ابوالمظفر یحییٰ بن محمد بن ہبیرۃ شیبانی

اکمال المعلم شرح صحیح مسلم — علامۃ قاضی ابوالفضل عیاض یحصبی

الدر المختار	علامہ محمد علاء الدین حصکفی
السنن الصغریٰ	امام احمد بن الحسین ابوبکر بیہقی
السنن الکبریٰ	امام احمد بن الحسین ابوبکر بیہقی
الصحوۃ الاسلامیۃ بین الاختلاف المشروع والتفرق المذموم	ڈاکٹر یوسف القرضاوی
العنایہ	علامہ شمس الدین بابرتی
القراءۃ خلف الامام للبخاری	امام محمد بن اسماعیل البخاری
المحلی	شیخ ابومحمد بن حزم اندلسی ظاہری
المستدرک	امام محمد بن عبداللہ حاکم نیساپوری
المعجم الاوسط	امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد طبرانی
الملفوظ	امام احمد رضا قادری، قادری کتاب گھر، بریلی، ۱۹۹۵ء
المنہاج شرح صحیح مسلم بن الحجاج	امام ابوزکریا یحییٰ بن شرف بن نووی
موطا امام مالک	امام مالک بن انس اصبحی
المیزان الکبریٰ الشعرانیۃ	امام عبدالوہاب شعرانی، دارالکتب العلمیۃ، بیروت ۱۹۹۸ء
سنن ابن ماجہ	امام ابوعبداللہ محمد بن یزید قزوینی
سنن ابی داؤد	امام سلیمان سجستانی ازدی
سنن الترمذی	امام ابوعیسیٰ محمد ترمذی
سنن الدارقطنی	امام ابوالحسن علی بغدادی دارقطنی
صحیح مسلم	امام مسلم بن الحجاج قشیری نیساپوری
صحیح البخاری	امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری
فتح القدیر	امام کمال الدین محمد بن عبدالواحد سیواسی
فقہ حنفی میں حالات زمانہ کی رعایت	مفتی محمد نظام الدین رضوی، مجلس شرعی مبارک پور ۲۰۱۳ء
کتاب الآثار	امام ابویوسف یعقوب بن ابراہیم انصاری
مسند احمد ابن حنبل	امام احمد بن حنبل ابوعبداللہ شیبانی
معرفۃ السنن والآثار للبیہقی	امام احمد بن الحسین ابوبکر بیہقی
ہدایۃ	علامہ ابوالحسن علی بن ابی بکر مرغینانی

نوٹ: اکثر حوالے المکتبۃ الشاملہ اور دیگر برقی ذرائع سے لیے گئے ہیں۔

○○○

پروفیسر بدیع الدین صابری

تنبیہ المغترین: اسلامی اخلاق کا ایک حسین گل دستہ

دسویں صدی ہجری کے نامور صوفی، سرزمین مصر کے چشم و چراغ، قطب ربانی، عارف باللہ حضرت سیدی عبدالوہاب شعرانی علیہ الرحمۃ والرضوان، اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے جن کا سینہ علوم شریعت وطریقت کا گنجینہ اور علم لدنی کا خزینہ تھا۔

آپ نے علم ظاہر و باطن کے اساطین حضرت امام جلال الدین سیوطی و حضرت زکریا انصاری اور شیخ محمد مغربی شاذلی و شیخ نورالدین شونی اور شیخ ابوالعباس علیہم الرحمہ جیسے شیوخ سے علمی استفادہ کیا، لیکن ان کے دل میں معرفت کا آفتاب جن کے توسل سے روشن ہوا وہ حضرت علی خواص علیہ الرحمہ ہے۔

حضرت امام شعرانی اپنے الہامات اور واردات قلبی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ایک دن شیخ علی خواص نے فرمایا: دریائے نیل کے فلاں مقام میں تمہارے دل پر فتوحات کا سلسلہ جاری ہوگا، اپنے شیخ کے فرمان کے مطابق اس مقام پر پہنچے، جو کیفیت آپ پر طاری ہوئی اس کا تذکرہ اس طرح فرمایا:

> ”جب کہ میں نیل کے ساحل پر برابرہ کے مکانات اور قلعہ کے سواقی کے پاس عنایت ربانی کے انتظار میں تھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرے دل پر علوم لدنیہ کے دروازے کھل گئے اور ہر دروازہ آسمان اور زمین کے درمیان کی وسعت سے زیادہ تھا، میں قرآن وحدیث کے معانی بیان کرنے لگا اور ان سے احکام اور نحو کے قواعد اور اصول وغیرہ علوم کو استنباط کرنے لگا یہاں تک کہ میں مؤلفین کی کتابیں دیکھنے سے مستغنی ہوگیا تو میں نے اس حالت میں سو کاپیاں تحریر کیں۔“(۱)

حضرت امام شعرانی کا شمار اولیائے حضوری میں ہوتا ہے یعنی وہ اولیا جنھیں بیداری کے

عالم میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضری کا شرف حاصل ہوتا ہے اور جو روحانی طور پر رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم اولین و آخرین سے استفادہ کرتے ہیں جیسا کہ امام شعرانی نے رقم فرمایا:

''اللہ تعالیٰ کے عظیم احسانات میں سے مجھ پر یہ بھی احسان اور انعام ہے کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار عالی کا حاضر باش ہوں اکثر اوقات یوں ہوتا ہے کہ میرے اور روضۂ اقدس کے درمیان فاصلہ بہت ہی کم رہ جاتا ہے، میں اپنے ہاتھ کو روضۂ اطہر پر پاتا ہوں اور اسی طرح محبوب عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کلام کرتا ہوں، جس طرح اپنے پاس بیٹھے ہوئے شخص کے ساتھ گفتگو کی جاتی ہے۔'' (۲)

آپ کی تصانیف کی تعداد تین سو سے زائد بتائی جاتی ہے جن میں سے چند مشہور کتابوں کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے:

لواقح الانوار فی طبقات الاخبار جو طبقات الکبریٰ سے مشہور ہے، الیواقیت و الجواھر فی بیان عقائد الاکابر، المیزان الکبریٰ، کشف الغمة عن جمیع الامة، البحر المورود فی المواثیق والعھود، الانوار القدسیة فی معرفة قواعد الصوفیة، الجوھر المصون فی علوم کتاب اللہ المکنون وغیرہ۔

آپ نے ان مایہ ناز کتابوں میں سے صوفیہ کرام کے اخلاق و اقوال کی روشنی میں اصلاح معاشرہ کے لیے ایک بہترین تصنیف فرمائی جس کا نام ہے:

تنبیہ المغترین اواخر القرن العاشر علی ما خالفوا فیہ سلفھم الطاھر

(ان لوگوں کی تنبیہ جو دھوکہ میں پڑے ہوئے ہیں دسویں صدی ہجری کے اواخر میں جنھوں نے ولایت کا دعویٰ کر کے اپنے پاکیزہ اسلاف کے اخلاق کی مخالفت کی)

اس کتاب کا اردو ترجمہ حضرت مولانا مفتی محمد صدیق ہزاروی حفظہ اللہ تعالیٰ نے کیا ہے جو چار سو چودہ صفحات پر مشتمل ہے جس کو مکتبہ اعلیٰ حضرت، لاہور، پاکستان نے شائع کیا ہے۔ کتاب کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے، اس کتاب کا مطالعہ انسان کے دل میں نیکیوں کی محبت اور گناہوں کی نفرت پیدا کرتا ہے۔

اسلام میں اخلاق کی اہمیت اس حقیقت سے عیاں ہو جاتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اخلاق کی تکمیل کو اپنی بعثت کا مقصد بتایا ہے۔ ارشاد نبوی ہے:

''انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔''

ترجمہ: میں بہترین اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی فضیلت کا معیار اخلاق کو قرار دیا:

''اکمل المومنین ایمانا احسنھم خلقا۔''

ترجمہ: اہل ایمان میں کامل ترین ایمان ان کا ہے جو ان میں سب سے زیادہ با اخلاق ہو۔

اور ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نے ارشاد فرمایا:

''حسن الخلق نصف الدین۔'' ترجمہ: اخلاق آدھا دین ہے۔ (۳)

اخلاق ہی انسانیت کا وہ جوہر پر بہار ہے جو در حقیقت انسانیت کی پستی و بلندی کا بڑا معیار ہے، جب حضرت امام شعرانی نے لوگوں کے اخلاق کو بگڑتے ہوئے دیکھا، خصوصا وہ لوگ جو صوفی یا ولایت کے منصب پر فائز ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ان کے دل حب دنیا سے بھرے ہوتے ہیں، مال و جاہ کی حرص جن کی زندگی کا طرۂ امتیاز بن چکا ہوتا ہے، ان لوگوں کی اصلاح کو ضروری سمجھتے ہوئے آپ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے کے لیے کمر بستہ ہو گئے، اگر چہ کہ مصنف علیہ الرحمہ نے اپنے زمانے کے دنیا پرست متصوفین کی اصلاح کے لیے اس کتاب کو تحریر کیا لیکن آج کے اخلاقی انحطاط کے دور میں جب کہ اکثر اہل علم بھی دنیا کی زیب و زینت پر فریفتہ ہو کر آخرت کی فکر یکسر فراموش کر چکے ہیں، اخلاق کی بہترین تعبیرات ان کے نوک قلم اور زبان پر تو ضرور ہے لیکن ان کا تعلق عملی زندگی سے نہیں، ایسے عالم میں یقیناً اس کتاب کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے، ہر سالک شریعت و طریقت کے لیے یہ کتاب ایک انمول تحفہ ہے، یہ کتاب صوفیہ کے ان اخلاق کی تجدید کرتی ہے جو تقریباً مٹ چکے ہیں جیسا کہ حضرت امام شعرانی نے اپنی کتاب کے مقدمے میں فرمایا:

یہ کتاب اس زمانے کے ہر صوفی اور فقیہ کے لیے نفع بخش ہے، ان میں سے کوئی بھی اس میں نظر کرنے سے بے نیاز نہیں ہو سکتا، جس طرح تم کو اس کتاب کے مطالعہ سے ان شاء اللہ معلوم ہوگا۔ یہ کتاب اس زمانے کے ہر اس شخص کی گردن کاٹتی ہے جو ناحق، شیخ و مرشد ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، کیوں کہ وہ اس کو مفلس قرار دیتی ہے حتیٰ کہ وہ اپنے آپ کو جماعت صوفیہ کے اخلاق سے برہنہ سمجھتا ہے جس طرح سانپ اپنے لباس (جلد) سے نکل آتا ہے اور میں بعض لوگوں کو جانتا ہوں جب ان تک اس کتاب کی خبر پہنچی تو وہ پریشان ہو گئے اور اگر ان کے بس میں ہوتا تو چوری کر کے اس کو دھوڈالتے، کیوں کہ ان کو یہ خوف ہے کہ اگر ان کے کسی معتقد نے اس کتاب پر نظر ڈالی تو ان کے حق میں ان معتقدین کا عقیدہ بدل جائے گا جب وہ دیکھیں گے کہ یہ لوگ ان صوفیہ کے اخلاق سے الگ تھلگ ہیں جن کے خلفا ہونے کا یہ دعویٰ کرتے ہیں۔ حالاں کہ ان کے لیے زیادہ

مناسب تھا کہ اس پر خوش ہوتے کیوں کہ یہ کتاب مکمل طور پر پند ونصائح پر مشتمل ہے اوران میں سے کوئی بھی اس کتاب جیسا ناصح نہیں پائے گا۔(۴)

جن پاکیزہ اخلاق کو مصنف علیہ الرحمہ نے تحریر فرمایا خود ان کی ذات ان اوصاف سے کامل طور پر مزین تھی۔

اچھے اخلاق اور برے اخلاق کی باریک سے باریک تر باتوں کو جن کی طرف اہل علم توجہ نہیں کرتے آپ نے سلف صالحین کے اقوال کی روشنی میں واضح کیا ہے، مثلاً مشائخ کی اولاد اکثر علم کی طرف رغبت نہ رکھنے کی وجہ کو اپنے شیخ علی الخواص سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

علما اور صالحین کی اولاد کے لیے ان کی عدم موجودگی میں دعا کرنے اور ان کے معاملے کو اللہ کے سپرد کرنے سے بڑھ کر کوئی بات نفع بخش نہیں، کیونکہ وہ اپنے والد کی طرف سے ناز ونعمت اور اگر اس کی ماں ہو تو اس کی مدد وتعاون میں پروان چڑھتا ہے اور چونکہ لوگ اس کے والد کی وجہ سے اس کی تعظیم کرتے ہیں لہٰذا وہ اسی پر اکتفا کرتا ہے اور عام طور پر خود فضائل حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتا اور اپنے دل میں کہتا ہے کہ میں جس مرتبے کو حاصل کرنے کے لیے علم اور ریاضت میں مشغول ہو کر اپنے آپ کو مشقت میں ڈالوں گا وہ مجھے اپنے والد کے ذریعہ حاصل ہے۔(۵)

اس کتاب کا پہلا باب بزرگان دین کے اخلاق میں سب سے اہم خلق، کتاب وسنت سے وابستگی پر مشتمل ہے۔

اس باب میں صوفیہ کے اقوال میں سے یہ قول انتہائی اہمیت کا حامل ہے جو حضرت جنید بغدادی علیہ الرحمہ سے منقول ہے، آپ نے فرمایا:

ہماری کتاب یعنی قرآن مجید تمام کتب کی سردار اور جامع ہے اور ہماری شریعت تمام شریعتوں سے زیادہ واضح اور دقیق ہے اور ہمارا طریقہ یعنی تصوف کتاب وسنت کے ساتھ مضبوط ومزین ہے بس جو شخص قرآن مجید نہ پڑھے اور سنت (احادیث) یاد نہ کرے اور نہ اس کے معانی کو سمجھے اس کی اقتدا صحیح نہیں۔(۶)

علم کا مقصد عمل ہے، علم بلاعمل صاحب علم کے لیے کل قیامت کے دن وبال ہے علم پر عمل کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے حضرت امام شعرانی متعدد اقوال نقل فرماتے ہیں:

حضرت امام مالک فرماتے تھے: علم روایت کی کثرت کا نام نہیں، علم وہ ہے جو نفع دے اور عالم اس پر عمل کرے۔

حضرت امام شافعی فرماتے ہیں: حضرت امام مالک نے مجھ سے فرمایا: اے محمد! اپنے عمل

کو آٹا اور اپنے علم کو نمک بناؤ (یعنی علم سے زیادہ عمل ہونا چاہیے۔(۷) علما کا عمل سے دوری قیامت کی نشانیوں میں سے ہے:

سیاتی علی الناس زمان یکون عبادھم جھالا و علماؤھم فساقا۔

عن قریب، لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا کہ ان کے عبادت گزار جاہل ہوں گے اور ان کے علما فاسق ہوں گے (مستدرک للحاکم)

امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مجھے اس امت پر اس عالم کا خوف زیادہ ہے جو زبان سے عالم اور دل سے جاہل ہے۔(۸)

حضرت امام احمد بن حنبل اس شخص کو تعلیم دینے سے رک جاتے تھے جو تہجد نہیں پڑھتا۔ ابو عصمہ نے ایک رات ان کے پاس گزاری تو امام احمد بن حنبل علیہ الرحمہ نے ان کے لیے وضو کا پانی رکھا (تہجد پڑھنے کے لیے) پھر فجر سے پہلے تشریف لائے تو ان کو سویا ہوا پایا اور پانی بھی اسی طرح موجود تھا، آپ نے ان کو جگایا اور پوچھا: ابو عصمہ! کیوں آئے ہو؟ انھوں نے عرض کیا، اے امام! میں آپ سے احادیث سیکھنے آیا ہوں۔ حضرت امام بن احمد بن حنبل نے فرمایا: تو کس طرح حدیث حاصل کرے گا جب کہ تو رات کو تہجد نہیں پڑھتا، جہاں سے آئے ہو وہیں چلے جاؤ۔(۹)

جو علما فرائض و واجبات کی ادائیگی میں کوتاہی وتساہلی برتتے ہیں اس عبارت سے عبرت لیں کہ اگر وہ سلف کی سنتوں پر عمل نہیں کر سکتے ہیں تو کم از کم فرائض وواجبات کا اہتمام تو کریں۔

علم کی آفت عجب (خود پسندی) ہے، حضرت سفیان ثوری فرماتے تھے: ایسے علما بہت کم ہیں جس کا حلقہ درس بڑا ہو اور وہ خود پسندی کا شکار نہ ہوں۔

حضرت عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں: انسان اس وقت تک عالم رہتا ہے جب تک اس کا خیال یہ ہو کہ اس شہر میں اس سے زیادہ علم والا ہے، جب وہ اپنے آپ کو ان سے زیادہ علم والا خیال کرے تو وہ جاہل ہے۔

جو جتنا زیادہ علم والا ہوتا ہے اتنا ہی اس میں کسر نفسی اور تواضع کی صفت بھی پائی جاتی ہے۔ صوفیہ کرام کے اس سلسلہ میں کیا اخلاق ہیں؟

حضرت امام شعرانی اپنی کتاب کے دوسرے باب کی ابتدا کسر نفسی اور تواضع کے عنوان سے اس طرح فرماتے ہیں:

ان کے اخلاق میں سے ایک بات یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو نہایت مطیع اور عاجز رکھتے ہیں کہ ان میں سے ایک اپنے شاگرد سے برکت حاصل کرتا ہے اور اس کا بوجھ اٹھاتا ہے، وہ اپنے آپ کو اپنے مرید سے زیادہ علم والا خیال نہ کرتا نہ اس سے زیادہ شرعی طریقے پر باعمل سمجھتا ہے

جب کہ اس سے کسی فتنہ کا خوف نہ ہو۔

ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ امام شافعی نے جب اپنا قاصد حضرت امام احمد بن حنبل کے پاس بھیجا کہ عنقریب وہ سخت مشقت میں پڑیں گے اور اس سے صحیح سالم نکل آئیں گے۔ تو اے! بھائی! حضرت شافعی علیہ الرحمہ کی حضرت امام احمد بن حنبل کے ساتھ تواضع دیکھو حالانکہ امام احمد بن حنبل علیہ الرحمہ ان کے شاگرد تھے۔ جب قاصد نے ان کو خبر دی تو حضرت امام احمد بن حنبل نے حضرت امام شافعی کے قاصد کے آنے کی خوشی میں اپنی قمیص اتار کر اسے دے دی جب قاصد قمیص لے کر واپس آیا تو انھوں نے اس سے پوچھا کیا یہ قمیص ان کے جسم پر کسی دوسرے کپڑے کے لیے حائل ہونے کے بغیر تھی؟ اس نے کہا جی ہاں؟ تو حضرت شافعی نے اسے چوما اور اپنی آنکھوں پر رکھا پھر ایک برتن میں اس پر پانی ڈالا اور اس کو ملا یا پھر اس کو نچوڑا اور اس کا پانی شیشی میں ڈال دیا چنانچہ جب اس کے شاگردوں میں سے کوئی بیمار ہو جاتا تو اس پانی سے جس میں قمیص دھوئی تھی کچھ اس کے پاس بھیجتے جب وہ اسے اپنے جسم پر ملتا تو اسی وقت بیماری سے عافیت حاصل کر لیتا۔

حضرت امام شعرانی اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

یہ واقعہ اس بات پر تمہاری رہنمائی کرتا ہے یہ لوگ اعمال صالحہ کی کثرت کے باوجود اپنے آپ کو کسی مسلمان سے بڑا نہیں سمجھتے تھے جبکہ اس زمانے کے نام نہاد مشائخ کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔(۱۰)

صوفیۂ کرام جس طرح اپنی ذات کو کمتر سمجھتے ہیں اسی طرح کثرت نوافل و اعمال صالحہ کے باوجود اپنے اعمال کو بھی قلیل سمجھتے ہیں، اپنے کثرت نوافل و اعمال کے بارے میں سوچنے کا انداز کتنا انوکھا ہے، تنبیہ المغترین کی حسب ذیل عبارت ملاحظہ کیجیے:

صوفیہ کے اخلاق میں سے ایک خلق یہ ہے کہ وہ نوافل کو اپنے لیے (مستقل) عبادت خیال نہیں کرتے، اگر چہ وہ اس قدر کھڑے ہوں کہ ان کے قدم پھول جائیں تو نوافل کو فرائض میں پیدا ہونے والے نقص کو پورا کرنے کا سبب سمجھتے ہیں کیونکہ حقیقتا نوافل اس شخص کے لیے ہوتے ہیں جس کے فرائض کامل ہوں جس طرح ارشاد خداوندی ہے۔ **و من اللیل فتھجد بہ نافلۃ لک** (۱۱) (اور آپ رات میں تہجد پڑھیے، یہ آپ کے لیے نفل نماز ہے۔)

اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ تہجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نفلی نماز ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض کامل تھے، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عبادات میں نقص سے معصوم تھے۔(۱۲)

یہ حقیقت ہے کہ جو بندہ جتنا متقی ہوتا ہے اتنا ہی وہ اپنے آپ کو قصوروار سمجھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ آل عمران کے دوسرے رکوع میں متقین کے اوصاف بیان فرمایا کہ وہ صبر کرنے والے سچے و اطاعت گزار (راہ خدا میں) خرچ کرنے والے اور سحر کے وقت استغفار کرنے والے ہوتے ہیں اس کے باوجود وہ کیا اعتراف کرتے ہیں، اس سے قبل آیت میں ارشاد فرمایا:

الذین یقولون ربنا اننا أمنا فاغفر لنا ذنوبنا و قنا عذاب النار (۱۳)

(جو یہ کہتے ہیں، اے ہمارے رب! یقینا ہم ایمان لے آئے تو تو ہمارے لیے ہمارے گناہوں کو معاف فرما اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے محفوظ فرما۔)

صوفیۂ کرام اپنے نفس کے لیے کسی سے نہ دوستی کرتے ہیں اور نہ دشمنی رکھتے ہیں، ان کی دوستی و دشمنی صرف اللہ کے لیے ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ کیا آپ نے میرے لیے کوئی عمل کیا ہے؟ انھوں نے عرض کیا، ہاں اے میرے رب! میں نے نماز پڑھی، روزہ رکھا اور صدقہ کیا اسی طرح دیگر امور کا ذکر کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ تو آپ کے لیے ہے۔ کیا میرے لیے کسی ولی سے محبت کی یا میری خاطر میرے کسی دشمن سے دشمنی کی۔(۱۴)

محبت زبانی جمع خرچ کا نام نہیں جس سے محبت ہوتی ہے، اس کے اقوال و افعال اور کردار سے بھی محبت ہوتی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کہ چاند سے تو محبت ہے، چاندنی سے نہیں، سورج سے تو محبت ہے روشنی سے نہیں، گلاب سے تو محبت ہے خوشبو سے نہیں؟ جب محبوب سے محبت ہوتی ہے تو اس کی ہر ہر ادا سے محبت رکھنا پڑے گا اس سلسلہ میں امام شعرانی نے یہ روایت نقل کی ہے۔

حضرت حسن بصری نے ایک مرتبہ ایک شخص سے یہ حدیث سنی: **المرء مع من أحب**

(آدمی قیامت کے دن اس کے ساتھ ہوگا وہ جس سے محبت کرتا ہے)

تو انھوں نے فرمایا اے بھائی! یہ قول تمہیں دھوکہ نہ دے تم نیک لوگوں کے ساتھ اسی وقت ملو گے جب ان کے اعمال جیسے اعمال کرو گے کیوں کہ یہود و نصاریٰ اپنے انبیا کرام علیہم السلام سے محبت کرتے ہیں لیکن ان کے ساتھ جنت میں نہیں جائیں گے کیونکہ اعمال میں وہ ان سے پیچھے رہ گئے اور ان کی مخالفت کرتے ہیں۔(۱۵)

جن و انس کی پیدائش کا مقصد عبادت خداوندی ہے ارشاد ربانی ہے:

و ما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون (۱۶)

(میں نے جن و انس کو پیدا نہیں کیا مگر یہ کہ وہ میری عبادت کریں)

سلف و صالحین کی عبادت کا کیا حال تھا اپنی کتاب کے لیے متعدد مقامات پر ان کے خوف

کا عالم اور عبادت کی کیفیت کو واضح کیا جیسا کہ حضرت سیدنا عمر بن الخطاب کے بارے میں فرمایا:

آپ اپنی خلافت کے دنوں میں رات اور دن میں سوتے نہیں تھے صرف بیٹھے بیٹھے سر جھک جاتا تھا اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرماتے تھے جب میں رات کو سو جاؤں تو اپنے نفس کو ضائع کروں گا اور اگر دن کے وقت سو جاؤں گا تو اپنی رعایا کو ضائع کروں گا اور ان کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔(۱۷)

حضرت ابو مطیع نے فرمایا:

حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس رات کا بچھونا نہیں تھا اور آپ بیٹھے بیٹھے تھوڑا سا اونگھ لیتے تھے۔(۱۸)

جو لوگ معرفت الٰہی کا یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ توحید کے اسرار و رموز سے واقف ہو جانا اور مصطلحات تصوف کا ماہر ہونا کافی ہے، کثرت عبادت و ریاضت کی ضرورت نہیں سمجھتے وہ دھوکہ میں پڑے ہوئے ہیں کیونکہ جس کو جتنی معرفت ہوتی ہے اتنا ہی وہ رب سے ڈرتا ہے جیسا کہ حضرت فضیل بن عیاض فرماتے ہیں:

اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں کہ جب وہ اللہ کی عظمت کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے دل ان کے سینوں کے اندر کٹ جاتے ہیں پھر جڑ جاتے ہیں پھر کٹتے ہیں اور پھر ٹھیک ہو جاتے ہیں پھر کٹتے ہیں اور پھر ٹھیک ہو جاتے ہیں اور جب تک زندہ رہتے ہیں وہ اسی طرح ٹھیک رہتے ہیں اور وہ فرماتے تھے: بندہ اللہ تعالیٰ سے اسی قدر ڈرتا ہے جس قدر اسے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔(۱۹)

دنیا میں ایک ایسی شئ ہے جو ساری انسانیت کا مطلوب و محبوب ہے، امیر ہو کہ غریب، بچہ ہو کہ بوڑھا، عورت ہو کہ مرد، مومن ہو کہ کافر، وہ محبوب جس کے سب محب ہیں وہ ہے کامیابی (Success) لیکن کامیابی کا مفہوم ایک کے پاس جداگانہ ہے، کوئی تو یہ سمجھتا ہے کہ سونے و چاندی کے امبار جمع کر لینا کامیابی ہے، کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کرنا کامیابی ہے، کسی کا خیال ہے کہ حکومت کا کوئی عہدہ حاصل کر لینا کامیابی ہے، حد تو یہ ہے کہ اس دور بداخلاق میں صنف نسواں میں سے کوئی اپنے جمال کا بھرپور مظاہرہ کرے وہ کامیاب ہے۔ کامیابی یہ نہیں ہے، حقیقت میں کامیابی وہ ہے جسے اللہ اور اس کا رسول کامیاب قرار دے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قد افلح من تزکیٰ و ذکر اسم ربہ فصلیٰ(۲۰)

(حقیقت میں کامیاب وہ ہے جسے تزکیہ نفس حاصل ہوا اور جو اپنے رب کا ذکر کرتا ہے اور نماز پڑھا۔)

جب ہر مسلمان جانتا ہے کہ کامیابی ان تینوں کے حصول میں منحصر ہے تو پھر اسے حاصل

کرنے میں انتہائی کوشش کیوں نہیں کرتا، تو اس کا جواب انھیں مذکورہ آیات سے متصل ہے:

بل تؤثرون الحیوۃ الدنیا و الاٰخرۃ خیر و ابقیٰ(۲۱)

(بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت سب سے بہتر اور باقی رہنے والی ہے)

اس لیے صوفیہ کرام اپنی تقریر اور تحریر بلکہ اپنے عمل کے ذریعہ ہمیشہ آخرت کی فکر کو اجاگر کرتے رہے اور دنیا اور اس کی محبت کی آفتوں کا ہر جگہ ذکر کرتے رہے، کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

حب الدنیا راس کل خطیئۃ (۲۲) (دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے)

کتاب تنبیہ المغترین آخرت کی فکر اور زہد فی الدنیا سے تعلق رکھنے والے مضامین سے بھری پڑی ہے۔

حضرت ابراہیم بن ادہم فرماتے ہیں کہ تم میں اور صوفیہ کرام رحمھم اللہ میں بہت دوری ہے، دنیا ان کے سامنے آئی تو وہ اس سے بھاگ گئے اور تم سے دنیا بھاگ گئی تو تم اس کے پیچھے چلے۔

حضرت ربیع بن انس فرماتے تھے کہ مچھر جب تک بھوکا ہوتا ہے زندگی رہتی ہے اور جب سیر ہوتا ہے تو موٹا ہو جاتا ہے اور جب موٹا ہو جاتا ہے تو وہ مر جاتا ہے اور انسان جب دنیا سے بھر جاتا ہے تو اس کا دل مر جاتا ہے۔(۲۳)

مرنے سے پہلے اعمال صالحہ کا توشہ لینا اور آخرت کی فکر اور موت کو یاد رکھنا ان سب باتوں کے بیان پر ابھارنے والی اور صوفیہ کے اعمال کی صحت اور عظمت کو بتانے والی دلیل حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول مبارک ہے:

اغتنم خمسا قبل خمس، شبابک قبل ھرمک و صحتک قبل سقمک و غناک قبل فقرک و فراغک قبل شغلک و حیاتک قبل موتک۔(۲۴)

(پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جان، اپنی جوانی کو بڑھاپے سے پہلے، اپنی صحت کو اپنی بیماری سے پہلے، اپنی فراغت کو شغل سے پہلے اور اپنی زندگی کو اپنی موت سے پہلے۔)

صحابہ کرام اور ان کے متبعین صوفیۂ کرام نے کس طرح اس حدیث پر عمل کر کے دکھایا اسے معلوم کرنے کے لیے حضرت امام شعرانی کی کتاب تنبیہ الغافلین کے متنوع مضامین کو پڑھیے۔

حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کا گھر سامان سے خالی تھا، اس میں صرف ایک برتن تھا جس کو طہارت کے لیے استعمال کرتے تھے، ایک دن آپ سے کہا گیا کہ آپ اپنے گھر میں سامان نہیں رکھتے؟ فرمایا: اس گھر کا مالک (اللہ تعالیٰ) ہمیں اس گھر میں رہنے نہیں دے گا اور

ہمارا ایک اور گھر ہے، ہم اس کی طرف نیک اعمال (کا سامان) بھیجتے ہیں۔(۲۵)

حضرت ابوادریس خولانی اپنے ساتھیوں سے فرماتے تھے اپنے کپڑے دھونے کا زیادہ اہتمام نہ کرو (اس کے دھونے اور جلد جلد بدلنے میں زیادہ وقت ضائع نہ کرو) کیونکہ میلے کپڑوں میں صاف دل اس دل سے زیادہ پسندیدہ ہے جو دل گندا اور کپڑے صاف ہو۔(۲۶)

اگر کسی کو عبادت، ذکر وفکر واخلاص وتواضع اور اخلاق فاضلہ میں سے بڑا حصہ حاصل ہو جائے لیکن اس کی روزی حلال کی نہیں تو اسے اپنی عبادت سے وہ نور حاصل نہیں ہوگا جو اس کی قبر کو روشن کرے اور پل صراط کی رہ گزر کو منور کرے۔

اکل حلال وصدق مقال پرندے کے دو بازوں کی طرح ہے جس کے بغیر وہ اڑ نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

کلو امن الطیبات و اعملو اصالحا (۲۷) پاکیزہ چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک عمل کرو۔

عمل صالح سے پہلے اکل حلال کا حکم دینا اس کی اہمیت کو بتاتا ہے اس لیے امام شعرانی اکل حلال کے اہتمام کی ترغیب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

اے بھائی! اس زمانے میں اپنے کھانے کی طرف دیکھو اور تم پر بہت زیادہ بھوک لازم ہے اور تم کسی امیر یا اس کے شریک کار یا قاضی (جج) کے کھانے سے بچو چہ جائیکہ تم ظالموں اور ٹیکس لینے والے (ظالم) کا کھانا کھاؤ اور اسکی چھان بین نہ کرو یہ تمہارے دین کے لیے ہلاکت کا سبب ہے اگر چہ تمہارے سر پر اونی عمامہ اور جسم پر جبہ ہو۔(۲۸)

جب ایک مسلمان صوفیہ کے بیان کردہ شرائط کے مطابق راہ سلوک طے کرتا ہے تو ولایت میں اسے ایک ایسا مقام بھی حاصل ہوتا ہے، جہاں اسے اللہ کے حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بیداری میں زیارت نصیب ہوتی ہے۔ تنبیہ المغترین کی حسب ذیل عبارت دیکھیے جس سے اولیا کے مقام کے ساتھ ساتھ اس کتاب کی مقبولیت کا پتہ بھی چلتا ہے۔ حضرت امام شعرانی فرماتے ہیں:

میں جب اپنی کتاب لکھتے وقت اس کی (فصل: کرامات کو چھپانا) پر پہنچا تو ایک شخص نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور صحیح علامات کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے ذریعہ سے سلام بھیجا۔ زیارت کرنے والے نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مسئلہ پوچھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ وہ شخص اس کو سمجھنے میں توقف کر رہا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: مصر جاؤ اور شعرانی سے پوچھو وہ تمہارے لیے اس کی تشریح کریں گے، تو جس طرح خواب میں نشانی دیکھی تھی اسی کے

مطابق مصر آیا اور مجھ سے سوال کیا، اس نے مجھ سے کہا مجھے مصر میں صرف یہی کام تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں آپ سے ملوں، پھر اس نے مجھ سے مسئلہ کے بارے میں پوچھا، تو الحمدللہ میں نے اس کی وضاحت کر دی۔

اسی فصل میں آپ لکھتے ہیں:

صوفیۂ کرام رحمہم اللہ کے اخلاق میں سے یہ بات ہے کہ وہ پانچ نمازیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف میں پڑھتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے سلام کا جواب سنتے ہیں، جب وہ اپنے تشہد میں السلام علیک یا ایھا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہ پڑھتے ہیں۔

آگے چل کر وہ حضرت شیخ ابوالعباس مرسی کے اس قول کو نقل کرتے ہیں۔

اللہ کی قسم! اگر میں رات یا دن میں سے تھوڑے حصے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پردہ میں ہو جاؤں تو اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار نہیں کرتا۔(۲۹)

غرض کہ کتاب تنبیہ المغترین کے مختلف عناوین اخلاق فاضلہ پیدا کرنے اور ہمیں غفلت کی نیند سے بیدار کرنے کے لیے انتہائی مؤثر ہیں۔

و صلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا محمد و علی اٰلہ و صحبہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین و الحمدللہ رب العالمین۔

حوالہ جات

۱۔الاحسان، جلد:۱، ص:۱۲۲ (مجلہ فصلیہ عربیہ، مضمون: الشیخ عبدالوہاب الشعرانی، للشیخ محمد خالد ثابت)

۲۔المنن الکبری، مطبوعہ مصر، ص:۱۴۲

۳۔کنز العمال، المجلد الثالث

۴۔تنبیہ المغترین، ص:۱۲۵-۲۶

۵۔مصدر سابق، ص:۳۸

۶۔نفس مصدر، ص:۴۳

۷۔نفس مصدر، ص:۵۳

۸۔نفس مصدر، ص:۴۶

۹۔نفس مصدر، ص:۵۴

۱۰۔نفس مصدر، ص:۱۲۳

۱۱۔سورۃ الاسرار، ص:۷۹

۱۲۔تنبیہ المغترین،ص:۱۳۱

۱۳۔آل عمران:۱٦

۱۴۔تنبیہ المغترین،ص:٦۳

۱۵۔نفس مصدر،ص:۱۸۹

۱٦۔الذاریات:۵٦

۱۷۔تنبیہ المغترین،ص:۱۱۹

۱۸۔نفس مصدر،ص:۱۹۲

۱۹۔نفس مصدر،ص:۱۱۵

۲۰۔الاعلیٰ:۱۴۔۱۵

۲۱۔الاعلیٰ:۱٦۔۱۷

۲۲۔کنز العمال

۲۳ تنبیہ المغترین،ص:۱۷۴،۱۷۸

۲۴۔المستدرک للحاکم: کتاب الرقاق

۲۵۔تنبیہ المغترین،ص:۱۸۲

۲٦۔نفس مصدر،ص:۱۸۲

۲۷۔المؤمنون:۵۱

۲۸۔تنبیہ المغترین،ص:۱۸۷

۲۹۔نفس مصدر،ص:۲۰٦۔۲۰۸

○○○

افتخار عالم سعیدی

رہ نمائے راہ طریقت

کتاب: الانوار القدسیۃ فی معرفۃ قواعد الصوفیہ کی چند جھلکیاں

امام شعرانی دسویں صدی ہجری کے ایک عظیم عالم، محقق، مدبر اور صوفی گزرے ہیں، جنھوں نے تقریباً تصوف، فقہ، اصول فقہ، تفسیر، حدیث اور اخلاق وغیرہ جیسے اہم فنون پر اپنی صلاحیتوں کا زبردست مظاہرہ فرمایا ہے۔انھوں نے اپنی ۷۵ سالہ زندگی میں سیکڑوں کتابیں تصنیف کیں ان میں سے ایک **الانوار القدسیہ فی معرفۃ قواعد الصوفیہ** بھی ہے۔ان کی اکثر کتابیں دو دو جلدوں پر مشتمل ہیں اور بعض کتابیں پانچ پانچ جلدوں تک پہنچ گئی ہیں۔

''**الانوار القدسیہ فی معرفۃ قواعد الصوفیہ**'' امام عبدالوہاب الشعرانی کی تصنیف ہے۔طٰہٰ عبدالباقی اور سید محمد عید الشافعی کی تحقیق سے یہ کتاب مکتبۃ المعارف، بیروت (لبنان) سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی۔

''**الانوار القدسیہ فی معرفۃ قواعد الصوفیہ**'' تصوف کی ایک عظیم شاہ کار ہے، جس میں انہوں نے راہ طریقت پر چلنے والوں کے لیے ایک مکمل آئین و دستور مرتب کر دیا ہے، یہ سالکین طریقت کے لیے ایک قیمتی اور انمول خزانہ ہے۔انہوں نے اس کتاب میں مریدین کے ہر پہلو کو عیاں کرنے کی بھرپور کدو کاوش کی ہے۔پوری کتاب کے مطالعے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنے موقف کی تائید میں صوفیہ و مشائخ کے اقوال و افعال کو زیادہ سے زیادہ پیش فرمایا ہے، وہ اپنی رائے دو تین سطروں میں پیش کر دیتے پھر بطور دلیل صوفیہ اور مشائخ کے اقوال کو کثرت سے نقل کرتے ہیں، کبھی کبھی عنوان قائم کرتے ہیں اور اس کی شروعات کسی کے قول سے کرتے ہیں جیسا کہ **صور من امراض النفس، شرط المرید الصادق، کیف یصل المرید الیٰ حضرۃ الحق** اور **جواسیس القلوب** وغیرہ عناوین کے تحت دیکھا گیا۔ان کا اپنے قول پر مشائخ کے قول کو

ترجیح دینا جب کہ وہ خود ایک جید عالم اور بڑے صوفی تھے، اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مشائخ سے بے پناہ عقیدت ومحبت رکھتے تھے، ان کے نزدیک طریقت میں ''ادب'' سب سے بڑی چیز ہے، چنانچہ انہوں نے تقریباً ڈیڑھ سو صفحات پر مریدین کے آداب کو بیان کیا اور اس کی اہمیت وافادیت پر سیر حاصل گفتگو کی ہے، جس سے ادب کی ایک خاص اہمیت سمجھ میں آتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ طریقت میں ادب ہی سب کچھ ہے۔ اس کے بغیر اس راہ میں آنا ایسا ہی ہے جیسا کہ بغیر اجرت کے مزدوری کرنا۔ پوری کتاب میں ایک اور چیز نمایاں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر عنوان کے تحت تزکیہ اور تصفیہ کا ذکر ضرور آیا ہے کسی نہ کسی طریقے سے قلب کی صفائی وستھرائی کی بات آہی گئی ہے اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک تزکہ نفس کی خاصی اہمیت ہے۔

پوری کتاب میں ایک مقدمہ، تین ابواب اور ایک خاتمہ ہے، اور یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس مقالے میں صرف جلد اول کے مطالعے کا خلاصہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ہر اہم عنوان کی باتیں، تین چار سطروں میں خلاصے کے طور پر لائی گئی ہیں اور بطور دلیل کسی کا قول پیش کیا گیا ہے۔ مقدمہ میں صوفیہ کے عقائد، ذکر، خرقہ پوشی اور آداب وغیرہ کو بیان کیا ہے۔ باب اول میں ان آداب کا بیان ہے جس کا تعلق بذات خود مرید سے ہے، دوم میں شیخ سے، سوم میں شیخ اور مرید کے اخوان سے اور خاتمے میں پوری مخلوق سے متعلق آداب کو بیان کیا گیا ہے۔

ذکر

مرید پر واجب ہے کہ وہ ''لا الٰہ الا اللہ'' کا ذکر ہر لمحہ، ہر وقت اور ہر جگہ، کثرت سے کرتا رہے اور اکیلے کے بجائے جماعت کے ساتھ کرے کیونکہ جماعت کے ساتھ ذکر کرنا افضل ہے، ذکر میں کلمہ لا الٰہ الا اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کلمہ کو شامل نہ کرے چونکہ اس سے بہتر کوئی کلمہ نہیں۔ سالکین کے ذکر کے لیے لا الٰہ الا اللہ کا ذکر ہی سب سے افضل ہے، لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی نہ ملائے، جب تک کے توحید کامل حاصل نہ ہو جائے، جب کلمہ الٰہ قلب و روح میں مکمل طور سے جم جائے گا تب ہی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر کرنا فائدہ دے گا چونکہ بغیر توحید کے رسالت کوئی فائدہ نہیں دیتا، اور اس لیے بھی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر عمر میں ایک مرتبہ کافی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا ذکر ہر وقت واجب ہے، تاکہ دل مقصود حقیقی کی طرف مائل ہو جائے چونکہ یہی اصل ہے۔

صوفیہ نے فرمایا: جو شخص سورج ڈوبنے سے صبح تک نماز کے علاوہ ذکر الٰہی نہیں کرتا تو اس کے لیے طریقت میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اسے زندہ رکھ سکے، اور فرمایا: ذکر، مریدین کی تلوار ہے، جس سے وہ اپنے دشمنوں کو قتل کرتے ہیں اور طریقت میں آنے والے تمام مشکلات کو

دور کرتے ہیں اور مشائخ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ذکر، غیب کی کنجی ہے، اور دلوں کو غفلت سے بچاتا ہے۔ کیوں کہ ہر چیز کی ڈھال ہوتی ہے اور دل کی ڈھال ذکر الٰہی ہے۔ (ص:۳۵)

شداد بن اوس سے روایت ہے: ہم لوگوں نے تھوڑی دیر ہاتھ اٹھایا اور کہا ''لا الٰہ الا اللہ'' پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے اللہ! تو نے مجھے اسی کلمہ سے پیدا فرمایا اور اسی کا حکم دیا اور تو نے اسی کے بدلے جنت کا وعدہ کیا اور بے شک تو وعدہ خلافی نہیں کرتا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر ارشاد فرمایا: تم لوگوں کو خوش خبری ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تم سب کو بخش دیا۔ ایک دوسری روایت ہے: یوسف العجمی اپنے رسالے میں سند متصل کے ساتھ حضرت علی ابن طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ: میں نے کہا یا رسول اللہ! مجھے طریقت کے سب سے قریب راستہ اور آسان طریقہ اور اس کی فضیلت بتائیں: رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے علی! اللہ تعالیٰ کا ذکر لازم کر لو خواہ سری ہو یا جہری، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ہر آدمی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے، یا رسول اللہ میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے کوئی خاص وظیفہ بتائیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے علی سب سے افضل وہی ہے جو میں نے کہا (لا الٰہ الا اللہ)، مجھ سے پہلے تمام انبیا نے اسی ذکر کو سب سے افضل بتایا ہے، اگر ساتوں زمین وآسمان ایک ہتھیلی میں ہو اور لا الٰہ الا اللہ ایک ہتھیلی میں تو میں ضرور لا الٰہ الا اللہ کی طرف رجوع کروں گا۔ (ص:۲۸)

ذکر کے آداب

ذکر کے آداب مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) توبہ

(۲) طہارت: یعنی کپڑوں اور جسم کو پاک کرے اور منھ کو خوشبو سے معطر کرے۔

(۳) سکون واطمینان

(۵) شیخ سے استمداد: گوکہ یہ استمداد حقیقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ہوتی ہے لیکن شیخ، مرید اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان واسطہ ہے۔

(۶) آنکھیں نیچے رکھنا، چوں کہ اس سے حواس ظاہرہ کے تمام راستے صحیح ہو جاتے ہیں اور قلبی وباطنی حواس کے کھلنے کا سبب بنتا ہے۔

(۷) جب تک ذکر میں رہے شیخ کا تصور برقرار رکھے۔

(۸) ذکر میں صادق ہو اور اس کا ظاہر وباطن ایک ہو۔

(۹) اخلاص

(۱۱) ذکر کے معنی ومفہوم کو اپنے قلب میں حاضر رکھے۔

(۱۲) قلب کوسوائے اللہ تعالیٰ کے تمام چیزوں سے خالی رکھے۔
(۱۳) ذکر درج ذیل شرطوں کے ساتھ کرے: (الف) پاک جگہ بیٹھے۔ (ب) دونوں ہاتھوں کو اپنے ران پر رکھے۔ (ج) قبلہ رو ہو۔ (د) مجلس ذکر کو خوشبو سے معطر کرے۔ (ہ) تاریک اور خلوت کی جگہ اختیار کرے۔ (و) ذکر پوری قوت سے کرے، تاکہ ذکر میں یکسوئی ہو اور ذاکر کے دل میں سوائے اللہ کے کچھ نہ رہے، پھر زبان کو قلب کے موافق کر لے۔
(ص:۳۶،۳۷ملخصاً)

باب اول: مریدین کے آداب میں

مرید محبت شیخ میں صادق ہو

شیخ کی محبت راہ سلوک کی دلیل ہے اور محبت کا لازمی نتیجہ شیخ کی طاعت وفرماں برداری ہے اور مخالفت عدم محبت کی دلیل ہے، لہٰذا جس نے دلیل کی مخالفت کی یعنی شیخ کی اطاعت نہیں کی اس کا سلوک منقطع ہو گیا، اور وہ ہلاک ہو گیا۔

مرید شیخ کی بارگاہ میں توبہ کر کے آئے

مرید کی شان یہ ہے کہ وہ ظاہری اور باطنی گناہوں؛ جیسے غیبت، حسد، شراب نوشی، بغض وکینہ وغیرہ سے توبہ کئے بغیر شیخ کی بارگاہ میں نہ آئے، چونکہ بغیر توبہ کے شیخ کی بارگاہ میں آنے سے کوئی فائدہ نہیں، یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ نماز اس حال میں ادا کی گئی کہ بدن یا کپڑا میں نجاست لگی ہو تو وہ نماز بے فائدہ ہے، لہٰذا جو منہیات کے ارتکاب، شہوات کی موافقت اور محرمات کے لزوم کو برقرار رکھے تو اس کے اور راہ طریقت کے درمیان زمین وآسمان کی طرح دوری ہے۔ (ص:۵۳) البتہ توبہ کے درجات ومراتب ضرور ہیں۔ مرید سب سے پہلے گناہ کبیرہ سے توبہ کرے، پھر صغائر سے، پھر مکروہات سے، پھر خلاف اولی سے، پھر نیکی کی طرف نظر کرنے سے اور پھر اس فکر سے کہ وہ فقرا میں سے ہے۔

جہاد بالنفس

اس کے بعد مجاہدہ نفس کو لازم پکڑے؛ کیوں کہ مجاہدہ نفس سے ہی طریقت کے اسرار ورموز کو جانا جا سکتا ہے اور روحانیت کو مادیت پر غالب کیا جا سکتا ہے۔
شیخ ابوعلی دقاق فرماتے ہیں: جو اپنے ظاہر کو مجاہدے سے مزین کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے باطن کو مشاہدے سے مزین فرماتا ہے اور جس نے ابتدا میں مجاہدہ بالنفس نہیں کیا تو وہ طریقت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا۔ اور ابوعثمان المغربی کا قول ہے: ''جس نے یہ گمان کیا کہ بغیر مجاہدہ کے راہ طریقت کی کچھ چیزیں کھل جائیں گی تو اس نے محال کا خیال کیا۔'' (ص:۵۴) اور حسن عوار نے کہا:

طریقہ صوفیہ تین چیزوں پر ہے: اول: فاقہ، دوم: شب بیداری اور سوم: خاموشی سوائے ضرورت شرعیہ کے۔ (ص:۵۴) ابراہیم بن ادہم فرماتے ہیں: کوئی شخص صالحین کے درجے کو نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ اس میں یہ چھ باتیں نہ ہوں: (۱) مجاہدہ بالنفس (۲) ذلت نفس (۳) شب بیداری (۴) دنیا سے کم لگاؤ (۵) ترک دنیا سے خوشی (۶) امیدوں کو توڑنا۔ (ص:۵۴)

طریقت کے ارکان

طریقت کے چار ارکان ہیں: بھوک، گوشہ نشینی، شب بیداری اور قلت کلام۔ ابوالقاسم قشیری فرماتے ہیں بھوک باب طریقت کی بنیاد ہے، اور شیخ محی الدین ابن عربی فتوحات میں فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے جب نفس کو پیدا فرمایا تو اس نے نفس سے کہا کہ میں کون ہوں؟ نفس نے جواب دیا: میں کون ہوں؟ تو اللہ نے اسے چار ہزار سال تک بھوک کے سمندر میں غرق رکھا، پھر فرمایا: میں کون ہوں؟ تو اس نے جواب دیا: انت ربی۔ (ص:۵۶) علما ومشائخ فاقہ کشی کے ذریعے قرب الٰہی کے حقدار ہوتے ہیں چنانچہ سہل بن عبداللہ تستری پندرہ دنوں کے بعد کھانا کھایا کرتے اور جب رمضان کا مہینہ آتا تو شوال کا چاند دیکھے بغیر افطار نہ کرتے اور جب افطار کا وقت آتا تو صرف پانی پر اکتفا کرتے ان کی حالت یہ تھی کہ جب بھوکا رہتے تو قوی ومضبوط ہوتے اور جب کھانا کھاتے تو انہیں کمزوری لاحق ہوتی۔ (ص:۵۶)

ادب کی رعایت

مرید کی شان یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ اور اولیاء اللہ کے ساتھ ادب ملحوظ خاطر رکھے اور کبھی بھی نفس کو بے ادبی میں گرفتار نہ کرے۔ علی ابودقاق کا قول ہے: جس نے شیخ کی طاعت میں ادب کی رعایت نہ کی تو اس کے اور اس کے رب کے درمیان ستر حجابات حائل ہو گئے۔ عبداللہ الجلال فرماتے ہیں: جو مؤدب نہیں ہے وہ شریعت، ایمان اور توحید میں کامل نہیں۔ (ص:۵۶) عبدالرحمن بن قاسم فرماتے ہیں: میں امام مالک کی صحبت میں بیس سال رہا، ان میں اٹھارہ سال ادب کی تعلیم میں گزارا اور دو سال علم میں، کاش میں پورے بیس سال ادب کے لیے صرف کرتا۔ (ص،۵۸)

مخالفت نفس

مرید کی شان یہ ہے کہ وہ نفس کی مخالفت کرے اور اس کی کبھی موافقت نہ کرے چوں کہ تمام صوفیہ اس بات پر متفق ہیں کہ مرید کا اصل جوہر مخالفت نفس ہی ہے۔ ابوبکر تہسانی فرماتے ہیں: تمہارے اور رب کے درمیان سب سے بڑا حجاب موافقت نفس ہے۔ ابن شیبان کہتے ہیں: جس نے اپنی خواہش سے کچھ کھایا اس نے خود کو رب کے شہود سے حجاب میں کر لیا۔ (ص:۵۹)

صوفیہ فقیہ ہیں

تفقہ فی الدین طریقت کی کنجی ہے،اسی وجہ سے صوفیہ نے مریدین کے متعلق فرمایا ہے کہ تفقہ فی الدین اولا لازم ہے،بغیر اس کے راہ طریقت میں نہیں آنا چاہیے،چونکہ تفقہ فی الدین کے حصول کے بعد ہی اللہ تعالیٰ طریقت کے راستے میں داخل فرماتا ہے۔چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:**من یرد اللہ خیر ایفقهه فی الدین** (اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اسے دین کا فقیہ بناتا ہے۔) اسی لیے امام احمد بن حنبل،امام شافعی اور قاضی احمد بن شریح جیسے لوگ پہلے عالم فقیہ ہوئے پھر طریقت کے راستے کو مطمح نظر بنایا۔امام احمد بن حنبل اپنے جلالت علم کے باوجود جب کسی مسئلے پر توقف فرماتے تو ابوحمزہ بغدادی سے کہتے:"**ماتقول فی هذه المسئلة یا صوفی؟**" پھر ابوحمزہ بغدادی اس مسئلہ پر گفتگو فرماتے اور ان کو سمجھاتے،اس سے ان کو اعتماد ہوتا اور ان پر مسئلہ کی گرہیں کھل جاتیں۔(ص:۶۳) اسی طرح امام شافعی اتنے بڑے فقیہ ہونے کے باوجود صوفیوں کی مجالس میں بیٹھا کرتے تھے،جب ان سے پوچھا جاتا کہ آپ نے صوفیوں کی مجلس سے کیا استفادہ کیا؟ تو فرماتے: میں نے ان سے دو چیزیں حاصل کیں:ایک"وقت تلوار ہے اگر تم اسے نہیں کاٹو گے تو وہ تمہیں کاٹ دے گا۔" دوسرا"نفس کو خیر کی طرف مشغول نہیں کرو گے تو وہ تمہیں شر کی طرف مشغول کر دے گا"۔اور قاضی احمد بن شریح،ابوالقاسم الجنید کے معترف تھے اور ان کی مجلسوں میں بیٹھا کرتے تھے ان سے مجلس میں کوئی سوال کیا جاتا تو کہتے"**انی لم افهم منه شیئا**" میں نے کچھ بھی نہیں سمجھا۔(ص:۶۳)

مرید ایک ہی شیخ کو لازم پکڑے

مرید کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ دو شیخ کے ہاتھوں بکے،بلکہ وہ ایک شیخ کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہے کیوں کہ ایسے مرید کو کبھی فلاح پاتے نہیں دیکھا گیا،جس کے دو شیخ رہے ہوں،دو شیخ کے دامن کو پکڑنا ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک عورت دو لوگوں کے نکاح میں،اور اگر کسی نے دو یا اس سے زیادہ شیوخ کی صحبت اختیار کی تو اسے چاہیے کہ ان میں سے ایک کو حقیقی شیخ تصور کرے۔

مرید دوسرے شیخ کی طرف کب جا سکتا ہے

ابوعلی دقاق فرماتے ہیں: مرید کے لیے شیخ کا ہونا ضروری ہے کیوں کہ انسان طریقت کے راستے کو بغیر شیخ کے طے نہیں کر سکتا اس لیے کہ راہ طریقت غیب یا غیب الغیب کے رازوں میں سے ایک راز ہے۔(ص:۶۴) مرید کے تکملہ سلوک سے پہلے ہی اگر ان کا شیخ داعی اجل کو لبیک کہہ گیا ہو تو مرید پر واجب ہے کہ وہ دوسرے شیخ کا دامن پکڑ لے تاکہ شیخ ثانی شیخ اول کی تربیت میں اضافہ کرے،اس لیے کہ راہ طریقت میں کوئی قرار نہیں۔

مرید کی آزمائش

راہ طریقت میں آزمائشوں کے پہاڑ ہوتے ہیں اس لئے اگر کوئی مرید کسی شیخ کے پاس راہ طریقت کے ارادے سے جائے اور شیخ اسے نظر انداز کر دے تو وہ اس پر صبر کرے اور اپنے ایمان کو متزلزل نہ ہونے دے اور اپنے نفس کو حقیر جانے،اور شیخ کے دروازے پر ڈٹا رہے یہاں تک کہ شیخ ان پر نظر عنایت فرمائے،صوفیہ نے فرمایا ہے ایسے مرید جن کو ان کے شیوخ بغیر کسی امتحان کے راہ طریقت میں داخل کر لیا کرتے ہیں،وہ کبھی فلاح نہیں پاتے،اس لیے کہ وہ راہ طریقت میں ادب و تعظیم کے بغیر کود پڑا۔اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:**یایها الذین امنوا اذا جاءکم المومنات مهاجرات فامتحنوهن اللہ اعلم بایمانهن** (ترجمہ:اے ایمان والو! جب تمہارے پاس کوئی مومن عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو انھیں جانچ لیا کرو،اللہ تعالیٰ ان کے ایمان کو خوب جانتا ہے۔)(ص:۷۲)

محمد الشناوی الاحمدی نے مجھے خبر دی ہے کہ جب وہ راہ طریقت کے طالب ہوئے تو وہ فارس شیخ ابی الحمایل کے پاس گئے انھوں نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں فرمائی اور ان کا ذکر بھی نہیں کیا،وہ اسی حال میں پانچ مہینہ تک ڈٹے رہے،جب شیخ نے ان کی شدت رغبت کو دیکھا تو ان کو بلایا اور قریب کیا اور ان سے فرمایا:اے محمد! میں تمہارے لیے خیر کو پسند کرتا ہوں اور دوسروں کے لیے بھی اور جو کچھ تمہارے ساتھ واقع ہوا وہ تمہارا امتحان تھا،اور وہ اس لیے تھا تاکہ تم راہ طریقت اور اہل اللہ میں داخل ہو۔(ص،۷۲)

ترک خواہش

امام قشیری فرماتے ہیں: جس مرید کے دل میں دنیا کی تھوڑی سی بھی خواہش ہے تو وہ حقیقتاً مرید نہیں ہاں مجازا ہو سکتا ہے،لہٰذا مرید پر واجب ہے کہ اس کے نزدیک دنیا اور عدم دنیا دونوں برابر ہو۔(ص:۷۳)

مرید صادق وہ ہے کہ جب وہ راہ طریقت میں قدم رکھے تو پلٹ کر اپنے کھوئے ہوئے مال واسباب کی طرف نہ دیکھے اور نہ ہی زمین وجائداد اور اسباب کی طرف نظر رکھے۔اس لیے کہ ان تمام چیزوں کی طرف التفات کرنا مرید کو کمزور ہونے یا کرنے کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔اور جب کبھی ان چیزوں میں سے کسی کی طرف پلٹتا ہے تو وہ راہ طریقت میں داخل ہونے سے پہلے سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔اور وہ اپنے آپ کو،اپنے نفس کے کل حصوں سے خارج جانے اور اس کی طرف مطلقاً التفات نہ کرے،جیسے مال،جاہ وحشمت،نسب اور خاندان وغیرہ۔جیسا کہ صادقین کی شان ہے اس لیے کہ فلاح ونجات،نفس کی مرغوبات کو چھوڑے بغیر اور احسان کے بدلے مصیبت قبول کیے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔

مرید کیسا ہو؟ وہ غیبت، حسد، ظلم وستم، دھوکہ بازی، محتاجی، نفس کی غلامی، نزاع، کسی کی تنقیص وغیرہ تمام صفات رذیلہ سے پاک وصاف ہو، جس نے مرید صادق ہونے کا دعوی کیا اور اس میں مذکورہ صفات میں سے کوئی ایک صفت بھی باقی ہے تو وہ جھوٹا ہے۔

عہد شکنی ہلاکت ہے

عہد توڑنے کا انجام یہ ہوتا ہے کہ مرید مردودین میں سے ہوجاتا ہے، لہٰذا وہ اپنے عہد کی حفاظت کرے، اور گناہوں سے توبہ کرنے کو لازم پکڑے، اگر اس نے عہد توڑ دیا، تو وہ گناہ عظیم میں مبتلا ہوگیا جس کی وجہ سے وہ بروز قیامت مردودین کی صفوں میں کھڑا کیا جائے گا۔

ابوالقاسم القشیری فرماتے ہیں: مرید پر ان عہود کی پابندی واجب ہے جو اس نے اللہ تعالیٰ سے کیے ہیں، اسی طرح وہ اپنے شیخ سے کسی بات پر اختلاف نہ کرے، اس لیے کہ اختلاف کرنا مرید کے لیے ضرر عظیم ہے۔ (ص، ۱۷۹)

طریقت کا راز اوراد ووظائف میں مضمر ہے

چنانچہ مرید ان اوراد ووظائف سے نہ گھبرائے جس کا شیخ نے اسے حکم دیا ہے، چوں کہ ہر شیخ پر اللہ تعالیٰ کی مدد ہوتی ہے، اور مرید وطریقت کے درمیان وہی اوراد ووظائف راز ہوتے ہیں جن کے وہ مامور ہیں تو جس نے بھی مامور بہ وظائف کو ترک کیا اس نے شیخ کے عہد کو توڑ دیا۔ صوفیہ اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ مرید کا عہد شکنی کرنا شیخ کے فیضان سے محروم کر دیتا ہے۔

ابراہیم دسوقی فرماتے ہیں: مرید پر واجب ہے کہ وہ راہ طریقت میں پوری ہمت وعزم کے ساتھ جما رہے، تاکہ ذوق سے طریقت کو پہچانے، نہ کہ علم وصفت سے۔ (ص: ۱۰۴) نیز فرماتے ہیں: جب مرید صادق اپنے شیخ کے جملہ مامورات پر عمل کرتا ہے تو ایک ایسا وقت آتا ہے جب وہ پکارنے لگتا ہے واہ واہ طریقت کی کیا ہی حلاوت وشیرینی ہے کیا ہی بہتر زندگی ہے، کیا ہی بہتر حکم ہے، کیا ہی خوب صورت قتل ہے، کیا ہی بہتر زندگی ہے، چنانچہ نفس کو ڈراتا رہے اور اسے طریقت کی راہ میں سپرد کرنے پر برانگیختہ کرتا رہے تاکہ اسے حیات ابدی حاصل ہوجائے۔

زبان گونگی ہوجاتی ہے

مرید خلوت میں ذکر کرتے کرتے ایسی حالت میں پہنچ جاتا ہے کہ اس کی زبان حرکت کرنے کے قابل نہیں رہتی اور وہ زبان سے ذکر نہیں کرسکتا اس لیے کہ وہ جلوہ ربانی اور مشاہدہ ربانی میں گم ہوتا ہے، اور جب انسان اللہ تعالیٰ کے مشاہدے میں گم ہوجاتا ہے تو بالاختیار کچھ بھی کرنے پر قادر نہیں رہتا۔ مرید اللہ تعالیٰ کے ساتھ حضور قلبی سے منہمک رہتا ہے تو پھر وہ شہود قلبی کی وجہ سے ذکر لسانی سے بے نیاز ہوجاتا ہے اور جب تک حضور دائم حاصل نہ ہو تب تک ذکر لسانی پر

مامور ہے اس لیے کہ شہود کی اس قدر دہشت ہوتی ہے کہ زبان ساکت خاموش ہوجاتی ہے، اس لیے مرید کو چاہیے کہ اس وقت تک ذکر کی مجلس ختم نہ کرے جب تک مقام غیبت حاصل نہ ہو جائے، بغیر اس کے مجلس ختم کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ بغیر اجرت کے محنت کرنا۔

ظاہری لباس سے اجتناب

مرید ظاہری لباس سے اجتناب کرے اور کبھی بھی اس کی طرف ضرورت وحاجت کے علاوہ التفات نہ کرے، کیوں کہ جس نے بھی ظاہر کی طرف توجہ کی وہ طریقت کے راستے سے الگ ہوگیا، احمد بن الرفاعی نے ایک فقیر کو عمدہ لباس پہنے ہوئے دیکھا تو فرمایا: یہ راہ طریقت سے نکالنے والی چیز ہے۔ (ص:۸۹)

اتباع شریعت

مرید ابتداءً شریعت مطہرہ کی مکمل پابندی کرے یعنی فرائض وواجبات پھر نوافل، کیوں کہ شریعت کی پابندی کیے بغیر طریقت کی ابتدا نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ شیخ ابراہیم دسوقی فرماتے ہیں: مرید پر فرائض وواجبات کی ادائیگی واجب ہے لیکن اسے اس سے زیادہ کی طرف متوجہ نہیں ہونا چاہیے، یہاں تک کہ سلوک کا تکملہ ہوجائے اور اپنے رب کو پہچان لے۔ جب یہ چیزیں حاصل ہوجائیں گی تب اسے رب تعالیٰ سے کوئی چیز غافل نہیں کرے گی، اب اگر وہ علم کلام، علم نحو، علم احکام پڑھے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کشفا اور شہودا ہوگا برخلاف اس کے کہ اس کے سلوک کا تکملہ نہ ہوا ہو۔

شریعت کی نظر میں اسلاف کے طریقے پر قائم رہنا خیر ہے اور نئی نئی باتیں گڑھنا شر ہے، چنانچہ امام قشیری فرماتے ہیں: مرید کو اللہ تعالیٰ سے کسی ایسے کام کا معاہدہ نہیں کرنا چاہیے جس کا اللہ تعالیٰ نے اسے مکلف نہیں کیا، اس لیے کہ یہ مکروہات شرعیہ میں سے ہے۔ چوں کہ عموماً لوگ اس کی رعایت نہیں کر پاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فمارعوھا حق رعایتھا۔ ترجمہ: ان لوگوں نے اس کی کما حقہ رعایت نہیں کی۔ (ص:۸۱)

اگر مرید طریقت کے راستے میں داخل ہوا اور وہ شادی شدہ ہے تو بیوی کو طلاق نہ دے اس لیے کہ طریقت میں رہنا رہبانیت نہیں ہے اور اگر غیر شادی شدہ ہے تو بغیر اذن شیخ کے نکاح نہ کرے۔

اعتراض سے پرہیز کرے

راہ طریقت میں اسے کوئی شک نہ ہو اگرچہ کوئی چیز اس کے علم کے خلاف جارہی ہو یہاں تک کہ شیخ اسے اجازت دے دے۔ ابوعلی دقاق فرماتے ہیں: جو شیخ کی صحبت میں داخل ہوا پھر اس پر کوئی اعتراض کیا تو اس نے صحبت کا عہد توڑ دیا، اب اس پر تجدید عہد (تجدید بیعت) واجب ہے۔ (ص: ۱۷۴) ابوسہل سعلوکی فرماتے ہیں: کبھی کبھی ایسا ہوا ہے کہ شیخ مجلس میں قرآن مجید کی

تفسیر پر گفتگو فرما رہے ہیں پھرانھوں نے اس مجلس کو''مجلس سماع'' میں بدل دیا،تو ایک مرید کے
دل میں خیال آیا کہ یہ کیسی مجلس ہے کہ مجلس قرآن کو مجلس سماع میں بدل دیا گیا،شیخ نے فورا فرمایا:
اے فلاں! جو شیخ پر اعتراض کرے وہ کبھی فلاح نہیں پا سکتا، پھر مرید نے توبہ کیا۔(ص:۱۷۵)
اور میں نے برہان الدین بن ابی شریف سے فرماتے ہوئے سنا: جس نے شیخ کی غلطی پر نظر کی
،اگر چہ وہ صواب پر ہو تو وہ اس شیخ سے کوئی فیض نہ پائے گا۔(ص:۱۵۶)

باطن کی صفائی

علی بن وفا فرماتے ہیں: اے مرید صادق کپڑے کی نظافت میں مشغول ہونے سے بچو،
اس لیے کہ یہ عمل قلب کی طہارت کو بھلا دیتا ہے اور نظر کو طہارت قلبی کے معاملے میں موٹا
کر دیتا ہے، اس لیے کہ اس سے وقت ضائع ہوتا ہے لہٰذا تم پر واجب ہے کہ طہارت حقیقی کی طرف
رجوع کرو؛ کیوں کہ طہارت حقیقی اللہ تعالیٰ کی طرف لے جاتی ہے اور اس کی بارگاہ میں عاجزی
وانکساری کا اظہار کراتی ہے، اس طور پر کہ وہ تمہیں نماز کے لیے پاک کرتی ہے، تمہاری زندگی
کو پاکیزہ بناتی ہے، تمہیں موت کے لیے تیار کرتی ہے اور موت کو تمہارے لیے، اس میں تمہارے
قلب وروح کی راحت ہے، اس طرح کہ تمہیں معرفت الٰہی اور مشاہدۂ ربانی سے زندہ رکھتی ہے،
کاش! تو اس شیریں اور صاف وشفاف سمندر سے اپنے قلب وروح کو پاک کرتا۔(ص،۱۲۰)

ابو حسن شاذلی فرماتے ہیں: جب تمہارے دل میں خطرات ووسوسے کثرت سے گزرنے
لگیں تو اپنے قلب کو اپنے شیخ کی طرف متوجہ کر دو، اگر اس کے باوجود قلب کو راحت نہ ملے تو قلب
کو رب تعالیٰ کی طرف متوجہ کر کے''**سبحان الملک القدوس**'' پڑھو۔(ص:۱۲۰)

نقصان دہ چیزیں

مرید صادق کے لیے سب سے نقصان دہ چیز یہ ہے کہ وہ لوگوں کے احوال وکیفیات پر
اعتراض کرے اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آزمائیشوں پر اعتراض کر رہا ہے، اگر کسی نے ایسا کیا تو
وہ موت آنے سے پہلے تین مرتبہ مرے گا،(۱) ذلت کی موت،(۲) فقر کی موت اور(۳) لوگوں
تک ہاتھ پھیلانے کی موت، پھر اس پر کوئی رحم نہیں کرے گا۔مرید حرام اور شبہات چیزوں کے
کھانے، پینے، پہننے، بولنے، سننے، دیکھنے، پکڑنے، چلنے وغیرہ سے پرہیز کرے، اور مسلمانوں
کے بارے میں سوء ظن نہ کرے اور جو نور اس کے دل میں ظاہر ہوتا ہے اس کا اظہار بھی نہ کرے،
اور طریقت میں داخل ہونے سے پہلے کے گناہوں کی طرف نظر نہ کرے، چوں کہ یہ چیزیں
طریقت میں رکاوٹ بنتی ہیں، ایسے بہت سارے لوگ ہیں جو پہلے گناہ میں مبتلا تھے پھر انہوں
نے صدق دل سے توبہ کی اور مرتبۂ ولایت تک پہنچ گئے۔

مرید اپنے مرتبے کا خیال کرے

مرید اپنے مرتبے کے اعتبار سے عمل کرے اور جس مرتبے پہ فائز ہوا سی درجے کی چیزیں
استعمال کرے، ایسا نہ ہو کہ ابھی حرام چیزوں سے بچ ہی نہیں پایا اور خلاف اولیٰ کی پابندی شروع
کر دی چونکہ ایسا کرنا اسے کوئی فائدہ نہیں دے گا۔ان کے کئی مراتب ہیں اول سننا، دوم سمجھنا، سوم
جاننا، چہارم مشاہدہ کرنا، اور پنجم پہچاننا، مرید صادق وہ ہے جس کا سلوک باطن سے شروع ہوتا ہے،
اور اس کا ظاہر متبع ہوتا ہے، اور عابد وہ ہے کہ اس کے سلوک کی ابتدا ظاہر سے ہوتی ہے اور باطن
اس کا تابع ہوتا ہے، مرید اس وقت تک صوف کا لباس نہ پہنے جب تک کہ وہ اخلاق وآداب کا
مکمل علم حاصل نہ کر لے۔ ہمارے شیخ جب کسی مرید کو صوف کے لباس میں دیکھتے تو فرماتے کہ
اس لباس کو اتار دو، یہاں تک کہ جہاد بالنفس سے فارغ ہو جا اس لیے کہ صوف انبیاء کا لباس اور
اصفیا کا حلیہ ہے، پس جو ان کے اخلاق پر نہ ہو، اس کے لیے صوف کا لباس پہننا جائز نہیں۔

امراض نفس کی صورتیں

مرید کے امراض ، بھوک، شکم سیری، شہوت، غضب، خوف، معصیت اور سکون ہیں۔
بھوک کمزور بچے کے مانند، شکم سیری شیر کی طرح، غضب جابر بادشاہ کی طرح، خواہش جانوروں کی
طرح، خوف بلی کی طرح، معصیت شیطان کی طرح اور خاموشی پتھر کی طرح ہے،(ص:۱۴۲)
اگر کسی مرید میں مذکورہ چیزوں میں سے کوئی ایک چیز بھی ہے تو یہ اس کا مرض ہے۔اس سے بچے۔
اور اس کی مصیبت تین چیزوں میں ہے، اول نکاح، دوم ایسے علوم کی طرف متوجہ ہونا جس کا تعلق
شریعت سے نہیں، سوم مخالفین کی صحبت۔ چنانچہ مرید تمام باطنی گناہوں سے پاک وصاف
ہو، باطنی عیوب کی پاکی کے بغیر لوگوں کے پاس پاکی کا اظہار کرنا استقامت سے محروم کر دیتا ہے
اور اس کا اظہار باطنی معصیت ہے، اس طرح کی چیزوں سے مرید عموما ہدایت سے محروم رہ
جاتا ہے، اور اس کی تمام عبادتیں اس معصیت کی وجہ سے رد کر دی جاتی ہیں اور وہ ایسا ہو جاتا ہے
گویا اس نے کوئی عبادت ہی نہیں کی، لہٰذا وہ راہ طریقت میں ترقی نہیں پا سکتا؛ کیوں کہ جملہ
معاصی کے اجتناب کے بغیر ترقی ناممکن ہے۔

باب دوم: شیخ کے ساتھ مرید کے آداب

شیخ کی ضرورت

طریقت کی راہ کسی کو شیخ کی بارگاہ میں جانے اور اس کے جملہ آداب بجالانے اور اس کی
خدمت کرنے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے، جس نے بغیر شیخ کے طریقت کا دعوی کیا تو اس کا شیخ شیطان
ہے، اب اگر ایسے لوگوں سے کرامت کا ظہور ہو جائے تو وہ دراصل کرامت نہیں بلکہ استدراج

ہے، جیسا کہ آخری زمانے میں دجال سے اس طرح کے بعض استدراج کا ظہور ہوگا۔ ابوالقاسم الجنید فرماتے ہیں: جس نے راہ طریقت میں بغیر شیخ کے چلنا شروع کیا تو وہ گمراہ اور گمراہ گر ہے اور جو آزمائش کے وقت شیخ کے آداب کا احترام نہ کر سکا وہ نور ایمانی سے محروم رہا۔ (ص: ۱۷۴)

توبہ

ان تمام اقوال وافعال اور ارادے سے رجوع کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ سے غافل ہونے کا سبب بنیں چنانچہ ذوالنون مصری فرماتے ہیں: جس نے توبہ کا دعویٰ کیا اور دنیا کی خواہشوں میں سے کسی ایک خواہش کی طرف بھی مائل ہے تو وہ جھوٹا ہے۔ (ص: ۳۳)

توبہ سے پہلے طریقت میں داخل ہونا درست نہیں، اور مشائخ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جس نے تمام ظاہری، باطنی، صغائر اور کبائر گناہوں سے توبہ نہیں کیا اس پر طریقت کا راز نہیں کھل سکتا، اس لیے کہ راہ طریقت دراصل بارگاہ الٰہی ہے، جیسے کہ نماز اور جنت دیدار الٰہی کی جگہ ہے، لہٰذا جس طرح نجاست لگنے سے نماز نہیں ہوتی اور گناہوں کے ساتھ جنت میں داخلہ نہیں ہوتا اسی طرح طریقت میں معصیت کے ساتھ داخل ہونا ممکن نہیں۔ (ص، ۷۸)

محبت

سب سے اہم ادب اپنے شیخ کے ساتھ یہ ہے کہ مرید اپنے شیخ سے بے انتہا محبت کرے، جو مرید اپنے شیخ کی محبت میں کامل نہیں اسے خواہش نفس گناہوں کی طرف مائل کر سکتی ہے، اور وہ طریقت میں کامیاب نہیں ہو سکتا اس لیے کہ شیخ کی محبت ہی درجات ومراتب معین کرتی ہے، اور محبت شیخ کے ذریعے ہی اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کی جا سکتی ہے، مرید کا محبت شیخ میں صادق ہونے کی دلیل یہ ہے کہ مرید تمام گناہوں سے تائب اور جملہ عیوب سے پاک وصاف ہو جائے، جو مرید گناہوں میں آلودہ رہتا ہے اور محبت شیخ کا دعوی کرتا ہے وہ اپنے دعوے میں جھوٹا ہے اور وہ اس آدمی کی طرح ہے، جو نہ شیخ سے محبت کرتا ہے اور نہ شیخ اس سے محبت کرتے ہیں، لہٰذا جو شیخ سے محبت نہیں رکھتا اللہ بھی اس سے محبت نہیں کرتا، اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے: **ان اللہ یحب التوابین ویحب المتطهرین۔ ان اللہ لایحب المفسدین** (ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والے اور پاکی حاصل کرنے والے سے محبت کرتا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ فساد کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔)

میں نے اپنے بھائی افضل الدین سے کہتے ہوئے سنا ہے کہ جو محبت کے نشے سے لطف اندوز ہو گیا تو وہ اپنے محبوب ومعشوق کی محبت میں مشغول ہو گیا اور میں نے علی الخواص سے سنا ہے جس نے محبت کا مزہ چکھ لیا تو میں نے اس کے دل میں سوزش عشق وشوق اضطراب دیکھا پھر اسے کوئی چیز محبوب نہیں ہوتی۔ (ص: ۱۶۸)

عاشقوں کی زبان

ان کی زبان الگ ہوتی ہے چوں کہ وہ محبت، عشق اور سکر کی زبان میں کلام کرتے ہیں، نہ کہ علم، عقل اور تحقیق کی زبان میں لہٰذا اگر کوئی ان میں مخالف چیز دیکھے تو اعتراض سے پرہیز کرے۔ اور اس لیے بھی کہ شیخ کی محبت واحترام اللہ تعالیٰ کی محبت واحترام ہے لہٰذا اعتراض سے پرہیز کرے۔ میں نے علی مرصفی سے کہتے ہوئے سنا ہے کہ مرید محبت شیخ میں جب ایک حد کو عبور کرتا ہے تو وہ شیخ کے کلام سے ایک خاص قسم کی لذت پاتا ہے جیسے کہ جماع سے ایک خاص قسم کی لذت ہوتی ہے لہٰذا جس نے ایسی کیفیت وحالت کا احساس نہیں کیا تو سمجھ لیا جائے کہ وہ شیخ کی محبت میں ناقص ہے۔ (ص: ۱۷۲)

مشائخ روحانی طبیب ہوتے ہیں

شیخ کسی مرید سے شریعت کی کوئی چیز نہیں چھپاتا کیوں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے نائبین میں سے ہیں، اور مقام ارشاد پر فائز ہیں، یہی لوگ حقیقت میں رسول اللہ ﷺ کے نائبین ہیں اور رہے علما تو وہ طبیب کی منزل میں ہیں مگر ایسے طبیب جو طبیعت کو نہیں پہچانتے بلکہ وہ انسانی بدن کے مدبر ونباض ہوتے ہیں، اور مشائخ تو دونوں کے عارف ہوتے ہیں۔ میں نے علی الخواص سے سنا ہے علما اللہ تعالیٰ کے اسما وصفات کے دروازے ہیں، اور صوفیہ جن کو وہبی علم ہے وہ ذات الٰہی کے دروازے ہیں اور اس کی معرفت رکھنے والے ہیں۔ (ص: ۱۷۳)

شیخ سے کچھ نہ چھپائے

مرید شیخ سے کوئی چیز نہ چھپائے، اور شیخ تک اپنے جملہ معاملات پہنچائے اور وہ انھیں احوال ظاہرہ وباطنہ کی خبر دیتا رہے، یہاں تک کہ وہ خطرات بھی جو ان کے دل میں آتے ہیں ان سے بھی شیخ کو آگاہ کرے اور اگر اس نے کچھ چھپایا تو اس نے صحبت شیخ کی خیانت کی، اب اس پر تجدید صحبت لازم ہے، اور شیخ مرید کو اس وقت تک اوراد ووظائف نہ بتائے جب تک کہ مرید بالکلیہ اپنے آپ کو پوری دنیا سے الگ نہ کر لے۔

ابوالعاص المرصفی فرماتے ہیں: مرید اور شیخ کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہونا چاہئے (امراض کا پردہ) اس لیے کہ شیخ روحانی طبیب ہے اور مرید کا باطنی حال پردہ ہے، تو مرید کے لیے جائز ہے کہ وہ اس پردے (امراض) کو ظاہر کرے، بطور علاج ہی سہی، مرید شیخ کو اپنے عیوب کے مکاشفہ کا مکلف نہ بنائے، اس لیے کہ مشائخ عیوب کے کشف کرنے سے پاک ومنزہ ہوتے ہیں، کیوں کہ کشف عیوب، کشف شیطانی ہے، لہٰذا مرید اپنے احوال باطنہ کی خبر شیخ کو ضرور دے۔ (ص: ۱۹۷) اور یہ خیال رکھے کہ شیخ کے سامنے کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہو جس سے

شیخ کے دل کو ناگواری گزرتی ہو، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ شیخ کی ناراضگی پر ناراض اور ان کی خوشی پر خوش ہوتا ہے۔

مرید شیخ کے سائے میں ہوتا ہے

ابراہیم دسوقی فرماتے ہیں: مریدین کے قلوب مشائخ کے قلوب کے سائے میں ہوتے ہیں وہ شخص ناکام ہے، جس کا دل شیخ کے سائے میں نہیں۔ (ص:۱۹۷) اور مرید صادق شیخ کو اپنی تربیت پر پریشان نہیں کرتا کہ شیخ مرید کی ہر بات کو سنے جب بھی مرید اشارہ کرے۔ (ص:۱۹۹)

مرید پر اذن شیخ واجب ہے

مرید شیخ کی اجازت کے بغیر جائز اور نوافل کام بھی نہ کرے یہاں تک کہ حج بیت اللہ بھی۔ اس لیے کہ معرفت بیت معرفت صاحب بیت پر موقوف ہے تو جس نے صاحب بیت کی معرفت حاصل نہیں کی اور اس کے گھر چلا گیا، تو وہ خطا پر ہے، اور اسے شیخ کی امداد بھی حاصل نہیں رہے گی، جس طرح عورت کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ نفل حج بغیر شوہر کی اجازت کے کرے، چنانچہ شیخ مرید پر اسی طرح تصرف کرسکتا ہے، جیسا کہ شوہر بیوی پر، اور شیخ کے تصرفات مرید کی تربیت، تزکیہ وتطہیر کے لیے ہوتے ہیں۔

مرید ان چیزوں کو لازم پکڑے

مرید پر لازم ہے کہ وہ شب بیداری، بھوک، ذلت ورسوائی پر صبر کرتا رہے، اور ان چیزوں پر بھی جو لوگوں کی طرف سے اس کے قلب وبدن پر پہنچتی ہیں، اہل طریقت میں جھوٹ، بہتان، ریا اور نفاق وغیرہ دیکھے تو اس سے دور بھاگے، گناہ گار لوگوں سے دور رہے، شب بیداری اور قیام اللیل کی کثرت کرے اور اپنے شیخ کی حتی الامکان خدمت کرتا رہے، اور اللہ تبارک وتعالیٰ سے کمال محبت کا دعوی کرنے سے پرہیز کرے۔ مرید کسی کو سویا دیکھے تو وہ اسے اپنی عبادت سے افضل جانے، قیل وقال کی مجلس میں بیٹھنا مرید کے لیے مصیبت ہے۔

مرید کا عقیدہ

مرید اپنے شیخ کو کامل اور شریعت وطریقت کا عالم جانے۔ ابراہیم دسوقی فرماتے ہیں: اے میرے مرید! اگر تو مجھ سے سچی محبت کرتا ہے اور تیرا وعدہ سچا ہے تو میں تجھ سے قریب ہوں اور میں تیرے ذہن میں، تیرے اطراف میں، اور تیرے تمام حواس ظاہرہ وباطنہ میں موجود ہوں اور اگر تو سچا نہیں تو میں تجھ سے دور ہوں۔ (ص: ۱۸۹) اور فرماتے: اگر مرید صادق اپنے شیخ کو ہزار سال کی مسافت سے بھی پکارے تو شیخ اس کا جواب دیتا ہے، خواہ شیخ حیات میں ہو یا نہ ہو، لہٰذا مرید کو ہر معاملہ میں اپنے قلب سے شیخ کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ خصوصاً جب کوئی

ناگہانی معاملہ درپیش ہو، پھر وہ شیخ کی آواز سنتا ہے اور اپنے مشکلات کو شیخ کے سامنے عرض کرتا ہے، شیخ ان کے معاملات کو حل کرتے ہیں۔ (ص:۱۸۹)

شیخ کی صحبت وخدمت

مرید شیخ کی خدمت میں ہر وقت مصروف رہے، خواہ شیخ سفر میں ہو یا حضر میں، شیخ مرید کو خدمت کا موقع اس وقت دیتے ہیں، جب کہ وہ مرید کے لیے کوئی خیر کا پہلو دیکھتے ہیں، اگر خدمت کرنے میں خیر کا پہلو نہیں ہوتا ہے تو مشائخ عموماً اس حال میں خدمت سے منع فرمادیا کرتے ہیں اور اگر شیخ مرید کو اپنے اخوان کی خدمت کرنے کا حکم دے تو مرید اخلاص کے ساتھ ان کی بھی خدمت کرتا رہے، اور ان کی بے رخی پر صبر کرتا رہے اور یہ کہتا رہے میں قاصر ہوں، میں آپ لوگوں کی کما حقہ خدمت نہ کرسکا۔

مرید صادق اپنے شیخ کے علاوہ کسی کی صحبت اختیار نہ کرے، اور اس کی بے التفاتی پر بھی صبر کرے، اس لیے کہ شیخ کا بے التفاتی کرنا مرید کے لیے امتحان ہے اور جان لے کہ شیخ بے رخی کرکے خیر کا ارادہ کررہا ہے، لہٰذا مرید سے جفا کرنا اسرار انوار سے مطلع کرنے کی دلیل ہے۔ اور فرماتے ہیں: جب تک مرید شیخ کے پاس ہے، وہ مسلسل ترقی پر ہے، اور اگر وہ شیخ سے دور ہوگیا اگرچہ اسے محصول چیزوں پر اعتماد ہو، تو وہ ہلاک ہوگیا، اور وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ انسان کا آسمان کی طرف اچھالا ہوا پتھر کہ جب تک اس پتھر میں انسان کی طاقت باقی ہوتی ہے پتھر آسمان کی طرف بلند ہوتا رہتا ہے اور جیسے ہی انسانی طاقت پتھر سے ختم ہوجاتی ہے تو وہ پتھر نیچے آنے لگتا ہے، یہاں تک کہ مکمل زمیں بوس ہوجاتا ہے۔ (ص:۱۹۲)

ابراہیم دسوقی فرماتے ہیں: مرید کو شیخ سے جدا نہیں ہونا چاہئے، اور نہ ہی ان کی خدمت سے، یہاں تک کہ ذوق سے طریقت کا مشاہدہ کرلے، نہ کہ علم سے اور وہ صرف دیکھنے اور سننے پر اکتفا نہ کرے، جب تک کہ مشاہدہ نہ کرلے۔ (ص، ۱۹۸) مرید صادق کے دل میں یہ خواہش نہیں ہونی چاہے، کہ وہ جب بھی بارگاہ شیخ میں آئے تو شیخ اسے قبول کرے، اس لیے کہ کبھی کبھی مشائخ اپنے رب کے ساتھ مشغول ہوتے ہیں اور اپنی اولاد کی طرف بھی التفات نہیں کرتے اور نہ ہی انھیں پہچانتے ہیں۔ (ص:۱۹۹)

مرید کو کوشش کرنی چاہیے کہ وہ حتی الامکان شیخ کے ساتھ نماز ادا کرے اگرچہ اس کا گھر شیخ کے گھر سے دور ہو۔ ابوبکر دیرینی کا گھر جامعہ ازہر کے آس پاس تھا، وہ میرے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھتے تھے اور جامعہ ازہر کو ترجیح نہیں دیتے تھے، باوجود اس کے کہ وہاں جماعت کی تعداد یہاں کے مقابلے میں زیادہ ہوتی تھی۔

مرید شیخ کی بات بغیر الفاظ کے سمجھ سکتے ہیں

بعض مرید ایسے ہوتے ہیں جو شیخ کے اوامر ونواہی کو بغیر صراحت کے،صرف رمز واشارہ کے ذریعے سمجھ لیتے ہیں، چنانچہ بایزید بسطامی اپنے شیخ کے پاس لفظوں کے محتاج نہیں رہتے اور شیخ کی باتوں کو رمز وکنایہ میں سمجھ لیا کرتے تھے اور ان سے زبانی کلام کے بجائے قلبی کلام فرمایا کرتے تھے۔شیخ عبداللہ الفاعل نے مجھے کہا: ایک مرتبہ شیخ ابوالعاص باطن سے گفتگو فرما رہے تھے،اور اس میں کسی لفظ کی ادائیگی نہیں تھی اور میں نے اس کو سمجھ لیا،اور اس حکم کو بجالایا۔

مرید محبت شیخ میں کسی کو شریک نہ کرے

مرید اپنے شیخ کی محبت میں کسی کو شریک نہ کرے،سوائے ان لوگوں کے جن سے محبت کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔علی بن وفا فرماتے ہیں: انبیاو اولیا اور صالحین ومومنین سے محبت کرنا شیخ کی محبت میں کسی کو شریک ٹھہرانا نہیں ہے بلکہ ان تمام لوگوں کی محبت عین شریعت ہے،شریعت وطریقت نور الٰہی ہے، جو بغیر کسی کے امتیاز کے تمام لوگوں پر ظاہر ہوتا ہے۔

صوفیہ ہی حق پر ہیں

صوفی کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایسے عالم ہوتے ہیں جو اپنے علم کے مطابق خلوص وللّٰہیت کے ساتھ عمل کرتے ہیں،علم تصوف کی معرفت صرف عمل بالاخلاص سے ہی ہوسکتی ہے،علم تصوف اخلاص تک پہنچنے کا بہترین آلہ ہے، جو عالم اپنے علم پر عمل کرتا ہے حقیقتاً وہی صوفی ہے،ابراہیم دسوقی فرماتے ہیں: عالم اگر صوفیہ کے پاس مکمل اخلاص کے ساتھ اپنے امراض باطنی کے علاج کے لیے آئے تو وہ ضرور بارگاہ الٰہی تک رسائی حاصل کرے گا۔

امام شعرانی نے جتنی گفتگو کی ہے ان سب کا نچوڑ یہ ہے کہ انسان مکمل اللہ تعالیٰ کا ہوجائے اور فنا فی اللہ بقا باللہ کا سہرا سجانے کی کوشش کرے اور ''ان صلاتی ونسکی ومحیائی ومماتی للہ رب العلمین '' (میری نماز، میری قربانیاں، میرا مرنا اور میرا جینا سب اللہ کے لیے ہے) پر قولاً وفعلاً ایمان لائے۔

○○○

آداب ومقامات سالک

کتاب: مدارج السالکین الی رسوم طریق العارفین کے چند اسباق

حضرت امام عبدالوہاب شعرانی رضی اللہ عنہ نے اپنے ماقبل اور ہم عصر مشائخ عظام کے کچھ اقوال منتخب فرما کر ایک رسالہ تیار کیا جو سالکین وطالبین کے لیے بہت ہی نفع بخش ہے، جس کا نام انہوں نے ''مدارج السالکین الی رسوم طریق العارفین '' رکھا۔اس کتاب کی عصری اہمیت وافادیت کے پیش نظر اس کا خلاصہ ہم قارئین کی بارگاہ میں پیش کررہے ہیں۔

امام شعرانی علیہ الرحمہ نے اس رسالہ کو پانچ ابواب پر ترتیب دیا ہے، باب اول سند تلقین، لبس خرقہ اور آداب ذکر کے بیان میں ہے۔باب دوم آداب مرید کے بیان میں۔باب سوم آداب شیخ سے متعلق ہے۔باب چہارم مرید کا اپنے اخوان، فقرا اور دنیاداروں سے تعلق کے آداب میں جب کہ باب پنجم مریدین صادقین کے اوصاف کے تعلق سے مشائخ کے اقوال وارشادات پر مبنی ہے۔

پہلی بات

سند تلقین کے تعلق سے حضرت امام شعرانی مرید صادق کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اے مرید صادق! (اللہ ہمیں اور تجھے اپنی رضا کا طلب گار بنائے) جو شخص اپنے طریقت کے آبا واجداد کے نسب ومسلک اور عادات ورسوم کو نہ جانے وہ اندھا ہے۔کیوں کہ جو شخص اپنے آپ کو کسی دوسرے باپ کی طرف منسوب کرتا ہے اور اپنا اصل نسب چھپاتا ہے تو بہت ممکن ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان ''لَعَنَ اللہ من انتسب لغیر ابیہ '' میں داخل ہوجائے۔اس لیے مرید کو سب سے پہلے یہ چاہیے کہ وہ جس راستے پر قدم رکھنا چاہتا ہے اس کے تعلق سے اولاً شیخ کامل سے اس سلسلے کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرلے اور آداب طریقت سیکھ کر اس سے اجازت لے کر مسند ارشاد پر بیٹھے،اس کے بغیر مسند رشد وہدایت پر بیٹھنا جائز نہیں ہے، نیز اس

نے ایسے شیخ طریقت سے آداب معرفت سیکھا ہو جس کی جلالت و شان طریقت کے حوالے سے متفقہ طور پر مشہور و معروف ہو، نیز اس کی راہ پر صریح طور پر گامزن رہ کر رشد و ہدایت کا کام کرے، تلقین سند کرے اور خرقہ پہنائے۔ (مدارج السالکین الی رسوم طریق العارفین، ص: ۲۰۱)

اسرار تلقین ذکر

حضرت امام عبدالوہاب شعرانی علیہ الرحمہ تلقین ذکر کا راز بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تلقین ذکر میں راز یہ ہے کہ اس میں بزرگوں کے قلوب کا آپس میں ربط ہوتا ہے، یہاں تک کہ اس کا سلسلہ حضور محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ اور آپ سے اللہ عزوجل تک منتہی ہوتا ہے۔ اسی لیے جب تک کوئی لا الہ الا اللہ نہ کہہ دے اس کے اسلام کا حکم نہیں دیا جاتا اور اس کی تائید اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے ہوتی ہے **لا یؤمن احدکم حتی تکون ھواہ تبعا لما جئت بہ**۔ تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہ ہوگا جب تک کہ اس کی جملہ خواہشات اس کے محبوب کی خواہشات کے تابع نہ ہو جائے۔ (مدارج السالکین، ص: ۳)

مرید کو جملہ ارواح اولیا سے فیض ملتا ہے

مرید جب تلقین کے ذریعے جماعت صوفیہ کے سلسلے میں داخل ہو جاتا ہے تو اسے جملہ ارواح اولیا سے فیض ملنے لگتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے شیخ کے وسیلے سے بارگاہ رسالت و حضرت بارگاہ صمدیت میں حاضری کے قابل ہو جاتا ہے، لہٰذا جو تلقین ذکر میں مشائخ کے طریقہ پر نہیں وہ اس گروہ سے شمار نہ کیا جائے گا اور اسے کوئی قبول نہ کرے گا۔ شیخ سے حاصل ذکر کا ورد اس طرح کرے کہ اس کے نفس کا الگ الگ حلقہ حرکت کرنے لگے۔

ثبوت تلقین ذکر

امام شعرانی علیہ الرحمہ طبرانی و بزار کے حوالے سے تلقین کا بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کو کلمہ لا الہ الا اللہ کی تلقین کبھی ایک جماعت میں فرماتے کبھی فرد واحد کو تنہائی میں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے اصحاب کو جماعت میں تلقین ذکر فرمائی تھی اس کے راوی حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نبی کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم کی بارگاہ اقدس میں حاضر تھے تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”**ھل فیکم غریب**“ کیا تم میں کوئی غریب یعنی اہل کتاب ہے۔ ہم لوگوں نے عرض کی یا رسول اللہ نہیں۔ تو آپ نے دروازہ بند کرنے کا حکم دیا اور فرمایا: تم لوگ اپنے ہاتھوں کو لا الہ الا اللہ کہتے ہوئے اٹھاؤ تو کچھ دیر تک ہم لوگوں نے اپنے ہاتھوں کو اٹھائے رکھا اور لا الہ الا اللہ کہتے رہے۔ پھر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ”**الا فابشروا فان اللہ قد غفر لکم**“ سنو! تمہیں مبارک ہو کہ اللہ عزوجل نے تم سب کو بخش دیا ہے۔ (ایضاً، ص: ۳)

کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بعض اصحاب کو تنہائی میں تلقین فرماتے، جیسا کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے بارگاہ نبوی میں عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے ایسے طریقے کی رہنمائی فرمائیں جو اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ قریب، اس کی بارگاہ میں سب سے افضل اور لوگوں پر زیادہ آسان ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے علی! اس کے لیے تم پر لازم ہے کہ سری اور جہری طور پر اللہ کے ذکر پر مداومت کرو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کی کہ ذکر الٰہی یوں تو سب لوگ کرتے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے اللہ کا کوئی خاص ذکر بتائیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں! اے علی وہ افضل ذکر جسے میں نے اور مجھ سے پہلے انبیا علیہم السلام نے کیا وہ لا الٰہ الا اللہ ہے، اگر ساتوں زمین و آسمان ایک ہتھیلی پر ہوں اور لا الٰہ الا اللہ دوسری ہتھیلی میں تو لا الٰہ الا اللہ ہی کو ان پر ترجیح دوں گا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید فرمایا اے علی! جب تک اس روئے زمین پر لا الٰہ الا اللہ کہنے والے رہیں گے، اس وقت تک قیامت نہیں آئے گی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کی یا رسول اللہ! میں کس طرح ذکر کروں تو آپ نے فرمایا: تم اپنی آنکھیں بند کر لو اور مجھ سے تین مرتبہ لا الٰہ الا اللہ سنو پھر آپ نے فرمایا اب تم لا الٰہ الا اللہ کہو میں سنتا ہوں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آنکھوں کو بند کر کے تین مرتبہ بلند آواز سے لا الٰہ الا اللہ کہا اور حضرت علی سنتے رہے، اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آنکھوں کو بند کر کے لا الٰہ الا اللہ بلند آواز سے کہا اور نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم سنتے رہے۔ یہی حدیث صوفیہ حضرات کے یہاں تلقین ذکر کی سند ہے۔ (ایضا ص: ۴)

ازالۂ شبہ

تلقین ذکر کے تعلق سے ابھی معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک جماعت کو تلقین ذکر فرماتے، کبھی فرداً فرداً، نیز اس جماعت میں اہل اور نااہل کی شناخت بھی کی جاتی کہ کون اس کا متحمل ہے اور کون اس کے لائق نہیں۔ اب ان حضرات کا یہ اعتراض دور ہو جاتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملاقات ثابت نہیں ہے۔ امام شعرانی علیہ الرحمہ کے نزدیک علما کا یہ قول بالکل قابل اعتبار نہیں ہے؛ کیوں کہ اس قول کا قائل خود صوفیہ کے طریقے میں داخل نہیں ہے، اگر داخل ہوتا تو ضرور تسلیم کرتا اور ان کے بارے میں اعتقاد رکھتا کہ یہ صوفیہ سچے ہیں، اس لیے کہ یہ طریقۂ صوفیہ کے مابین تواتر کے ساتھ جاری و ساری ہے، البتہ علما کو اس کی صریح سند نہ مل سکی جس کی بنیاد پر وہ عنداللہ گرفت میں نہ ہوں گے، ہاں! اپنی تحقیق کے مطابق اگر سند نہ مل سکی تو دوسروں کی تحقیق کو جھٹلانا بھی نہ چاہیے کہ یہ سبب وبال جان اور ہٹ دھرمی ہے؛ کیوں کہ علما و صوفیہ میں سے ہر ایک کے انداز تحقیق میں بڑا واضح فرق ہے۔ (ایضاً ص: ۵)

امام شعرانی کی سند تلقین

امام عبدالوہاب شعرانی علیہ الرحمہ اپنی سند تلقین ذکر کچھ اس طرح بیان فرماتے ہیں:

حضرت علی بن ابی طالب نے تلقین فرمائی حضرت حسن بصری کو، انہوں نے داؤد طائی کو، انہوں نے معروف کرخی کو اور معروف کرخی نے سری سقطی کو، سری سقطی نے ابوالقاسم جنید بغدادی کو، جنید بغدادی نے قاضی رویم کو، قاضی رویم نے محمد بن حنیف شیرازی کو، ابن حنیف نے ابوالعباس نہاوندی کو اور نہاوندی نے شیخ فرج الدین زنجانی کو، شیخ فرج نے قاضی وجیہ الدین کو اور وجیہ الدین نے ابونجیب سہروردی کو، سہروردی نے شیخ نجیب الدین بن برغوث شیرازی کو اور ابن برغوث نے شیخ عبدالصمد النطنزی کو، شیخ عبدالصمد نے شیخ حسن شمشیری کو، شیخ حسن نے شیخ نجم الدین محمود اصفہانی کو اور شیخ محمود نے شیخ یوسف العجم الکورانی کو، شیخ یوسف نے سید شیخ محمد حسن الشستری کو، سیدی حسن نے شیخ سیدی شہاب الدین احمد الزاہد کو، سیدی احمد الزاہد نے شیخ عارف باللہ تعالیٰ سیدی مدین کو، سیدی مدین نے سید شیخ محمد کو (آپ سید مدین کے بہن کے لڑکے ہیں) اور سیدی شیخ محمد نے سیدی شیخ محمد ابوالحمایل السروی کو، سیدی محمد السروی نے شیخنا وقدوتنا الی اللہ تعالیٰ الشیخ محمد الشناوی کو تلقین فرمائی اور شیخ محمد شناوی نے اس رسالہ (مدارج السالکین) کے مؤلف عبد الوہاب شعرانی ابن احمد بن علی الانصاری رضی اللہ عنہم کو تلقین فرمائی۔ (ایضاً، ص: ۶/۵)

امام شعرانی فرماتے ہیں کہ مجھے میرے شیخ نے فرمایا کہ مرید کو سند تلقین ذکر کو یاد کرنا ضروری ہے، اسی طرح خرقہ پہننے سے پہلے سند خرقہ یاد کر لینا بھی ضروری ہے۔

آداب ذکر کا بیان

ذکر خدا میں مشغول ہونے سے پہلے پانچ آداب کا لحاظ کرنا صوفیہ کے یہاں لازمی قرار دیا گیا ہے کہ بغیر ان کے ذکر بے سود ہوگا، وہ پانچ آداب یہ ہیں:

(۱) توبہ، صوفیہ اور اہل طریقت کے نزدیک توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو اللہ کی رضا اور اس کے ذکر میں رکاوٹ کا سبب بنے، اس سے قولاً، فعلاً اور ارادتاً دستبردار ہو جائے۔

(۲) ذکر سے پہلے غسل کرے، اگر حرج ہو تو وضو کر لے۔

(۳) سکون و سکوت، تاکہ اس کے ذریعے صدق حاصل ہو، بایں طور کہ اس کا دل بغیر بولے فطری طور پر اللہ کے ساتھ مشغول رہے، یہاں تک کہ اللہ کے ساتھ کوئی خیال دل و دماغ میں باقی نہ رہے، پھر اپنی زبان کے قول لا الٰہ الا اللہ کو اپنے دل کے مطابق کرے تاکہ قال حال کے مطابق ہو جائے اور حال قال کے مطابق۔

(۴) ذکر شروع کرتے وقت اپنے شیخ کی توجہ و ہمت سے اپنے قلب کے ذریعے مدد

طلب کرے۔

(۵) اپنے شیخ سے مدد طلب کرنے کے دوران یہ خیال جمائے کہ وہ گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد طلب کر رہا ہے؛ کیوں کہ شیخ، نبی کا نائب ہوتا ہے۔ (ص: ۸)

احوال ذکر کے بارہ آداب ہیں

(۱) پاک گھر میں نماز میں بیٹھنے کی طرح بیٹھے۔

(۲) اپنے ہاتھوں کو اپنے زانوؤں پر رکھے۔

(۳) ذکر کے مجلس کو پاکیزہ خوشبو سے معطر کرے، اسی طرح اپنے بدن کے کپڑے میں بھی خوشبو لگائے۔

(۴) حلال و پاکیزہ لباس پہنے۔

(۵) اگر ہو سکے تو تاریک جگہ اختیار کرے تاکہ دل جمعی حاصل ہو سکے۔

(۶) آنکھوں کو بند کرے؛ کیوں کہ آنکھوں کو بند کرنے سے اس پر حواس ظاہرہ بند ہو جائیں گے اور حواس ظاہرہ بند کرنے سے قلب کے حواس کھل جاتے ہیں۔

(۷) اپنے آنکھوں کے درمیان اپنے شیخ کا تصور جمائے، صوفیہ کے یہاں بالخصوص اس کی تاکید کی جاتی ہے، کیوں کہ اس کے بڑے فوائد ہیں، جسے اہل طریقت سے ہی معلوم کیا جا سکتا ہے۔

(۸) ذکر میں ایسا صدق پیدا کرے کہ اس کے نزدیک ظاہر و باطن برابر ہو جائے۔

(۹) اخلاص نام ہے دل کو لایعنی اور غیر ضروری کام سے پاکیزہ و فارغ کر لینے کا، ذاکر ذکر اور اخلاص کے ذریعے ہی مقام صدیقیت تک پہنچتا ہے، اس کے لیے شرط ہے کہ ذاکر کے قلب میں جو اچھے برے خطرات اور وسوسے ظاہر ہوتے ہیں، وہ اسے اپنے شیخ سے بتا دے، اگر وہ اپنے شیخ سے ظاہر نہ کرے گا تو وہ خیانت کرنے والا ہوگا اور مقام فتح پر پہنچنے سے محروم ہو جائے گا۔ واللہ لایحب الخائنین۔

(۱۰) ذکر لفظ لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ اختیار کرے؛ کیوں کہ صوفیہ کے مسلک میں اس کلمہ کا ایک خاص اثر ہے، جو دیگر اذکار شرعیہ میں نہیں پایا جاتا، لہٰذا پوری طاقت بھر اس کلمہ کا ذکر جہری کرے۔

(۱۱) ذکر مکمل حضور قلب کے ساتھ ادا کرے۔

(۱۲) لا الٰہ الا اللہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے سوا قلب سے ہر موجود شے کی نفی کرے تاکہ الا اللہ کی تاثیر قلب میں جاں گزیں ہو جائے۔

بعد ذکر، ذاکر پر تین چیزوں کا لحاظ ضروری ہے:

(۱) جب ذکر سے فارغ ہو تو مکمل خشوع وخضوع کے ساتھ پرسکون ہو جائے اور حضور قلب کے ساتھ اس چیز کا منتظر رہے جو اس کے قلب پر وارد ہوتا ہے اور اس حالت کی مقدار کو بڑھاتا رہے۔

(۲) ذکر کے بعد بار بار اپنے نفس کو ملامت کرتا رہے کہ تو نے ذکر میں کوتاہی کی، جیسا چاہیے ویسا نہیں کیا۔

(۳) ذکر کے بعد پانی نہ پیے تاکہ ذاکر کے اندر مذکور کی طلب کے لیے سوزش وشوق پیدا ہو؛ کیوں کہ وہی مطلوب اعظم ہے۔ ذکر کے بعد پانی پینے سے وہ سوزش و ذوق ختم سا ہو جاتا ہے۔(ایضاً، ص:۱۰)

آداب المرید

آداب المرید کے باب میں امام شعرانی علیہ الرحمہ نے بڑی بصیرت آموز، ناصحانہ گفتگو فرمائی ہے، جن میں سے خاص آداب کا ذکر کیا جاتا ہے۔

☆ مرید پر سکوت کا غلبہ ضروری ہے، صرف ضرورۃً کلام کرے

☆ جب ذکر شروع کرے تو اس وقت تک ذکر منقطع نہ کرے جب تک کہ تمام حاضرین وجمیع اخوان سے غیبت حاصل کر کے حق تعالیٰ کے ساتھ حاضر نہ ہو جائے۔ اس لیے کہ فتح الٰہی اسی وقت حاصل ہوگی جب کہ وہ اپنے جملہ احساسات سے غائب ہو جائے اور بارگاہ الٰہی میں حاضر ہونے کا مستحق قرار دیا جائے، لیکن جسے ذکر کے ساتھ غیبت حاصل نہ ہو، اسے اس کے ذکر کی نیکیاں ملیں گی، البتہ درجات حاصل نہ ہوں گے۔

☆ اس کی قمیص چھوٹی، صاف ستھری اور کشادہ آستین والی ہو، کپڑا ایک ہی طرح کا سادہ ہو یا پورا رنگا ہوا ہو۔

☆ سفید کپڑا صرف جمعہ کے دن پہنے، اس لیے کہ مرید پر تجرید اور ترک دنیا واجب ہے۔ سفید کپڑا روزانہ پہننے میں اس کے لیے پریشانی یہ ہے کہ اسے صابون سے دھونا پڑے گا جس کے لیے پیسے کی حاجت ہوگی تو وہ اس کے لیے کسب وپیشہ اور سوال کا محتاج ہوگا، لہٰذا اس کی توجہ اللہ عزوجل کی طرف سے منقطع ہو جائے گی، اس صورت میں مرید دنیا اور ہر اس چیز کی طرف متوجہ ہوگا جو اس کو توجہ الی اللہ سے دور کرے۔ مرید کو چاہیے کہ وہ گندے کپڑے پر ہی صبر کرے، یہاں تک کہ اس کے دل کی گندگی دور ہو جائے اور اس کی حالت کمال کو پہنچ کر ظاہر کپڑے کی نظافت طلب کرنے لگے، تاکہ اس کا ظاہر وباطن یکساں نظر آئے اور اس معاملے میں صاحب عدل شمار کیا جائے۔ کیوں کہ جب مرید صرف اپنے ظاہر کی صفائی میں مشغول ہو جائے

اونی اور بیل بوٹے والے کپڑے پہننے لگے تو وہ کبھی فلاح نہ پائے گا، اگرچہ اس کا شیخ اکبر السالکین ہی کیوں نہ ہو۔

☆ اسی طرح مرید کے لیے مناسب نہیں کہ وہ ایسے لباس پہنے، جس میں طرح طرح کی سرخ اور ہری لکیریں بنی ہوں، جیسے کہ بعض فساق اور اہل رعونت پہنتے ہیں۔

☆ مرید صادق کو شروع میں کچھ مدت تک اپنے تمام احوال کو چھپائے رکھنا ضروری ہے۔

☆ کبھی بھی اپنے کپڑے پر پیوندی تبرک (بابرکت کپڑے کا ٹکڑا) کے سوا کسی چیز کا نشان نہ لگائے، البتہ اگر وہ رنگ صاحب لون کی جانب سے ہو تو لگائے جیسے لون احمدیہ، رفاعیہ، اور قادریہ وغیرہ۔ میں نے بعض کتابوں میں اس کی اصل دیکھی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور حضرت جبریل علیہ السلام ایک صندوق لائے، آپ نے اس کو کھولا تو اس میں ہرے، سرخ اور سیاہ رنگ کے خرقے تھے۔ آپ نے فرمایا اے جبریل! یہ کیا ہے؟ تو حضرت جبریل نے عرض کی، حضور! یہ وہ خرقے ہیں جو عنقریب آپ کی امت کے خواص کو ملیں گے۔ میں نے اس حدیث کو صاحب کتاب سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل السند دیکھا ہے۔ پھر صاحب کتاب نے یہ کہا **رواہ البزار ایضا باسناد لا بأس بل واللہ اعلم**

☆ اپنے شیخ کے حکم کی تعمیل میں بیدار مغزی سے کام لے، کبھی اپنے شیخ کے امر ونہی کی تصریح کا محتاج نہ رہے، بلکہ محض اشارہ ہی سے سمجھ لے۔(مدارج السالکین، ص:۱۰ تا ۱۶)

شیخ کے ساتھ مرید کے آداب

اللہ عزوجل ہم سب پر رحم فرمائے، کوئی بھی شخص بلند حال ومقام تک، اس وقت تک نہیں پہنچتا جب تک کہ اس نے کسی شیخ کامل سے ملاقات نہ کر لی ہو اور ادب کے ساتھ ان کی خدمت اختیار نہ کی ہو، جس نے بھی اکابر کی صحبت بغیر ادب واحترام کے اختیار کیا تو وہ ان کے اثر انگیز فوائد اور کیمیائی بابرکت فیوض سے محروم رہا اور اس پر ان کے آثار میں بہت کچھ ظاہر نہیں ہوا، اگرچہ وہ اس کا مکلف ہو۔ حضرت سید الطائفہ جنید بغدادی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: **مَن حَرُمَ احترام الاولیاء ابتلاہ اللّٰہ بالمقتِ بینَ العبادِ** جو شخص بھی اولیا کے احترام سے محروم ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے بندوں کے درمیان بغض وحسد کے ساتھ مبتلا کر دیتا ہے۔(مدارج السالکین، ص:۱۶)

اور عقبہ کی روایت میں ہے **"مَن جلس هذه الطائفة ثم لم یتأدب معهم سلب الله عنه نور الایمان" و فی روایة "مَن جلس معهم و نازعهم فی شیٔ یتحققون به فی انفسهم یخاف الله علیه مِن سوء الخاتمة"**۔ جو شخص ان صوفیہ واولیا حضرات کے گروہ میں مؤدب ہو کر نہ بیٹھا، اللہ عزوجل اس سے نور ایمان کو سلب کر لیتا ہے۔ ایک دوسری روایت میں

ہے جوان کے ساتھ بیٹھے اوران سے کسی ایسی چیز کے بارے میں نزاع کرے، جس کو وہ حضرات اپنے نزدیک متحقق سمجھتے ہیں تو اس پر اللہ تعالیٰ غضب فرماتا ہے اوراس کا خاتمہ بالخیر نہ ہونے کا اندیشہ ہے۔ ہرزمانے میں یہی نکتہ چیں حضرات (جن میں اکثر اہل علم شامل رہے) ان شیوخ کی اقتدا نہ کرنے اوراپنی خواہشات پر چلنے کی وجہ سے منزل مقصود تک پہنچنے سے محروم رہے، حتی کہ اس راستے پر چلتے چلتے مر گئے، لیکن مطلوب تک نہ پہنچ سکے۔ (ایضاً:۱۶)

صوفیہ کا طریقہ کتاب وسنت پر استوار ہے

سیدی ابراہیم الدسوقی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں تم ان مشاہدات کی باتوں اور دعاؤں کو چھوڑ دو جو کتاب وسنت سے ثابت نہیں، کیوں کہ یہ تمہیں تمہارے رب کی بارگاہ سے دور کرنے کا سبب ہیں؛ کیوں کہ ہمارا طریقہ کتاب وسنت سے مقید ہے۔ لہٰذا جس نے کسی ایسے طریقے کو پیدا کیا جس کی اصل قرآن وسنت میں نہ ہوتو وہ ہمارے طریقے پر نہیں ہے اور نہ اس کا تعلق ہمارے گروہ سے ہوگا، ہم اس سے دنیا وآخرت میں بری ہیں، اگر چہ وہ ہماری طرف اپنی نسبت کا مدعی ہو۔ اللہ تعالیٰ صرف انہیں اعمال کے ذریعے دلوں کو حیات جاودانی بخشتا ہے جو شریعت کے نزدیک جائز و مستحسن ہیں۔ (ایضا:۱۸)

بے عمل ظاہر پرست علما، مرید کے لیے عظیم گھاٹی ہیں

مرید کے لیے وصول الی اللہ میں سب سے زیادہ رکاوٹ کا سبب بننے والے علما ہیں جو علم کو بغیر عمل کے طلب کرتے ہیں اور اپنے ہم عصر علما پر جاہ ومرتبہ اور فوقیت حاصل کرنے کے لیے ان فروعی مسائل کے مطالعہ اور بحث وتمحیص میں لگے رہتے ہیں، جن کی عوام الناس میں سے کسی کو کوئی خاص ضرورت نہیں ہوتی۔ بسا اوقات یہ لوگ مرید کو چکنی چپڑی باتوں میں پھانس کر کہتے ہیں کہ علما جن فروعی مسائل میں مصروف ہیں یہ اللہ کے ذکر واشغال میں لگنے سے افضل ہے۔ **(معاذ اللہ رب العٰلمین)** اس سے مرید کا اپنے شیخ سے روحانی عقد وبند بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ بالآخر لاچار و مجبور ہونے کی وجہ سے وہ اس کے بعد کبھی فلاح نہیں پاتا۔ (ایضاً، ص:۱۹)

صوفیہ کا راستہ وصول الی اللہ میں فقہا کے راستے سے بہتر اور قریب تر ہے۔ حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا کہ بغداد میں علم حاصل کرنے والوں کی ایک جماعت اپنے شیخ کی فقہی مجلس کو چھوڑ کر حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ کے حلقۂ ذکر میں بیٹھ گئی تو آن جناب کو یہ بہت برا لگا اوران لوگوں سے بد دل ہوگئے اور صوفیہ حضرات کے تعلق سے اناپ شناپ بکنے لگے تو حضرت جنید بغدادی علیہ الرحمہ نے ان کے پاس ایک قاصد کہلا بھیجا کہ اے میرے بھائی! جب بندہ اپنے محبوب کی لقا اوراس کے قرب کا طالب ہوتا ہے تو اس کے لیے

یہاں دو راستے ہیں، ان میں سے پہلا راستہ یہ ہے کہ بندہ کو اپنے محبوب ومطلوب کا قرب ووصال تیس سال میں حاصل ہوگا۔ دوسرا یہ کہ اسے اپنے محبوب تک رسائی سال بھر سے کم میں حاصل ہو جاتی ہے تو ان میں سے کون راستہ زیادہ لائق اور مناسب ہے؟ فقیہ نے کہا کہ جو راستہ وصول الی اللہ میں قریب تر ہو اور وقت کے لحاظ سے مختصر ہو وہی راستہ زیادہ لائق ہے۔ حضرت جنید بغدادی علیہ الرحمہ نے فرمایا یقینا تو نے سچ کہا تو فقیہ صاحب نے کہا کہ ہمارا طریقہ اللہ کے زیادہ قریب ہے برخلاف تمہارے طریقے کے، حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ نے جواباً ارشاد فرمایا: جناب بلکہ اللہ عز وجل کے ذکر کا راستہ اس کے احکام کی معرفت کے راستے سے اللہ کے زیادہ قریب ہے ۔اس لیے کہ احکام خلق سے متعلق ہیں، جب کہ ذکر کا تعلق حق تعالیٰ سے ہے۔ فقیہ نے کہا مجھے اس کی کوئی علامت بتائیے؟ حضرت جنید بغدادی علیہ الرحمہ نے ایک شخص سے فرمایا تم اس پتھر کو لو اور اسے فقرا کے وسط حلقہ میں اس طرح پھینکو کہ انہیں نہ لگے، چنانچہ پتھر لے کر ان کے حلقے کے بیچ پھینکا گیا اتنے میں تمام فقرا اللہ اللہ کہہ کر چیخ اٹھے۔ پھر آپ نے دوسرا پتھر منگا کر جماعت فقہا کے وسط حلقہ میں پھینکنے کا حکم دیا جیسے ہی پتھر ان کے درمیان پڑا وہ سب کے سب شرارہ بھری تیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگے اور کہا کیا یہ تم لوگوں کا ہمیں مارنا جائز ہے بلکہ یہ تو تم پر حرام ہے۔ فقیہ نے یہ دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کی اور آپ کی صحبت اختیار کر کے آپ کے عظیم اصحاب میں سے ہوگیا۔ (مدارج السالکین، ص:۱۹)

صوفیہ کا گروہ سب سے زیادہ مؤدب، مہذب اور مخلص ہے

حضرت امام یافعی سے حکایت ہے کہ انہوں نے شیخ الیمن رضی اللہ عنہ سے اپنے بارے میں بتایا کہ میں پندرہ سال سے اس بارے میں متردد ہوں کہ فقہا اور صوفیہ کے راستوں میں کون سا راستہ افضل ہے اور وصول الی اللہ میں کون سا طریقہ اللہ کے زیادہ قریب ہے، کیوں کہ صوفیہ آداب ظاہری وآداب باطنی کی رعایت کرتے ہیں تو فلاح پا جاتے ہیں اور بارگاہ قرب میں جگہ پا جاتے ہیں، جب کہ فقہا صرف ظواہر کا لحاظ کرتے ہیں اس لیے وہ ترقی نہیں کر پاتے اور شریعت کے اسرار سے محجوب رہتے ہیں۔ لہٰذا ہر صوفی فقیہ ہے، لیکن ہر فقیہ صوفی نہیں۔ پھر شیخ الیمن نے مجھ سے فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ تمہیں ایسی چیز دکھاؤں جس سے تم دونوں راستوں کے ثمرہ ونتیجہ کی معرفت بخوبی کر سکو کہ ہر ایک کا ثمرہ کیا ہوتا ہے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے، آپ جیسا چاہیں کریں۔ شیخ الیمن نے فرمایا اے فلاں! تو اٹھ اور ہمارے شہر زبیہ کے فلاں مفتی عالم کو بلا کر لا۔ پھر ایک دوسرے فقیر سے فرمایا کہ جب وہ فلاں کسی کو لائے تو تو اس کو اسی دم حرکت میں لانا اور اس کے سلام کا جواب مت دینا۔ پس جب وہ مفتی عالم آیا اور السلام علیکم کہا تو کسی نے اس کے سلام کا

جواب نہیں دیا۔ پھر اس عالم نے کہا حرام علیکم تم پر حرام ہو۔ سلام کا جواب واجب ہے۔ حضرت شیخ نے اس عالم سے فرمایا۔ حضرت! ان فقرا کے دلوں میں آپ کے تعلق سے کچھ ہے تو فوراً اس عالم نے کہا بلکہ میرے دل میں ان لوگوں کی طرف سے چند چیزیں ہیں۔ پھر اس عالم نے اپنے ایک عزیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ میں اس وقت کے فقرا کو پانچ چیزوں میں مبتلا دیکھ رہا ہوں: (۱) سنت کے مقابلے میں بدعت کو رواج دینا۔ (۲) حق کے مقابلے میں باطل کا اتباع کرنا۔ (۳) حقائق کو چھوڑ کر خرافات کا طلب کرنا۔ (۴) استاذ کی پیروی چھوڑ کر خواہشات پر عمل کرنا۔ (۵) بے ثبوت دعاؤں کا پڑھنا اور ان کا اثر بتانا۔

شیخ یمن نے مجھ سے فرمایا: تو نے ان کی ذات کو پہچانا؟ تو میں نے کہا جی ہاں! مجھ سے فرمایا کہ اس عالم مفتی کی وہ تہذیب کہاں گئی جس کو اس نے اپنے علم سے حاصل کیا۔ میں نے عرض کی اس نے ذرہ برابر بھی اپنے علم سے تہذیب نہیں لیا۔ اس کے بعد شیخ نے فرمایا اے فلاں! اٹھ اور فلاں فقیر کو میرے پاس بلا کر لا اور فقرا کو حکم دیا کہ جب وہ فقیر تمہارے پاس آئے تو تم لوگ اس کے سلام کا جواب مت دینا۔ جیسا کہ اس عالم کے ساتھ کیا گیا۔ پس جب وہ فقیر آیا تو اس نے کہا السلام علیکم۔ کسی نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا۔ وہ فقیر ہنسا اور دوبارہ السلام علیکم کہا۔ اس بار بھی کسی نے اس کا جواب نہ دیا۔ اس وقت بھی فقیر ہنسا اور تیسری بار السلام علیکم کہا تو فقرا کے شیخ نے اس سے فرمایا ان لوگوں کے دل میں تمہاری طرف سے کچھ ہے۔ اس نے کہا ایسے خیال سے مجھے اللہ معاف فرمائے۔ پھر اس نے جوتے لیے اور انہیں اپنے سر پر رکھ کر چل دیا۔ حضرت شیخ الیمن نے فرمایا تم فقرا کے طریقے کو دیکھو اور اسے اپناؤ۔ حضرت امام یافعی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: اس دن سے میں نے صوفیہ کے طریقے کو مکمل طور سے پکڑ لیا۔ (ایضاً، ص: ۲۰)

صوفیہ اساس پر ہیں اور دوسرے لوگ رسوم پر

جب شیخ عزالدین بن عبدالسلام نے شیخ ابوالحسن شاذلی رضی اللہ عنہ کی صحبت اختیار کی تو شیخ شاذلی نے شیخ عزالدین سے فرمایا کہ صوفیہ اساس و بنیاد پر عمل پیرا ہیں جب کہ دوسرے لوگ رسوم کی پابندی کرتے ہیں۔ نیز فرمایا کرتے تھے کہ صوفیہ کے طریقے کی صحت پر سب سے عظیم دلیل یہ ہے کہ ان کے ہاتھ پر کرامات و خوارق کا وقوع ہوتا ہے اور کسی فقیہ کے ہاتھ پر کرامت کا وقوع نہیں ہوتا، البتہ اگر وہ صوفیہ کے طریقے پر چلتا ہو تو کرامات کا وقوع ہوگا۔ میرے عزیز! تو فقرا کے راستے کو اپنا لے اور اسی پر دل و جان سے گامزن رہ اور اس سلسلے میں اپنے شیخ کے علاوہ کسی سے نہ مشورہ لے، نہ کسی کا مشورہ قبول کر، میں نے تجھے نصیحت کی۔

مرید اپنے شیخ سے خطرات نفس کو پوشیدہ نہ رکھے۔ البتہ ان خطرات کو اسی وقت شیخ کے

سامنے پیش کرے جب یہ خطرات مکرر آئیں۔

شیخ کے کسی قول و فعل پر عقل و قلب سے معترض نہ ہو اور اس کے کلام میں ہرگز تاویل روا نہ رکھے، بلکہ اس کے ظاہر کلام پر عمل کرے، ورنہ ہلاکت سے دوچار ہوگا، بلکہ اس معاملے میں قصۂ خضر و موسیٰ علیہما السلام کو پیش نظر رکھے۔

شیخ کی بارگاہ میں سراپا عاجزی و غلامی کے ساتھ بیٹھے اور اس کی بارگاہ میں زیادہ بیٹھنے سے بچے تاکہ دل سے شیخ کی مجلس کی حرمت نہ ختم ہوجائے۔ (ایضاً، ص: ۲۰)

مرید کے لیے شیخ کی مطلقہ یا بیوہ سے نکاح جائز نہیں

مرید شیخ کی مطلقہ اور بیوہ عورت سے نکاح ہرگز نہ کرے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے لوگوں نے مہاجرین اولین کی امامت کرنے کا مطالبہ کیا تو آپ نے انکار فرمادیا اور کہا کہ میں ایسی قوم کی امامت کیسے کروں جن کے ہاتھوں پر اللہ عزوجل نے ہمیں ہدایت دی یا ہم ان کے انساب سے کیسے نکاح کریں۔

حضرت امام شعرانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے میرے شیخ نے بیان کیا کہ حضرت شومی علیہ الرحمہ جو کہ سیدی مدین مصری کے اصحاب میں سے تھے، انہوں نے اپنی مرض موت میں اپنے اصحاب کو خبر دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے میرے بعد میری عورت سے نکاح کیا میں نے اسے قتل کیا۔ پس جب سیدی محمد شومی کا انتقال ہوا تو ایک شخص نے ان کی بیوی سے نکاح کی درخواست کی، آپ کے اصحاب نے شیخ کے فرمان سے اسے باخبر کیا لیکن وہ نہ مانا اور علماے مصر سے اس بارے میں فتویٰ طلب کیا، علما نے جواباً فرمایا کہ خصوصیت صرف اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے نہ کہ ان کے لیے، لہٰذا تم ان کی بیوی سے نکاح کر سکتے ہو، اس میں کوئی حرج نہیں۔ آخرش اس شخص نے ان کی بیوی سے نکاح کرلیا تو رات کے وقت اس کے بغل میں کوئی چیز داخل ہوئی اور وہ زور زور سے چیخنے چلانے لگا یہاں تک کہ اس کی روح نکل گئی۔ اس کے بعد اس کی بیوی بھی معذب ہوکر مرگئی۔ (الامان والحفیظ) (مدارج السالکین، ص: ۳۱)

اللہ تک پہنچنے کے لیے اطاعت شیخ ضروری ہے

مرید کے لیے اپنے تمام احوال میں سے اہم یہ ہے کہ وہ طلب شیخ میں ''صدق'' کو اپنی اصل پونجی بنائے؛ کیونکہ تمام مشائخ کا اس پر اجماع ہے کہ اگر مرید کے لیے کمال اطاعت شیخ درست ہے تو وہ بارگاہ الٰہی میں پہنچ جاتا ہے اور اس بارگاہ میں رہنے والوں کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ جس نے بھی اپنا قدم اس میں رکھا تو وہ دنیا کی محبت کی طرف کبھی نہیں لوٹے گا۔ یہ اس عظیم بارگاہ کے خصائص میں سے ہے۔ (مدارج السالکین، ص: ۳۸)

فعل مباح میں مرید کے لیے ترقی نہیں

مباحات پر عمل مرید کے لیے ضرر رساں ہے کہ اس میں ترقی نہیں ہوتی؛ کیونکہ وہ برزخ ہے۔ اس میں نہ ثواب ہے نہ عقاب۔ اکثر اوقات مباحات پر عمل کرنے والا مرید صادق نہیں بلکہ کاذب، خائن اور منافق ہے۔

مرید اپنے شیخ کے سامنے فعل مباح کے جواز میں اقوال علما ہرگز نہ پیش کرے کہ بہت ممکن ہے اس سے اپنے شیخ کی صحبت سے محروم ہوجائے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ فقہا کا طریقہ بھی اسی چشمے سے ماخوذ ہے جس سے فقرا کا طریقہ ماخوذ ہے، لیکن چونکہ فقہا جب مسند افتا و تدریس پر بیٹھتے ہیں تو وہ ہی اپنے زمانے کا مسلک بن بیٹھتے ہیں، جب کہ فقرا کا طریقہ اور اس کی باریکیاں فقہا کے فہم سے بالاتر ہیں؛ کیوں کہ ان لوگوں پر دنیا کی محبت اور اس کی گندگیاں غالب ہوتی ہیں، غلبۂ شہوات میں ڈوبے رہنے کی وجہ سے یہ راستے ان پر محجوب رہتے ہیں اور ترقی نہیں ہو پاتی۔ (ایضاً، ص: ۴۲)

جب شیخ کا مکان دور ہو یا اس کی طرف جانے کا ارادہ ہو تو صرف شیخ کی زیارت کی نیت سے نکلے۔ حضرت امام شعرانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ شیخ علی الخواص رحمۃ اللہ علیہ مجھے میرے مقصد سفر اور زیارت کا لحاظ کرتے ہوئے تلقین فرماتے۔ اگر میں صرف آپ کی زیارت کے لیے حاضر آتا تو مجھ کو مکمل طور سے ضروریات کی تلقین فرماتے، اگر مشترک چیزوں کے لیے نکلتا تو نصف تلقین فرماتے اور دوسری چیزوں کے واسطے نکلتا اور اتفاقاً آپ کے پاس حاضر ہوتا تو ایک بال کے برابر بھی کسی چیز کی تلقین نہ فرماتے اور فرمایا کرتے تھے کہ ہر چیز میں عدل مطلوب ہے تو جس شخص نے اس سے زیادہ لوگوں کو تلقین کی جس کے لیے وہ آئے ہیں یا اس میں کمی کی تو وہ مقام عدل سے خارج ہوجائے گا۔

امام شعرانی فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں آپ کے پاس کچھ شہوت کی چیزیں کھا کر حاضر آیا، جب کہ میں نے کھانے کے بعد اللہ تعالیٰ سے عہد کرلیا کہ اب میں کبھی شہوت کی چیز نہیں کھاؤں گا، تو جیسے ہی آپ کی پہلی نظر مجھ پر پڑی فرمایا: جس پر شہوت کا غلبہ ہو وہ گدھا ہے اور جو شہوت پر غلبہ پالے وہ مومن ہے اور جوان سب سے غائب ہوجائے وہ عارف ہے۔

حضرت عبدالوہاب شعرانی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

میرے ساتھ ایک مرتبہ ایسا واقعہ پیش آیا کہ جس کو کرنا میرے لیے مناسب نہ تھا لیکن بھول سے کرلیا پس جب میری نگاہ شیخ علی خواص علیہ الرحمہ پر پڑی تو میں نے دیکھا کہ آپ نے فرمایا لوگ جو پاتے ہیں وہی کر بیٹھتے ہیں۔ پھر میں آپ کی بارگاہ میں معافی کا خواست گار رہا۔ شیخ

علی خواص علیہ الرحمہ نے فرمایا جناب میں تمہاری کتاب اور تمہاری تختی ہوں۔

(مدارج السالکین، ص: ۴۶/۴۷)

اس کے بعد امام شعرانی علیہ الرحمہ و الرضوان نے چوتھا باب **آداب المریدین مع اخوانه** کے عنوان سے باندھا ہے جس میں آپ نے مرید کے اپنے پیر بھائیوں اور دوسرے اصحاب کے تعلق سے خاص حقوق بیان کیے ہیں اور ان کے ضروری حقوق کو حقوق اللہ سمجھ کر بجا لانے کی تاکید کی ہے تاکہ اس میں کچھ بھی فروگذاشت نہ ہوسکے۔

اس کے بعد امام شعرانی علیہ الرحمہ نے **مقالات الاشیاخ فی صفات المریدین الصادقین** کے تعلق سے کبار مشائخ عظام کے اقوال نقل فرمائے ہیں۔ ان کے ذریعے آپ نے مرید صادق کو اس بات کی تنبیہ کی ہے کہ ہر وہ چیز جس سے مرید صادق کی آتش ارادت میں کمزوری پائی جائے اس سے دور رہے اور ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے مطلوب و مقصود سے غافل نہ رہے۔ ہر پل، ہر لحظہ رضائے الٰہی کو پیش نظر رکھ کر شیخ کے روحانی فیضان کے ذریعے اپنے آپ کو جملہ نفسانی و حیوانی اور شیطانی عوائق سے بچانے کی کوشش کرے تاکہ **اکملتُ لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دیناً** کے تاج زریں سے نوازا جائے۔ **ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء و اللہ واسع علیم و ھو المستعان و علیہ التکلان۔**

○○○

مرید صادق اور مرید کاذب کی شناخت

"الکوکب الشاھق فی الفرق بین المرید الصادق و غیر الصادق" کے حوالے سے

مریدی صرف رسم بیعت و زبانی ارادت کا نام نہیں بلکہ تمام تر آزادی واختیار کے باوجود شعوری طور پر اپنی تمام خواہشات وارادے کو شیخ کے حکم کے مقابلے میں ختم کر دینے کا نام ہے۔ یہ بلاشبہ ایک مشکل ترین کام ہے، جو سب کے بس کا روگ نہیں۔ یہاں نہ سہل پسندی کا گزر ہے نہ اطاعت کے بغیر عقیدت مندی گوارا، بلکہ دقت پسند طبیعتیں ہی عملی پیش رفت کے ذریعہ اس میدان میں سرخرو ہوتی ہیں۔ الا ماشاءاللہ۔ مرید صادق اور مرید کاذب کے اوصاف وخصائص کے تعلق سے جن چند معتبر و مستند محققین صوفیہ نے اپنے افکار وخیالات اور مشاہدات وتجربات بیان کیے ہیں، ان میں ایک اہم نام امام العرب والعجم عارف باللہ شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (۹۷۳ھ) کا بھی ہے، انھوں نے امت مسلمہ کے اندر بڑھتے اختلافات کو کم سے کم کرنے کے متعلق گراں قدر کام کیا، اس سلسلے میں "الطبقات الکبریٰ"، "الیواقیت والجواھر" اور "المیزان الکبریٰ الشعرانیۃ" کے نام خصوصیت کے ساتھ لیے جاسکتے ہیں، امام شعرانی نے سلوک وتصوف اور ان سے متعلق دیگر مسائل پر بھی کافی شرح وبسط سے لکھا اور اس طرح لکھا کہ کہیں کوئی پیچیدگی باقی نہ رہی بلکہ ہر گوشے کو آئینہ کر دیا۔

معرفت خداوندی کی حصول یابی کی شرائط میں پہلی شرط مرید ہونا ہے۔ جس طرح ہر شئے کے دو پہلو ہوتے ہیں اسی طرح مرید کے بھی دو پہلو ہوتے ہیں۔ پہلا مرید صادق، دوسرا مرید کاذب، اس سلسلے میں امام شعرانی کی ایک معرکہ آرا کتاب "الکوکب الشاھق فی الفرق بین المرید الصادق وغیر الصادق" ہے، جو جامعہ اسکندریہ مصر کے فلسفہ اسلامی کے استاذ ڈاکٹر حسن محمد شرقاوی کی تحقیق وتعلیق کے ساتھ ۱۹۹۱ء میں دارالمعارف قاہرہ مصر سے شائع ہوئی ہے،

اور یہی ایڈیشن اس وقت پیش نظر ہے۔ یہ کتاب ۲۴۸ رصفحات پر مشتمل ہے، ابتدائی ۳۰ر صفحات ایک مختصر مقدمہ اور پیش لفظ پر مشتمل ہیں اور اخیر کے ۶۰ رصفحات تعلیقات، اعلام اور فہارس کو محیط ہیں، جب کہ اصل کتاب ۳۱ رصفحہ سے شروع ہوکر ۱۸۸ رصفحہ پر ختم ہوجاتی ہے، ذیل کے سطور میں اصل کتاب کے مندرجات ومشمولات کا حاصل مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، واضح ہو کہ جملہ حوالہ جات اسی کتاب سے منقول ہیں۔

(۱) مرید صادق کے لیے تبحر علمی ضروری ہے

امام شعرانی نے مرید صادق اور مرید کاذب کا جو پہلا فرق بیان کیا ہے وہ ہے علوم شرعیہ میں قدرے تبحر، کیوں کہ معرفت خداوندی کا حصول بغیر حلال وحرام میں تمیز کیے ناممکن ہے بلکہ بعض صوفیہ نے شبہات سے دوری کو بھی اس راہ کے لیے لازمی امر قرار دیا ہے، جو بلاشبہ شرعی علوم حاصل کیے بغیر عادۃً محال ہے۔ امام شعرانی نے اپنی تائید میں شیخ احمد بن رفاعی کے اس قول کو پیش کیا ہے، کہ "جملہ عبادات میں بندہ جب تک اپنے نقص اور کمی کی معرفت حاصل نہیں کر لیتا تب تک وہ اس راہ میں قدم رکھنے کے لائق بھی نہیں ہوتا" (ص: ۳۳) انھوں نے اس قول کی باریکیوں کی بھی وضاحت کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ اپنے عیوب ونقائص کا علم نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے لوگ حرام وشبہات سے اجتناب نہیں کرتے جو سچی ارادت کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے۔ انھوں نے یہ نکتہ بھی پیش کیا ہے کہ سچی ارادت رکھنے والوں کے لیے صرف فرائض وواجبات اور منہیات ومحرمات کا علم ہی کافی نہیں بلکہ ان علوم کے تقاضوں پر سختی سے عامل ہونا بھی ضروری ہے۔ یہاں نہ خوشی وغمی کا کوئی امتیاز ہے نہ جلوت وخلوت کا۔ زندگی کے ہر حصے میں کتاب وسنت اور اجماع علمائے راسخین کے اصول پر کاربند ہونا لازمی ہے۔ ان کے الفاظ ہیں:

> "مرید کے لیے ضروری ہے کہ وہ ارادت وسلوک کے راستے میں قدم رکھنے سے پہلے علوم شرعیہ میں قدرے متبحر ہو چکا ہو، تاکہ شیخ اسے بجائے شرعی امور کے طریقت ومعرفت کی رہنمائی کر سکے" (ص: ۳۳)

اس کے بعد شیخ ابوالحسن شاذلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے:

> "جو شخص علوم شرعیہ میں اس حد تک متبحر نہ ہو کہ اپنے زمانے کے اکابر علما (ظواہر) کو مجلس مناظرہ میں واضح اور روشن دلیلوں کے ذریعہ خاموش کر سکے وہ ہماری (صوفیہ کی) صحبت اختیار نہ کرے" (ص: ۳۴)

پھر اس قول کی توضیح یوں کی کہ طریقت کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات سے ہے جو نہایت باریک مسئلہ ہے۔ ایسی صورت میں جو انسان شرعی احکام کا بھی علم نہ رکھتا ہو وہ ذات و

صفات باری تعالیٰ کی معرفت کہاں حاصل کر سکتا ہے۔

اور اگر کسی نے علم ظاہر کے بغیر علم باطنی کی طرف پیش قدمی کی تو گویا اس نے اپنے آپ کو زندیقیت وگمراہیت کے قعر میں ڈال دیا؛ کیوں کہ علم یقین کے بغیر اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات سے بحث کرنا بلاشبہہ گمراہیت کی طرف لے جاتا ہے۔

(۲) بے اتباع شریعت دعویٰ حقیقت زندیقی ہے

صوفیہ کی طرف خود کو منسوب کرنے والی ایک جماعت ایسی پیدا ہوئی جس نے اپنے آپ کو احکام شرعیہ کی پابندی سے آزاد تصور کیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ نعرہ بلند کیا کہ اتباع شریعت ان لوگوں پر لازم ہے جو ابھی تک درجۂ حقیقت کو نہیں پہنچ سکے ہیں اور ہم اصحاب حقیقت ہیں لہٰذا ہم پر اتباع شریعت ضروری نہیں کیوں کہ چھت پر پہنچنے کے لیے زینہ کی ضرورت ہوتی ہے چھت پر پہنچنے کے بعد نہیں۔ امام شعرانی ایسے لوگوں کو گمراہ، گمراہ گر اور شیطان کہتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جملہ مشائخ جن کا تعلق طریقت وحقیقت سے رہا ہے، کے شب وروز کتاب وسنت کے دائرے میں بسر ہوئے ہیں جیسے سیدی شیخ عبدالقادر جیلانی (غوث اعظم) سیدی شیخ احمد بن رفاعی، سیدی احمد بدوی، سیدی ابراہیم دسوقی وغیرہم حتیٰ کہ سیدی شیخ ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ جس نے شریعت کی بوتل میں خود کو مقید نہ رکھا اور اس پر حقیقت کی مہر نہ لگائی وہ مجھ سے نہیں اور ایسے شخص سے میں دنیا وآخرت دونوں جہاں میں بری ہوں اور سیدی احمد بن رفاعی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ اہل طریقت کا اس بات پر اجماع ہے کہ ہر وہ حقیقت جسے شریعت رد کردے زندقہ ہے اور سید الطائفہ ابوالقاسم جنید بغدادی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں کہ ہم اہل طریقت صوفیہ کا طریقہ کتاب وسنت کی مضبوط رسی سے بندھا ہوا ہے، تو جو شخص قرآن وحدیث کا فہم نہ رکھتا ہو ہمارے نزدیک ایسے شخص کو اپنا مقتدا، پیشوا اور رہنما بنانا کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے۔ لہٰذا اگر تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ ہوا پر اڑ رہا ہے تو اس وقت تک اس کی طرف توجہ ہی نہ کرو جب تک یہ نہ دیکھ لو کہ احکام اور اوامر ونواہی پر عمل کرنے میں اس کی حالت کیا رہتی ہے، اگر شریعت کے اوامر ونواہی کا سختی کے ساتھ پابند ہے تب تو ٹھیک ورنہ ایسا شخص درخور اعتبار ہے ہی نہیں۔ مزید یہ بھی فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنے بارے میں اہل اللہ سے ہونے کا دعویٰ کرتا ہے ایسے شخص سے عقل کی سلامتی کی صورت میں اگر شریعت کے ان احکام سے جن کا کرنا بہر حال ضروری ہے، ان میں کوئی بھی عمل چھوٹ جاتا ہے تو یقینی طور پر وہ اپنے دعوی میں جھوٹا ہے، بلکہ جو چوری بھی کرتا ہے اور زنا بھی وہ بھی ایسے جھوٹے شخص سے بدرجہا بہتر ہے کہ کم از کم خود

کو اہل اللہ سے ہونے کا دعویٰ تو نہیں کرتا۔ اور شیخ افضل الدین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہر وہ شخص جس نے اپنی گردن سے تکالیف شرعیہ کا قلادہ اتار دیا اس نے اپنے باطن کو کجی اور گمراہی سے ملا دیا، جان لو یہی لوگ جو شریعت کی پیروی کو چھوڑ کر وصول الی اللہ کا دعویٰ کرتے ہیں دین میں فتنہ پیدا کرتے ہیں اور یہی لوگ ملحد وزندیق ہیں۔ پس تم پر واجب ہے کہ ایسے لوگوں کی صحبت ومعیت سے خود کو دور رکھو؛ کیوں کہ ایسے لوگوں کے انفاس کی ظلمتیں مرید صادق کے قلوب کے لیے سم قاتل ہیں۔'' (۴۲_۳۹)

(۳) شیخ کے حکم کے بغیر مرید کچھ بھی نہ کرے

مرید صادق اپنے جملہ حرکات وسکنات میں اپنے شیخ کے حکم کا تابع ہوتا ہے، جب تک کہ شیخ کوئی حکم نہ دے وہ کچھ بھی نہیں کرتا اگرچہ امر مندوب ومستحب ہی کیوں نہ ہو مثلاً، ذکر واذکار اور نفلی عبادات وغیرہ۔ مزید وہ ہمیشہ اپنے خطرات و واردات کا محاسبہ کرتا رہتا ہے کہ کسی لمحہ لاشعوری میں بھی کوئی ایسا کام نہ ہو جائے جو منشاء شیخ یا تقاضائے ارادت کے خلاف ہو کیوں کہ شیخ کے اوامر پر جس طرح کاربند ہونا ضروری ہے اسی طرح ان کے نواہی پر بھی پابندی لازم ہے کہ شیخ اگر کسی فعل سے روک دے تو اس کے ایک ذرے کا صدور بھی اس سے متصور نہ ہو اور نہ کبھی اس کا نفس اس امر ممنوع کی طرف میلان کرے کہ کاش ان منہیات سے کسی کے کرنے کی اجازت ملتی۔ شعرانی کے لفظوں میں:

''شیخ اگر اپنے مریدوں میں سے کسی کو خانقاہ میں موجود فقرا کا کھانا کھانے کا حکم دے تو کھائے اور اگر اس سے منع کردے تو نہ کھائے خواہ چوری چھپے ہی ہو۔ اس معاملے میں خانقاہی فقرا پر وقف شدہ کھانا اور کسی کے ذریعہ نذر کیا گیا کھانا سب کا حکم ایک ہے۔ مزید اگر شیخ ان خانقاہی فقرا یا اور کسی دوسرے شخص کے ساتھ نشست وبرخواست سے منع فرمادے تو اب مرید ان کے ساتھ نہ تو اعلانیہ طور پر اٹھے بیٹھے نہ آنکھ بچا کر، اسی طرح اگر شیخ عبادات نافلہ مثلاً کھانے، سونے، نفلی طہارت اور نفلی نماز وغیرہ سے روک دے تو مرید پر واجب ہے کہ وہ ان افعال واعمال کی انجام پذیری سے خود کو باز رکھے اور کبھی اس امر کی جستجو بھی نہ کرے کہ کاش ان منہیات سے کسی امر کے کرنے کی اجازت ملتی۔'' (ص: ۵۴/۵۵)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''مرید کے لیے ہرگز یہ جائز نہیں ہے کہ وہ شیخ کی اجازت کے بغیر خطابت وموعظت اور درس وتدریس جیسا کوئی بھی فریضہ انجام دے'' (ص: ۸۷)

(۴) شیخ اول سے تکمیل نہ ہونے کی صورت میں شیخ ثانی اختیار کرنا ضروری ہے

شعرانی نے اپنے زمانے کے مریدی کادعوی کرنے والے لوگوں کی عام روش کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آج کل اکثر لوگ محض مرید ہونے کا دعوی کرتے ہیں جب کہ ان کی حالت ان کے صدق ارادت کی تکذیب کرتی ہے۔ مرید ہونے کا مطلب اللہ تعالی کی معرفت حاصل کرنا ہے جو بلاصحبت اختیار کیے محال عادی ہے اور بیعت کی متعدد قسمیں ہیں، مگر ان میں دو سب سے اہم ہیں۔ اول بیعت برکت، دوم بیعت ارادت، اگر کسی شیخ جامع شرائط سے بیعت ہونے کے بعد ان کی صحبت میں رہ کر تربیت حاصل کرنے کا موقع نہ ملا تو یہ بیعت برکت ہے اور اگر موقع ملا پھر صحبت وتربیت بھی پائی تب یہ بیعت بیعت ارادت ہے۔ بیعت برکت وتبرک کا دنیوی کوئی فائدہ نہیں، ہاں! آخرت میں وہ اتنا فائدہ ضرور دے گی کہ جب نجات کے لیے کوئی عمل کام نہ آئے گا تو وہ نجات کا سامان بن جائے گی، مگر یہ بھی صرف ان ہی لوگوں کے لیے ہے جو نیت حسن کے ساتھ بیعت ہوئے ہوں نہ کہ دنیوی اغراض فاسدہ کی نیت سے مثلاً اولاد، حصول رزق میں برکت اور دفع حرج وغیرہ کی نیت سے۔ ہاں اب اگر کوئی شخص دنیا ہی میں بیعت کا مقصد اصلی معرفت خداوندی حاصل کرنا چاہتا ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ کسی ایسے کامل ومکمل شیخ کے ہاتھ پر بیعت ارادت کرے جو فانی فی اللہ اور باقی باللہ ہو یعنی اپنے ارادہ واختیار سے فانی اور مشیت و مرضی الٰہی کے ساتھ باقی ہو پھر اپنے آپ کو شیخ ارادت کے حضور مردہ بدست غسال کی مانند سپرد کردے۔ اب اگر ایسا شیخ تکمیل سلوک سے پہلے وصال کر جائے یا کسی وجہ سے ان سے دور رہنا پڑے تو وجوبی طور پر کوئی دوسرا شیخ کامل تلاش کرے جس کی صحبت وتربیت میں رہنا ممکن ہو پھر اس شیخ کی صحبت وتربیت میں اپنے سلوک کی تکمیل کرے کیوں کہ مقصود خدا است نہ کہ شخصے۔ اب اگر کوئی مرید ایسا نہیں کرتا تو وہ یقیناً اپنی ارادت میں جھوٹا ہے۔ شعرانی کے الفاظ میں:

> "اگر تکمیل سلوک سے پہلے شیخ ارادت کا وصال ہوجائے تو مرید پر واجب ہے کہ دوسرا شیخ کامل تلاش کرے اور خود کو اس کے حضور سپرد کردے اور اس کی صحبت میں رہ کر اپنا تکملہ کرے نہ کہ مرید ہونے کا جھوٹا دعوی کرنے والوں کی طرح یہ بکتا پھرے کہ اب روئے زمین پر میرے شیخ جیسا کوئی بچا ہی نہیں جس کے ہاتھ پر بیعت کرکے اپنے سلوک کی تکمیل کروں کیوں کہ اس طرح کی لغو اور بیہودہ باتیں کرنا یہودیوں کا وطیرہ ہے۔ یہودیوں نے موسیٰ علیہ السلام کے وصال کے بعد صاف لفظوں میں کہا تھا کہ دنیا میں اب کوئی بھی موسیٰ علیہ السلام جیسی فضیلت کا حامل شخص بچا ہی نہیں یہاں تک کہ جب جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی جلوہ گری ہوئی جو ان سے درجوں بلند ہیں، اپنے گمان فاسد کی وجہ سے انہوں نے آپ کی رسالت کا انکار کردیا اور آپ پر ایمان نہ لا کر

> دنیا وآخرت ہر دو جہان میں اپنے دائمی نقصان کا سامان اکٹھا کرلیا" (ص: ۶۴)

(۵) عزت وشہرت اور جاہ منصب کی چاہ نہ کرے

امام شعرانی اپنے زمانے کے عام حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ مرید ہونے کے بعد انسان گناہوں سے کنارہ کشی اختیار کرکے نیکیوں میں مشغول ہوجاتا ہے۔ کثرت عبادات اور کثرت وظائف اس کا معمول بن جاتا ہے مگر نیت میں اخلاص کے باوجود تزکیہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ ساری چیزیں بندے کے قلوب میں حب جاہ اور حب منصب کی طلب تیز کردیتی ہیں اور انسان اپنے آپ کو بڑا نیکوکار اور صاحب تقویٰ تصور کرنے لگتا ہے۔ لوگوں پر اپنے بے جا پرہیزگاری کا رعب جما کر اپنی تعریف وتوصیف کے پھیروں میں پھنس جاتا ہے اور پھر اس کے دل میں تکبر، گھمنڈ وغیرہ اس طرح رچ بس جاتا ہے جس کا نکلنا تقریباً مشکل ہوجاتا ہے۔ پھر وہ جادۂ مستقیم سے ہٹ کر گمرہی کی طرف اندھا دھند چلا جاتا ہے۔ اگر کسی مرید کی ایسی حالت ہوجائے تو اس بلائے عظیم سے بچنے کے لیے اسے چاہیے کہ اپنے قیام کے لیے ایسی جگہ کا انتخاب کرے جہاں اسے عزت کی بجائے ذلت، شہرت کی بجائے گمنامی اور تعریف و توصیف کی بجائے تضلیل وتضحیک کا سامنا کرنا پڑے، مزید یہ کہ لوگوں کی طرف سے پہنچنے والی ان تکالیف پر غم وغصہ کی بجائے صبر وشکر کا مظاہرہ کرے تاکہ صدق ارادت کی دولت سے شرف یاب ہوسکے۔ ان کے الفاظ میں:

> "مریدوں میں سے کوئی بھی شخص ایسی جگہ قیام نہ کرے جہاں لوگ اس کے معتقد ہوں کیوں کہ ان کا عقیدت مندی کے ساتھ پیش آنا مرید کے لیے زہر قاتل ہے۔ ہاں ایسی جگہ ضرور سکونت اختیار کرے جہاں لوگ اس کے افعال واقوال پر اعتراض وانکار کریں تاکہ ان کے ذریعہ پہنچنے والے ان آزار پر غم وغصہ کی بجائے صبر وشکر کے ذریعہ مرید صادق کے درجے تک پہونچ سکے" (ص: ۱۰۲)

(۶) کسی مذہب کی مخالفت نہ کرے

امام شعرانی کا ماننا ہے کہ تمام ائمہ مجتہدین اور جملہ مذاہب فقہ برحق ہیں ان میں نہ کوئی خاطی ہے اور نہ کوئی گمراہ بلکہ سب کے سب مصیب اور جادۂ مستقیم پر گامزن ہیں کیوں کہ ان سارے مذاہب کا سرا عین شریعت مطہرہ سے جاملتا ہے۔ اور سب کا منبع وسرچشمہ قرآن وحدیث ہی ہے۔ لہٰذا ان میں سے کسی ایک کا بھی انکار بالواسطہ یا بلاواسطہ قرآن وحدیث کا انکار قرار پائے گا۔ ان کی اس تحریر کا مقصد وحید صرف یہی ہے کہ مسلک ومذہب کے نام پر جو اختلافات وانتشار بلکہ کفر والحاد کا بازار گرم ہے اس کا خاتمہ ہوسکے اور لوگ تمام تر فقہی اختلافات کے باوجود بنام مسلم ایک ساتھ شیر

وشکر ہوکر زندگی بسر کرسکیں اور مقصد شریعت بلکہ عین شریعت کی تبلیغ وتشہیر کرسکیں۔انہیں نقطۂ نظر کے تحت شعرانی ایک مرید کے لیے یہ واجب قرار دیتے ہیں کہ وہ ائمہ اسلام میں سے کسی کی بھی مخالفت نہ کرے بلکہ حتی المقدور سب کوایک ساتھ جمع کرنے کی کوشش کرے۔ان کے الفاظ میں :

''مرید پر واجب ہے کہ وہ ائمہ فقہ میں سے کسی کی مخالفت نہ کرے اور اپنی قدرت بھر کامل طو پر تمام مذہبی اختلافات کی رعایت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اور صرف اپنے مذہب کے طریقے پر ہی اکتفانہ کرے''(ص:۱۱۸)

(۷) شیخ کے اخلاق کواپنانا ہی شیخ سے سچی محبت ہے

مشاہدات وتجربات سے یہ امر بالکل واضح ہو چکا ہے کہ نام نہاد مریدین اپنے شیخ سے بے پناہ محبت کا اظہار کرتے ہیں اور یہ اظہار بھی صرف زبانی جمع خرچ کے طور پر ہوتا ہے جب کہ ان کی عام روش رافضیوں کی طرح ہوتی ہے کہ وہ اپنے امیر کی محبت کا صرف لسانی دعوہ کرتے ہیں اور عملی طور پر امیر کی باتیں ان کے سامنے کچھ وقعت نہیں رکھتیں۔ٹھیک اسی طرح مریدین زمانہ کا حال ہے کہ وہ صرف دعوئ محبت کے قائل ہیں جب کہ ان کا عمل نہ تو شیخ کے ارشادات واحکامات کے مطابق ہوتا ہے نہ ہی ان کے کسی طرز ادا سے اتباع شیخ کا رنگ جھلکتا ہے۔چنانچہ شعرانی کا نظریہ یہ ہے کہ ایک مرید کواس امر پر کمر بستہ ہوجانا چاہیے کہ وہ اپنے شیخ کے جملہ اخلاق حمیدہ مثلاً زہد، ورع، خشوع، قناعت،توکل،تفویض،تسلیم،صبر اوراس کے علاوہ دوسرے تمام سیر حسنہ کا بڑی گہرائی سے مشاہدہ کرے اوراسی سانچے میں اپنی زندگی کوڈھالنے کی کوشش کرے۔مگر صد افسوس کہ آج مریدی کا دعوی کرنے والے حضرات کی حالت اس کے بالکل برعکس ہے کہ وہ شیخ کے اخلاق و عادات اپنانے کواپنے لیے ضروری نہیں سمجھتے اور پھر شیخ کے گزر جانے کے بعد ان کے سارے اخلاق اس کی نظر میں محض حکایت بن کر رہ جاتے ہیں جن کی وجہ سے وہ یہ کہتا پھرتا ہے کہ ہمارے شیخ ایسے تھے،ایسا کہا کرتے تھے،ایسا کیا کرتے تھے۔اب جب کہ شیخ کا وصال ہوگیا اوراسے ان کے اخلاق سے آراستہ ہونے کی توفیق نہ ملی ،اگر کوئی اس سے کہتا ہے کہ کسی دوسرے شیخ کی صحبت اختیار کرلے شاید طریقت وحقیقت کی خو بو تجھ میں بھی آجائے تو وہ یہ کہہ کر اپنی شقاوت قلبی کا اظہار کرتا ہے کہ اب میرے شیخ کی طرح کوئی ہے ہی نہیں میں کس کی صحبت اختیار کروں! شعرانی کے الفاظ میں :

"ان یکون احدھم (من المریدین) کثیر النظر فی اخلاق شیخہ لیتاسی بما فیھا من زھدوورع وخشوع وقناعۃ وتفویض وتسلیم وصبر وغیر ذلک، و لایھمل اخلاق شیخہ، فلایتخلق منھا اذا مات شیخہ یصیر حکویا،یقول کان

شیخنا کذاوکان یفعل کذا،ویقول کذا،فیقول لہ ماذا اکتسبت من شیخک ولایجد نفسہ اکتسب شیئا وھذا الحال قد فشی فی غالب اصحاب مشایخ ھذا الزمان،ثم انہ مع عدم انتفاعہ بشیخہ الذی یزعم ان الزمان مابقی یخلف مثلہ یغش نفسہ ولاتصیر نفسہ تطاوعہ ان یتلمذ لاحد من لقیہ ان یشممہ شیئا من روائح الطریق"(ص:۱۳۳)

ترجمہ:بعض مریدین اپنے شیخ کے اخلاق کا بغور مطالعہ کرتے رہتے ہیں،تاکہ اپنے شیخ کے محاسن زہدوورع،خشوع وخضوع،صبر وقناعت اور تسلیم ورضا وغیرہ کواختیار کریں،پھر ابھی ان اخلاق سے خودکومزین نہیں کر پاتے کہ ان کے شیخ کا وصال ہوجاتا ہے،اب وہ افسانہ طرازی شروع کردیتے ہیں، ہمارے شیخ ایسے تھے، وہ یوں کرتے تھے، ایسے بیان کرتے تھے اور ویسے بیان کرتے تھے۔بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ اپنے شیخ سے تم نے کیا سیکھا؟ خود انہیں بھی احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے کچھ نہیں سیکھا ہے۔اس زمانے کے مشائخ کے اکثر مریدین میں یہ مرض عام ہو چکا ہے۔ایسے لوگ باوجود اس کے کہ اپنے شیخ سے کچھ حاصل کیے ہوئے نہیں ہوتے ،اس گمان میں کہ ان کے شیخ کی مثال اب زمانے میں نہیں رہی، وہ اپنے آپ کو دھوکہ دیتے رہتے ہیں، ان کا نفس کسی دوسرے شیخ کے سامنے زانوے ادب تہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا جو انہیں راہ طریقت کی خوشبو سے کچھ بھی آشنا کرے۔

(۸) شیخ کا بتایا طریقہ ہی افضل ہے

انسانی معاشرے میں جی رہے انسانوں میں صاحب عقل وفراست حضرات جب قوت ارادی کی دولت سے شرف یاب ہوجاتے ہیں تو وہ کسی بھی کام میں بذات خود حتمی رائے قائم کرتے ہیں اوراسی کے مطابق اپنی زندگی کی گاڑی آگے بڑھاتے ہیں مگر طریقت کی راہ اس قدر پرخار اور پرخطر ہے جہاں ذرہ برابر نفس وشیطان کی آویزش انسان کو بحر ضلالت میں غرقاب کردیتی ہے جس کی وجہ سے فوز وفلاح کے سارے دروازے اس پر بند ہوجاتے ہیں۔اسی لیے مشائخ نے مرید کے لیے ایک لازمی امر یہ بھی قرار دیا کہ وہ شیخ کے حکم وارشاد کو اپنے خواہش وارادہ پر فوقیت دے اور ہمہ دم شیخ کی اطاعت وفرماں برداری کواپنے اوپر لازم جانے ورنہ نتیجہ بہر حال نقصان دہ اور افسوس ناک ہوگا اور آج کل یہی کچھ ہوتا ہے کہ مرید کو اپنے شیخ کے حکم وارشاد میں اگر بظاہر تھوڑی دیر کے لیے نقصان یا غیر موافق بات سمجھ میں آتی ہے تو مرید اپنی مرضی کوشیخ کی مرضی پر ترجیح دیتا ہوا نظر آتا ہے۔اس طرح اپنے ہی شیخ کی مخالفت کر اپنی دنیا وآخرت

برباد کر بیٹھتا ہے۔ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام شعرانی رقم طراز ہیں:

''شیخ کی مرضی پر اپنی مرضی کو ترجیح دینے والا شخص اگر چہ شیخ کی صحبت میں بیسوں سال یا اس سے زائد سال گزار دے وہ کبھی بھی فوز وفلاح سے ہم کنار نہیں ہو سکتا، کیوں کہ وہ اپنے گمان میں شیخ کے بتائے ہوئے طریقے کو مفضول اور اپنی مرضی سے اپنی مشغولیت کو افضل گردانتا ہے۔'' (ص:۱۳۸)

(۹) خود کو سب سے بڑا گناہ گار تصور کرے

خیر وشر سے ماورا اس کمینی دنیا میں انسان جہاں برائیوں کا مرتکب ہوا وہیں اس کے اندر یہ برائی بھی در آئی کہ وہ لوگوں کے محاسن پر نگاہ رکھنے کی بجائے ہمہ دم ان کی برائیوں کی کھوج میں لگا رہتا ہے اور یہ برائی ایسا نہیں کہ صرف عوام اور مرید ہونے کا جھوٹا دعویٰ کرنے والوں ہی میں پائی جاتی ہے بلکہ موجودہ زمانہ کے اکثر مشائخ کہلانے والے حضرات بھی اس سے الگ نہیں۔ امام شعرانی فرماتے ہیں کہ یہ ایسی برائی ہے جو انسانوں کے اندر سے جذبۂ خیر خواہی کو فنا کر کے بغض، حسد، غیبت اور چغل خوری جیسی مہلک عادتوں کا رسیہ بنا دیتی ہے۔ لہٰذا مرید صادق کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ لوگوں کے عیوب پر نگاہ رکھنے کی بجائے ان کے محاسن پر نگاہ رکھے اور اگر کسی کا عیب ہی دیکھنا ہو تو اپنا عیب دیکھے۔ ان کے الفاظ ہیں:

''مرید کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی دو آنکھیں ہوں۔ ایک آنکھ سے وہ لوگوں کے حسن اخلاق اور حسن کردار کا نظارہ کرے اور دوسری آنکھ سے اپنے عیوب ونقائص کا مشاہدہ کرے تا کہ نیکیوں کو اپنا سکے اور برائیوں سے خود کو دور کر سکے۔'' (ص:۱۴۸)

دوسری جگہ رقمطراز ہیں:

''مزید مرید پر یہ بھی واجب ہے کہ وہ اس امت کے کسی بھی فرد کا کوئی بھی گناہ نہ دیکھے بلکہ ہمہ دم اپنے گناہ پر نظر رکھے اور خود کو دائمی اور ابدی طور پر سب سے بڑا فاسق شمار کرے۔ ہاں! ہاں! اپنے آپ کو مکمل طور سے لوگوں کے عیوب ونقائص دیکھنے کے معاملے میں اندھا کر لے اور یاد رکھے کہ جس وقت اس نے خود کو اصحاب دین وتقویٰ کے برابر گردانا یقینی طور پر وہ اسی وقت بے ادب قرار دیا گیا اور ارادت حقیقی سے منحرف ہو گیا، کیوں کہ راہ ارادت میں نیک وبد جملہ مخلوقات سے خود کو کمتر تسلیم کرنا واجب ہے۔'' (ص:۱۲۱)

(۱۰) شیخ کے افعال پر اعتراض نہ کرے

مشائخ اہل طریقت کا یہ طرۂ امتیاز رہا ہے کہ وہ اپنے در پر آنے والوں میں سے کسی کو بھی خواہ وہ فقرا ومساکین ہوں، یا رؤسا واغنیا ہوں، خالی ہاتھ لوٹنے نہیں دیتے۔ کچھ نہ کچھ

انعام انھیں ضرور دیا جاتا ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر کوئی چیز موجود نہیں تو کم از کم کھانا یا پانی سے تو ضرور خاطر تواضع کی جاتی ہے۔ مگر کبھی کبھی کسی مصلحت یا حکمت کے تحت ان سے ایسے افعال بھی سرزد ہوتے ہیں جو بظاہر وقتی طور پر ایک سادہ انسان انہیں سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے، مثلاً شیخ کے دسترخوان پر غریب اور مالدار ہر طرح کے لوگ خوان نعمت سے لطف اندوز ہوتے رہے اور شیخ کے انعامات کے سزاوار دونوں رہیں مگر اب شیخ نے اپنی توجہ غریبوں سے ہٹا کر صرف مالداروں پر مرکوز کر دی اور غریبوں پر اپنے دسترخوان سے کھانے پر پابندی عائد کر دی۔ ان سے ملنا بند کر دیا۔ انھیں انعام واکرام سے نوازنے کا سلسلہ منقطع کر دیا اور عنایات خسروانہ کے یہ سارے باب صرف اور صرف مالداروں پر وا کر دیے۔ ان تمام حالات میں شیطان نے مرید کے قلب میں وسوسہ ڈالا اور اعتراض علی الشیخ پر ابھارا۔ نادان اپنی کم فہمی کی وجہ سے شیخ پر اعتراض کر بیٹھا کہ بالواسطہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض ہے، کیوں کہ شیخ مظہر ذات الٰہی ہوتا ہے۔ اس کے جملہ افعال صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی مرضی سے انجام پذیر ہوتے ہیں۔ اس طرح انسان اپنے شیخ پر اعتراض کر کے دونوں جہاں میں اپنے لیے گھاٹے کا سودا جمع کر لیتا ہے۔ امام شعرانی لکھتے ہیں:

''مریدوں میں سے کوئی اگر شیخ کو دیکھے کہ وہ مالداروں کو مال دیتے ہیں، کپڑا اعطا کرتے ہیں اور انھیں کھانا کھلاتے ہیں جب کہ انھیں کے دربار میں فقرا ننگے، بھوکے اور بے روزگار ہیں تو ہرگز ہرگز اپنے شیخ پر اعتراض نہ کرے اور نہ اپنے دل ہی میں یہ خیال لائے کہ اگر مالداروں کے بجائے شیخ غریبوں کو نوازتے تو زیادہ بہتر ہوتا، کیوں کہ یہ اعتراض حد درجہ جہالت پر مبنی ہے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ کتنے مالدار ایسے ہیں جن کے پاس ہزاروں لاکھوں دارہم ودنانیر موجود ہیں پھر بھی اللہ تعالیٰ انھیں مزید مالدار بناتا رہتا ہے جب کہ اسی کے حضور ایک مسکین اور ایک فقیر محض درہم کے ایک ٹکڑے کے لیے ہزار ہا بار گریہ وزاری کرتا ہے اور وہ اسے ایک ذرہ بھی نہیں دیتا۔ اور یہ مشائخ تو اللہ تعالیٰ ہی کے اخلاق کے مظہر ہیں۔ پھر ان پر اعتراض کیوں؟ ہاں! یہاں ایک بات یہ بھی یاد رکھو کہ اگر شیخ کسی فقیر کو کچھ نہیں دیتا تو یہ بخل کی وجہ سے نہیں بلکہ وہ کسی حکمت کے پیش نظر ایسا کرتا ہے اور وہی اس حکمت کو اچھی طرح جانتا ہے۔ جی ہاں! وہ من جانب اللہ اس امر پر مامور ہوتا ہے کہ کسے دے اور کسے نہ دے۔ لہٰذا مرید کے اوپر واجب ہے کہ وہ شیخ کے ان افعال پر ہرگز ہرگز کوئی اعتراض نہ کرے، نہ حالاً نہ قالاً یعنی نہ زبان سے، نہ قلب سے اور نہ ہی اپنی کسی تحریر سے۔'' (ص:۱۵۸)

(۱۱) حضوری قلب لازم ہے

صوفیہ نے قلوب کی جلا کے لیے ذکر الٰہی کو لازم قرار دیا ہے یہ اور بات ہے کہ بعض ذکر جہری کو لازم قرار دیتے ہیں بعض ذکر سری کو۔ بہرصورت ہمہ دم ماسوی اللہ کے ذکر سے قلب کو خالی کر کے اس کے ذکر میں مشغول ومنہمک رکھنا ایک مرید صادق کے لیے بہت ضروری ہے کہ بندہ اگر ذکر الٰہی سے صرف نظر کرتے ہوئے ذکر دنیا میں مشغول ہوگا تو کسی بھی صورت میں وہ معرفت خداوندی حاصل نہیں کرسکتا، کیوں کہ اس کے عرفان کے لیے ضروری ہے کہ بندے کا دل ماسوی اللہ سے یکسر خالی ہوگیا ہو۔ چنانچہ امام شعرانی اپنا تجربہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک مرتبہ کی بات ہے مجھے حد درجہ خشوع کے ساتھ اپنے رب کی بارگاہ میں حضوری کا شرف حاصل ہوا، جسے میرا رب ہی خوب جانتا ہے کہ اچانک میرے دل میں ایک شخص کے تعلق سے جسے میں ناپسند کرتا تھا بدخواہی پیدا ہوئی، اس بدخواہی کے پیدا ہوتے ہی میرے دل کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حضوری سے محروم کردیا گیا پھر میرے اور میرے رب کی بارگاہ میں حضوری کے درمیان ایک حجاب ڈال دیا گیا۔ اس کے بعد میں نے مسلسل توبہ واستغفار کے ذریعہ اس کیفیت حضوری کو واپس لانے کی کوشش کی لیکن عاجز رہا اور مدتوں خشوع کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہونے پر قادر نہ ہوسکا۔'' (ص:۱۶۹)

اللہ اکبر! امام شعرانی جیسے متقی اور مقبول بارگاہ الٰہی شخص کی یہ کیفیت اور ہم ایسے گناہ گار وخطا کار کہ ایک لمحہ کے لیے بھی حاضری کی سعادت نہیں ملتی، اس کے باوجود خود کو کامل درجے کا متقی اور صالح شمار کرتے نہیں شرماتے۔ کاش! ہم اپنے احوال وکوائف پر غور کرتے۔

(۱۲) اپنے جملہ احوال اپنے شیخ سے بیان کرے

انسان جب تک درجۂ کمال تک نہیں پہنچ جاتا تب تک اس پر نفس وشیطان کا غلبہ رہتا ہے جس کی وجہ سے اس سے گناہ کا صدور بڑی حد تک ممکن ہوتا ہے۔ خدانہ خواستہ اگر کسی بندے سے گناہ کا ارتکاب ہوجاتا ہے تو اسے چھپانا وہ اپنا فطری فریضہ تصور کرتا ہے اور اپنی پوری کوشش اس امر پر صرف کردیتا ہے کہ اس سے سرزد ہوئے گناہ پر کوئی بھی کسی بھی صورت سے آگاہ نہ ہوسکے۔ بسا اوقات تو انسان اپنے اچھے برے تمام خطرات کو لوگوں کی نگاہ سے اوجھل رکھنے کی کوشش کرتا ہے مگر راہ طریقت میں مرید کے اوپر ضروری ہے کہ وہ اپنے تمام حرکات وسکنات پر خواہ ان کا صدور دن کے اجالے میں ہو یا رات کے اندھیرے میں اپنے شیخ کو مطلع کرتا رہے، کیوں کہ مرید کی حیثیت اس راہ میں مریض کی ہے اور شیخ کی حیثیت طبیب حاذق کی۔ امام شعرانی فرماتے ہیں:

''مرید کو چاہیے کہ وہ اپنے امراض باطنیہ کو شیخ کے حضور پیش کرنے میں حیا نہ کرے،

کیوں کہ مرید مریض ہوتا ہے اور شیخ اس کا طبیب روحانی۔ اور اگر مریض نے اپنی بیماری کو ڈاکٹر سے پوشیدہ رکھا تو اس کی یہ بیماری یہاں تک دراز ہوجائے گی کہ اس کا علاج ناممکن ہوکر رہ جائے گا۔ (اس لیے مرید اپنے امراض روحانیہ پر شیخ کو ضرور مطلع کرے کیوں کہ) شیخ کے شرائط سے یہ امر بعید نہیں ہے کہ وہ مرید کے گناہوں پر بھی مطلع ہو، بلکہ یہ تو مرید پر واجب ہے کہ وہ اپنے عیوب ونقائص شیخ کے حضور بیان کرے اور ایسا کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ شیخ کی بارگاہ لوگوں کے قبائح اور نقائص دیکھنے سے پاک ہوتی ہے۔ یہ بارگاہ تو بعینہ اولیا، ملائکہ اور انبیا کی بارگاہ ہوتی ہے اور نقائص میں سے کوئی بھی ایسا نقص جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب بنے ان کی بارگاہوں میں نہیں ہوتا بلکہ ان کی بارگاہ تو سراپا قربتوں، بخششوں اور نوازشوں کی بارگاہ ہے برعکس شیطانی بارگاہوں کے کہ وہ محض اللہ تعالیٰ سے دوری، اس کی ناراضگی نیز اپنی حرماں نصیبی کے اڈے ہیں اور ہم نے اپنی اس کتاب الکوکب الشاہق میں صاف لفظوں میں یہ بیان کردیا کہ ایک مرید پر یہ امر واجب ہے کہ وہ اپنے معمولات یومیہ کو ہر دن شیخ کے حضور پیش کرے تاکہ اگر اس دن اس سے کوئی گناہ سرزد ہوجائے تو شیخ اس کی شفاعت اور مغفرت کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرے یا خود اسی کو طلب مغفرت کا کوئی مناسب طریقہ بتائے اور ایسا کرنا ایک مرید کے لیے یوں بھی ضروری ہے کہ مرید اور شیخ کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوتا کہ شیخ اس دنیا میں مرید کے خطرات کے محاسبے کے سلسلے میں بالواسطہ اللہ تعالیٰ کا نائب ہوتا ہے اور شیخ اپنے مریدوں کے محاسبے پر صرف اس لیے مامور ہوتا ہے تاکہ آخرت میں مرید کے حساب وکتاب میں تخفیف ہوسکے۔'' (ص:۱۷۷-۱۷۸)

(۱۳) مرید صادق کون؟

دسویں صدی ہجری ہی میں امام شعرانی نے اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ میرے زمانے میں (یعنی دسویں صدی ہجری) سچے مشائخ وصوفیہ کی اس قدر قلت ہوگئی ہے کہ اب یہ خال خال ہی نظر آتے ہیں اور زیادہ تر صلاح وتقویٰ کا جو کام ان قدیم مشائخ حقہ نے انجام دیا تھا وہ آج کل کے نام نہاد ڈھونگی حضرات کے یہاں معدوم ہوگیا ہے، کیوں کہ ان کا مقصود پارسائی کی آڑ میں صرف اور صرف دنیا حاصل کرنا ہے۔ یہ حضرات بذات خود تو تقویٰ وطہارت سے کوسوں دور ہوتے ہیں، ان کی مجلس اور ان کی گفتگو بھی ان سے بالکلیہ خالی ہوتی ہے۔

مزید وہ اس بات کا بھی برملا اظہار فرماتے ہیں کہ طلب مردار میں یہ نام نہاد ڈھونگی اتنے آگے نکل گئے کہ وہ تمام اخلاق وکردار جس کے حاملین پہلے کے عام مریدین ہوا کرتے تھے، یہ اس

سے بھی نیچے اتر گئے، بلکہ اخلاق کا زیور ہی اپنی گردنوں سے اتار دیا۔ اخلاقی قدروں کی یہ گراوٹ ان کے لیے نہایت کرب انگیز تھی، لہٰذا ان دم توڑتی ہوئی اخلاقی قدروں کو دوبارہ بحال کرنے کے لیے انھوں نے یہ کتاب تصنیف فرمائی۔ چنانچہ مقصد تحریر بیان کرتے ہوئے خود لکھتے ہیں:

''میں نے جن اخلاق کا تذکرہ اپنے اس کتاب ''الکوکب الشاہق'' میں کیا ہے وہ آج نہایت اجنبی قسم کے اخلاق ہو کر رہ گئے ہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ جن اخلاق حمیدہ سے قدیم زمانے کے عام مریدین آراستہ تھے آج کے مشائخ بھی ان سے مکمل خالی نظر آتے ہیں۔ چنانچہ میری سیکڑوں ایسے مشائخ سے ملاقات رہی ہے جو اخلاق حسنہ کے جامع تھے۔ میں نے اپنے حصے بھر ان سے خوب استفادہ بھی کیا مگر ان کے مریدین میں مجھے کوئی بھی فرد ایسا نظر نہ آیا جو اپنے شیخ کے اخلاق کا پیکر ہو۔ ان تمام حالات کو دیکھنے کے بعد یہ خوف مجھے لاحق ہوا کہ کہیں ان کے اور ان کے مریدین کے گزر جانے کے بعد یہ اخلاق ہی دنیا سے نہ اٹھ جائیں۔ لہٰذا میں نے آنے والے لوگوں کے لیے ان کے اخلاق کو جمع کر دیا۔ جو ان اخلاق کا جامع ہوگا وہی مرید صادق کہلانے کا حقدار ہوگا ورنہ اس کا شمار مرید کاذب میں ہوگا۔ یاد رکھو میری یہ کتاب اس زمانے کے ناحق صلاح وتقویٰ کا دعوی کرنے والے لوگوں کی گردن کاٹنے والی تلوار کی مانند ہے، کیوں کہ یہ ان جھوٹے مدعیوں کو صلاح وتقویٰ اور بیعت وارادت کے راستے سے ایسے ہی نکال باہر کرتی ہے جس طرح سانپ اپنے کیچوے سے باہر نکل جاتا ہے۔'' (ص:۳۱-۳۲)

اللہ تعالی ہمیں مشائخ کاملین کی تلاش اور پھر ان کی اطاعت اور ان سے ارادت کا سچا جذبہ عطا فرمائے، ہمیں طلب دنیا سے دوری اور طلب مولیٰ سے سچی محبت عطا فرمائے۔ خال خال ہی سہی مگر ایسے نفوس قدسیہ آج بھی موجود ہیں جو آپنی آستینوں میں ید بیضا لیے بیٹھے ہیں، فقط ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم انہیں اخلاص کے ساتھ تلاش کریں اور سچی ارادت کے ساتھ ان کی بارگاہ ناز میں زانوے ادب تہ کریں۔

○○○

اصغر علی مصباحی

الطبقات الکبریٰ: ایک مطالعہ

امام شعرانی رضی اللہ عنہ جہاں بہت بڑے محدث، مفسر، فقیہ اور متکلم تھے وہیں ایک زبردست صوفی بھی تھے یہی وجہ ہے کہ آپ کی جملہ تصنیفات میں خواہ وہ کتنا ہی خشک موضوع سے متعلق کیوں نہ ہو تصوف کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ سر دست آپ کی کتاب **الطبقات** میرے پیش نظر ہے۔ یہ کتاب طبقات اولیا پر لکھی گئی ایک منفرد کتاب ہے۔ اس کتاب میں مشائخ صوفیہ کی حیات کا سرسری جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں چوں کہ اصل زور تعلیمات صوفیہ پر ہے اسی لیے کسی بھی ولی یا صوفی کی سوانح میں ان کی ذاتی یا شخصی زندگی کے مختصر تذکرہ کے بعد اس شیخ کی تعلیمات اور معرفت وطریقت میں ان کے تجربات و نکات کا ذکر اس کثرت سے کیا گیا ہے کہ اس کا نام ملفوظات اولیا رکھ دیا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ آپ نے اس کتاب میں صحابہ اور تابعین سے لے کر نویں صدی اور دسویں کے نصف تک کے ان نمایاں اولیائے کرام کی حیات و خدمات اور ان کے ملفوظات وارشادات مرتب کرنے کی کوشش کی ہے جن سے راہ سلوک میں رہنمائی ملتی ہے اور جو طالبین وسالکین کے لیے ایک نمونہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آپ نے سب سے پہلے بطور تمہید چند ضروری باتیں تحریر فرمائی ہیں جن میں تالیف طبقات کا مقصد اس کا اسلوب اور کچھ مفید باتیں بیان کی ہیں پھر آپ نے ایک وقیع اور معلومات افزا مقدمہ سپرد قلم فرمایا ہے چنانچہ آپ تمہید میں اس کتاب کے مرتب کرنے کا مقصد بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ اس کتاب کی ترتیب سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ تصوف میں صوفیۂ کرام کے احوال ومقامات کے آداب کی سمجھ آجائے اس کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں ہے لہٰذا میں نے اس کتاب میں صوفیہ کے صرف وہی نفیس کلمات ذکر کیے ہیں جو ائمہ شریعہ کی کتابوں میں نہ تھے اسی طرح صوفیہ کی ابتدائی حالات میں سے صرف اسی کو بیان کیا ہے جو مرید وسالکین کے لیے ایک نمونہ ہو سکے جیسے بھوک کی شدت، شب بیداری، گمنامی اور عدم شہرت طلبی یا پھر ایسی باتوں کا ذکر کیا جن سے شریعت کی تعظیم وتکریم ہوتی ہو تا کہ ان لوگوں کا رد ہو جائے

جو یہ سمجھتے ہیں کہ صوفیہ نے جب راہ تصوف اختیار کیا تو احکام شریعت کو پس پشت ڈال دیا۔ جیسا کہ ابن
جوزی نے امام غزالی بلکہ حضرت جنید بغدادی اور حضرت شبلی رضی اللہ عنھم کے بارے میں تصریح کی کہ ان
لوگوں نے شریعت کی بساط ہی لپیٹ دی کاش یہ لوگ تصوف اختیار نہ کرتے۔ (ص:٦)

امام شعرانی کی مذکورہ باتوں سے یہ واضح ہو گیا کہ ان کی اس تالیف سے صوفیہ کے ان احوال
ومقامات کا بیان مقصود تھا جن سے راہ سلوک طے کرنے میں روشنی ملتی ہے اس لحاظ سے یہ کتاب اپنے
مقصد میں پوری اترتی ہے۔ ورنہ بحیثیت طبقات یہ اپنے موضوع سے میل نہیں کھاتی کیوں کہ اس
میں بعض اولیائے کرام کی نہ تاریخ ولادت ووفات اور نہ ان کی زندگی کے حالات وواقعات مذکور ہیں
بلکہ صرف ان کے ملفوظات وارشادات پر اکتفا کیا گیا ہے۔ آپ تمہید میں اس کتاب کا اسلوب بیان
کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کتاب کو لکھنے میں میں نے محدثین کا طریقہ اختیار کیا ہے اور جو
حکایات واقوال مستند کتاب سے لی ہے جیسے رسالۂ قشیریہ اور حلیۃ الاولیا وغیرہ اور اس کے راوی نے
ان کی سند کی توثیق کی ہو تو میں اس کو صیغۂ جزم سے بیان کرتا ہوں اسی طرح مشائخ نے اگر کسی بات
کو بطور دلیل ذکر کیا ہو تو میں اس کو صیغۂ تمریض سے بیان کرتا ہوں اور ان دونوں صورتوں کے علاوہ
صیغۂ تمریض جیسے یروی، قیل وغیرہ سے بیان کرتا ہوں۔ اسی طرح وہ کتابیں جو سادات صوفیہ کے
نزدیک مستند ہیں، اگر ان سے کوئی واقعہ ذکر کرتا ہوں تو صیغۂ جزم سے ذکر کرتا ہوں۔ پھر آپ نے
تمہید کے اخیر میں ایک بہت ہی اہم اور قابل غور بات لکھی ہے وہ یہ ہے کہ اس کتاب کو پڑھنے کے
وقت جس کے اندر سلوک الی اللہ کا جذبہ پیدا نہ ہو تو وہ اور مردہ شخص برابر ہے۔ (ص:٧)

اس کے بعد آپ نے مقدمہ لکھا ہے اس میں آپ نے بڑے شد ومد کے ساتھ اس بات کو ثابت
کرنے کی کوشش کی ہے کہ صوفیہ کرام کا راستہ کتاب وسنت سے مستحکم اور انبیا واصفیا کے اخلاق پر مبنی ہے،
ان کا راستہ مذموم اس وقت ہوتا جب کتاب وسنت اور اجماع امت کے صریح خلاف ہوتا حالانکہ ایسا
نہیں ہے، ہاں! ان کے پاس ایک خاص ادراک اور فہم ہوتی ہے جو کسی بھی مرد مومن کو عطا کی جاسکتی ہے
لہٰذا جس کا ان پر شرح صدر ہو عمل کرے اور جس کا نہ ہو عمل نہ کرے۔ (ص:٩) مزید صوفیہ کے راستے کے
درست ہونے کی وکالت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر صوفیہ کا راستہ غلط ہوتا تو اپنے وقت کے بڑے
بڑے علما ان کی باتوں پر اعتماد نہیں کرتے جب کہ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل جیسے مجتہدین حضرت
شیبان راعی پر اعتماد نہیں کرتے تھے اور حضرت امام احمد بن حنبل، حضرت ابوحمزہ بغدادی صوفی سے عقیدت
رکھتے تھے۔ آپ ان کے پاس دقیق مسائل بھیجتے اور ان سے کہتے ماتقول فی ھذا یا صوفی (ص:١٠)

آپ نے اس مقدمہ میں اس عہد کے بہت سے سلگتے ہوئے مسائل پر گفتگو فرمائی ہے اور اس کو
دلائل وبراہین سے مزین کرنے کی کوشش کی ہے جو آج بھی ہمارے لیے قابل غور ہے اس میں سے ایک

مسئلہ تکفیر کا بھی ہے جو اس وقت بھی ایک حساس مسئلہ تھا۔ اس حوالے سے آپ لکھتے ہیں کہ شیخ الاسلام تقی
الدین سبکی رحمہ اللہ سے غالی، بدعتی، اہل ہوس اور ذات باری تعالی کے تعلق سے بے جا گفتگو کرنے والے
کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا اے سائل! یاد رکھو جس کے دل میں خوف خدا اور اس کی
خشیت ہوگی اس پر کلمہ لا الہ الا اللہ کہنے والے کی تکفیر بہت ہی گراں ہے کیوں کہ راہ تکفیر پر خار اور بہت ہی
خطرناک وادی ہے کیوں کہ جس نے بھی کسی معین شخص کی تکفیر کی تو گویا اس نے اس بات کی خبر دی کہ وہ ابد
الآباد تک جہنم میں رہے گا اور دنیا میں اس کا خون مباح یعنی اس کو قتل کرنا جائز، اس کا مال غیر محفوظ وہ کسی مسلمہ
سے نکاح نہیں کر سکتا اور نہ اس کی زندگی میں اور نہ مرنے کے بعد اسلامی احکامات لاگو ہو سکتے ہیں اور غلطی
سے ہزار خون معاف کر دینا زیادہ آسان ہے بنسبت اس کے کہ بغیر غلطی کے کسی مسلم انسان کا ایک سنگ ہی
بھر خون بہایا جائے۔ پھر آپ اخیر میں فرماتے ہیں کہ تکفیر کا حکم صرف اسی کے لیے ہے جو صراحتاً کفر کرے
اور اس کو بطور دین اختیار کر لے اور شہادتین کا بالکلیہ انکار کر دے اور دین سے بالکلیہ نکل جائے (ص:٢٢)

پھر اس کے بعد امام شعرانی نے کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے پہلا وہ جس میں نویں صدی
تک کے اولیائے کرام کی سوانح مذکور ہے اور دوسرا وہ جس میں دسویں صدی کے نصف تک کے ستاسی
اولیائے کرام کے تذکرے شامل ہیں آپ نے کتاب کا آغاز اجلہ صحابہ جیسے خلفائے راشدین کے
تذکرے سے کیا ہے پھر اس کے بعد تابعین تبع تابعین اور دیگر مشائخ عظام کی حیات وخدمات قلم بند
کیے ہیں۔ چوں کہ آپ نے اس کتاب میں اولیاء کرام کی سوانح اور ان کے حالات زندگی سے زیادہ ان
کے ارشادات وملفوظات کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے اس لیے ہم چند مشائخ کے ملفوظات نقل کر رہے
ہیں۔ حضور غوث پاک رضی اللہ عنہ اپنے مریدین سے فرمایا کرتے تھے: کتاب وسنت کی پیری کرو،
بدعت سے بچو، اطاعت بجالاؤ، روگردانی مت کرو، صبر سے کام لو، بے صبری مت کرو، ثابت قدم رہو،
متفرق مت ہو جاؤ، آس لگائے رہو، ناامید مت ہو جاؤ، ذکر الٰہی پر جمے رہو منتشر مت ہو جاؤ، گناہوں
کے کیچڑ سے نکلو اس میں لت پت مت رہو اور اپنے مولی کے چوکھٹ سر نیاز جمائے رکھو (ص:١٨٥)

آپ فرمایا کرتے تھے جو آخرت کا طالب ہو اس پر دنیا سے بے نیازی لازم ہے اور جو
طالب مولیٰ ہے اس پر آخرت سے بھی بے نیازی واجب ہے اور جس شخص کا دل دنیا کی خواہش یا
اس کی لذتوں میں سے کسی لذت کی طلب میں لگا ہوا ہے جیسے کھانا، پہننا، نکاح کرنا یا کسی عہدہ کی
خواہش رکھنا، یا اس فن میں باریک بینی سے کام لینا جو حدود فرائض سے باہر ہو جیسے آج کل روایت
حدیث اور روایت سبعہ کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت اور جیسے نحو وصرف، لغت اور فصاحت و
بلاغت تو وہ شخص آخرت کا طالب نہیں بلکہ وہ دنیا کا طلبگار اور اپنے نفس کا پیروکار ہے (ص:١٨٩)

حضرت ذوالنون مصری علمائے سوء کے متعلق فرماتے ہیں آج عبادت گزار، زاہد اور قاری

پر اس بات کا غلبہ ہوگیا ہے کہ وہ گناہوں کو حقیر سمجھنے لگے ہیں اور پیٹ، شرم گاہ کی شہوت کی تکمیل میں اس قدر پھنسے ہیں کہ اپنے عیوب دیکھنے سے محجوب ہو گئے ہیں چنانچہ وہ ہلاک ہوئے اور انہیں اس کا شعور تک نہیں ہے، حرام کھا رہے ہیں اور حلال کی کمائی کو چھوڑ رہے ہیں اور عمل کے بجائے صرف علم پر خوش ہیں انہیں اس بات سے حیا آتی ہے کہ وہ نامعلوم مسئلہ میں **لا اعلم** کہیں۔ یہ لوگ دنیا کے بندے ہیں علمائے شریعت نہیں ہیں اگر وہ شریعت کے علما ہوتے تو شریعت انہیں ان قبائح سے روک دیتی۔ اگر دست سوال دراز کرتے تو اپنے سوال میں اصرار کرتے اور ان سے اگر کچھ مانگا جاتا تو وہ بخل کرتے۔ یہ بھیڑیے ہیں جنہوں نے لباس پہن رکھا ہے، اللہ کے گھروں کو جو اس کے یاد کرنے کی جگہ ہے، جدل و جدال، قیل و قال اور فضولیات کی جگہ بنا رکھا ہے۔ اپنے علم کو جال بنا لیا ہے جس سے دنیا کا شکار کرتے رہتے ہیں لہٰذا تم ان کی ہم نشینی سے بچو۔ (ص ۱۰۳)

آپ عالموں سے فرمایا کرتے تھے کہ میں نے لوگوں کو دیکھا ہے کہ جب بھی ان میں سے کسی کے علم میں اضافہ ہوتا تو وہ اسی قدر دنیا سے بے رغبت اور متنفر ہوتا اور آج تم میں سے جب کسی کے علم میں اضافہ ہوتا ہے تو وہ اسی قدر دنیا کی محبت اور اس کی طلب میں گرفتار ہوتا ہے۔ میں نے ان لوگوں کو دیکھا کہ وہ لوگ علم کی تحصیل میں اپنے مال خرچ کیا کرتے تھے اور آج تم لوگ مال کی تحصیل میں اپنے علم کو خرچ کر رہے ہو۔ (ص: ۱۰۲) حضرت سری سقطی رضی اللہ عنہ جو حضرت جنید بغدادی رضی اللہ عنہ کے ماموں اور استاذ ہیں آپ فرماتے ہیں دنیا علما کے لیے ایک بہت بڑا زہریلا سانپ ہے اور عبادت گزاروں اور قاریوں کے لیے بہت بڑی جادوگرنی ہے ان کے ساتھ یوں کھیلتی ہے جیسے کہ بچہ گیند کے ساتھ کھیلتا ہے آپ فرماتے تھے کہ دو چیزیں ایسی ہیں جو بندے کو اللہ سے دور کرتی ہیں پہلی چیز فرائض کو ضائع کر کے نوافل ادا کرنا اور بغیر خلوص دل کے محض اعضاء جوارح سے عمل کرنا آپ روتے تھے اور فرماتے تھے کہ صالحین کا راستہ بہت مشکل راستہ ہے، اس پر چلنے والے بہت کم ہیں۔ اب تو لوگوں نے شریعت پر عمل کرنا بھی ترک کر دیا ہے بلکہ اس کی طرف رغبت رکھنے والے بھی کم رہ گئے ہیں۔ حق کو چھوڑ دیا گیا ہے آج ہر باطل پرست شخص حکمت کی باتیں کرتا ہے جب کہ وہ بالکلیہ عمل صالح سے خالی اور عاری ہوتا ہے رخصت کو پھیلا رکھا ہے ،تاویلات کا دروازہ کھولے ہوا ہے جس کی وجہ سے نافرمان لوگ عذر خواہ ہوں گے۔ (ص: ۱۰۸)

حضرت سیدی علی خواص رضی اللہ عنہ جو حضرت امام شعرانی کے شیخ ہیں امام شعرانی آپ کے تعلق سے لکھتے ہیں کہ آپ امی تھے، لکھتے پڑھتے نہ تھے اور قرآن و حدیث کے معانی اس طرح بیان کرتے تھے کے علما حیران رہ جاتے چنانچہ آپ عالم کی تعریف یہ بیان کرتے ہیں کہ میرے نزدیک عالم تو صرف وہ ہے جس کا علم نقل و صدر سے مستفاد نہ ہو بایں طور کہ وہ خضری المقام ہو (یعنی اسے علم لدنی حاصل ہو) اور اس کے علاوہ تو وہ بس دوسروں کے علم کی حکایت کرنے والا ہے لہٰذا اس

سے اس کا اجر ملے گا جو دوسرے کے علم کو اٹھانے والا ہو لیکن اسے عالم کا اجر نہ ملے گا اللہ محسنین کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ آپ فرماتے ہیں کہ جو شخص یقینی طور پر علم میں اپنا مرتبہ دیکھنا چاہے اس کو چاہیے کہ ہر وہ بات جو اس کے حافظے میں ہے اس کو وہ اس کے قائل تک پہنچا دے پھر اس کے بعد دیکھے کہ اس کا علم کتنا بچتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے پاس بہت تھوڑا علم بچے گا جس کی وجہ سے اسے عالم نہیں کہا جائے گا۔ پھر آپ فرماتے ہیں کہ ہمارے یہاں کوئی اس وقت تک اہل طریقت سے شمار نہیں کیا جاتا جب تک وہ شریعت مطہرہ کے مجمل، مفصل، ناسخ، منسوخ، خاص و عام کا عالم نہ ہو۔ اگر ان میں سے کسی ایک سے بھی ناواقف رہا تو وہ رجال اللہ کے درجے سے گر جاتا ہے میں نے عرض کیا کہ اس زمانے کے اکثر رہنما رجال اللہ کے درجے سے گرے ہوئے ہیں تو آپ نے فرمایا ہاں! یہ لوگ دین کے بعض امور کی طرف رہنمائی کرنے والے ہیں کامل رہنما تو وہ ہیں کہ اگر روئے زمین پر وہ تنہا رہ جائیں پھر بھی وہ تمام لوگوں کے لیے ان کے علمی مطالبات پورا کر سکتے ہیں۔ (ص: ۳/ ۴۹۲)

شیخ ابوبکر بن محمد بن علی بن جعفر کتانی سے پوچھا گیا کہ عارف کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ جو اس کے (اللہ تعالیٰ کے) اوامر میں اس کی موافقت کرے اور اپنے کسی بھی احوال میں اس کی مخالفت نہ کرے اور اس کے ولیوں کی محبت کی وجہ سے اس کے نزدیک محبوب ہو اور پلک جھپکنے کے برابر بھی اس کے ذکر سے کاہلی نہ کرے وہ عارف ہے۔ آپ فرماتے تھے کہ بدن سے اس دنیا میں مشغول رہو مگر دل کو آخرت میں لگائے رکھو۔ آپ فرماتے تھے کہ شہرت شیطان کا لگام ہے جس نے لگام شیطان کو پکڑا وہ اس کے پاس رہے گا۔ آپ سے اس سنت کے بارے میں دریافت کیا گیا جس میں کسی اہل علم کا اختلاف نہ ہو تو آپ نے فرمایا دنیا سے بے رغبتی، سخاوت اور مخلوق کی خیر خواہی۔ (ص: ۱۵۷) شیخ منصور بطائحی فرماتے ہیں کہ جس نے دنیا کو پہچان لیا وہ اس سے بے رغبت ہوا اور جس نے اللہ کو پہچانا وہ اس کی رضا کو ہر چیز پر مقدم رکھا اور جس نے اپنے نفس کو نہیں پہچانا وہ بہت بڑے دھوکے میں ہے آپ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کسی نے بندے کو کسی ایسی چیز میں مبتلا کر کے نہ آزمایا جو غفلت اور سستی سے زیادہ سخت ہو۔ اور جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت فرماتا ہے تو اس کو غفلت اور نیند سے بچاتا ہے۔ (ص: ۱۹۱) اس طرح کے بے شمار پند و نصائح اور حکمت کی باتیں بکھری ہوئی ہیں جن کو اس کتاب کے مطالعہ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ میں نے یہ ساری باتیں دار الکتب العلمیۃ سے طبع شدہ طبقات سے لی ہے اس پر عبد الغنی محمد علی فاسی نے حروف تہجی کے اعتبار سے اس میں شامل سارے اولیائے کرام کے اسما کی فہرست بنا دی ہے جس سے ہر ایک کے بارے میں معلومات حاصل کرنا آسان ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کے مطالعے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

○○○

مکتوبات

مفتی محمد عبیدالرحمن رشیدی (صاحب سجادہ: آستانہ عالیہ رشیدیہ، جون پور، یوپی)

خدا کرے آپ بخیر ہوں۔ ''الاحسان'' کا چوتھا شمارہ پڑھنے کو، ملا گزشتہ تیسرے شمارہ میں جو میرا انٹرویو آپ نے شائع فرمایا، اس پر عالی جناب ڈاکٹر سید علیم اشرف صاحب کا تبصرہ جو صفحہ: ۱۸۹ پر ہے، مطالعہ میں آیا، سید صاحب موصوف نے میرے ذکر کردہ قواعد نحویہ پر جو کلام فرمایا ہے، اس کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ فرماتے ہیں:

''**ھذہ الحروف الخمسة تنصب المضارع**''میں منشا خلجان سمجھ میں نہیں آیا، شاید یہاں بجائے **تنصب الاسم** کے **تنصب المضارع** غلطی سے لکھ گیا ہوگا۔''

آگے فرماتے ہیں:

''یہاں خمسہ کے بجائے **الستة** ہونا چاہیے، کیوں کہ اسم کو نصب دینے والے حروف (حروف مشبہ بالفعل) چھ ہیں پانچ نہیں۔''

کاش! اس کے لکھنے سے پہلے ''**شرح مأة عامل**'' کو پیش نظر رکھتے تو بہتر ہوتا، یہ عبارت ''**النوع الرابع**'' کے تحت پانچ حروف ندا کے بارے میں ہے کہ اگر یہ دوسرے اسم کی طرف مضاف ہوں تو اسم کو نصب دیں گے۔

پھر فرماتے ہیں:

''چوں کہ خمسہ حروف کی صفت ہے، لہٰذا وہ موصوف یعنی حروف کے بعد ہی ہوگی، اس لیے کہ صفت موصوف کے تابع ہوتی ہے۔''

جب کہ علامہ سید غلام جیلانی میرٹھی اپنی مایۂ ناز کتاب ''**البشیر الکامل**'' میں اس ترکیب کو غلط قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

''ھا'' حروف تنبیہ مبنی بر سکون ''ذہ'' اسم اشارہ برائے مؤنث غائب مبنی بر سکون موصوف ''**الحروف**'' صفت اول (**الخمسة**) صفت دوم تا برائے تذکیر اور یہ **الحروف** کی صفت نہیں کہ صفت کی صفت نہیں آتی، موصوف اپنی دونوں صفت سے مل کر مبتدا الخ''

لہٰذا (**الحروف**) تنہا ھذہ کی صفت ہے نہ کہ **الخمسہ** سے مل کر جیسا کہ انھوں نے فرمایا، اسی طرح تا برائے تذکیر کا صاف انکار کرتے ہوئے یہ فرماتے ہیں:

''عربی زبان میں کوئی تا تذکیر کے لیے نہیں ہوتی۔''

جب کہ صاحب **البشیر الکامل** نے تا برائے تذکیر کا ذکر فرمایا، علاوہ ازیں شرح جامی میں بھی تا برائے تذکیر کا ذکر ہے، اسباب منع صرف کے بیان میں جہاں وزن فعل کا ذکر آیا ہے، وہاں علامہ جامی کافیہ کی عبارت **غیر قابل للتاء** کے ذیل میں فرماتے ہیں:

"و لو قال غیر قابل للتاء قیاساً و بالاعتبار الذی امتنع من الصرف لاجلہ لم یرد علیہ اربع اذا اسمّی بہ فان لحوق التاء بہ للتذکیر فلا یکون قیاساً۔"

آپ ان امور مذکورہ کا ذکر ان سے کر دیجئے گا، میرا مقصد بحث ومباحثہ نہیں بلکہ قواعد نحویہ کی صحیح تفہیم وتشریح ہے اور غلط فہمی کا ازالہ بھی۔ فقط

مفتی محمد مطیع الرحمٰن رضوی (جامعہ نوریہ، شام پور، رائے گنج، اتر دیناج پور، بنگال، ۷۳۳۱۲)

کسی اہم اور عالمی پیمانہ پہ صدیوں سے متنازع موضوع پر سیر حاصل بحث کے لئے فرصت اور سکون کے جن لمحات کی ضرورت ہے، وہ مجھے عرصہ سے میسر نہیں۔ یہاں دسیوں محاذ ہیں جن پر تنہا مجھے کام کرنا پڑ رہا ہے اور عمر کے ساتھ ساتھ امراض کا یہ عالم ہے کہ بظاہر دواؤں کے سہارے ہی زندگی گزر رہی ہے۔ پھر بھی حکم کے مطابق اس تعلق سے اپنے نظریہ کو اجمالی طور پر ٹوٹے پھوٹے الفاظ کا جامہ پہنا کے بھیج رہا ہوں۔ پسند آئے تو شامل کرلیں ورنہ مجھے شکوہ نہیں ہوگا۔ والسلام!

پروفیسر حسین الحق (گیا، بہار)

مدتیں گزریں، ایک مرتبہ عزیزی عینین علی حق دہلی سے آئے تھے تو اپنے ساتھ آپ کی خانقاہ سے نکلنے والا رسالہ "الاحسان" لائے تھے۔

صوفیوں اور خانقاہوں سے تصوف کے متعلق ایسا علمی، سنجیدہ اور مدلل مکالمہ سننے کو کان ترس گئے ہیں اور پڑھنے کو آنکھیں بے چین رہتی ہیں۔ مجھے پتہ نہیں، رسالہ نکل رہا ہے یا نہیں۔ ابھی رفعت رضا صاحب سے باتیں ہوئیں تو معلوم ہوا کہ رسالہ نکل رہا ہے، الحمدللہ!

ایک مختصر سا مضمون بھیج رہا ہوں پسند آئے تو مطلع فرمادیجئے گا۔ احسان ہوگا۔

پروفیسر فاروق احمد صدیقی (سابق صدر شعبہ، بہار یونی ورسٹی، مظفر پور)

خالص تصوف کے موضوع پر مجلہ "الاحسان" الہ آباد بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی کی حیثیت رکھتا ہے۔ میرے علم واطلاع کے مطابق اردو میں پہلی مرتبہ اتنا ضخیم اور وقیع مجلہ اشاعت پذیر ہوا ہے۔ تصوف برائے شعر گفتن خوب است۔ یہ تو کم وبیش ہر دور میں عمل ہوتا رہتا ہے، لیکن اس کو عملی طور پر برتنے کی مثالیں خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ تصوف کی تعریف اور تعارف کے تعلق سے بہت ساری فلسفیانہ موشگافیاں کی گئی ہیں، لیکن میرے نزدیک تصوف کا صحیح اسلامی تصور یہ ہے کہ وہ تزکیہ نفس اور صفائے باطن کا نام ہے۔ انسانی ہمدردی، رواداری، سیرچشمی اور خلق ومروت اس کے مختلف مظاہر وآثار ہیں۔ تصوف کی اس تعریف سے کون صحیح الفکر انسان انکار کرسکتا ہے؟

موجودہ دور الحاد ومادیت پرستی میں ہماری ذہنی، قلبی اور روحانی تسکین وطمانیت کی

ضمانت، تصوف کے علاوہ اور کوئی دوسرا نظریہ حیات یا نظام فکر نہیں دے سکتا۔ رسالہ الاحسان کے اجرا کے پس منظر میں یہ محرکات وعوامل بھی ضرور کارفرما رہے ہوں گے۔ اس کے کئی شمارے اب تک منظر عام پر آچکے ہیں۔ ہر شمارہ دستاویزی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس کو قدر اول کے قلم کاروں اور مصنفین کا تعاون حاصل ہے۔ اس کے جملہ مضامین ومشتملات اپنی گرانمایگی کا احساس دلاتے ہیں۔

خدا کرے ہماری موجودہ اور آئندہ نسلیں اس کی قدر وقیمت کا صحیح ادراک واحاطہ کرنے کا حوصلہ اپنے اندر پیدا کریں اور اپنی عملی زندگی میں انھیں برتنے کی کوشش کریں۔

مفتی محمد انفاس الحسن چشتی (صدر المدرسین: جامعہ صمدیہ، پھپھوند شریف، ضلع اوریا، یوپی)

تصوف ہر دور میں انسانیت کی ضرورت رہی ہے۔ اسلام وسنیت کے فروغ واحیا میں تصوف اور صوفیہ کرام کا بڑا کلیدی کردار رہا ہے، اس لیے آج کے پُرآشوب ماحول میں بھٹکتی انسانیت کو تصوف کے قریب کرنا وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔ تصوف کے تعلق سے پھیلی ہوئی بدگمانیاں دور کرنا علما اور اہل سنت کی خانقاہوں کا فرض منصبی ہے۔ مسرت کی بات ہے کہ مجلہ الاحسان تصوف کی صحیح تعبیر وتشریح میں ہمہ تن کوشاں ہے۔ سنجیدہ اور علمی انداز میں تصوف کے مسائل کی توضیح 'الاحسان' کا امتیاز ہے، الاحسان کے شماروں کی زیارت کا شرف حاصل ہوا، مجلہ کے مدیر، مرتبین، معاونین، ارباب قلم تصوف کے موضوع پر اس قدر علمی وتحقیقی مجلّے کی اشاعت پر تبریک وتحسین کے مستحق ہیں۔

میں اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ وہ اپنے حبیب کے صدقہ وطفیل ہمیں اور ساری امت مسلمہ کو حق وصداقت کا داعی وامین بنائے، آمین بجاہ حبیبہ سید المرسلین۔

سید ضیاء الدین رحمانی (جدہ، سعودی عرب)

اللہ کرے مزاج گرامی مع جمیع متعلقین ہم دوش صحت وعافیت ہو۔ الاحسان کا چوتھا شمارہ بدست مخدومی داعی اسلام عارف ربانی حضرت شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ شاہ محمدی صفوی دامت برکاتہم، مکۃ المکرمہ میں ملا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اب یہ مجلہ شش ماہی کر دیا گیا ہے۔ اس طرح اب لمبے انتظار کی زحمت نہیں اٹھانی پڑے گی۔ آپ کا تحریر کردہ ابتدائیہ بہت پسند آیا۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

دیگر مضامین بھی بہت اچھے ہیں۔ خصوصاً سیادت پناہی حضرت ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی مدظلہ کا مضمون "اہل تصوف کا مجاہدانہ کردار، ساؤتھ افریقہ کے تناظر میں" بہت پسند آیا۔

مولانا طفیل احمد مصباحی، مدیر ماہنامہ اشرفیہ مبارک پور کا مقالہ: "تصوف شاہ عبدالعزیز

محدث دہلوی کی نظر میں'' بقول آپ کے شایان شمارہ ہے۔حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ان اہم شخصیات میں ہیں جنہوں نے حضرت امام ربانی مجدد و منور الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات اور آپ کے افکار و آرا کا بہترین دفاع کیا ہے، لیکن فاضل گرامی مولانا طفیل احمد مصباحی نے اپنے اس مضمون میں یہ لکھ کر ''حضرت مجدد الف ثانی شیخ سرہندی وحدت الوجود کے بالمقابل وحدت الشہود کے قائل تھے اور مسئلہ وحدت الوجود کی پرزور تردید کرتے تھے۔'' الاحسان کے ہزاروں قارئین کو گم راہ کیا ہے۔محقق عصر حضرت علامہ ابوالحسن زید فاروقی مجددی رحمۃ اللہ علیہ نے جامعہ کالج (جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) کی بزم ادب کی درخواست پر ۸ مارچ ۱۹۷۵ء کو ان کے جلسے میں حضرت امام ربانی مجدد و منور الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح حیات اور کارناموں پر ایک مبسوط اور فاضلانہ مقالہ پڑھا تھا۔بقول حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی '' آپ کا مقالہ جہاں محققانہ تھا، حضرت مجدد الف ثانی کی تعلیمات اور آپ کے افکار و آرا کا بے باک ترجمان بھی تھا۔'' حضرت شاہ ابوالخیر اکاڈمی، شاہ ابوالخیر مارگ دہلی نے اس مقالے کو شائع کر دیا ہے۔میں اس مقالے کے اقتباسات سے حضرت مجدد الف ثانی کے صحیح مسلک و مشرب کو پیش کرتا ہوں۔

محقق اہل سنت حضرت شاہ ابوالحسن زید فاروقی مجددی رحمۃ اللہ علیہ فاضل ازہر و صاحب سجادہ درگاہ حضرت شاہ ابوالخیر دہلی کی ذات محتاج تعارف نہیں۔ماہر رضویات ڈاکٹر محمد مسعود احمد نقش بندی مجددی نے حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی کے حوالے سے ''جہان امام ربانی'' کی شکل میں ایک تحقیقی شاہ کار تیار فرما کر جماعت اہل سنت پر عظیم احسان فرمایا ہے۔پروفیسر صاحب کے وصال کے بعد اب یہ کام ان کے صاحب زادے اور جانشین جناب ابوالسرور محمد مسرور احمد کی نگرانی میں جاری و ساری ہے۔میری نظر سے ''جہان امام ربانی'' کی گیارہ جلدیں گزری ہیں۔ ''جہان امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رضی اللہ عنہ'' اقلیم سوم کا انتساب محقق اہل سنت حضرت شاہ ابوالحسن زید فاروقی مجددی علیہ الرحمہ کے نام کیا ہے۔میں یہ صفحہ بھی بطور حوالہ کے اس عریضہ کے ساتھ خدمت سامی میں بھیج رہا ہوں۔فاضل مرتبین اس انتساب میں رقم طراز ہیں:

''☆ جو خاندان مجددیہ کا چشم و چراغ تھے ☆ جو علم و فضل اور تحقیق میں یگانہ تھے ☆ خانقاہ نشینوں میں علم و فضل میں ان کے معاصرین میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا ☆ جن کی خانقاہ عرب و عجم کی مرجع رہی ☆ جو حق گو اور بے باک تھے ☆ جو سادگی میں لاجواب اور ریا سے پاک تھے ☆ جن کی تصانیف علم و دانش کے چراغ ہیں ☆ جنہوں نے مفتی اعظم شاہ محمد مظہر اللہ کی نماز جنازہ کی امامت کی۔''

میری نظر میں یہ حضرت شاہ زید رحمۃ اللہ علیہ کا اختصار کے ساتھ بہترین تعارف ہے۔اس پر اکتفا کرتے ہوئے میں نے تعارفی نوٹ نہیں لکھا ہے۔اب حضرت والا کی تحریر سے

حضرت مجدد الف ثانی کا صحیح مسلک و مشرب پیش کرتا ہوں:

''مخدوما! اس فقیر کا مشرب خوردسالی سے اہل توحید کا مسلک رہا ہے۔فقیر کے والد کا مشرب بہ ظاہر اسی پر تھا۔مع حصول نگرانی بہ جانب مرتبۂ بے کیفی، مشہور ہے کہ فقیہ کا بیٹا فقیہ، فقیر کو از روئے علم اسی مشرب سے حِظِّ وافر اور لذّتِ عظیم حاصل تھی اور حضرت خواجہ سے بیعت ہونے کے بعد توحید کے اسرار کا انکشاف مجھ پر ہوا۔مجھ پر ان تمام حقائق کا انکشاف ہوا جن کو شیخ اکبر نے فصوص میں بیان کیا ہے، بلکہ وہ اَسرار بھی ظاہر ہوئے جن کو شیخ اکبر خاتم الوقت سے مخصوص سمجھتے ہیں۔'' (مکتوب،۲۱، دفتر اول)

اور اس مسئلے میں حضرت مجدد نے خواجہ جمال الدین حسینی کو لکھا ہے:

''مسئلۂ وحدتِ وجود میں کسی کی مخالفت سے مجھ کو اندیشہ نہیں، اندیشہ اس وقت ہوتا کہ مجھ کو اپنے کشف میں کچھ تذبذب ہوتا۔جب کہ نورِ فجر کی طرح وضاحت کے ساتھ مجھ پر حقیقت واضح ہو چکی ہے تو پھر تذبذب کس بنا پر۔اس مسئلے کا تعلق اگر اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کی تصدیق و تنزیہ سے نہ ہوتا ہو تو میں ہرگز اپنے کشوفات کا اظہار نہ کرتا اور حضرات مشائخ کے علوم کے خلاف ایک لفظ بھی زبان پر نہ لاتا۔میں ان حضرات کے اَنبارِ دولت کا ایک ادنیٰ رِیزہ گیر اور ان کے خوان انعامات کا ایک کمترین خوشہ چیں ہوں۔'' (مکتوب:۴۲، دفتر دوم)

اور آپ نے شیخ عبدالعزیز جونپوری کو مفصل مکتوب ارسال کیا ہے۔آپ نے پہلے شیخ اکبر کا مسلک بیان کیا ہے اور پھر اپنا۔آپ نے شیخ اکبر کی جلالتِ قدر کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''شیخ برہانِ مقتدمانِ ایں طائفہ حجتِ متأخرانِ ایشاں گشتہ۔''

اور پھر آپ نے لکھا ہے:

''شیخ پر جتنا کشف ہوا اس کا بیان انھوں نے کیا اور اب مجھ پر جو کشف ہوا ہے اس کا اظہار میں کرتا ہوں۔''

آپ نے خواجہ جمال الدین حسینی کے خط میں شیخ اکبر سے اپنے اختلافات کرنے اور علمائے ظاہر کے اختلاف کرنے کا بیان اس طرح کیا ہے:

''مشائخ سے علما کا اختلاف از رَاہِ نظر و استدلال ہے اور میرا اختلاف از راہ کشف و شہود ہے۔علما ان امور کے قبح کے قائل ہیں اور میں بہ شرط عُبُورِ اِن کے حُسن کا قائل ہوں۔'' (مکتوب اول، دفتر دوم)

آپ نے ملا ہاشم کو اپنا سلوک طے کرنے کا حال لکھ کر تحریر کیا (۲۴) ہے:

''اے عزیز! اگر تفصیلِ احوال اور تبیینِ معارف کو ڈھیل دے دوں تو مضمون طویل ہوجائے گا اور اگر توحید کے معارف اور ظِلّیتِ اشیا کو بیان کردوں تو وہ لوگ جنھوں نے اپنی عمریں توحیدِ وجودی میں صرف کردی ہیں، محسوس کریں گے کہ انھوں نے اس دریائے بے کنار سے پورا ایک قطرہ بھی حاصل نہیں کیا ہے۔ تعجب ہے کہ وہی لوگ اس درویش کو اربابِ توحیدِ وجود سے شمار نہیں کرتے بلکہ توحیدِ وجود کے منکرین میں سے سمجھتے ہیں۔''

(مکتوب ۲۹، دفتر اول)

آپ نے قاضی محمد اسماعیل فرید آبادی کو لکھا (۲۵) ہے:

''اَنَا الْحَقُّ، سُبْحَانِیْ اور مَافِیْ جُبَّتِیْ اِلَّا اللّٰہُ، جیسے سُکر آمیز کلمات میں حُلُول ہے نہ اِتّحاد۔ ان کلمات کا صدور بہ اِعتبار ظہور کے ہوا ہے نہ بہ اعتبار وجہ کے، جیسا کہ عام طور پر سمجھا گیا ہے اور ان کلمات کو حلول اور اتحاد کا لباس پہنایا گیا ہے۔ متقدمین کے زمانے میں یہ مسئلہ پوری طرح واضح نہیں ہوا تھا۔ جو شخص مغلوب الاحوال ہوتا اس کی زبان پر ایسے کلمات آجاتے تھے اور وہ سُکر و مدہوشی کی وجہ سے ان الفاظ کے صدور کی وجہ معلوم نہیں کرسکتا تھا۔ جناب شیخ بزرگوار محی الدین ابن عربی کا دور آیا تو انھوں نے اس دقیق مسئلہ کو شرح و بسط سے بیان کیا۔ باوجود اس شرح و بسط کے ان کے مطالب کو ایک جماعت نہیں سمجھی اور اس نے شیخ اکبر کو مَطعون و مَلام کیا۔ جناب شیخ اکبر اپنی اکثر تحقیقات میں حق پر ہیں اور ان پر طعن کرنے والے صواب سے دور، جناب شیخ نے جو تحقیق اس مسئلے میں کی ہے اس سے ان کی بزرگی اور ان کے وفُورِ علم کا اندازہ لگانا چاہیے، نہ یہ کہ ان پر طعن اور ان کے کلام کو رد کیا جائے۔'' (مکتوب: ۲۹ دفتر سوم)

آپ نے شیخ عبدالعزیز جونپوری کو جو تفصیل تحریر کی ہے اس کا خلاصہ اس طرح پر ہے:

شیخ اکبر کہتے ہیں وجود صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اس کی صفات کا ظہور ہوا۔ اس کی صفات میں ایک صفت علم ہے۔ اللہ کے علم میں تمام اشیا کی تفصیل موجود ہے۔ اشیا کی تفصیل کا نام ''اعیان ثابتہ'' ہے۔ اعیان ثابتہ کا عکس باہر پڑا۔ اور ان کا ظہور ہوا۔ ممکنات کی جو شکلیں آرہی ہیں وہ موہومی ہیں، حقیقت میں صرف ایک ہی ذات وحدہ لاشریک لہ کی ہے اور چوں کہ یہ موہومی شکلیں خلاق عظیم جل جلالہ کی صفت ہے، اسی لیے ان میں اتقان ہے اور اتقان بھی ایسا ہے کہ ان پر ثواب و عقاب کا ظہور ہوتا ہے۔ شیخ اکبر نے جب تمام اشیا کو موہومی عکس قرار دے دیا ''ہمہ اوست'' کہنا ان کے لیے جائز ہوا۔

حضرت مجدد فرماتے ہیں:

وجود صرف اللہ کا ہی ہے۔ عالم میں جو کچھ نمود ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ صفات الٰہیہ کا پرتو اجزائے عدَمیہ پر پڑا۔ اور کائنات کا ظہور ہوا۔ ممکنات کی اصل اجزائے عدَمیہ ہیں اور ممکن کا وجود ظلّی اور عکسی وجود ہے، ممکن کا نقائص اپنی اصل سے اور کمالات اسما وصفات کی تجلیات سے ملے ہیں۔ اس طرح مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ نَّفْسِكَ کی تفسیر واضح ہوئی۔ یعنی جو بھلائی تم کو پہنچے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو برائی تم کو پہنچے وہ تمہارے نفس کی طرف سے ہے۔

حضرت مجدد نے شیخ اکبر کے مسلک کو پوری طرح سمجھا اور بیان کیا کہ وہ ممکن کے موہومی وجود کے قائل ہیں لہٰذا ان پر رد و انکار درست نہیں۔ آپ نے شیخ اکبر کو متقدمین کے لیے برہان اور متاخرین کے لیے حجت قرار دیا اور تحریر فرمایا ہے کہ وہ مقبولین کی جماعت میں نظر آتے ہیں۔ آپ نے بعض مسائل میں شیخ اکبر سے اختلاف کیا ہے اور آپ کا اختلاف از روئے کشف ہے۔ آپ نے کشف اور مسلک کو علمائے اعلام کے اندازِ بیان پر تحریر فرمایا ہے۔ مولانا حسن کشمیری نے آپ کو شیخ عبدالکبیر یمنی کا ایک قول لکھ دیا جو شریعت کی رو سے ٹھیک نہ تھا۔ آپ نے ان کو تحریر فرمایا:

''مخدومنا! اس قسم کی بات سننے کی تاب مجھ کو نہیں۔ میری فاروقی رگ بے اختیار حرکت کرنے لگتی ہے اور مجھ کو مہلت نہیں دیتی کہ میں تاویل یا توجیہ کی فکر کروں۔ ایسی بات کہنے والے شیخ کبیر یمنی ہوں یا شیخ اکبر شامی۔ مجھ کو محمد عربی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا کلام چاہیے۔ محی الدین ابن عربی۔ صدرالدین قونوی اور عبدالرزاق کاشی کا کلام میرے لیے حجت نہیں۔ مجھ کو نص چاہیے نہ فص (یعنی شریعت کا صریح حکم نہ فصوص کی عبارت) مجھ کو فتوحاتِ مَدَنیہ نے فتوحاتِ مکیہ سے بے نیاز کردیا ہے (یعنی ارشاد نبویہ نے ابن عربی کی کتاب فتوحاتِ مکیہ سے)۔'' (مکتوب: ۱۰۰، دفتر اول)

آپ نے اس ایمان پرور تحریر میں مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ کا مفہوم ادا کردیا ہے۔ نہ آپ نے کسی کو برا کہا ہے، نہ منقصت کی ہے۔ تعجب ہے کہ بعض افراد نے حضرت مجدد پر الزام لگایا ہے کہ وہ ابن عربی کو کافر کہتے ہیں۔ کہاں آپ کی مدح وستائش اور کہاں یہ اتہام۔''

قارئین وناظرین!" وحدۃ الوجود" اور" وحدۃ الشہود" کے تقابلی مطالعہ کے لیے بحر العلوم علامہ عبد العلی انصاری فرنگی محلی کے رسالہ" وحدۃ الوجود" جس کا فارسی سے اردو ترجمہ مرشدنا حضرت علامہ شاہ ابوالحسن زید فاروقی مجددی نے کیا ہے۔ اور اس موقر حواشی میں حضرت مجدد الف

ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریرات سے مسئلہ "وحدۃ الشہود" کو تفصیل سے پیش کیا ہے، کا مطالعہ کریں۔ حضرت مرشدنا کا یہ ترجمہ سب سے پہلے ندوۃ المصنفین دہلی نے شائع فرمایا تھا۔ میرے اس عریضہ کو اگر آپ پسند فرمائیں تو الاحسان کی عنقریب اشاعت میں شائع کر دیں۔ برادر عزیز کی خدمت سامی میں مودبانہ سلام عرض ہے۔ باقی حالات لائق شکر ہیں۔ زیادہ حد ادب

ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی (شعبۂ عربی، مولانا آزاد نیشنل یونی ورسٹی، حیدر آباد)

مکرمی! آپ کی ادارت میں تصوف پر اردو زبان میں نکلنے والا سب سے وقیع اور پر مغز کتابی سلسلہ مجلہ ''الاحسان'' کا چوتھا شمارہ پیش نظر ہے جو بہ قامت کہتر اور بہ قیمت بہتر کا شاندار نمونہ ہے۔ خدا کرے یہ سلسلہ یونہی دراز رہے اور یہ مجلہ مادیت، دہشت گردی اور تقشّف کے اس عہد میں ایک چشمۂ حیواں کی مانند فکر ونظر کی پیاس بجھاتا رہے ایمان کو حرکت وحرارت بخشتا رہے اور قلب کو نرمی اور گداز گی عطا کرتا رہے۔ اس کے مدیر 'جدیر بالتقدیر'، اس کے مرتبین، جو مجھے خونی رشتوں سے زیادہ عزیز ہیں اور ان کے معاونین سبھی ہمارے شکر وسپاس کے حق دار ہیں، جو اپنی شب وروز کی محنت کے ذریعے روحانیت کے اس گل دستے کی آرائش وزیبائش کرتے ہیں۔ ناسپاسی ہوگی اگر اس سپاس وامتنان میں ان کے مربی وہادی اور مرشد حادی داعی اسلام حضرت علام شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی دامت ظلالہ کا ذکر نہ کیا جائے جن کی نظر کیمیا اثر سے احسان شناسوں کی یہ محفل برپا ہے۔

احسان کے عربی شمارے کا خیر مقدم ہے، لیکن احسان اردو کے حجم میں کٹوتی پر اس کے قرا کا حق احتجاج محفوظ ہے۔ احسان زیادہ کا متقاضی ہے اور اگر خود احسان کے ساتھ احسان نہ ہو تو یہ قابل احتجاج امر ہے۔ مجلہ کا تازہ عدد ہر دو صوری اور معنوی اعتبار سے جاذب نظر اور پر اثر ہے۔ اس عدد کا انتساب تصوف کی ایک عظیم القدر شخصیت کے نام ہے جن کا ذکر بھی دلوں کو جلا بخشتا ہے۔

بقول شاعر:

کرّر علی حد یثھم یا حادی

فحد یثھم یجلو الفؤاد الصادی

حضرت مخدوم شاہ صفی کی ذات مجمع الصفات تصوف کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ مجلّے کی ابتدا ایک خوب صورت غزل سے ہوئی، البتہ عجز مطلع کا قافیہ صدر میں مستعمل قافیے اور غزل کے دوسرے قوافی سے الگ ہے، کیوں کہ یہ لفظ ساکن الوسط ہے اور یہ چیز عیوب قوافی میں شمار ہوتی ہے اور غالباً قافیہ کے اس عیب کو اسناد کہتے ہیں۔ غزل کا مقطع بھی قابل توجہ ہے۔

ابتدائیہ بے حد جامع ہے۔ ایک علمی مجلّے کا اداریہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ الاحسان کا ابتدائیہ

معارف (اعظم گڑھ) کے شذرات کی یاد دلاتا ہے جو معارف کی شناخت بن گئے ہیں۔ ابتدائیہ میں الاحسان کے عربی ورژن (اصدار) کی ضرورت اور اس کے اہداف ومقاصد کو بیان کیا گیا ہے جن سے انکار ممکن نہیں اور نہ عربی اصدار کے پشت پر مذکور داعی اسلام کے پیغام سے روگردانی ممکن ہے۔ اہل عرب میں اسلامیان ہند سے متعلق معلومات کی بے حد جستجو اور طلب ہے۔ یہ مجلہ نہ صرف اس طلب کی تکمیل کرے گا بلکہ عرب وہند کے درمیان ایک علمی وثقافتی پل کا کام بھی کرے گا۔ اس پیغام میں 'روحانیت اور دین داری کی دنیا' کا ترجمہ 'عالم الروح و الدین' سے کیا گیا ہے جو بہت مناسب نہیں ہے۔ عرب میں تصوف کے موضوع پر بڑے عمدہ اور علمی مجلّات نکل رہے ہیں جن میں **دعوۃ الحق** اور **مجلۃ الاحیاء** (مراقش) مجلہ'' **المسلم** '' (مصر) اور '' **التصوف الاسلامی** '' وغیرہ قابل ذکر ہیں ان مجلّات سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

اگرچہ ابتدائیہ اپنے مواد کی جامعیت اور پیش کش کے جمال وحسن کے اعتبار سے خوب ہی نہیں خوب تر ہے تو اس میں اردو اسالیب اور روز مرہ کی کئی غلطیاں بھی در آئی ہیں، چند مثالیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ ''... پچھلے تینوں شمارے 408 صفحات پر مشتمل تھے اور تازہ شمارہ تقریباً نصف ہو کر 216 صفحات کو محیط ہے۔'' (ص:۱۰)

لفظ محیط کا ستعمال درست نہیں ہے، اسے علی سبیل المثال یوں ہونا چاہیے کہ: 216 صفحات میں سمٹ گیا ہے۔ محیط کا استعمال اضافے کی صورت میں بہتر ہوتا۔

۲۔ ''علمی دلائل سے محبت کے ساتھ تصوف یا اسلام کے اخلاقی پہلو کے حوالے سے اپنوں اور بیگانوں کے شبہات کا ازالہ ہے۔'' (ص:۷)

یہ بات عربی شمارے کے مقاصد میں بیان کی گئی ہے لیکن اسلوب بہت واضح نہیں ہے۔

۳۔ ''اعلی صوفیانہ شاعری کے نئے نمونے دیکھنے کو ہماری آنکھیں ترس جاتی ہیں، اس لیے بادہ وساغر کے کالم کو حذف کرنا پڑا۔'' (ص:۱۱)

''بادہ وساغر'' کو حذف کرنے کی جو علت بیان کی گئی ہے وہ کیسے درست ہو سکتی ہے؟

۴۔ ''موجودہ زمانے کا جبری مطالبہ ہے کہ فقہ وتصوف کے بیچ حائل خلیج کو اب پھر پاٹ دی جائے۔'' (ص:۱۱)

مجھے نہیں معلوم کہ فقہ وتصوف کے درمیان کون سی خلیج ہے، البتہ فقیہ وصوفی کے درمیان کی ساری سرحدیں مٹ گئی ہیں، ہر ایک فتویٰ دے رہا ہے اور ہر ایک پیری مریدی کر رہا ہے۔ دارالافتاء اور درگاہ دونوں جگہ مزار نظر آتے ہیں۔ (الا ماشاء اللہ)۔ یہ جملہ اسلوبی اعتبار سے بھی

درست نہیں ہے۔

۵۔ ''تقلید بے بصارت اور اجتہاد بے بصیرت کے اس دور میں'' (ص:۱۲)

واقعہ یہ ہے کہ بے بصارت ہونا نہ مقلد کے لیے عیب ہے نہ مجتہد کے لیے، البتہ اجتہاد و تقلید دونوں مذموم ہیں اگر بے بصیرت ہوں، رہا بے بصر (نابینا) ہونا، تو کئی مجتہدین اور بے شمار مقلدین بے بصر رہے ہیں، لیکن حاشا وکلا ان کی بے بصری یا بے بصارتی ہرگز ان کے لیے عیب نہیں تھی۔

ابتدائیہ کے آخری حصے میں داعی اسلام کے بارے میں جو کچھ بھی کہا گیا ہے وہ سب ان کی شخصیت وخدمات سے فروتر ہے۔ چراغ کی اہمیت اس کی روشنی کی کثرت سے نہیں ہوتی ہے بلکہ اندھیروں کی شدت سے ہوتی ہے۔ دن کے اجالوں میں ہزاروں واٹ کے بلب کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہوتی لیکن شب دیجور میں ایک ننھا سا چراغ بھی امیدوں کے ہزاروں دیے جلا دیتا ہے اور راہ نوردوں کے لیے آفتاب نصف النہار سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔

صاحب ابتدائیہ نے مکتوبات کے ذکر کے ضمن میں خاکسار کے بارے میں جو بھی کچھ لکھا ہے یہ ان کی اپنی رائے ہے اور اس پر کسی تبصرے سے اعراض کرتے ہوئے دعا کرتا ہوں کہ **جعلنی اللہ عند حسن ظنہ** (اللہ تعالیٰ مجھے ان کے حسن ظن کے مطابق بنائے) علاوہ ازیں ''جس طرح اہل قلم کی رائے سے ادارے کا اتفاق ضروری نہیں۔'' (ص:۲) بالکل اسی طرح سے ادارے کی رائے سے اہل قلم کا اتفاق بھی ضروری نہیں ہے۔ یہاں یہ گزارش ضرور کروں گا کہ مجلّے کے کسی بھی معاون کی توصیف اعتدال بلکہ اقتصاد کے ساتھ ہو۔ علمی مجلّات کا رویہ بھی یہی ہوتا ہے اور الاحسان کے قیمتی صفحات کا تقاضا بھی یہی ہے۔

باب تذکیر کا پہلا مضمون ''ایمان کے درجات'' ایک ایمان افروز مضمون ہے۔ ترجمہ بھی بے حد عمدہ اور سلیس ہے۔ ماخذ کا مفصل ذکر ضرور ہونا چاہیے۔ بظاہر یہ اقتباس **قوت القلوب فی معاملۃ المحبوب** سے ہی ہوگا۔ یہ وہ عظیم کتاب ہے جس نے امام غزالی جیسے مفکر کو بھی متاثر کیا۔ کہا جاتا ہے کہ امام موصوف نے اپنے عظیم الشان دائرۃ المعارف ''**احیاء علوم الدین**'' کی بنیاد جن کتابوں پر ڈالی تھی ان میں سے ایک **قوت القلوب** بھی ہے۔ اس باب کا دوسرا مضمون بھی بنیادی اہمیت کا حامل ہے، جو ہمیں وارث محمدی کی تلاش وجستجو اور صحبت کی قیمت و برکت اور ضرورت و اہمیت کی نشان دہی کرتا ہے اور ان کے آداب کی وضاحت کرتا ہے۔ انتخاب بھی عمدہ ہے اور ترجمہ بھی شان دار ہے۔

حضرت شیخ کے افادات بے حد دل پذیر اور چشم کشا ہیں۔ یہ نہ صرف صوفی توسع کی دلیل

ہیں بلکہ متاخر فقہی تقشّف کو دعوت فکر بھی دیتے ہیں اور مرتب نے بھی حسب سابق ان بلند افکار کو لفظوں کا خوب صورت جامہ پہنایا ہے۔ بلاشبہ جن ائمہ کو زبان سے برحق مانتے ہیں انہیں عمل سے بھی برحق ماننا چاہیے اور ''اگر مگر'' کے بغیر ماننا چاہیے۔ مضمون میں ایک سے زائد بار یہ بات کہی گئی ہے کہ بوقت ضرورت امام شافعی کے مذہب پر عمل کرتے ہوئے عصر کی نماز مثل اول میں ادا کر لی جائے جب کہ مثل اول اتفاق ائمہ سے ظہر کا وقت ہے، اختلاف مثل ثانی میں ہے چوں کہ یہ بات صراحت کے ساتھ اور ایک بار سے زیادہ وارد ہے، لہٰذا اس کی طرف اشارہ ضروری تھا۔ فقہی مسائل میں توسع اور تیسیر کا استقبال ہونا چاہیے بشرطیکہ قواعد شرعیہ کے مطابق ہو اور فکری اباحیت پر مشتمل نہ ہو، جیسا کہ بعض معاصر جماعتوں کا شیوہ ہے۔

مضمون میں وارد ائمہ ثمانیہ اور ائمہ عشرہ کی وضاحت بے حد ضروری تھی، معاصر اصطلاح کے مطابق مذاہب ثمانیہ (آٹھ مذاہب) بول کر اہل سنت کے چاروں مذاہب اور ظاہری، زیدی، جعفری، اور اباضی مذاہب مراد ہوتے ہیں، کیا یہ بھی امت ہدایت میں شامل ہیں اور کیا ان کا اختلاف بھی رحمت ہے یا پھر ان سے اہل سنت کے وہ مذاہب مراد ہیں جو عملاً موجود نہیں ہیں۔

''ایک عبرت آموز ایمانی سفر'' بھی خوب ہے اور یہ سفر جاری وساری رہنا چاہیے۔ اس سفر کے مسافر خانقاہوں میں اب کم ہی نظر آ رہے ہیں۔ خانقاہ عارفیہ، سید سراواں کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ایمانی سفر کے مسافر اب بھی وہاں آ کر مقیم ہو رہے ہیں اور یہ اس امر کی دلیل ہے کہ بعض خانقاہیں اب بھی دعوۃ الی اللہ کے کاموں میں لگی ہوئی ہیں۔

باب تحقیق وتنقید میں راقم السطور کے مقالے کے علاوہ چھ مقالے شامل ہیں اور جیسا کہ ابتدائیہ میں کہا گیا ہے اس باب کو دیکھنے سے ہرگز یہ نہیں لگتا کہ مجلّے کی ضخامت نصف ہوگئی ہے۔ یہ باب اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ شامل کتاب ہے۔ پہلا مقالہ پروفیسر بدیع الدین صابری صاحب کا ہے جس کا عنوان ہے: ''عصر حاضر میں ذکر الٰہی اور مراقبے کی ضرورت واہمیت''۔ مجموعی طور پر یہ مقالہ ایک اعلیٰ درجے کا علمی مقالہ ہے اور عصر حاضر میں ایسے مقالوں کی خود اپنی اہمیت و ضرورت ہے۔ انسان کی خفیہ طاقتوں کی وسعت پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے لیکن اس کی تعبیر کی مختلف صورتیں ہنوز منت کش تحقیق ہیں۔ نہ راقم السطور کسی تہہ دار ذہن سے واقف ہے اور نہ ہی مقالے میں بیان کیے گئے چیلینجز اور ان کی مختلف فریکونسی کو کیچ کرنے والا کوئی رسیور اس کے پاس ہے، لہٰذا اس پر کوئی تبصرہ کرنے سے بھی عاجز ہے۔ واضح رہے کہ ذہن اور دماغ کے مدلولات علاحدہ علاحدہ ہیں۔ اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ ذہنی استعداد اور ارتکاز کے کئی مراحل ہیں، البتہ یہ مختلف مراحل دعا کی قبولیت میں بھی کچھ دخل رکھتے ہیں، کم از کم مجھے نہیں

معلوم۔ البتہ حسن نیت ، اخلاص اور تقویٰ الٰہی وغیرہ کی کثرت وقلت اور وجود وعدم دعاؤں کی قبولیت میں ضرور موثر ہوتے ہیں۔

مراقبہ نہ Meditation کا نام ہے نہ کسی ہیئت مخصوص کا، یہ دراصل اللہ تعالیٰ کی نگرانی کا احساس ہے، جس کی تعبیر حدیث جبریل میں "فانه یراک" سے کی گئی ہے۔ البتہ اس امر سے کسی کو انکار نہیں ہونا چاہیے کہ بعض ہیئتیں اور حصول ارتکاز کی بعض کوششیں مراقبے کے احساس اور تصور کو مضبوطی اور قوت بخشتی ہیں۔ آج مغرب میں جس یوگا اور میڈیٹیشن کا غلغلہ ہے، وہ اپنی حقیت اور مقصد دونوں اعتبار سے مراقبے سے مختلف ہیں، بعض جزئی مشابہت نا قابل التفات ہے۔ خود فاضل مقالہ نگار نے اس بات کی صراحت فرمائی ہے۔

ذکر الٰہی کے عنوان سے مصنف گرامی قدر نے جو کچھ فرمایا ہے وہ سب آیات واحادیث اور اقوال صوفیہ سے مدلل ومبرہن ہے اور یہ ان کا حق بھی ہے اور منصب بھی ہے، کیوں کہ وہ خود صاحب ذکر ونسبت ہیں۔ ذکر کا تذکرہ چلا تو حضرت ابوبکر شبلی رحمہ اللہ کی جانب منسوب ایک شعر کا ذکر کرتا چلوں، فرماتے ہیں:

ذکرتک لا انی نسیتک لمحة

و أیسر ما فی الذکر ذکر لسان

یعنی میں نے (زبان سے) اگر آپ کو یاد کیا ہے، آپ کا ذکر کیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں نے آپ کو ایک لمحے کے لیے بھی فراموش کیا، اور زبان کا ذکر سب سے آسان ذکر ہے۔

اس وقیع مقالے کے آخر میں مقالہ نگار نے مراقبے کی حقیقت و ماہیت، اس کے بعض مناہج وطرق اور اس کے فوائد اور منافع کو بھی بڑے سلیقے سے ترتیب دیا ہے۔ بلا شک وشبہ مراقبہ ہی تخلیہ کا سبب ہے، تحلیہ کا موجب ہے اور تجلیہ تک موصل ہے۔

اگلا مقالہ مفتی مطیع الرحمٰن صاحب کا ہے جو ایک دیدہ ور فقیہ اور مفتی ہیں اور معقولات درسِ نظامی کے مشہور ومعروف اساتذہ میں سے ہیں۔ فاضل مقالہ نگار نے اپنے اس مقالے میں مجاہدۂ نفس، کثرت ذکر وعبادت اور زہد وغیرہ پر ہونے والے اعتراضات کا بھر پور جواب دیا ہے، لیکن حوالے نہیں دیے گئے ہیں اور مقالے کے درمیان میں جو حوالے ہیں وہ تقریباً سب کے سب ناقص ہیں بلکہ جن عبارتوں کے ردوابطال پر مضمون کی بنیاد ڈالی گئی ہے، اس کا بھی کوئی حوالہ موجود نہیں ہے اور یہ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ جن اعتراضات کو ذکر کیا گیا ہے وہ کسی تقریر وخطاب کا حصہ ہے یا کسی مقالے اور کتاب سے ماخوذ ہیں۔ یہ صورت حال ان لوگوں کے لیے، جو فاضل مقالہ نگار اور

ان کے تبحر علمی سے واقف نہیں ہیں، مقالے کی ثقاہت اور مصداقیت کو کمزور کرتی ہے۔

مقالے میں کثرت عبادت وذکر، تزکیہ اور نفس کشی وغیرہ اعمال صوفیہ کا مدلل ومفصل اثبات کیا گیا ہے۔ البتہ تطبیق وتوفیق کے عنوان سے جو کچھ بیان کیا گیا ہے نہ وہ عنوان کے مطابق ہے نہ موافق ہے، کیوں کہ اس عنوان کے تحت تقریباً 19 سطروں میں کچھ احادیث ذکر کی گئی ہیں، وہ بظاہر صرف استطاعت بھر عبادت کرنے پر دلالت کرتی ہیں لیکن اس میں تطبیق وتوفیق کی کوئی کوشش نہیں ملتی۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ مسودے کے کچھ صفحات طباعت سے رہ گئے ہیں۔ بسا اوقات مقالہ نگار عدم توجہ یا عدم فرصت کے سبب مقالے میں ضروری حذف واضافہ نہیں کر پاتا، ایسی حالت میں مرتبین کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ مقالے کے مضامین وعناوین میں مناسب تغییر وتعدیل کر لیں۔

اس باب کا تیسرا مقالہ صاحب تصانیف کثیرہ استاذ گرامی پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی کا ہے۔ ان کے مقالے کا عنوان ہے "حقیقت تصوف: موافق ومخالف نظریات کا تجزیہ" یہ ایک دعوت فکر ونظر دینے والا مضمون ہے جو وسیع مطالعے اور عمیق فکر کا نتیجہ ہے۔ حامیان تصوف کے لیے بھی چشم کشا اور مخالفین تصوف کے لیے بھی حقیقت افروز ہے۔ اعتدال وتوازن کی دعوت پر مشتمل اس مقالے کے اکثر حصے کے صدق وصحت کے اعتراف کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔

البتہ یہ ملاحظہ غلط نہ ہوگا کہ زیادہ زور حامیان تصوف کے عدم اعتدال پر صرف کیا گیا ہے اور اس طرح جانبین کے عدم اعتدال کے بیان میں پوری طرح سے اعتدال کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ حامیان تصوف کے عدم اعتدال کی تنقید کا حجم ہو یا اس کے لیے اختیار کی جانے والی لفظیات ہو یا پھر اس کا اسلوب بیان ہو، یہ سب مخالفین تصوف کے عدم اعتدال کے بیان میں نظر نہیں آتے۔ ایسا لگتا ہے کہ اول الذکر مقصود اور عمدہ ہے جب کہ ثانی الذکر غیر مقصود اور فضلی ہے، محض استکمال موضوع اور استیفائے عنوان کے طور پر ہے۔

یہ احتمال ضرور ہے، بلکہ میرا حسن ظن بھی یہی ہے کہ دونوں کے عدم توازن کے بیان میں توازن کے فقدان کا سبب یہ ہے کہ لوگ، اپنوں کی تنقید میں کثرت سے بھی کام لیتے ہیں اور شدت سے بھی، علاوہ ازیں جہاں جہاں فاضل مقالہ نگار نے حامیان تصوف کے مبالغے اور عدم اعتدال کا ذکر کیا ہے وہ مبالغہ اور عدم اعتدال صوفیہ صافیہ کا نہیں، بلکہ مدعیان تصوف اور مترسمین بالصوفیہ کا ہے اور صوفیۂ کرام اس بات سے بری ہیں مثلاً فاضل مقالہ نگار کی یہ عبارت ملاحظہ فرمائیں:

"حامی وموافق طریقت افراد نے یہ افراط وتفریط کی ہے کہ صرف تیسرے جزو احسان پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے اور اس کا رشتہ ایمان واسلام سے کاٹ دیا۔" (ص: ۷۲)

کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا؟ آخر یہ حامی وموافق طریقت کون ہیں جنھوں نے یہ جرم شنیع کیا ہے؟ کیا جنید بغدادی، امام غزالی، شیخ عبدالقادر جیلانی، محبوب الٰہی اور سید اشرف سمنانی وغیرہ حامی وموافق طریقت نہیں تھے؟ کیا انھیں بھی اس جرم شنیع کا مجرم گردانا جا سکتا ہے؟ کیا بعض نفس پرستوں اور مدعیان کو پیش نظر رکھ کر کوئی کلیہ بنانا بذات خود اعتدال سے انحراف نہیں ہے؟ کیا یہ تعمیم اور جنرلائزیشن درست ہے؟ حق یہ ہے کہ اساطین تصوف وطریقت دین کے تینوں ارکان (ایمان، اسلام، احسان) کی جامعیت میں اللہ کی نشانیوں میں سے تھے۔ فاضل مقالہ نگار مذکورہ بالا عبارت سے متصلاً فرماتے ہیں:

’’اور اس سے زیادہ یہ ستم کیا کہ عبادت کا مفہوم بہت ہی محدود کر دیا۔‘‘

یہ باب خدمت خلق کو بھی عبادت کا مظہر سمجھنے والے صوفیہ کے بارے میں کیوں کر کہی جا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں ان دعووں کے لیے دلائل بھی مطلوب ہیں، یا یہ بدیہیات اور مسلمات میں سے ہیں جو دلائل سے مستغنی ہوتے ہیں اور اگر بفرض کچھ جہال ایسا سمجھتے ہیں تو اس کے ذمہ دار اہل تصوف کیسے ہو سکتے ہیں؟ اہل طریقت کے بارے میں مقالہ نگار کا خود اپنا قول ہے:

’’اہل طریقت نے بھی بلا استثنا تسلیم کیا ہے کہ شریعت اسلامی محمدی کی کامل اور مخلصانہ پیروی کے بغیر تزکیہ ناممکن ہے۔‘‘ (ص: ۷۰)

یہاں ’بلا استثنا‘ قابل توجہ ہے، کیوں کہ یہ صراحتاً گزشتہ عبارتوں سے متصادم ہے۔ ان اصولی گذارشات کے علاوہ بھی چند امور نشان دہی کے قابل ہیں، اگرچہ اصولی نوعیت کے نہیں ہیں۔ مثلاً: اللہ عزوجل کے بارے میں یہ عبارت کہ اس نے ’’جب جیسی ضرورت محسوس کی **تعالی اللہ عن ذلک علوا کبیرا** اللہ تعالیٰ وتقدس کو کوئی ضرورت نہیں اور وہ احساس جیسی حیوانی صفات سے بھی بلند وبالا ہے۔ ممکن ہے کہ ان الفاظ کی تاویل ہو جائے، لیکن ان سے احتراز احوط واولیٰ ہے۔ یونہی ایک مقام پر انسانی تخلیق کو ’’عاجلانہ‘‘ سے موصوف کیا گیا ہے، جب کہ تخلیق اللہ تعالیٰ کا فعل ہے اور اسے عاجلانہ سے متصف نہیں کر سکتے، یہ خلق کا نہیں بلکہ مخلوق کا وصف ہے، بلفظ دگر انسان کی خلقت جلد باز نہیں، فطرت جلد باز ہے، اسی بات کو آیت کریمہ **و کان الانسان عجولا**۔ (الاسراء: ۱۱) میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

اس مقالے کی معنویت واہمیت اور افادیت ونفعیت کے پورے اعتراف کے ساتھ، یہ ایک اجمالی تبصرہ ہے اور اس اپیل کے ساتھ ہے کہ دعوت الی التصوف کے کام سے وابستہ لوگ اس مقالے کو بار بار پڑھیں، کیوں کہ مقالے کے جو بنیادی مقدمے ہیں ان کی صحت میں کوئی شبہ نہیں ہے، ہمارے معروضات کا تعلق صرف جزئیات اور تمثیلات سے ہے۔ ان میں پہلا مقدمہ یہ ہے کہ ’’کائنات الٰہی

کا سارا نظام اعتدال وتوازن اور تمام اجزا کے باہمی تعاون پر استوار ہے۔‘‘ (ص: ۶۸) اور دوسرا مقدمہ ہے کہ ’’فطرت انسانی کی یہ بوالعجبی لگتی ہے کہ وہ اپنے ارادہ واختیار کے عنصر کی وجہ سے جادۂ اعتدال سے انحراف کرتا ہے۔‘‘ (ص: ۶۹) اور یہ انسانی نہیں، قرآنی مقدمات ہیں اور ان کی صداقت پر متعدد آیات قرآنی گواہ ہیں، لہٰذا ان مقدمات کی معرفت کا تقاضا ہے کہ ہم نعمت اختیار کے سبب جادۂ اعتدال سے انحراف نہ کریں، ورنہ عالم اصغر کی طرح عالم اکبر کا بھی سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور انسان اپنے مقصد تخلیق کی تکمیل نہیں کر پائے گا اور چوں کہ اس انحراف کا محرک ہمارا نفس ہوتا ہے، لہٰذا اس کی نگہداشت کی جائے، اس سے غافل نہ رہا جائے اور مجاہدہ وریاضت کے ذریعے ہمیشہ اسے جادۂ اعتدال پر رکھا جائے۔

’’تصوف برائے دنیاداری کردن خوب است‘‘ جیسی فکر رکھنے والوں کا تو ذکر ہی فضول ہے، مخلصین وواصلین کے اقوال واعمال کو بھی کتاب وسنت پر پیش کیا جائے گا، کیوں کہ یہ حضرات بھی اپنے اجتہاد میں مصیب ومخطی دونوں ہوتے ہیں اور ہمیشہ اس بات کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ **کل یوخذ ویرد علیہ الا النبی المعصوم صلی اللہ علیہ وسلم**۔ (نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ ہر ایک کی بات قبول بھی کی جائے گی اور رد بھی کی جائے گی۔) لیکن کسی صوفی کی اجتہادی خطاؤں کو جادۂ اعتدال سے انحراف نہیں کہا جا سکتا۔ ان اجتہادی اخطاء پر (جو قرار واقعی ہوں) یہ حضرات ان شاء اللہ ماجور ہوں گے اور ماجور منحرف نہیں ہوتا۔ اس تبصرے کے اخیر میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس کے ذریعے ہر حامی وموافق تصوف کا دفاع مطلوب نہیں ہے، بعض حامی وموافق تصوف بالکل ویسے ہیں جیسا کہ مقالہ نگار نے لکھا ہے، بلکہ بعض اس سے بھی بڑھے ہوئے ہیں، البتہ انھیں میں جیسا کہ مقالہ نگار نے لکھا ہے، صوفیہ صافیہ بھی شامل ہیں، کیوں کہ ہر حامی تصوف تو صوفی نہیں ہے لیکن ہر صوفی حامی تصوف ضرور ہے اور انھیں اور صرف انھیں حامیان تصوف کے لیے یہ سطریں سپرد قرطاس کی گئی ہیں۔

اگلا مقالہ خود راقم السطور کا ہے۔ یہ ایک متواضعانہ کوشش ہے جس میں صوفیہ پر لگنے والے ایک مشہور ومعروف اعتراض کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ مرتبین کی جانب سے عنوان کے اجزاء میں تقدیم وتاخیر کرنے کے سبب اس میں ایک گونہ تعقید پیدا ہو گئی ہے۔ مقالے کا اصل عنوان تھا: ’’نوآبادیاتی نظام کے خلاف صوفی تحریکات اور شخصیات کی جد وجہد، شمالی افریقہ کے خصوصی تناظر میں‘‘ مشمولات (فہرست) میں کاتب بزرگوار نے شمالی افریقہ کے بجائے ساؤتھ افریقہ لکھ دیا ہے۔ قارئین حضرات اپنے اپنے نسخوں میں تصحیح فرمالیں۔ اپنے مقالے کے سلسلے میں اسی قدر پر اکتفا کرتا ہوں۔

باب تحقیق وتنقید کے پانچویں مقالے کا عنوان: ''تصوف وصوفیہ پر اعتراضات کا علمی محاسبہ'' ہے۔ یہ مقالہ جناب مولانا شاہ ہلال احمد قادری صاحب کا ہے جس میں انہوں نے ماہنامہ معارف اعظم گڑھ کے جنوری، فروری ۲۰۱۲ء میں شائع پروفیسر الطاف حسین اعظمی صاحب کے مضمون: ''تصوف کیا ہے؟'' کا جائزہ لیا ہے۔ جناب الطاف اعظمی صاحب پر سردیوں میں کوئی خاص کیفیت طاری ہوتی ہے یا یہ کیفیت ہمیشہ رہتی ہے اور سردیوں میں صرف اظہار ہوتا ہے۔ اس دسمبر اور جنوری (۱۴-۲۰۱۳) میں ان کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے: ''قتل عمد میں قصاص اور دیت ہے، معافی نہیں'' اور جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے کہ انھوں نے اس مقالے میں تقریباً پوری امت سے اختلاف کیا ہے اور واضح طور پر احادیث اور اس کی حجیت کا انکار کیا ہے اور راویان حدیث کو بغیر کسی دلیل کے متہم کیا ہے، حتی کہ ادارہ معارف کو ان کے بعض دعاوی پر حاشیہ لگانا پڑا، ان کے خیال میں قدما اور ان کی حدیث فہمی وقرآن دانی قابل اعتبار نہیں، بلکہ ان کا اور ان کے امثال: اصلحھم اللہ کا خود ساختہ تدبر کافی ہے۔ اس مقالے میں انھوں نے اپنے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ حنفی علما وفقہا نے احادیث سے کم ہی رجوع کیا ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ ظالمانہ دعویٰ کیا ہے کہ احناف نے صحیح حدیث کی موجودگی میں بھی قیاس کو ترجیح دی ہے۔ یہ ایک ایسی تہمت ہے جس کی جواب دہی پروفیسر موصوف کو میدان محشر میں بڑی مہنگی پڑے گی۔ مذاہب اربعہ کی تقلید کو یہودیوں کی اپنے احبار ورہبان کی تقلید سے مشابہت دی ہے، احادیث سے مستنبط احکام کو ظنی قرار دیا ہے اور اخبار آحاد کو ناقابل اعتبار ٹھہرایا ہے اور ان سب کا ثبوت انھیں ائمہ کے فرمودات واقوال سے دیا ہے جن کی اتباع کو یہودیوں کی اپنے احبار کی اتباع کے مثل قرار دیا ہے۔ مزید آگے بڑھ کر حدیث کے تمام ذخیرے کو غیر ضروری بتایا ہے، کیوں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مطابق احادیث کی کتابت سے منع فرمایا تھا اور اس کا ثبوت مسلم اور ترمذی کی حدیث سے پیش کیا ہے اور اس طرح اس مقالے میں تفسیر وحدیث وفقہ سب کو رد کر کے صرف قرآن پر عمل کرنے کی دعوت دی ہے۔ اس مقالے سے قبل بھی ''حقیقت رجم'' کے عنوان سے ان کا ایک مختلف فیہ مقالہ ہنگامۂ قیل وقال برپا کر چکا ہے، یعنی:

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑے زمانے میں

یہ ساری تفصیل اس لیے رقم کرنی پڑی کہ جو شخص قرآن اور اپنے تدبر کے درمیان تفسیر و حدیث کا وجود برداشت نہ کرے تو تصوف کی کیا حیثیت ہے، جو ان سے ماخوذ ایک علم ہے۔ مولانا قادری صاحب نے مناسب انداز میں جواب دیا ہے اور تصوف پر کیے گئے ان کے اعتراض کا اپنے جواب میں مکمل احاطہ کیا ہے۔ لہٰذا یہاں پروفیسر الطاف صاحب زید لطفہ کے مزاعم اور

دعاوی کے بارے میں کچھ نہیں کہنا ہے۔ پروفیسر یٰسین مظہر صاحب اکثر فرماتے تھے کہ فلاحیوں کو فلاح کی سب سے زیادہ حاجت اور اصلاحیوں کو اصلاح کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ مختصر یہ کہ تصوف کیا ہے ایک ایسا مقالہ ہے جس میں تحقیق (Research) میں پڑھائے جانے والے تفکیر علمی (Scientific Thinking) میں غلطی کے تمام یا بیشتر اسباب موجود ہیں، جیسے تہوین (Underestimation) تعمیم (Generalization) لف ودوران (Twisting) شخصی حملہ (Personal Attack) غلط مقارنہ (Wrong Comparison) خواہش نفس کی پیروی (Capriciousness) اور غلط استدلال وغیرہ۔ پروفیسر الطاف اعظمی صاحب کا یہ مقالہ فکر میں غلطی کے ان اسباب کو سمجھنے سمجھانے کے لیے بطور نمونہ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ مقالہ نگار نے مجموعی طور پر جواب کا حق ادا کیا ہے۔ فجزاہ اللہ عن التصوف واھلہ خیراً کثیرا۔

تصوف شاہ عبدالعزیز دہلوی کی نظر میں مولانا طفیل احمد مصباحی کا ایک علمی مقالہ ہے۔ بلاشبہ سراج الہند شاہ عبدالعزیز کی ذات اس شعر کا مصداق ہے:

لیس علی اللہ بمستنکر
أن یجمع العالم فی واحد

مقالہ نگار کے اس جملے کی صداقت محل نظر ہے کہ: ''شاہ عبدالعزیز کے بعد علم حدیث ہندوستان سے رخصت ہوگیا۔'' البتہ یہ ضرور ہے کہ ان کے بعد ان کے پائے کا کوئی محدث برصغیر میں نہیں ہوا۔ اس علم کی تدریس وتعلیم اور اس میں تصنیف وتالیف کا عمل ان کے بعد بھی جاری ہے اور زور وشور سے جاری ہے۔ جو ہمارے محلے میں نہیں وہ چیز ضروری نہیں کہ شہر میں بھی نہ ہو۔ ہماری معلومات عموماً اپنے محلے تک محدود رہتی ہے یا ہم اپنے محلے کو ہی شہر جان لیتے ہیں۔ اور جو دل کا حال ہے وہی دلی کا حال ہے، مان لیتے ہیں۔ راقم السطور نے کلیۃ الدعوۃ الاسلامیۃ لیبیا کی لائبریری میں تقریباً ایک سو سے زیادہ ایسی ضخیم کتابوں کو ایک ساتھ دیکھا ہے جو علم حدیث کے موضوع پر ہیں اور جنھیں شاہ عبدالعزیز کے بعد کے ہندوستانی علما نے لکھا ہے۔

مقالے میں ص/۱۴۶ پر حضرت شاہ صاحب کی ایک عبارت میں علاؤالدولہ سمنانی (متوفی: ۷۳۶ھ) کی جگہ علاؤالدین سمنانی لکھا ہے، یہ غالباً ناسخ یا کاتب کا کارنامہ ہے۔ مقالے میں بعض مقام پر ترجمہ بھی بہت دقیق نہیں ہے مثلاً: ص: ۱۴۷ پر حضرت شاہ صاحب کی ایک عبارت ہے:

وحدۃ الوجود آنست کہ وجود حقیقی بمعنی ما بہ الموجودیۃ نہ بمعنی مصدری اعتباری یک چیز است کہ ...'' کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے:

''وحدۃ الوجود بمعنی ما ھو الموجودیۃ نہ کہ بمعنی مصدری ایک اعتباری چیز ہے ...''جو درست نہیں ہے۔

لیکن بایں ہمہ یہ ایک مفید مقالہ ہے اور سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے بعض صوفیانہ افکار ونظریات پر روشنی ڈالتا ہے۔ چوں کہ حضرت شاہ صاحب کے تصوف پر بہت کم لکھا گیا ہے، لہٰذا اس مقالے کی بڑی اہمیت ہے۔ بطور خاص ان لوگوں کے لیے بہت مفید ہے جو شب و روز حضرت شاہ عبدالعزیز اور ان کے آبا واجداد کو ٹکسالی اہل حدیث ثابت کرنے میں لگے ہیں۔ اگر آپ Alukah.net پر حضرت شاہ صاحب کی سوانح پڑھیں تو آپ کو ایسا محسوس ہوگا کہ کسی ایسے غیر مقلد کا ذکر ہو رہا ہے جو کسی اتفاق، غلطی یا مصلحت کے سبب چند باتوں میں مقلدین کے شریک ہو گیا ہو۔ ظاہر ہے کہ شاہ صاحب کی اس سوانح کے مرتب ایک عرب نژاد سلفی ہیں جو شاہ صاحب کی اپنی تصنیفات سے بے خبر ہیں اور ان کے پاس شاہ صاحب کے بارے میں وہی ناقص محرف اور مدسوس معلومات ہیں جو ''پاسباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی'' کی پالیسی پر عمل کرنے والے برصغیر کے علما نے انھیں فراہم کی ہیں اور جن فرضی اور جھوٹی معلومات کے سہارے ایک طبقہ خانوادۂ ولی اللہی کی توہیب کے درپئے ہے۔

ولا تحسبن اللہ غافلا عما یقول الظالمون

اگلا مقالہ بے حد معرکۃ الآرا ہے جو عالم شریعت و عارف طریقت امام عبدالوہاب شعرانی کی کتاب ''میزان الشریعۃ الکبریٰ'' سے ماخوذ ہے جو مقالے سے زیادہ تبصرہ اور ریویو محسوس ہوتا ہے، جسے مولانا ذیشان احمد مصباحی نے بے حد سلیقے اور قرینے سے مرتب کیا ہے، جو ان کے زور بیان اور جرأت اظہار دونوں کا غماز ہے۔ مقالہ نگار اگر ذی شان ہیں تو مقالہ ذات شان کا مصداق ہے۔ اس مقالے یا ریویو کا آغاز امام شعرانی کے اس مقدمے سے ہوتا ہے کہ شریعت مطہرہ کے تمام اوامر ونواہی تخفیف وشدت یا رخصت وعزیمت پر مبنی ہوتے ہیں یعنی ہر حکم رخصت کے ساتھ بھی ہوتا ہے اور عزیمت کے ساتھ بھی اور مکلفین یا ان احکام پر عمل کرنے والے بھی یا تو ایمانی وجسمانی اعتبار سے کمزور ہوتے ہیں یا قوی ہوتے ہیں۔ کمزور سے تخفیف ورخصت پر عمل کرنے کو کہا جاتا ہے اور قوی سے شدت وعزیمت پر عمل کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ مقالہ نگار امام شعرانی کے اس قاعدے کو نقل کرنے کے بعد رقم طراز ہیں کہ اس قاعدے کی رو سے ائمہ دین اور مجتہدین کے اختلاف کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی کیوں کہ یہ اختلافات صحیح وغلط اور افضل واولیٰ پر مبنی نہیں ہے بلکہ صرف رخصت وعزیمت کے اختلاف ہیں، لہٰذا جو عزیمت پر قادر ہو وہ اسی مجتہد کے مذہب کی اتباع کرے گا جس کا قول عزیمت پر مبنی ہو اور جو اپنے ایمانی ضعف اور جسمانی ناتوانی

کے سبب رخصت پر ہی عمل کر سکتا ہے، وہ اس قول کی پیروی کرے گا جو رخصت پر مشتمل ہو، خواہ وہ قول کسی بھی امام کا ہو۔

فقہی تقشّف اور تقلیدی تعصب کے اس دور میں بظاہر یہ بات جاذب نظر ہو سکتی ہے، لیکن اس کی تطبیق کا مرحلہ آسان نہیں ہوگا، مبادا یہ دعوت فوضیٰ اور لاقانونیت کی دعوت نہ بن جائے۔ راقم السطور امام شعرانی کے ثنا خوانوں میں شامل ہے۔ ان کے اس قاعدے کو کتاب میں بیان کردہ تقییدات کے ساتھ دیکھنا چاہیے، محض مذکورہ قاعدے کا بیان امام شعرانی کے مطلوب ومراد تک نہیں پہنچا سکتا ہے۔ مقالہ نگار سے یہ بھی گزارش ہے کہ اس اصول زریں کی تطبیق مقالوں پر بھی ہونی چاہیے۔ کچھ مقالے اہل عزیمت قاریوں کے لیے لکھے جاتے ہیں اور کچھ اہل رخصت کے لیے۔ میرے علم واطلاع کے مطابق مجلہ الاحسان کے قاریوں کی اکثریت اہل عزیمت میں سے نہیں ہے۔ اس مقالے کی صحیح جگہ کوئی علمی، اصولی اور خالص فقہی مجلہ ہونا چاہیے۔ الاحسان کے اہل رخصت قرا فکری اعتبار سے گرانبار اس مقالے کے فہم وادراک کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ یہ بیچارے اسے پڑھ کر بے شمار سوالات اور غلط فہمیوں کے گرداب میں پھنس جائیں گے، بلکہ خدشہ ہے کہ یہ دین کی متاع پس ماندہ سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

امام شعرانی نے یہ کتاب اس عہد کے لیے تصنیف فرمائی تھی جب قرون وسطیٰ میں فقہی منافرت اپنے شباب پر تھی اور مختلف مسالک ومذاہب کے علما مذہبی ومسلکی مناظرہ بازی کی لیے فرض روزے تک ترک کر دیتے تھے اور اسے دینداری شمار کرتے تھے۔ آج صورت حال بالکل مختلف ہے، سلفیت پوری طاقت وقوت سے نہ صرف مقلدین بلکہ ائمہ مجتہدین کے خلاف صف آرا ہے اور دامے، درمے، قلمے، سخنے، تیرے وتفنگے اور بندوقے وبمے غیر مقلدیت کو مسلط کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، لہٰذا آج اس مضمون کی ویسی معنویت نہیں ہے جو امام شعرانی کے عہد میں تھی۔

اس مقالے میں ایک عنوان ہے کہ ''اولیا حنفی یا شافعی نہیں ہوتے''۔ اس کے تحت یہ بتایا گیا ہے کہ اولیاء اللہ کشف کے ذریعے عین شریعت کا مشاہدہ کرتے ہیں، جہاں سارے مسالک فقہ چشمۂ نبوت سے پھوٹتے نظر آتے ہیں اور سارے ائمہ مصیب وبرحق نظر آتے ہیں اور اس کشف ومشاہدہ کے بعد بندہ تقلید کی زنجیر سے آزاد ہو جاتا ہے یا اسے تقلید کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی۔ عام لوگوں کے لیے یہ بیانات بے حد خلجان پیدا کرنے والے ہیں۔ اس کشف ومجاہدے کا قرار واقعی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ جب تمام مذاہب مصیب ودرست ہیں اور سبھی ایک چشمے سے نکلے ہیں تو ان میں سے کسی ایک کی بھی اتباع وتقلید درست ہوگی۔ تقلید سے آزادی ولایت یا عین شریعت کے مشاہدے سے نہیں بلکہ مرتبۂ اجتہاد پر فائز ہونے سے ہوتی ہے اور دونوں باہم لازم

ولمزوم نہیں ہیں۔لہٰذا یہ عنوان متوسط اذہان میں صرف غلط فہمیاں پیدا کرنے والا ہے اور یہ واقع کے مطابق بھی نہیں ہے، چنانچہ ہم تواتر سے جانتے ہیں کہ حضرت غوث اعظم جیلانی زندگی کے آخری لمحات تک امام احمد بن حنبل کے مقلد رہے اور ان کی فقہ کے مطابق فتوے دیتے، لہٰذا مرتبۂ ولایت پر فائز ہونے سے پہلے اور بعد کی تفریق بھی درست نہیں ہے، علاوہ ازیں جن بزرگوں کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ وہ مادرزاد ولی ہیں، ان پر اس قاعدے کی تطبیق کیسے ہوگی، کیوں کہ مادرزاد ولی کو تو زندگی کے کسی بھی مرحلے میں مقلد نہیں ہونا چاہیے۔

درحقیقت بزرگوں کے ان اقوال کا مقصد صرف یہ ہے کہ عام انسانوں کی تقلید دلیل کی معرفت کے بغیر ہوتی ہے اور اولیاء اللہ مشاہدۂ عین شریعت کے بعد معرفت دلیل کے ساتھ تقلید کرتے ہیں اور ان کی تقلید عام انسانوں کی تقلید کی طرح نہیں ہوتی۔

غالباً یہ بات بھی درست نہیں ہے کہ ائمہ کے تمام اختلاف صرف رخصت وعزیمت میں محصور ہیں، بلکہ ان اختلافات کی نوعیتیں مختلف ہیں، جنھیں رخصت وعزیمت کے حوالے سے حل نہیں کیا جاسکتا اور تقریباً تمام مذاہب فقہ میں احوال انسانی سے متعلق رخصت وعزیمت کی حالتوں کے لیے الگ الگ فتاویٰ موجود ہیں۔اس صورت میں بھی کسی مذہب ومسلک کی طرف عدول کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

لیکن اس امر میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ عہد وسطیٰ اور اس کے بعد عالم اسلام میں عموماً اور ایران وخراسان اور برصغیر میں خصوصاً مسلکی ومذہبی تعصب اپنی انتہا کو پہنچ گیا اور تمام مذاہب برحق ہیں، یہ مقولہ صرف قول کی حد تک سمٹ گیا۔اسلام کا توسع تقریباً مفقود ہوگیا اور فقہی تقشف اور تشدد اس درجہ بڑھ گیا کہ بعض حضرات دوسرے مسالک ومذاہب کے ساتھ دوسرے ادیان کی طرح سلوک کرنے لگے۔ایک مرتبہ حضرت محبوب الٰہی نے دربار شاہی میں ہونے والے کسی علمی مباحثے میں جب امام شافعی کے کسی قول سے استناد کیا تو وہاں موجود علما نے ان کا مذاق اڑایا اور اس بات پر حیرت ظاہر کی کہ وہ کسی غیر بلکہ مخالف کے قول سے استدلال کیسے کرسکتے ہیں؟

خلاصۂ کلام یہ کہ کتاب مستطاب میزان الشریعۃ الکبریٰ کی تمام باتوں سے اتفاق تو ممکن نہیں ہے ''أبی اللہ أن یصح کتاب غیر کتابہ''، لیکن اکثر اور بیشتر باتیں بے حد وقیع اور قیمتی ہیں، لیکن یہ بات فراموش نہیں ہونی چاہیے کہ خوف الٰہی کے بعد سب سے بڑی حکمت اصلاح وہدایت میں تدریج اور مدعو کے معیار کی رعایت کرنا ہے۔

مکتوبات کے کالم کی علمیت اور ضخامت دونوں الاحسان کا امتیاز ہے۔یہ کالم اس بار 27 صفحات پر مشتمل ہے جو اوسط درجے کے اردو رسالوں کی ضخامت کے قریب ہے اور اس بات

کی دلیل ہے کہ الاحسان کے قاریوں کی اپنے اس محبوب مجلّے سے وابستگی کتنی گہری ہے۔بعض مقالے (باستثنائے مکتوب راقم۔قارئین اس استثنا کو دائمی سمجھیں اور اگر کبھی اتفاقاً موجود نہ ہو تو بھی مفہوم ہوگا) قاریوں کے حسن مطالعہ اور ذوق ملاحظہ کی بھی غمازی کرتے ہیں۔

واخیراً اعوذباللہ من الحصر والھذر والعجب بمااحسن والتکلف بما لااحسن وصلی اللہ علی سیدنامحمدوالہ وصحبہ ومن دعابدعوتہ

پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی (ادارۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

امید ہے کہ آپ تمام بزرگوں کے ساتھ بخیر ہوں گے۔بحمد اللہ بعافیت ہوں اور اس کی بیکراں نعمتوں کا شکر گذار کہ عوارض کے باوجود کارگذار بنا رکھا ہے۔محض آپ کے محبت بھرے اصرار نے حضرت امام شعرانی رحمہ اللہ پر مقالہ لکھوالیا، جیسا چاہتا تھا ویسا تو نہیں لکھا گیا کہ ذہن و قلم میں صحیح ارتباط نہ تھا اور مصادر بھی میسر نہ تھے۔لیکن بقول شاعر خاکسارانہ مایہ حاضر خدمت ہے۔کم وبیش ہو تو اصلاح کل کا پورا اختیار دیتا ہوں کہ شیوخ ومرشدین کو اصلاح کی ہر وقت اور ہر کام میں ضرورت رہتی ہے، اپنی طرف سے صرف یہ عرض کرسکتا ہوں کہ مجھے اس کے لکھنے میں بڑا فائدہ ہوا اور دوسرے اعمال واشغال کا جبر نہ ہوتا تو شاید ایک کتاب ہوجاتی۔بہرحال وہ عام قارئین کرام کے لیے مفید ثابت ہوگا۔

الاحسان کے شمارے بھیجنے کا ممنون ہوں۔ان سے قیمتی معلومات ملتی ہیں اور اپنی اصلاح کے مواقع نصیب ہوتے ہیں۔تصوف وطریقت کے بارے میں خاکسار کا عقیدہ وایقان ہے اور اس کا بار بار اظہار کرچکا ہوں اور وہ اکثر متشددین ومنکرین دونوں کو ناپسند آتا ہے کہ طریقت شریعت کا صرف ایک حصہ ہے اور وہ بھی بقول شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ معرفت واصلاح کا ظنی طریقہ ہے، حتمی اور پختہ اور صحیح طریقہ شریعت کا ہے۔کتاب وسنت سے اگر تقویٰ وطہارت نہیں مل سکتی تو پھر کس چیز سے مل سکتی ہے۔تمام بزرگ صوفیۂ کرام کا اعلان رہا ہے کہ وہ کتاب وسنت کے پابند تصوف کے قائل اور منادی ہیں، مگر مبالغہ وغلو کرنے والے افراد وطبقات طریقت کو شریعت کا مدمقابل بلکہ بدل۔نعم البدل۔بھی قرار دیتے ہیں اور اسی غلو آمیز رویہ وفکر سے مبالغہ آرائی کے ساتھ واقعات وروایات بلکہ احادیث وآیات اور اعمال واشغال صحابہ وتابعین اور معمولات اکابر صوفیہ کے بارے میں مسخ نگاری، غلط تعبیر وتشریح کا گمراہ کن پرچار شروع ہوجاتا ہے۔

شمارہ چہارم بقامت کہتر بقیمت بہتر کا مصداق ہے۔''تذکیر'' کے تحت چاروں مقالات و مضامین بہت عمدہ ہیں اور متوازن بھی۔شیخ صفوی کا مقالہ ''فقہی مذاہب کا اختلاف رحمت ہے'' چشم کشا اور بصیرت افروز ہے اور مسلکی جدل وجدال کرنے والوں کے لیے تازیانہ عبرت۔''تحقیق و

تنقید'' کے تحت خاکسار کے مقالے کے سوا، دلچسپ ہیں۔ سید علیم اشرف جائسی کا مقالہ ایک نئے پہلو پر قیمتی دستاویز ہے۔ صوفیۂ کرام اور سالکان کو بسا اوقات مجتہدین بھی کہا گیا ہے، خاص کر امام شعرانی کے افکار و مقالات میں مگر مفتی مطیع الرحمٰن رضوی صاحب کا نفس کشی پر مقالہ قرآن وسنت کی روشنی سے زیادہ ان کی فکری وذہنی سوچ کا زائیدہ ہے۔ انہوں نے متعدد صحابۂ کرام کے بارے میں جس نفس کشی کا اثبات کیا ہے وہ اصلاً ان کی عسرت وتنگ دستی کا معاملہ تھا۔ بعض عبارتوں کا ترجمہ صحیح نہیں اور ساری تعبیرات خاص نہج کے مطابق ہیں۔ ان پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ امام شعرانی کے مسئلۂ اجتہاد وتقلید پر جناب ذیشان مصباحی کی تحریر بہت عمدہ ہے۔ افسوس اس سے زیادہ استفادہ اپنے مقالے میں نہیں کرسکا۔ تنقید وتبصرہ کے لیے بعض اہل قلم سے معذرت خواہ ہوں۔ لیکن یہ میرے خیالات ہیں۔ امید ہے کہ آپ ان کو پسند کریں گے، اگرچہ اختلاف کرسکتے ہیں۔ زیادہ حد ادب۔

ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی (شعبۂ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

پچھلے دنوں جامعہ عارفیہ میں جائزہ وزیارت کے لیے حاضر ہوا۔ یہاں کے اساتذۂ کرام، طلبۂ عزیز اور ذمہ دارانِ جامعہ سے مل کر انتہائی مسرت ہوئی۔ جامعہ کا نظم ونسق اور نوجوان اساتذہ کے اندر تدریسی جذبہ دیکھ کر اس کی ترقی کے لیے دل دعائیں کرنے لگا کیونکہ ان کے اندر نونہالان ملت کو بنانے اور ان کے مستقبل کو سنوارنے کی فکر ہے۔ جامعہ عارفیہ گو کہ شہر الہ آباد سے ۲۲ کلومیٹر دوری پر واقع ہے، اس کے باوجود اس نے اپنی بہترین کارکردگی اور تدریسی محاسن کی بنیاد پر ہندوستان کے مختلف صوبوں کو اپنی طرف راغب کرلیا ہے۔ یہاں پر تعمیراتی سلسلہ مستقل جاری ہے ایسا لگتا ہے کہ آئندہ چند سالوں میں تعلیم وتعلم کے میدان میں ایک صالح انقلاب برپا کرے گا۔ یہاں یہ ذکر بھی مناسب ہوگا کہ مسجد کی تعمیر جدید اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ ذمہ دارانِ ادارہ کے اندر تعمیراتی حسن پوری طریقے سے موجود ہے۔ ان شاء اللہ آئندہ اپنی تکمیل کے بعد یہ مسجد قابل ذکر مساجد میں شمار کی جائے گی۔

خاکسار کو ہندوستان کے مختلف جامعات اور دینی مدارس میں حاضری کا شرف حاصل رہا ہے، لیکن یہاں کی شائستگی، کیمپس کی شگفتگی اور کتب خانے کی ترتیب وتنظیم دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہوئی۔ کتب خانہ میں کتابیں بڑے سلیقے سے لگی ہوئی تھیں اور اس میں آنے والے رسائل ومجلّات کو بڑی خوش سلیقگی سے سجایا گیا تھا۔ یہ سب چیزیں اس بات کی شہادت پیش کرتی ہیں کہ جامعہ عارفیہ صحیح معنوں میں صدق دل سے علوم وفنون کے فروغ کا تمنائی ہے۔ یہ بھی خوش آئند ہے کہ یہ جامعہ طلبہ کے اندر سائنٹیفک مزاج پیدا کرنے کا خواست گار ہے، یہی وجہ ہے کہ دینی علوم کے ساتھ ساتھ عصری علوم سے بھی بچوں کی تزئین کاری کو اپنا فریضہ سمجھتا ہے۔

شاید ہندوستان میں ایسے مدارس کم ملیں گے جو خود کفیل بننے کے لیے کوشاں ہوں، جامعہ

عارفیہ اپنی کفالت آپ کرتے ہوئے نوجوانانِ امت کی تربیت وتعمیر میں مصروف ہے۔ یہاں پر ایک دواخانہ ہے جہاں بہت سی ادویہ تیار کر کے ملک کے مختلف حصوں میں بھیجی جاتی ہیں۔ اس حوالے سے جامعہ عارفیہ مبارک باد کا مستحق ہے۔

جامعہ عارفیہ تعلیم وتدریس کے ساتھ بچوں کے اندر تحریری صلاحیت پیدا کرنے کے لیے فکر مند ہے۔ یہاں سے ''الاحسان اردو'' ''الاحسان عربی'' کے علاوہ خضر راہ کے نام سے ایک رسالہ ہر ماہ پابندی سے شائع ہوتا ہے۔ اس مستحسن اقدام کی وجہ سے ہند وعرب کے ارباب فکر ودانش اس سے جڑے ہوئے ہیں۔ یقین ہے کہ ان رسائل کے بہت ہی اچھے نتائج برآمد ہوں گے۔

محمد ارشاد احمد مصباحی (استاذ: دار العلوم مخدومیہ، سونو کمپاؤنڈ، جوگیشوری (ویسٹ)، ممبئی۔ ۱۰۲)

سال نامہ ''الاحسان'' کے بارے میں کبھی کسی نیوز پیپر یا کسی رسالے میں پڑھا تھا۔ اس تعلق سے تھوڑا تجسس بڑھا تھا مگر مصروفیتوں کے باعث اس کی اہمیت پر کوئی خاص توجہ نہیں دے سکا۔ ۲۰۱۲ء کے اواخر میں دار العلوم مخدومیہ جوگیشوری ممبئی، کے کمپیوٹر لیب میں حسب ضرورت انتظامیہ کی جانب سے ایک کمپیوٹر کو انٹرنیٹ کی سہولیت مہیا کروائی گئی۔ انٹرنیٹ یوز کرنے کی وجہ سے دنیا بھر کے بے شمار دینی اور دنیاوی فوائد سے بہرہ ور ہوتے گئے۔ ایک دن فیس بک یوز کرتے ہوئے ایک پوسٹ پر جا کر نگاہ رک گئی، اس پوسٹ میں سالنامہ ''الاحسان'' کا ٹائٹل پیج اپلوڈ کیا گیا تھا اور نیچے ایک ڈسکرپشن لنک دی گئی تھی۔ جب میں نے اس لنک پر کلک کیا تو میرے سامنے ڈاؤنلوڈ کا ایک آپشن آیا۔ اس پر کلک کیا اور تھوڑی دیر کے بعد سال نامہ ''الاحسان'' کی ایک کاپی میری نگاہوں کے سامنے تھی۔ فوراً نیوز پیپر یا رسالے والی وہ بات یاد آگئی جو کبھی میں نے اس سال نامے کے تعلق سے پڑھا تھا۔ تجسس مزید بڑھ گیا اور سب کچھ چھوڑ کر اس کا مطالعہ کرنے لگا۔

دو تین قسطوں میں سارے مندرجات کے مطالعے کے بعد طبیعت مچل اٹھی، دل مسرور ہوگیا مگر ساتھ ہی حیرت زدہ بھی رہ گیا۔ تصوف پر کئی کتابیں زیر مطالعہ رہیں مگر جس قدر تصوف پر مبنی معلوماتی تحریریں میں نے اس کتاب میں دیکھیں، کہیں اور دیکھنے اور پڑھنے کو نہیں ملیں۔ چند ایسے بھی گوشے اس کتاب میں ملے جن کے بارے میں مجھے کافی عرصے سے تلاش تھی۔ تصوف کا باب بے پناہ وسیع ہے، اس کا اندازہ مجھے اس کتاب کی معلوماتی تحریروں کو پڑھنے کے بعد ہوا۔ فیس بک میں مندرج ڈسکرپشن لنک کی مدد سے کچھ اور کاپیاں موصول ہوئیں جنہیں پڑھنے کے بعد مجھے تصوف کے حوالے وہ ساری باتیں مل گئیں جنہیں برسوں سے مجھے تلاش تھی اور ایسی باتیں بھی ملیں جن کے بارے میں مجھے بالکل علم نہیں تھا۔

جامعہ عارفیہ پر مبنی تعارفی ویڈیو دیکھنے کے بعد ٹرسٹ کے ماتحت مختلف مگر اہم شعبہ جات

اور مستقبل کے زبردست منصوبوں کا علم ہوا۔ ساتھ ہی یہ وہم بھی دور ہوا کہ خانقاہیں تعلیم واخلاص سے کوسوں دور صرف دنیا سازی میں مصروف ہیں۔ دل سے صرف یہی دعائیں نکلتی ہیں مولیٰ تعالیٰ اپنے حبیب پاک علیہ التحیۃ والثناء کے صدقہ وطفیل حضور داعی اسلام کو عمر خضر عطا فرمائے اور حضور والا کا سایۂ عاطفت ہمارے سروں پر تادیر قائم رہے اور حضور داعی اسلام کی ذات سے وہ سارے کام پایۂ تکمیل تک پہنچ جائیں جنھیں انھوں نے شروع فرمادیا ہے اور وہ بھی جنھیں انھوں نے منصوبوں کے جامے میں پنہاں رکھا ہے۔

اب دل میں یہی آرزو کروٹیں لے رہی ہے کہ وہ وقت سعید جلد ہمارے نصیبے کی گرفت میں آجائے کہ میں اپنے ماتھے کی نگاہوں سے حضور داعی اسلام کے پرنور چہرے کی زیارت کر کے دست بوسی کا شرف حاصل کروں اور جامعہ عارفیہ کے تعلیمی گلستاں کی خوشبوؤں سے اپنی مشام جاں کو معطر کروں۔

عبدالکریم امجدی ثقافی (دفتر رابطۂ عامہ، مرکز الثقافۃ السنیۃ، کیرالا)

سب سے پہلے جامعہ مرکز کی جانب سے آپ تمام حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جنوبی ہند میں الاحسان نامی تصوف کا رسالہ بروقت پہنچ جاتا ہے جس سے یہاں کے علمی ماحول میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ سارے مضامین بے حد پسند آئے، جو قابل تعریف وتقلید ہیں۔ مناسب سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے صوفیۂ کرام کی تاریخ سلسلہ وار پیش کی جائے، اس طرح صوفیۂ ہند کا ایک سرسری جائزہ بھی منظر عام پر آجائے گا۔

آفتاب رشک مصباحی (پرنسپل: دارالعلوم الہ آباد، الہ آباد، یوپی)

الاحسان اردو کا چوتھا شمارہ دست یاب ہوا۔ شکریہ! کساد بازاری کے اس دور میں بھی اتنا وقیع اور ضخیم مجلہ بلاناغہ شائع کرتے رہنا یقیناً آپ حضرات کا بڑا کارنامہ ہے۔ اس کے لیے الاحسان کے سرپرست داعی اسلام شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی دام ظلہ العالی پوری الاحسان ٹیم کے ساتھ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو تادیر سلامت رکھے تاکہ امت مرحومہ لمبی مدت تک خم خانۂ تصوف سے سرشار ہوتی رہے۔

گذشتہ شماروں کے بہ نسبت یہ شمارہ اپنی ضخامت کے اعتبار سے کافی دبلا پتلا ہو گیا ہے جس کی وجہ مدیر مجلہ مولانا حسن سعید صفوی صاحب نے ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے:

''اب تک الاحسان کا دورانیہ سالانہ تھا، اہل علم وقلم کی فرمائش کا احترام کرتے ہوئے اب یہ مجلہ ششماہی کر دیا گیا ہے۔ ان شاء اللہ قارئین الاحسان کو اب لمبے انتظار کی زحمت نہیں اٹھانی پڑے گی۔ ہر چھ ماہ بعد الاحسان کا تازہ شمارہ ان کی میز پر ہوگا''۔

(الاحسان اردو شمارہ:۴،ص:۱۰)

اللہ کرے ایسا ہی ہو مگر ان کالمز کا کیا ہوگا جو حذف کر دیے گئے؟ یہ اور بات ہے کہ مدیر موصوف کے نزدیک وہ کالمز ''برائے وزن شعری معلوم ہوتے تھے''، مگر سیکڑوں محققین سمیت مجھ جیسا طالب علم ان میں شائع ہونے والے مقالات کو دستاویزی حیثیت دیتا ہے۔ بہرحال! ان کے حذف ہونے سے قارئین الاحسان کو تکلیف تو ضرور ہوئی۔

ابتدائیہ میں مدیر موصوف نے الاحسان عربی کے خوب صورت اشاعتی کارنامے سے روشناس کرایا جو اس بات کا غماز ہے کہ شاہ صفی اکیڈمی صرف اردو دنیا کو ہی نہیں بلکہ دیگر زبانوں سے واقفیت رکھنے والے حضرات کو بھی روح تصوف سے آشنا کرانے کا عزم رکھتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کہ اشاعت روح دین میں پوری الاحسان ٹیم **حریص علیکم بالمؤمنین رؤف رحیم** کے نقش قدم پر چلنے میں کوشاں ہے۔ ''تذکیر'' کے کالم میں جہاں ''ایمان کے درجات''، ''طالب صادق اور سلوک راہ طریقت'' اہم ہیں، وہیں ''فقہی مذاہب کا اختلاف رحمت ہے'' اور ''ایک عبرت آمیز ایمان کا سفر'' چشم کشا، نصیحت آمیز اور ایمان افروز ہیں۔ پروفیسر بدیع الدین صابری کا مضمون ''عصر حاضر میں ذکر الٰہی اور مراقبے کی ضرورت واہمیت'' بھی خوب ہے۔ جملہ اذکار واشغال جو صوفیہ نے ایجاد کیے وہ محض یاد الٰہی اور قرب الٰہی کے لیے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ہمارا مقصد تخلیق بھی یاد الٰہی ہے۔ اس حیثیت سے ہماری زندگی کے جو لمحات یاد الٰہی میں بسر ہوئے، صحیح معنوں میں وہی زندگی ہے باقی سب ضیاع عمری۔ بقول شخصے:

مختصر سی مری کہانی ہے
جو بھی ہے ان کی مہربانی ہے
جتنی سانسوں میں ان کا نام لیا
بس وہی میری زندگانی ہے

مفتی مطیع الرحمٰن رضوی نے ''نفس کشی اور تزکیہ: قرآن وحدیث کی روشنی میں'' عنوان کے موافق مقالے کو نبھانے کی کوشش کی ہے اور کسی حد تک نبھایا بھی ہے، یہ اور بات ہے کہ اسے مزید بہتر کیا جا سکتا تھا۔ بہرحال عربی عبارات کے ترجمے کی عدم سلاست کے باوجود مقالہ عمدہ اور بہتر ہے۔ ''حقیقت تصوف: موافق ومخالف نظریات کا تجزیہ'' کے عنوان سے پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی صاحب کا مضمون باذوق ارباب علم وتحقیق کو دعوت مطالعہ دیتا ہے۔ موصوف نے اپنی بات کہنے کی بھرپور کوشش کی ہے، اگرچہ بعض مقامات پر خود بھی ٹھوکریں کھائی ہیں مثلاً ان کا یہ کہنا کہ ''تصوف میں وحدۃ الوجود یا وحدۃ الشہود وغیرہ کے نظریات بنیادی طور پر فلسفیانہ ہیں اور ان کا راست تعلق

دین وشریعت یا تصوف سے نہیں ہے'' ایک بڑی غلط فہمی کی پیداوار ہے؛ کیوں کہ نظریۂ وحدۃ الوجود یا نظریۂ وحدۃ الشہود جسے بعض حضرات نے اگرچہ فلسفے کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی ہے مگر اس کا تعلق فلسفے سے نہیں، ایمانیات سے ہے، بالفاظ دیگر قال سے نہیں حال سے ہے، علم وفکر سے نہیں ذوق وکیفیت سے ہے، اس کے باوجود علمی طور پر اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ وحدۃ الوجود یعنی وجود واحد، موجود واحد صرف اور صرف اللہ کی ذات اقدس ہے۔ حقیقی وجود، واجب الوجود صرف اللہ ہے باقی سب اس کے ارادے کا ظہور ہے۔ اللہ کے علاوہ وجود حقیقی کسی اور کے لیے نہیں، فقیر کے نزدیک علمی طور پر یہ وحدۃ الوجود ہے جو میرے ایمانی ذوق کی بنیاد پر خالص دین اور عین ایمان ہے۔ مشہور عربی شاعر لبید کے قول:

الا کل شیٔ ما خلا اللہ باطل

کی تائید کرتے ہوئے رسول اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

اصدق کلمۃ قالھا الشاعر کلمۃ لبید: ألا کل شیٔ ما خلا اللہ باطل

(صحیح البخاری، کتاب الادب، حدیث نمبر:۵۶۸۱)

یعنی کسی شاعر کی جو سب سے سچی بات ہوسکتی ہے وہ لبید کی یہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ ساری چیزیں بے حقیقت ہیں۔

قرآن میں ہے:

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ (الرحمن:26،27)

روئے زمین پر جتنی چیزیں ہیں سب فانی ہیں باقی تو صرف جلال واکرام والے رب کی ذات ہے۔

دوسری جگہ ہے:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ (الاخلاص:1) اے محبوب! آپ فرمادیں کہ اللہ ایک ہے۔

اور ہمارا عقیدہ بھی ہے کہ وہ ایک ہے **لا مثیل لہ و لا نظیر لہ** نہ اس کی طرح کوئی چیز ہے نہ کوئی اس کی نظیر ہے۔ اور ''**الآن کما کان**'' وہ جیسا تھا ویسا آج بھی ہے۔ یعنی تخلیق عالم سے پہلے بھی واحد اور موجود تھا، آج بھی وہ واحد اور موجود ہے، گویا باعتبار وجود کے اس کے ایک اور موجود حقیقی ہونے کا عقیدہ ایمانیات کی خشت اول ہے، کہ بغیر اس کے کوئی مومن ہی نہیں ہوسکتا۔

رہا وحدۃ الشہود تو کمال ایمان سے متصف ہونے کے بعد اللہ رب العزت اپنے بندے کو مشاہدے کی نعمت سے سرفراز کرتا ہے۔ اب اس کی نظر تجلی پر نہیں ہوتی بلکہ متجلی پر ہوتی ہے اور وہ ارادۂ الٰہی کے ظہور میں جلوۂ الٰہی کا نظارہ اور مشاہدہ کرتا ہے جو خالص عطائے ربانی اور انعام خداوندی ہے۔ اللہ رب العزت کا ارشاد گرامی ہے: **فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ** (البقرۃ:115) تم

جدھر نظر کروگے جمال حق ہی کا مشاہدہ کروگے۔ خلاصہ یہ کہ وحدۃ الوجود عین ایمان اور بنیاد ایمان ہے، جب کہ وحدۃ الشہود کمال ایمان اور انعام رحمٰن ہے اور یہ دونوں نظریات فلسفیانہ نہیں بلکہ دین وشریعت اور تصوف سے براہ راست متعلق ہیں۔

اسی طرح پروفیسر موصوف کا یہ قول بھی کہ ''فقر وزہد کی فضیلت کی بہت سی احادیث جو متداول ومعروف بنیادیں ہیں، وہ سرے سے احادیث ہی نہیں منکر وموضوع روایات ہیں۔'' کہاں تک درست ہے، ارباب حدیث ہی بتا سکتے ہیں۔ ویسے صحیح بخاری، صحیح مسلم وغیرہا جملہ کتب صحاح میں اس طرح کی سیکڑوں حدیثیں مروی ہیں جن پر منکر وموضوع کا حکم لگانا شاید عجلت پسندی ہی کہی جاسکتی ہے۔ بہر حال! پورا مضمون عمیق مطالعے سے تعلق رکھتا ہے۔

عبادت وریاضت، ذکر وفکر، تزکیہ ونفس کشی اور مراقبہ ومشاہدہ جیسے صوفیہ کے اہم مشاغل کو چھوڑ کر صوفیہ کے جہادی کردار کو شمالی افریقہ کے تناظر میں ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی نے بڑی عمدگی کے ساتھ متعارف کرایا ہے جو قابل ستائش ہے۔ مولانا شاہ ہلال احمد قادری کا تنقیدی مضمون بھی خوب ہے مگر کہیں کہیں انہوں نے تشدد کی راہ اختیار کر لی ہے جو ایک اصلاح پسند تنقید کے لیے عیب مانا جاتا ہے۔ خانوادۂ ولی اللہی کے عظیم المرتبت علمی وروحانی جانشیں سراج الہند شاہ عبد العزیز قدس سرہٗ کے نظریۂ تصوف پر مولانا طفیل احمد مصباحی کا مضمون ''تصوف: شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کی نظر میں'' عمدہ اور معلوماتی ہے مگر ان کی عبارت ''حضرت مجدد الف ثانی شیخ سرہندی وحدۃ الوجود کے بالمقابل ''وحدۃ الشہود'' کے قائل تھے اور مسئلہ وحدۃ الوجود کی پرزور تردید کرتے تھے'' خود مجدد الف ثانی شیخ سرہندی کے خلاف ہے۔ مکتوبات امام ربانی دفتر اول مکتوب نمبر:۱۳ میں خود مجدد صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''میرے مخدوم ومکرم! فقیر کا اعتقاد لڑکپن سے اہل توحید کا مشرب تھا اور فقیر کے والد بزرگوار قدس سرہٗ بظاہر اسی مشرب پر ہوئے ہیں اور باطن میں پوری پوری نگرانی حاصل ہونے کے باوجود جو مرتبہ بے کیفی کی جانب رکھتے تھے ان کا اشتغال ہمیشہ اسی طریق پر رہا اور اس مضمون کے موافق کہ فقیہ کا بیٹا آدھا فقیہ ہوتا ہے، فقیر کو اس مشرب سے از روئے علم بہت فائدہ اور بڑی لذت حاصل تھی، یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے محض اپنے کرم سے ارشاد وہدایت کی پناہ والے، حقائق ومعارف کو جاننے والے، پسندیدہ دین کی تائید کرنے والے ہمارے شیخ سیدی خواجہ محمد باقی قدس سرہٗ کی خدمت وصحبت نصیب کی اور انہوں نے فقیر کو طریقۂ عالیہ نقش بندیہ تعلیم فرمائی اور مسکین کے حال زار پر بڑی توجہ فرمائی۔ اس طریقۂ عالیہ نقش بندیہ کی مشق کے بعد تھوڑی ہی مدت میں توحید وجودی

منکشف ہوگئی، اس کشف میں حد سے بڑھ کر زیادتی پیدا ہوئی اور اس مقام کے بہت سے علوم و معارف ظاہر ہوئے، یہاں تک کہ اس مرتبۂ دقائق سے شاید ہی کوئی دقیقہ ہو جس کو اس فقیر پر منکشف نہ کر دیا گیا ہو۔'' (مکتوبات امام ربانی، دفتر اول، مکتوب: ۳۱)

اس شمارے کا آخری مضمون مولانا ذیشان احمد مصباحی کا ہے۔ مولانا مصباحی نے امام شعرانی کے سمندر علم میں غوطہ زنی کر کے وہ موتیاں نکالی ہیں جن کی چمک نے مجھ سمیت سیکڑوں محققین علما کی آنکھیں چوندھیا دی ہیں۔ اجتہاد و تقلید کے تعلق سے ایسا جامع اور علمی مضمون آج تک نہ پڑھنے کو ملا، نہ دیکھنے کو اور نہ ہی سننے کو۔ پورا مضمون مولانا مصباحی کے ذوق تحقیق کا آئینہ دار ہے۔ مکتوبات کے کالم میں شامل جملہ خطوط بھی بہتر ہیں۔ اللہ اس مجلہ کو مزید بہتر سے بہتر بنائے۔ (آمین)

سلمان بلرام پوری (روہیل کھنڈ یونی ورسٹی، بریلی، یوپی)

آپ کا یہ ادبی رسالہ اردو ادب کی دنیا میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔ یہ ادبی رسالہ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ مکرمی! میں اس ادبی رسالہ کا ایک حصہ بننا چاہتا ہوں۔ میں اس کے لیے اپنا ایک مضمون ارسال کر رہا ہوں۔ میں اس کی اشاعت پر دل سے شکر گزار رہوں گا۔

محمد ہاشم نقشبندی مجددی (خادم: جامعہ صدیقیہ، سوجاں شریف، مغربی راجستھان)

آج بروز سنیچر ''الاحسان'' کی چار کاپیاں ناچیز کو موصول ہوئیں۔ الاحسان کتابی سلسلہ جو جاری کیا ہے اس کے تعلق سے صرف سنا کرتے تھے مگر حقیقت اس وقت عیاں ہوگئی جب الاحسان کا یکے بعد دیگرے مطالعہ شروع کیا۔ دل پر ایسی کیفیت طاری تھی کہ بیان سے باہر ہے۔ پھر جب اساتذہ کو ایک ایک کاپی دی تو محو حیرت مجھ سے پوچھنے لگے کہ یہ کتابیں کب آئی ہیں؟ میں نے تسلی دی کہ یہ اب ہمیشہ آتے رہیں گے۔ الاحسان تصوف کی روح ہے، سلوک کی جان ہے، دل کی تسکین اور سیاہ قلوب کے لیے ایک تریاق ہے جن کے مضامین ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ مولیٰ قدیر جل شانہ ہم سب کو اخلاص سے دین متین کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

امان اللہ محمدی (متعلم درجہ سابعہ: الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ، یوپی)

تصوف پر نہایت علمی، تحقیقی اور دعوتی مجلہ الاحسان الہ باد کے ابتدائی تین شمارے مفتی آفتاب رشک مصباحی پرنسپل دار العلوم الہ آباد، الہ آباد، یوپی کے گھر پر ان کی ذاتی لائبریری میں دیکھنے کو ملے۔ یکے بعد دیگرے جستہ جستہ سب کا مطالعہ کیا اور اپنی استعداد بھر خوب علمی استفادہ کیا، سارے مجلّات حد درجہ معلوماتی اور تحقیقی ہیں بالخصوص مولانا ذیشان احمد مصباحی اور مولانا ضیاء الرحمن علیمی کے مضامین ان مجلّات کی جان ہیں۔ تصوف کے تعلق سے پھیلی غلط

فہمیوں کے ازالے کے لیے جس طرح کے مجلّے کی ضرورت ارباب تصوف محسوس کر رہے تھے، آپ حضرات نے الاحسان شائع کر کے اس ضرورت کو پوری کر دی ہے۔ تمام مجلّات پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ ہر آنے والا مجلہ گذشتہ مجلّے سے معیاری اور تحقیقی ہوتا جا رہا ہے یعنی **وللآخرة خير لك من الاولى** کا مصداق ہے۔ یہ کسی بھی مجلّے کی درازی عمر کے لیے ایک خوش آئند بات ہے، اللہ کرے یہ مجلہ عمر خضر پائے۔

اس وقت میرے پیش نظر الاحسان اردو کا چوتھا شمارہ ہے جو مفتی آفتاب رشک صاحب کے توسط سے مجھ تک پہنچا مگر اس کا حجم پہلے سے بہت کم ہے جس کی وجہ سے بہت سے کالمز کی تخفیف ہے۔ اسباب خواہ جو بھی رہے ہوں، مگر یہ باعث افسوس ہے مثلا اس شمارے میں بادہ و ساغر، احوال، بادۂ کہنہ، بحث ونظر، شناسائی، صوفی ادب، زاویہ اور پیمانہ جیسے اہم کالمز نہیں ہیں جس کی وجہ سے بہت سی معلوماتی اور انکشافی باتیں جو مذکورہ کالمز میں پڑھنے کو مل جاتی تھیں انہیں پڑھنے سے ہم محروم رہے، جس کا ہمیں قلق ہے۔ امید کہ آئندہ شمارہ ابتدائی تین شماروں کی طرح اپنے تمام کالمز کے ساتھ منشا شہود پر جلوہ بار ہوگا۔ ان شاء اللہ۔ اس چوتھے شمارے کے مقالات بھی نہایت علمی اور تحقیقی ہیں۔

''فقہی مذاہب کا اختلاف رحمت ہے'' اور ''ایک عبرت آمیز ایمانی سفر'' متاثر کن بھی ہے اور مسرت بخش بھی۔ سچ ہے اللہ جسے چاہے اپنی راہ دے۔ پہلے مضمون نے مذاہب اربعہ کی حقانیت کا جو دعوی محض زبان پر تھا اسے دل میں جگہ دی۔ دوسرے مضمون نے ایمان ویقین کا جو مشاہداتی رنگ دکھایا ہے اسے پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ قرآن کی آیت کریمہ: **قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ۔** (الحجرات: 14) کے مصداق وہ اعرابی ہم ہی ہیں جو محض زبانی دعوئ ایمان کرتے ہیں اور حال یہ ہے کہ ایمان ابھی ہمارے دلوں میں داخل بھی نہیں ہوا، اللہ ہمیں مومن کامل بنائے۔

بہر حال آپ کا یہ مجلہ معنوی و صوری ہر اعتبار سے اتنا وقیع، معیاری و معلوماتی ہے کہ برسوں، سیکڑوں کتابوں کی ورق گردانی اور ہزاروں دروازوں کی جاروب کشی کے باوجود وہ چیزیں نہیں مل سکتیں جو ان مجلّات میں اکٹھا مل جاتی ہیں۔ مہنگائی اور قلت مطالعہ کے اس دور میں اس قدر عظیم اور ضخیم مجلّات کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتے ہیں اور اللہ سے دعا بھی کرتے ہیں کہ مولیٰ! تصوف کے اس دریائے نیل کو قیامت تک خشک نہ ہونے دے۔

○○○

الاحسان - ۴ پر اخبارات ورسائل کے تبصرے

وصیل احمد خان

(روز نامہ اردو ٹائمز، ممبئی ۱۳ ستمبر ۲۰۱۳ء)

صوفی ازم یا تصوف سے اسلام کا اولین رشتہ رہا ہے۔ ابتدائی دور اسلام میں بھی ایک جماعت ایسی موجود تھی جو دنیا و مافیہا سے بے خبر، خالص اسلامی اعمال وافکار کو حرز جاں بنائے رکھتی تھی، جنہیں تاریخ، اصحاب صفہ کے نام سے متعارف کراتی ہے، جس کی نگراں خود ذات رسول ہوا کرتی تھی۔ آج بھی وہی جماعت خانقاہوں میں میں موجود ہے، حالاں کہ ان کی ایک بڑی تعداد عیش ولذائذ دنیا کے حصول میں غرق ہو کر روحانیت کو معدوم کر چکی ہے۔ پھر بھی اس کی نشاۃ ثانیہ کی بازیابی ممکن ہے، اگر ہمت باندھ لی جائے۔ اس ضمن میں خانقاہ عارفیہ الہ آباد نے تصوف کے اسی حقیقی خدوخال کو پھر سے نمایاں اور واضح کرنے میں پیش قدمی کرتے ہوئے مجلہ الاحسان کا اجرا کیا ہے، جس کا چوتھا سلسلہ اس وقت زیر نظر ہے، جو مارچ ۲۰۱۳ کو شائع ہوا ہے، جو اپنے معیار، حسن انتخاب اور مطمح نظر یعنی اسلامی اور غیر اسلامی تصوف کے فروق اور اس کے اندر موجود غیر اسلامی خیال آرائیوں کی نشان دہی اور ان کا اخراج جیسے اہم ترین موضوعات پر انتہائی بیش قیمت مضامین ومقالات شامل ہیں۔ سابقہ شماروں کی بہ نسبت یہ شمارہ ضخامت میں تقریباً نصف کر دیا گیا ہے، لیکن ندرت، انفرادیت اور جامعیت کو قائم رکھا گیا ہے۔ مشمولات کو کل تین حصوں میں تقسیم کر کے تذکیر، تحقیق وتنقید اور مکتوبات کے عنوانات دیے گئے ہیں۔

توفیق احسن برکاتی

(ماہ نامہ سنی دعوت اسلامی، ممبئی رجولائی ۲۰۱۳ء)

الاحسان الہ آباد (اردو) ایک کتابی سلسلہ ہے۔ اس کا چوتھا شمارہ راقم کے پیش نگاہ ہے۔ اس سے پہلے کے تین کامیاب نقوش ارباب فکر ودانش کے فکر وخیال کو اپنی سحر آگیں، علمی وتحقیقی کرنوں کا اسیر بنا چکے ہیں۔ ۲۱۲ صفحات پر مشتمل یہ شمارہ شش ماہی کی شکل میں شائع ہوا ہے۔ ابتدا کے تین شمارے ضخامت میں اس کا دوگنا تھے اور انہیں سال نامے کی حیثیت دی گئی تھی، ان کے کالمز کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ زیر تذکرہ شمارہ اپنی سابقہ روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہے، البتہ

اس میں صرف چار کالمز ہی شامل کیے گئے ہیں۔ ابتدائیہ مدیر رسالہ محترم حسن سعید صفوی کے قلم کی یادگار بنا ہوا ہے۔ تذکیر کے کالم میں چار مضامین اور تحقیق وتنقید کے تحت سات قلم کاروں کے گراں قدر مقالات کی شمولیت ہے اور اخیر میں مکتوبات کا کالم ہے جس کا مطالعہ بحث ومذاکرے کا در وا کرتا ہے اور افہام وتفہیم کی راہیں کشادہ ہوتی ہیں۔ اس چوتھے شمارے میں بھی ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی کا خط بحث کا موضوع بن سکتا ہے اور کچھ مقالات پر بھی قلم اٹھایا جا سکتا ہے۔ بہر حال یہ شمارہ بالکل لاجواب، بے حد متنوع اور انتخاب مضامین کے لحاظ سے انتہائی منفرد تسلیم کیا جائے گا۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اس جریدے کو ملک کے مقتدر ارباب قلم کا تعاون حاصل ہے اور مکتوبات کا کالم بتا رہا ہے کہ یہ کتابی سلسلہ ہر طرح کی شخصیات کے مطالعے کی میز تک پہنچ رہا ہے۔ یہ بڑی اہم بات ہے جو اس رسالے کو امتیاز دے رہی ہے۔

ساجد سعیدی

(ماہ نامہ جام نور دہلی اپریل ۲۰۱۳ء)

اکیسویں صدی میں یہ بات ناقابل انکار حقیقت کے طور پر تسلیم کر لی گئی ہے کہ تصوف ہی وہ واحد راستہ ہے جس کے ذریعے پریشان خیالوں کو سکون اور اضطرابی حالات سے دوچار ہونے والوں کو اطمنان فراہم کیا جا سکتا ہے اور یہ کہ موجودہ صدی احیاے تصوف اور اس کی نشاۃ ثانیہ کی صدی ہے۔ ایسے دور میں جب کہ ہر ایک کی نگاہ امید، تصوف کی طرف لگی ہوئی ہے، تصوف میں در آئے ان تمام خرافات کا نہایت علمی طریقے سے اخراج ضروری ٹھہرا جو تصوف کی روشن پیشانی پر سیاہ داغ بنے ہوئے ہیں۔ زیر تبصرہ مجلہ الاحسان تصوف کے حوالے سے دیگر تحقیق وتنقید اور دنیا کے سامنے تصوف کی اصل شبیہ پیش کرنے ساتھ اس کار سعید کی بھی ایک مسعود ومبارک کوشش ہے، جس کا آغاز آج سے چار سال قبل ۲۰۱۰ء میں ہوا۔ الاحسان اپنے تین شماروں کی کامیاب اشاعت کے بعد باذوق اور تحقیق پسند قارئین کے لیے اپنی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اور بعض تبدیلی کے ساتھ چوتھے شمارے کی شکل میں اشاعت پذیر ہوا۔ بلاشبہ اس کا سارا کریڈٹ داعی اسلام شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی کے نام جاتا ہے، جنہوں نے تصوف پر کام کرنے کے لیے اتنا عظیم پلیٹ فارم مہیا کر رکھا ہے۔

اس شمارے کے خاص قلم کار

- **ڈاکٹر مفتی علی جمعہ**، سابق مفتی جمہوریہ، جامعہ ازہر، مصر
- **شیخ عدنان بن عبداللہ زہار**، ایک عظیم خطیب و اسلامی اسکالر، مراقش
- **ڈاکٹر یوسف القرضاوی**، معروف اخوان حامی مصری اسکالر، قطر
- **مفتی مطیع الرحمن رضوی**، جامعہ نوریہ، رائے گنج، اتر دیناج پور، بنگال 9593791928
- **پروفیسر اختر الواسع**، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی 9810541045
- **پروفیسر بدیع الدین صابری**، شعبۂ عربی، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد 9949351984
- **ڈاکٹر سید علیم اشرف جائسی**، مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی، حیدرآباد 9885700584
- **شیخ سید شرف الدین نیر قادری**، سجادہ نشیں: خانقاہ قادریہ محمدیہ، امجھر شریف
- **شمیم طارق**، معروف صحافی و قلم کار، ممبئی 9224751077
- **ڈاکٹر سید شاہد علی**، شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی 8750390067
- **ڈاکٹر ظفر انصاری ظفر**، شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد، یوپی 8853579247
- **مولانا محمد ظفر الدین برکاتی**، مدیر ماہ نامہ کنز الایمان، دہلی 9990261528
- **مولانا جہانگیر حسن مصباحی**، مدیر مسئول: ماہ نامہ خضر راہ، سید سراواں، الہ آباد 9794364306
- **مولانا صادق رضا مصباحی**، گراؤنڈ فلور، ناگپاڑہ، ممبئی 9619034199
- **آصف رضا مصباحی**، دار الافتاء، اجمل العلوم، سنبھل، مراد آباد 9927941795
- **جان محمد عرف جانکی**، نئی گڑھی، ضلع ریوا، مدھیہ پردیش 8109762447

شاہ صفی اکیڈمی کی اہم ایجنسیاں

اتر پردیش: ○**ابو میانز شاہی اسٹور**، نور اللہ روڈ، الہ آباد-9839457055 ○ **فیاض الحسن بک سیلر**، نئی سڑک، کان پور 9936805213 ○**حافظ سیف احمد**، فہیم آباد، کان پور 9670731895 ○**حافظ ہارون**، قلعہ مسجد، اٹاوہ 7417842567 ○**نور نبی بک سیلر**، ڈالمنڈی، وارانسی ○**بہار:** ○ **انصار بک ڈپو**، بارہ پتھر، ڈہری اون سون - 8603741579 ○**مدرسہ عارفیہ سعید العلوم**، نہوٹا شیر گھاٹی، گیا-9939479919 ○**رضا بک سیلر**، کمپنی باغ، مظفر پور، بہار-9709634293 ○**دار العلوم تاج الشریعہ**، مصری گنج، مدھوبنی-9931431786 ○**خواجہ بک ڈپو**، مٹیا محل، جامع مسجد-9313086318 ○**راجا اسٹیشنری**، شاہین باغ Ext روڈ، نئی دہلی-9891590739 ○**مولانا شفیق**، مسجد عمر فاروق، شاہین باغ، دہلی-9716559786 ○**الجامعۃ الاسلامیہ**، جیت پور II، دہلی-9650934740 ○**شاہ صفی اکیڈمی**، بٹلہ ہاؤس، دہلی-9910865854 **کرناٹک:** ○**سید صادق انوری**، بیجا پور، کرناٹک 9036543026 ○**مولانا مشتاق**، بیلگام 8147449067 ○ **برکاتی بک ڈپو**، عمران گیسٹ ہاؤس کمپلیکس، خواجہ بازار کے پیچھے، چھوٹا روضہ، گلبرگہ 9739752587 **کولکاتا:** ○**نیوز پیپر ایجنٹ**، رابندرا سارانی، کولکاتا-9748210140 ○ **بک اسٹال**، نیئر مسلم انسٹی ٹیوٹ، کولکاتا، 16۔ 9330643486 ○**خانقاہ نعمتی**، مٹیا برج، کولکاتا-09831746380 **نسیم بک ڈپو**، کولوٹولہ، کولکاتا-9339422992 ○**رضا بک سینٹر**، روشن گلدار لین، ٹکیہ پارہ، ہاوڑہ-9330462827 **جھارکھنڈ:** ○ **امدادیہ بک ڈپو**، جامع مسجد روڈ، ہزاری باغ-9835523993 ○**دار العلوم غریب نواز**، جھلوا، گڑھوا، جھارکھنڈ- ○**محمد اجمل**، جپلا، پلامو، جھارکھنڈ - 9430003405 ○ **دلکش بک ڈپو**، رام گڑھ، جھارکھنڈ-9798306353 **مہاراشٹر:** ○**قاری سرفراز**، دھاراوی، ممبئی-9819291874 ○**شیخ جاوید اقبال**، شیلیس نگر، ممرا 9322865066 ○**محمد ابراہیم**، شولا پور 9421067863 **آندھرا پردیش:** ○ **عرشی کتاب گھر**، پتھر گٹی، حیدرآباد 9440068759 ○**گلشن میڈیکیئر**، سکندرآباد، حیدرآباد 27716760 ○**میگھالیہ** ○**آمر نانگبری**، ہاویل روڈ، لابان، شیلانگ-8794042067 ○**حافظ شبیر شاداب**، دُرگ، چھتیس گڑھ-7869230382 **اڑیسہ:** ○**قریشی نیوز ایجنسی**، رجک سنیما روڈ، راورکیلا، اڑیسہ 9439499458 **گجرات:** ○**عادل نورانی**، الامین مسجد، سلطانیہ جمخانہ، سورت-9879657766 **راجستھان:** ○**غلام ذو النورین**، حسینی مسجد، بیکانیر 9460172623